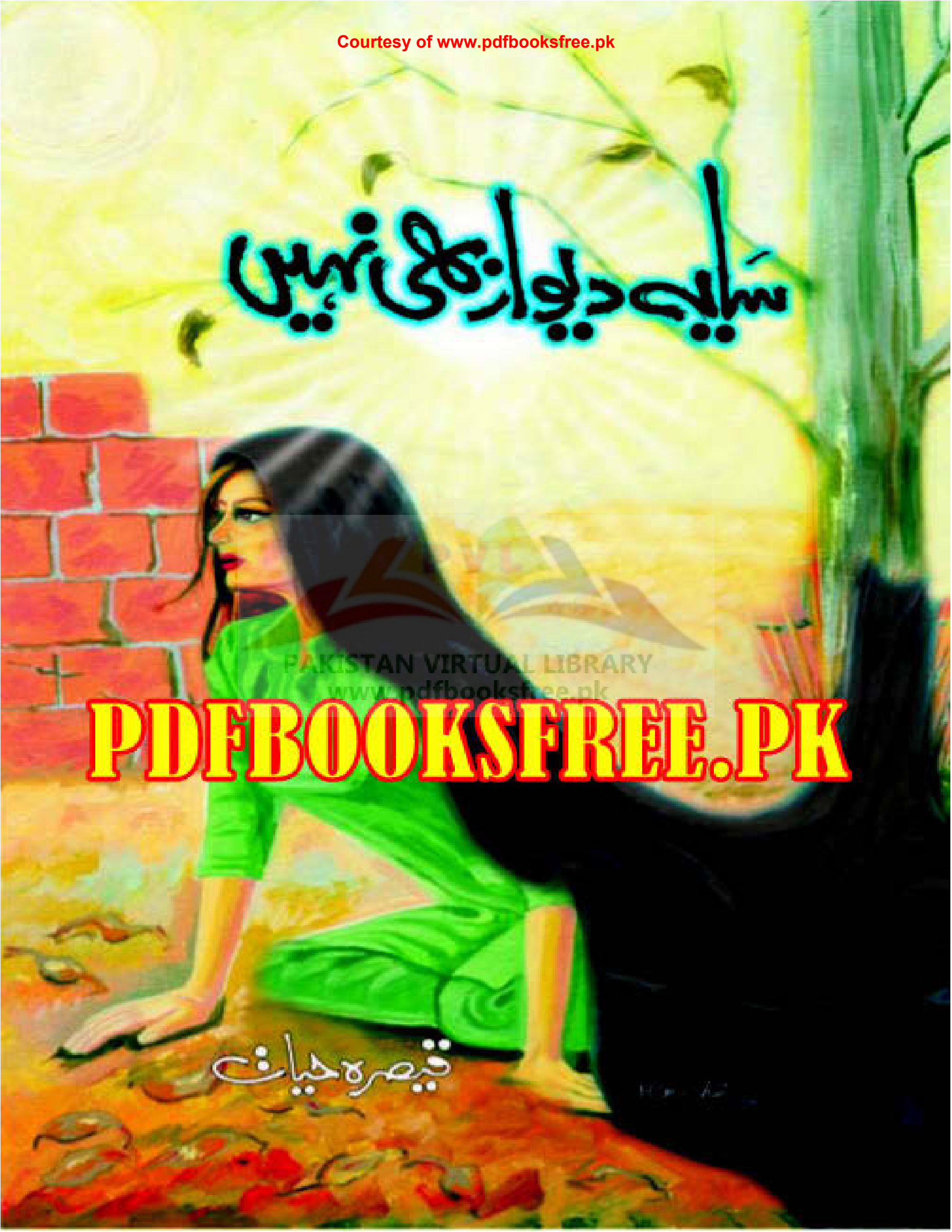


سایہ دیوار کی زینبی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

PDFBOOKSFREE.PK

قصہ حیات



سایہ دیوار بھی نہیں



جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام ناول	سایہ بیار بھی نہیں
مصنفہ	قیصرہ حیات
ناشر	گل نزار احمد
کیوزنگ	علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور
ہدف خوانی	رفاعت علی
سن اشاعت	محمد اکرم شاہ
مطبع	جنوری 2007ء
قیمت	جوہر رحمانیہ پرنٹرز، لاہور
	300/- روپے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

سیونٹھ سکاکی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ، الحمد مارکیٹ
40- اردو بازار لاہور



علم و عرفان پبلشرز

34- اردو بازار لاہور

فون: 042-7352332-7232336

انتساب!

بہت پیارا اور دعاؤں کے ساتھ
اپنی سب سے چھوٹی بہن ”سنبل“ کے نام
جسے میں بہت محبت کرتی ہوں۔



”دیباچہ“

یہ ناول پاکیزہ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا میرا پہلا ناول ہے جو عام روایتی ناولوں سے قدرے مختلف ہے کیونکہ اس میں کوئی بھی کردار مخصوص انداز میں میر دیا میر دین بن کر نمودار نہیں ہوا بلکہ یہ معاشرے کے ان چلتے پھرتے کرداروں کی کہانی ہے، جو اپنی اپنی سوچ کے مطابق زندگیوں گزارتے ہیں اور دنیا کی اسٹیج خالی کر کے چلے جاتے ہیں، جو سوچتے تو بہت کچھ ہیں مگر اس کے مطابق عمل نہیں کر سکتے۔ جو احساسات و جذبات تو رکھتے ہیں مگر بروقت ان کا اظہار نہیں کر پاتے۔ ایسے کردار ہمیں ہر معاشرے اور ہر طبقے میں ملتے ہیں۔ جنہیں ہم کبھی نظر انداز کر دیتے ہیں اور بعض اوقات نظر انداز کرنے کے باوجود بھی وہ ذہن سے محو نہیں ہو پاتے کیونکہ قدرت نے کہیں نہ کہیں ان میں کوئی انفرادیت ضرور رکھی ہوئی ہے اور یہ انفرادیت ہر کردار میں نہیں بلکہ بہت سے ایک جیسے کرداروں میں سے صرف چند ایک میں ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بھلائے نہیں جاسکتے۔

بقول شکسپیر ”یہ دنیا ایک اسٹیج ہے جہاں ہر انسان اپنا کردار ادا کر کے چلا جاتا ہے۔“ اب یہ قدرت کی عطا ہے کہ وہ ہم انسانوں کو اس دنیا کا نظام چلانے کے لیے کیا کیا رول (کردار) دیتی ہے۔ ہمیں اس کردار کو سمجھ کر بخوبی سمجھانے کے فن سے کس حد تک آشنا کرتی ہے۔ ہمیں کتنی صلاحیتوں سے نوازتی ہے۔ ہمارے فہم و ادراک کو کتنا متحرک اور فعال بناتی ہے۔ زمانے کی تحفوں اور نئی حقیقتوں کو دیکھنے کا کتنا شعور دیتی ہے۔ ہماری سوچ کس حد تک پریکٹیکل (عملی) بناتی ہے یا محض تخیلاتی۔ ہمارے لیے ہمارا ماحول کس حد تک سازگار ہے۔ یہ سب محال مل کر نہ صرف ہمارا کردار تشکیل دیتے ہیں بلکہ دنیا کی اسٹیج پر ہمارے کردار کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

یوں معاشرے کے ان تمام کرداروں کی وجہ بندی کریں تو سب سے پہلے ہمیں Prototype کردار نظر آتے ہیں یعنی دنیا کی اسٹیج پر نمودار ہونے والے صف اول کے شاہکار کردار جنہیں قدرت سیکڑوں، ہزاروں سالوں بعد دنیا میں بھیجتی ہے۔ ایسے جو ہر نایاب، کمیاب ہوتے ہیں اور وہ صرف دنیا والوں کے لیے ایک مثال اور نمونہ بننے کے لیے تخلیق کیے جاتے ہیں۔ انہیں ہر طرف سے بھرپور داد و تحسین دی جاتی ہے۔ ان کے مرنے کے بعد بھی دنیا انہیں بھول نہیں پاتی۔ ایسے کردار دنیا کی جہاں اور انسانیت کی خدمت کے لیے تخلیق کیے جاتے ہیں۔ دنیا کی پوری تاریخ پر نظر دوڑائیں تو ایسے نایاب کردار ملیں گے تو ضرور مگر کم تعداد میں۔ جیسا کہ اس ناول کا بظاہر اہم کردار نے والا کردار، مؤحد (ولیم) جو اپنی زندگی کا مقصد انسانیت کی خدمت کو ٹھہراتا ہے۔ مؤحد میں اپنے اس کردار کو سمجھانے کی کتنی صلاحیت ہے اس کا اندازہ اس کے محسوسات سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس نے ظاہر کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا مگر اس کے اندر اتنی پوٹینشل پیدا ہو چکی ہے کہ وہ تمام آزمائشوں سے آسانی گزر سکتا ہے۔ جو لوگ اوائل شباب میں ہی اپنے محسوسات، جذبات، شعور و خیالات سے جنگ کر کے اپنے لیے صراطِ مستقیم متعین کر لیتے ہیں وہ دراصل اپنی ذات اور اس کے تقاضوں کو سمجھ کر، اپنے Complexes کو نظر انداز کر کے دنیا کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس کشش کا مقصد ہی

یہی ہوتا ہے کہ قدرت ان کو اس کردار کو نبھانے کے فن سے آشنا کر رہی ہوتی ہے جو انھوں نے آئندہ زندگی بھر پورا انداز میں ادا کر کے دنیا کے لیے ایک مثال بننا ہوتا ہے۔

دوسرے کردار قدرے کم اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں سے داد و تحسین تو پاتے ہیں مگر ہمیشہ یاد نہیں رکھے جاتے۔ وہ آتے ہیں اور اپنا کردار احسن طریقے سے نبھا کر چلے جاتے ہیں۔ یاد آنے پر ان کی تعریف تو کی جاتی ہے مگر وہ پہلے کردار کی طرح مثال نہیں بن پاتے جیسا کہ اس ناول کا ایک اہم کردار حیدر ہے۔ جسے سراہا تو جاسکتا ہے مگر جس نے کوئی انقلابی قدم نہیں اٹھایا اور زندگی کے روایتی دھارے کو بہنے سے نہیں روکا۔ ایسے Stereotype کردار زندگی کو صرف چلاتے ہیں کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیتے۔

تیسرے کردار ایکسٹرا (Extras) ہیں جو دنیا کی اسٹیج کو صرف Fill کرنے کا کام انجام دیتے ہیں۔ دنیا کو ان کے آنے اور نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بقول ایک مغربی مفکر ”ایسے لوگ حشرات الارض“ ہوتے ہیں جو جنم لیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ جن کی زندگی میں Contributions کچھ بھی نہیں ہوتیں۔ اس ناول کے زیادہ تر کردار Extras ہیں۔

چوتھے کردار Idiosyncatic ہیں جو نہ تو اپنے کردار کو سمجھ پاتے ہیں نہ ہی اپنی صلاحیتوں کو اور نہ ہی اسٹیج یعنی اس دنیا کی ڈیمانڈز کو۔ وہ گوگو کیفیت میں ہوتے ہیں۔ جو چاہتے ہوئے بھی نہ کچھ کہہ پاتے ہیں اور سوچتے ہوئے بھی عملی قدم نہیں اٹھا پاتے۔ وہ ہمیشہ مناسب مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور جب بھی کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو انتہائی نامناسب موقعوں پر۔ ایسے کردار دنیا کے لیے ایک سوالیہ نشان بن جاتے ہیں اور جن کے چلے جانے کے بعد لوگ حیرت سے ان کے بارے میں سوالات کرتے رہتے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار (شہلا) سب کے لیے ایک سوال بنا رہا ہے کہ شہلا کون تھی؟ شہلا نے پہلے طلاق کیوں نہ لی۔ اس نے بچے کیوں چھوڑ دیے۔ اس نے پیٹر کو ولیم کا نام کیوں رکھنے دیا۔ وہ پیدائش سے لے کر مرنے تک ایک سوال بنی رہتی ہے اور میرے اس ناول کا مقصد ہی معاشرے کے ان کرداروں کو Highlight کرنا تھا جو ہمیشہ نظر انداز کیے جاتے ہیں۔ جن کے بارے میں ہم حیرت سے سوال تو کرتے ہیں مگر ان کی نفسیات کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے اور جن کے اندر جھانک کر ان کے احساسات تک رسائی نہیں کر پاتے اور جو مختلف نفسیاتی عارضوں اور جسمانی بیماریوں کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔

ان ہی کرداروں میں ایک اہم کردار ”شائل“ کا ہے جنھیں ہم Odd یا اٹارل کردار کہتے ہیں۔ میں نے کچھ عرصہ آری پبلک کالج سیالکوٹ میں بطور انگلش ٹیچر جاب کی۔ اس دوران بہت سے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے مسائل سامنے آئے جو ذہن میں مواد کی صورت میں جمع ہوتے رہے۔ ان میں ایک کردار کی مماثلت ”شائل“ سے تھی۔ جو نبھانے دنیا کی بھیڑ میں کہاں گم ہو گیا مگر میرے ذہن سے ٹھنڈ نہیں ہوسکا۔ اور جس کے یاد آنے پر دل سے ”آ“ نکلتی ہے۔ میں فلم کے ذریعے معاشرے کے ان چلتے پھرتے کرداروں کو میں کس طرح Portray کر پائی ہوں۔ اس کا فیصلہ قارئین کے ہاتھ میں ہے۔

اس ناول کے ضمن میں کچھ مخصوص لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جو اس ناول کی تخلیق اور اشاعت کا باعث بنے۔

سب سے پہلے اپنی دوست عمیرہ احمد کا، جس نے ہمیشہ اپنے ہر غلطیوں مشوروں سے نوازا اور جس کے قائل کرنے پر ہی میں نے پاکیزہ

ڈائجسٹ میں لکھا شروع کیا اور بہت سے قارئین تک رسائی ممکن ہوئی۔

اس کے بعد محترمہ صاحبہ (پاکیزہ کی ایڈیٹر) کا جنھوں نے اس ناول کا انتخاب میراث کی بنیاد پر کیا جسے میں نے دو تین سال قبل مکمل کر کے بھیجا اور جسے گا ہے پڑھ کر انھوں نے پاکیزہ میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔

اور ان تمام قارئین کا جنھوں نے ہر نقطہ کے بعد اپنی قیمتی آراء سے نوازا اور میری بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ جو اس ناول کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا باعث بنی۔

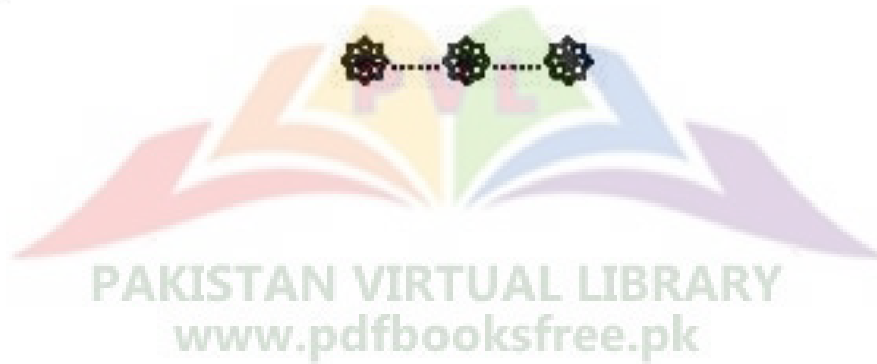
قارئین اپنی آراء اس ایڈریس پر ای میل کر سکتے ہیں۔

lco2006-sk1@yahoo.com

سب کے لیے دعا گو

قیصرہ حیات

23-11-2006



موسم خزاں کی اندر وہ شام کو مٹھل، دم توڑتی دھوپ میں آسمان پر روئی جیسے اڑتے پھرتے ہادلوں کے سنگ اور زمین پر جیز ہوا کے جھونکوں میں ہر طرف اڑتے پھرتے، پھڑاتے، کڑکڑاتے، سوکھے پتوں پر قدم رکھتے ہوئے وہ نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ کوئٹہ کی سیاہ سڑک پر ہر طرف براؤن، اور بیزکٹی رنگوں میں بدلتے پتوں کے ڈھیر لگے تھے۔ جیسے درخت اپنا سارا بوجھ اتارنے پر تھے ہوں اور اس فریضے سے جلد از جلد فارغ ہو کر قدرت کی طرف سے نئی آرائش کے منتظر ہوں۔ پرانے، مٹھل، شکستہ وجودوں کو اتار پھینک دینا چاہیے..... وہ کس کام کے؟ وہ سڑک کے عین وسط میں کھڑی ہو گئی اور ایک لمحے کو سوچا۔ ارد گرد سفیدے کے لیے لے اور سنبل کے درختوں ایک شکستہ عمارت کی ٹوٹی تھا۔ یہ سڑک کا سب سے خوب صورت حصہ محسوس ہو رہا تھا۔ مختلف ساز اور اسٹائل کے پتے، کچھ نیچے گرے ہوئے اور کچھ اکا دکا شاخوں کے ساتھ چٹے ہوئے، سبے سبے لگ رہے تھے۔ ہوا کا شدید جھونکا نہ جانے کہاں سے آیا اور پتے پھر ہوا کے سنگ پھڑ پھڑانے لگے۔ ہوا کے دوش پر سوار نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ جیسے انسان.... قسمت کے جھونکے انہیں کیسے کیسے اڑاتی پھرتی ہے۔ کبھی وہ اس کے پردوں پر سوار ہوا میں محو پرواز ہو جاتے ہیں تو کبھی وہ انہیں اٹھا اٹھا کر زمین پر زور سے پھینکتی ہے۔ کبھی وہ قدموں تلے آ کر کڑکڑ کرتے ہیں۔ کبھی گیلی زمین کے ساتھ چمٹ کر خاک میں پنہاں ہو جاتے ہیں۔

وہ آگے بڑھی۔ خوبصورت بڑے بڑے پتوں کو ہاتھ لگا کر دیکھنے کی خواہش کی تو نہ جانے کہاں سے کسی کی کوئیک کی کانٹوں بھری شاخ نے سر اٹھایا۔ اس پر ہر طرف کانٹے تھے۔ کہیں اکا دکا چھوٹے چھوٹے پتے اور تھوڑے تھوڑے قاصدے پر سرخ چھوٹے، چھوٹے مسکراتے ہوئے تین پھول کانٹوں بھری اس شاخ پر آگے سرخ پھول اسے قدرے اچھے لگے۔ اس نے پھول توڑنے کی کوشش کی، کانٹوں بھری شاخ اس کے دامن سے الجھ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں کئی کانٹے چھ لگے۔ اس نے پھر پھول توڑنے چاہے مگر اب کی بار کانٹوں نے اس کے دوپٹے کو بھی اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ الجھتی گئی۔ کانٹے چبھتے ہی گئے۔ اس نے کانٹوں سے دامن چھڑا کر ایک شاخ سے دوسری اور تیسری کئی کانٹوں بھری شاخیں نمودار ہونے لگیں اور اس کو اپنی پیٹ میں لے لیا۔ کانٹے چبھتے گئے اور وہ الجھتا ہوا ہوتی گئی۔ قدموں تلے سرسراتے، پھڑ پھڑاتے، پتے دم توڑتے رہے۔ اس کی ساری تک دو کار ت گئی۔

وہ کانٹوں کی جھین روح کے اندر تک محسوس کرتی رہی۔ فرار حاصل کرنے کی کوشش میں ادھر ادھر بھاگتی رہی مگر کانٹوں میں الجھا ہوا دوپٹا اس کے گلے کا پھندا بن رہا تھا۔ اس کی ایک لمحے کی خواہش اور آرزو نے اس کے وجود کو بھی خطرے میں ڈال دیا تھا۔ محض ایک لمحے کی خواہش، بڑا سوچے سمجھے لا حاصل کی تمنا، کچھ حاصل کرنے کی جستجو وہ تو کر چکی کر چکی ہو گئی تھی۔ بالکل شکستہ اور زخمی، جال میں پھڑ پھڑاتے پنچھیں کے مانند.....

وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اس کی خواہش، تمنا اور اس کے حصول کی جستجو بے شرعی یا بے سود۔ وہ الجھتی رہی، بھاگتی رہی اور کانٹوں کی جھین شدید ہوتی گئی۔ اچانک شاخ سے پھول ٹوٹ کر گرے اور پتی پتی ٹکڑے ہو گئے۔ حاصل کی تمنا دم توڑ چکی تھی۔ ہر جہت بے مانند پڑنے لگا۔ کچھ بھی باقی نہ رہا۔ نہ شاخ، نہ پھول، نہ کانٹے اور نہ ہی وہ خود..... وہ الجھتا ہوا دل اور شکستہ قدموں کے ساتھ ایک سمت کو مڑ گئی اور سیاہ لمبی سڑک..... پر چلتی ہوئی پتھروں سے ٹکراتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

”تم ایک انسان ہو۔ مکمل شخصیت، مکمل وجود!
تم بے حقیقت ہو۔ ادھوری شخصیت..... تا مکمل وجود!
تم خوب صورت احساس ہو، منفرد شخصیت..... حسن و جمال کا پیکر!
تم ایک عورت ہو۔ ایک معزز شخصیت..... خالق کی محترم مخلوق.....
اور..... سنو..... تم مسلمان بھی تو ہو۔ کہیں سے آؤ آئی۔

”نہیں، میرا کوئی وجود نہیں۔ کوئی شخصیت نہیں اور کوئی مذہب بھی نہیں۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ اسے آج اور اسی وقت فیصلہ کرنا تھا۔ ایک اہم فیصلہ۔ جس پر اس سمیت، کئی زندگیوں کا دار و مدار تھا۔ ایسا فیصلہ جس نے کتنے سالوں پر عادی ہونا تھا۔ کتنے وجودوں پر اثر انداز ہونا تھا۔ پراگندہ اور منتشر سوچوں نے اس کے ذہن کی یکسوئی کو تھوڑا کر دیا تھا۔ وہ بھنبلا گئی۔
گھر کے باہر لمبی سیاہ سنان سڑک پر اطراف میں اونچے اونچے درختوں کے درمیان چلتی ہوئی، سیاہ اور کوٹ میں پڑا مردہ چہرے، پراگندہ سوچوں اور مسخ شدہ شخصیت کے ساتھ وہ مرجھایا ہوا خزاں رسیدہ پتہ لگ رہی تھی۔ اس کے قدم ڈگر مار رہے تھے جیسے اس کی سوچیں اٹھل پھل ہو رہی تھیں۔

”میں کیا ہوں؟“ اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں اور اپنے آپ سے سوال کیا۔

”تم ایک انسان ہو، منفرد وجود، محبت کے قابل..... صرف تمہاری زندگی کا تم پر حق ہے۔ تم اس دنیا کی اہل حقیقت ہو۔ اس لیے صرف اور صرف اپنے بارے میں سوچو۔ دنیا میں تمہارے وجود سے بڑھ کر تمہارے لیے کچھ اہم نہیں ہونا چاہیے۔“ پیٹر کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجنے لگے اور اسے کچھ کرنے پر اکسانے لگے۔

”تم ایک تا مکمل وجود ہو، ایک ادھوری شخصیت۔ جس کا کوئی ماضی نہیں اور جس کا کوئی ماضی نہیں ہوتا۔ اس کی کوئی شناخت نہیں اور جس کی کوئی شناخت نہیں ہوتی وہ دنیا کی سب سے زیادہ بے وقعت اور حقیر شے ہوتی ہے۔ جسے صرف اور صرف نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔“ ملک منصور کے الفاظ اسے اندر ہی اندر کچھ کے لگانے لگے۔ اسے شدید ذلت کا احساس ہونے لگا۔

”تم قدرت کا حسین شاہکار ہو، چاند کی چاندنی اور ہوا کے خوشگوار مترنم جھونکے کا حسین، دلگداز احساس، چاہے جانے کے قابل ایک اہم وجود۔“ اسے حیدر کی پڑائی یاد آنے لگی۔ اس کے اندر ایک کھڑکی کھلی اور تازہ ہوا کے خوشگوار جھونکے کا لطیف احساس اسے اندر ہی اندر مہل کرنے لگا۔ لبوں پر پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں نمی بھی حیرنے لگی۔

”تم ایک عورت ہو، ایک بیٹی، خالق کی پیدا کردہ معزز مخلوق۔ مکمل حقوق کے ساتھ عزت کے قابل۔“ سید صاحب کے الفاظ ہمیشہ سے زخموں پر مرہم کا کام دیتے تھے۔

”لیکن مجھے تو منصور اور پیٹر میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ حیدر اور سید صاحب تو میرا ماضی ہیں اور ماضی کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ ان

سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ٹھنڈی ہوا کے بغ جھونکے اس کے جسم سے ٹکرائے اس نے کانپ کر جھرجھری سی لی۔
 "اور تم..... ایک مسلمان بھی تو ہو۔" کسی نے اندر سے پھر ٹپو کا دیا۔

کسی نے کہا "..... یہ تو..... یہ تو سید صاحب کا مذہب ہے۔ میرا تو نہیں جب میرے وجود کی شناخت ہی نہیں تو مذہب کیا۔ میرا کوئی مذہب نہیں۔ نہ ہندو، نہ مسلمان، نہ کریچن۔"

"انسان کو صرف اور صرف اپنے وجود، اپنی ذات کے حقوق کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس دنیا میں زندہ رہنے کی آرزو اس کی ہاتی سب سوچوں پر حاوی ہونی چاہیے۔" پیٹر کے الفاظ اسے ایک فیصلہ کرنے پر مجبور کرنے لگے۔ اس نے نادانستہ آنکھیں بند کیں تو آنسوؤں سے بھری آنکھیں برسنے لگیں۔

"انسان کا نصیب کہیں نہیں بدلتا۔ مشرق ہو یا مغرب، گھر ہو یا باہر، انسان تنہا ہو یا جھوم میں۔" اسے اپنے ہی کہے ہوئے الفاظ یاد آنے لگے جو اس نے ایک دفعہ حیدر سے کہے تھے۔

"ہاں، ہم سب بہت بے بس انسان ہیں۔ اپنی اپنی تقدیر کے ہاتھوں۔" حیدر کی شکستہ آواز کہیں سے سرگوشیوں کی صورت میں ابھری۔
 "مگر سچی محبت اور لگن قدرت کے فیصلوں کو بدل بھی دیتی ہے۔ دل سے نکل ہوئی، کلیجے کو شق کرتی دعا۔ کیا وہ بھی نہیں؟" اس نے آخری بار حیدر کو کونخس کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں..... قدرت اپنے فیصلوں میں ہمیشہ قائم ہوتی ہے۔" حیدر نے تردید کی اور حقیقت بتائی۔

"لیکن مجھے یقین ہے۔ وہ ضرور اپنے فیصلوں کو بدلے گا۔" وہ پراحتہ لہجے میں بولی۔

"Nature has to be done" حیدر کی سرگوشی مدہم ہوتی گئی۔

وہ چلتی ہوئی نہ جانے کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی تھی۔ اونچے اور لمبے لمبے درخت جھولتے ہوئے، سرسراہٹے ہوئے ایک دوسرے کو چھیڑ رہے تھے۔ آسمان اب آلود تھا۔ لندن کی صبحوں اور شامیں یکسانیت کا شکار ہو گئیں تھیں اور وہ خود بھی ویسی ہی ہو گئی تھی۔ موسم، ماحول، لوگ، کچھ بھی اسے متاثر نہیں کر رہا تھا۔

"You're a woman enjoy your rights you're an individual" پیٹر کے الفاظ اسے مجھوڑ رہے تھے۔ کوئی قدم اٹھانے پر مجبور کر رہے تھے۔

"دنیا کی سب سے بڑی حقیقت تم ہو۔ یہ شے تمہارے سب سے بنیاد ہاتھیں ہیں۔ تم اہم ہو۔ تمہاری خوشیاں اہم ہیں۔ صرف اور صرف اپنا سوچو۔ اپنی ذات کی خوشیاں مقدم رکھو ہاتی سب بھول جاؤ۔ تمہارے لیے کوئی اہم نہیں۔ صرف..... تم اپنے لیے اہم ہو۔" پیٹر کے لہجے کا اعتماد اسے اندر ہی اندر سکون بخش رہا تھا۔

"یہی سچ ہے، یہی سچ ہے۔ سب سے پہلے میں ایک انسان ہوں بعد میں کچھ اور۔" اس نے مثبت انداز میں سوچا اور فیصلہ کر لیا۔ اس

نے ڈور تیل بجائی تو اس کی چھ سالہ بیٹی شفق نے دروازہ کھولا۔ وہ بغیر کچھ کہے اندر داخل ہو گئی۔ خاموشی سے اوپر کوٹ اتارا اور بیٹر کے سامنے بیٹھ گئی۔ شفق حیرت سے ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”تمہارے پاپا کہاں ہیں؟“ اس نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

”اوپر.....“ شفق نے جواب دیا۔

”اکیلے پاپا کوئی اور بھی ساتھ ہے۔“ جواباً شفق خاموش رہی اور وہ اوپر چلی گئی۔

کمرے کا ماحول بہت رومانٹک تھا۔ آتش دان میں آگ دھک رہی تھی۔ بیوی ویلوٹ کے خوب صورت ویئر پردے، سگار اور کافی کی بھینی بھینی مہک آتش دان کے قریب دونوں غلوں کشن پر بیٹھے تھے۔ شزا گنار بجاری تھی اور منصور اس کے سامنے جیٹا محبت بھری پرسنالٹس لگا ہوں سے اسے دیکھنے میں محو تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“ شزا جھینپ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”گنار کے تاروں سے لٹکنے والے سروں کے ساتھ جھللاتی، چمکتی اور دھوش کرتی ان خوب صورت نیلی آنکھوں کو۔“ منصور دھوشی کے عالم میں بولا۔

”دنیا میں اور بھی تو بہت کچھ ہے ان کے سوا۔“ وہ اک ادا سے مسکرا کر بولی۔

”ہاں..... ہے تو سب..... مگر ہم تو صرف وہ دیکھ رہے ہیں جو جوڑو اور پھر جس تک رسائی بھی ممکن ہو۔“ وہ بھی مسکرا کر بولا۔

”اور جس تک رسائی ممکن نہ ہو تو؟“ اس نے متنی خیز مسکراہٹ سے پوچھا۔

”تو میں..... ملک منصور سے چھین لینے کا عادی ہوں۔ جلدی یا بدیر۔ اس تک رسائی کو ممکن بنانا ملک منصور کو اچھی طرح آتا ہے۔“ وہ غرور سے بولتا تھا۔

”بہت پوزے سیکھو۔“

”ہاں..... جب تم جیسا آئیں گے حسن بھکانے پر تھلا ہو۔“ ملک منصور نے اس کے نازک سر میں ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں یوں بند کیا جیسے پیپ میں موٹی۔

”اچھا یہ بتاؤ، واپس کب جا رہے ہو؟“ شزا نے جلدی سے بات کا موضوع بدلا۔ مبادا وہ کہیں مزید نہ بہک جائے۔ وہ اس کی دل چاہیگ طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی۔

”کل رات کو۔“

”سب.....“

”ہاں..... ظاہر ہے۔“ منصور پر اعتماد لہجے میں بولا۔

”مگر میں نہیں.....“ شہلا ایک دم اندر آ گئی اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر بولی۔ منصور کو اس کی غیر متوقع آمد سے جھٹکا لگا۔ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی اتنی جرات کہ شزا کی موجودگی میں وہ اس کے کمرے میں آ گئی تھی۔

”تم..... اور تمہاری یہ جرات!“ منصور اس کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے غرایا۔

”شٹ اپ!“ اس نے اس کے ہاتھ کو روکتے ہوئے کہا۔

منصور کے لیے یہ شاک سے کم نہیں تھا ”میں قسمیں چھوڑوں گا نہیں..... یو ہاسٹرڈ!“

”ہولڈ یور تنک.....“ وہ غصے سے آنکھیں ٹکاتی ہوئی بولی۔

شزا پٹٹی پٹٹی لگا ہوں سے دونوں کی طرف دیکھنے لگی ”پلیز ریلیکس، میں جارہی ہوں۔“ شزا حیرانی سے دونوں کی طرف دیکھتی ہوئی باہر جانے لگی اور اسی میں عافیت سمجھی۔

”تم کہاں جارہی ہو۔ یہ تماشا اچھی طرح دیکھ کر جانا۔“ شہلا نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روکنا چاہا۔

”کیا مطلب؟“ منصور چونکا۔

”مجھے ڈائیورس چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت!“ شہلا نے دھوکا کہا۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا؟“ منصور غیر یقینی لہجے میں بولا۔

”ہاں، بالکل ٹھیک ہے اور شاید ابھی ٹھیک ہوا ہے۔ اب میں مزید ذلت کی زندگی نہیں گزار سکتی۔ تم نے مجھے جتنا بے عزت کرنا تھا خوب کر لیا۔ اب تمہارے اور میرے راستے جدا جدا ہیں۔“ وہ قطعیت سے بولی۔ منصور کے لیے یہ خبر شاک سے کم نہ تھی۔ وہ شہلا جس نے کبھی اس کے سامنے زبان نہ کھولی تھی آج کیسے اس سے جھگڑ رہی تھی۔

”تم کہاں سے آرہی ہو؟“ منصور نے اس کے تیز دیکھ کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”تم سے مطلب.....“ شہلا قدرے بے پروائی سے بولی۔

”تم اپنی حد کر اس کر رہی ہو۔ شاید قسمیں معلوم نہیں کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ اپنا لہجہ دہیما کرتے ہوئے بولا۔

”میں بہت سوچ سمجھ کر بول رہی ہوں اور جو میں آج کر رہی ہوں وہ مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔“ وہ اعتماد سے بولی۔

”مجھے سب معلوم ہے یہ آگ اسی ہاسٹرڈ پیئر کی لگائی ہوئی ہے۔ جس سے تم چھپ چھپ کر ملتی ہو۔ ویسے بڑی پارمانتی ہو..... اور

اب..... تم ہو ہی ہاسٹرڈ.....!“ وہ دانت کچکھا کر بولا۔

”کیا قسمیں احساس ہے کہ بچے.....؟“ منصور نے آخری حربہ استعمال کیا۔

”بچے تمہارے ہیں اور بچوں کا جھوٹا سہارا لے کر انہیں میرے پاؤں کی زنجیر نہ بناؤ۔ جب عورت بچوں کے لیے تڑپے تو تم لوگوں کو

احساس نہیں ہوتا اور جب وہ خود چھوڑ دے تو تم لوگ اسے خود غرض اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہتے ہو۔ مجھے اب تم سے تعلق رکھنا ہے اور نہ تمہاری اولاد

ہے۔ تم نے نور بس جس طرح میرے وجود کو، میری ذات کو رہائے رکھا، مجھے اذیتیں دیں اور میری شخصیت کو کرجی کر جچی کیا ہے۔ یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ میں چلتی پھرتی ذمہ داریاں بن گئی ہوں۔ میں تمہارے لیے کبھی بھی اہم نہ تھی اور نہ کبھی ہو سکتی ہوں۔ تم نے مجھے بہت ذلیل کیا ہے۔ یقیناً تمہاری اولاد بھی ایسا ہی کرے گی۔ آخر وہ بھی تو تمہارے بچے ہیں۔ تمہارا ہی خون ہیں۔ تمہارے ہاتھوں تو ذلت اٹھا چکی ہوں۔ اب تمہاری اولاد کے ہاتھوں ذلیل نہیں ہونا چاہتی۔ منصور اس شادی شدہ زندگی کا صرف ایک لمحہ بناؤ جب تم نے میری اس طرح پذیرائی کی ہو جس طرح آج تم شزا کی کر رہے تھے۔ آخر میں بھی تو عورت ہوں۔ مجھے بھی پذیرائی چاہیے۔ مجھے بھی تحفظ اور عزت چاہیے اور نہیں تو طمانیت کا کچھ احساس ہی چاہیے۔ تم نے مجھے کیا دیا۔ سوائے مار کٹائی اور ذلت کے..... اب میں دھچکارتی ہوں تمہیں اور تمہاری اولاد کو.....“ وہ چلاتے ہوئے بولی۔

”اور سید صاحب کو کیا جواب دوں کہ سید زادی.....“ وہ ہلکی سی لہجے میں بولا۔

”میں سیدنا ابوی نہیں.... بقول تمہارے نالی کا کیڑا ہوں جو اتفاق سے رہ گیا تھا وہ ان کے قدموں سے لپٹ گیا۔ فرق یہی ہے انہوں نے مجھے قدموں سے روندنا نہیں، اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ تم ہی بتاؤ کیا اس سے میرا منی بدل سکتا ہے۔ میں جو پہلے دن تھی۔ اب بھی وہی ہوں۔ نہ وہ میری شناخت کو بدل سکے اور نہ تم....“

”شاید اب تمہارا نیا شوہر پیٹر بدل دے۔“ منصور اس کی بات کاٹ کر طعنیہ لہجے میں بولا۔

”ہاں شاید..... کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔“ وہ بھی قدرے ڈھٹائی سے بولی۔

”تم اس قدر.....“ منسور طیش میں بولا۔ اس نے اس پر ہاتھ اٹھانا چاہا اور پھر نیچے کر لیا۔ شاید شہزاد کی وجہ سے۔

”ذلیل ہو سکتی ہو، یہی کہنا چاہ رہے ہوتا تم؟ واقعی میں بہت ذلیل ہو چکی ہوں۔ کل تک مجھے طلاق کے کاغذات مل جانے چاہیں۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گئی۔

منصور ہونقوں کی طرح اسے باہر جاتا دیکھتا رہا۔ وہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شہلا کبھی اس کے سامنے یوں پھر پڑے گی۔ وہ تو صرف روتی اور خاموشی سے ذلیل ہوتی شہلا کو جانتا تھا۔ اب اس میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔

وہ نیچے اتری تو شفق حیرت سے ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آج اسے ماں پہلے سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔ پہلے تو ماما، پاپا کا سن کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی تھی اور آج خود اوپر چلی گئی تھی۔ شفق مضطرب سی کھڑی تھی۔

”فلک اور آفاق کہاں ہیں؟“ اس نے شوق سے پوچھا۔

”آفاق کپیٹر ٹیم کھیل رہا ہے اور فلک سوزی ہے۔“

“—”

”کیوں ماما.....؟“ شفیق نے حیرت سے پوچھا۔

”میں نے تم لوگوں کو ایک بات سمجھانی ہے۔ جاؤ اس کو بلا کر لاؤ۔“

”جی ماما.....“ وہ آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی باہر نکل گئی اور آفاق کو بلا لائی۔

”شفیق تم بڑی ہوادور بھائی چھوٹا ہے۔ آپس میں پیار سے رہنا۔ بھائی کا اور فلک کا بہت خیال رکھنا۔“ وہ انہیں سمجھاتے ہوئے بولی۔

”کیوں ماما..... آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ شفیق نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ لوگ پاکستان جا رہے ہیں اور میں سیکس رہوں گی۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جا رہی۔“ وہ بمشکل آنسو روکتے ہوئے بولی۔

”کیوں..... ماما..... کیوں ماما..... پھر ہم بھی نہیں جا رہے۔“ آفاق ضد کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں بیٹا ضد نہیں کرتے۔ آپ میرے ساتھ نہیں رہ سکتے۔“

”کیوں..... ماما.....؟“ شفیق روتے ہوئے بولی۔

”اس لیے کہ تمہاری ماما شادی کر رہی ہے۔“ ایک دم منصور پیچھے سے بولا۔

”شٹ اپ منصور، میں تو شادی کرنے جا رہی ہوں اور تم خود؟“

”جسٹ شٹ اپ اور ماؤتھ۔“ وہ بھی غصے سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

”ماما آپ وہیں نہیں گی؟“ شفیق نے حیرت سے پوچھا تو وہ چونک گئی۔ اس نے تو خود بھی ایسا نہ سوچا تھا۔ وہ مضطرب ہو کر واش روم میں

چلی گئی۔ اس کی آنکھیں ایک دم سرخ ہونے لگیں۔ اس نے واش بیسن کے اوپر لگے بڑے سے آئینے میں دیکھا۔ وہ کتنی بدل چکی تھی۔ جو کچھ وہ کرنے

جا رہی تھی کیا واقعی درست تھا؟ اس سے کسی کو پتہ نہ تھا کہ وہ کتنی شفیق اور فلک اور میرا آفاق۔ کتنے چھوٹے ہیں سب..... وہ میرے بھی وجود کے

حصے ہیں اور اپنے وجود کو یوں نکلے نکلے کرنا کیا کوئی آسان کام ہے۔ وہ خود سے سوال کر رہی تھی مگر بچے تو صرف باپ کے ہوتے ہیں۔ آج نہیں تو

کل وہ اس کی ڈگر پر چلیں گے۔ میں ہر روز ان کے باپ کے ہاتھوں ڈیل ہوتی رہی ہوں۔ کل کو ان کے ہاتھوں ہوں گی اور پھر کل میرے پاس وقت

نہیں ہوگا۔ آج بچے ہیں۔ کل بڑے ہو جائیں گے اور وہ کل نہ جانے کیسا ہو۔ اس کل کے لیے میں آج کی خوشیوں کو کیوں داؤ پر لگاؤں۔ قدرت آج

مجھے آپشن دے رہی ہے اور زندگی میں صرف ایک موقع تو ملتا ہے جب انسان چاہے تو اپنے لیے کچھ کر لے۔ پہلے بھی لوگوں نے میرے ساتھ بہت

زیادتی کی ہے۔ کبھی رولتوں اور رسم و رواج کا بھانڈا کر تو کبھی میری ذات کی شناخت کو نشانہ بنا کر۔ آخر زندگی کے اتنے برس گزار کر بھی میری حیثیت

گھر کی خادمہ جیسی نہیں تو پھر میں کیوں اپنے آج کو ان کے لیے برباد کروں۔ مجھے اپنا سوچنا چاہیے۔ اپنی خوشیوں کے بارے میں خود فیصلہ کرنا چاہیے۔

وہ بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔ اس کا سارا وجود سلگ رہا تھا۔ دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ شفیق آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی اور اس کے اوپر گر گئی۔

”ماما پلیز ہمیں چھوڑ کر مت جائیں۔ آئی لو یو ماما.....“ شفیق بہت پوز سیو ہو رہی تھی۔

”آئی نو مائی ڈیر، آئی لو یو۔ ڈونٹ کرائی مائی چائلڈ۔ میں جلد آؤں گی۔“

”ماما فلک تو بہت چھوٹی ہے۔ ٹھیک طرح سے چلتی بھی نہیں اور جگ بھی بہت کرتی ہے۔ کسی کے پاس بھی نہیں سوتی۔ میں اسے کیسے

سلاؤں گی۔“ شفیق قدرے پریشان ہو کر بولی۔

”تم فکر کیوں کرتی ہو تمہارے پاپا ہیں نادودہ کچھ بھال کریں گے۔ وہ خود سلا لیں گے اور پھر تمہاری داد دے گی تو ادھر ہے؟“ اس نے تسلی دی ”ادھر آؤ میرے پاس لیٹ جاؤ۔“ اس نے اسے اپنے پاس بیٹھ پر لٹالیا۔

”مما۔۔۔۔۔ آپ برا بیٹھ نہیں گی۔ اس لیے ہمارے ساتھ نہیں جا رہیں۔“ شفق کے اس اچانک سوال نے اسے جھنجھلا دیا۔

”فضول باتیں مت کرو۔ میں تمہارے پاپا کے ہاتھوں جھگ آگئی ہوں سنا تم نے؟“ وہ قدرے تلخی سے بولی۔ اسی اثنا میں آفاق آ کر ماں کے ساتھ لیٹ گیا۔

”مما پلیز۔۔۔۔۔ مجھے تو اپنے پاس رہنے دیں۔“ وہ روتے ہوئے ”مما۔۔۔۔۔ آپ پاپا کو جانے دیں۔ وہ آپ کو مارتے ہیں ہم تو تنگ نہیں کرتے نا۔ ہمیں تو ساتھ رہنے دیں۔“ دونوں اس کے ساتھ چٹ کر بولے۔

”آئی دل شوٹ پاپا۔“ آفاق غصے سے بولا۔

”نومانی ڈیئر، آپ کی دادو وہاں ہیں۔ وہ آپ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ اسی لیے تو بھیج رہی ہوں۔“

”مگر دادو اتنا اونچا سختی ہیں، ان سے بات کون کرے گا۔“ شفق ایک دم بولی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ لیکن وہ تم سب سے پیار بھی تو بہت کرتی ہیں نا۔“ اس نے پھر دلا سا دیا ”اب تم لوگ جاؤ اور مجھے تنگ نہ کرو۔“ وہ ڈرامے سے بولی۔

”اوکے۔۔۔۔۔ گڈ نائٹ ممما۔۔۔۔۔“ دونوں خاموشی سے بوجھل قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

دونوں کے اندر آتش فشاں اٹھنے کو تیار تھا مگر راستہ کوئی نہیں مل رہا تھا۔ آفاق غصے میں ادھر ادھر پھرنے لگا پھر وہ ناشروع کر دیا۔ شفق اسے تسلی دینے لگی تو وہ اس کے گلے لگ کر رونے لگا۔

”آئی سیٹ ممما۔۔۔۔۔“ وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

”آئی ٹو۔۔۔۔۔“ شفق نے بھی اس کی تائیدی کی۔

پینلنگ مکمل ہو چکی تھی۔ جانے کے لیے سب تیار کھڑے تھے۔ دو سالہ فلک پر ام میں سورہی تھی اور شفق نے پر ام کا ہینڈل مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ آفاق اس کے پاس کھڑا تھا۔ بچوں کے چہروں پر سوگوار سی اداسی چھائی تھی۔ آنکھوں میں ان گنت سوال اور شکوکے تھے مگر لب ساکت تھے۔ وہ ان کی طرف بڑھی مگر کوئی بھی اس کے گلے نہ لگا۔ شفق نے آفاق کی طرف دیکھا اور دونوں پر ام دھکیلتے ہوئے باہر نکل آئے۔

”یہ طلاق کے کاغذات ہیں۔ باقی کاغذات تمہارے پاس ہی ہیں۔ ہمارے ساتھ یہ گھر بھی تمہیں چھوڑنا پڑے گا۔“ منصور نے کاغذات تھماتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش بھی تھی اور حیران بھی کہ منصور شادی کا بازار تھا نا اس نے کوئی شور مچایا تھا۔ شاید وہ خود بھی اندر سے یہی کچھ چاہتا تھا اور خوش بھی تھا۔ شزا کی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ وہ اب اس کے ساتھ جا رہی تھی اور وہاں جا کر دونوں یقیناً شادی کر لیں گے۔ باہر گاڑی اشارت ہونے کی آواز آئی تو وہ باہر کی طرف بھاگی مگر وہ لوگ جا چکے تھے۔ بچوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے مگر لب خاموش تھے۔ فلک شفق کی گود میں بے خبر سو رہی تھی۔

”ہیلو پیٹر میں آگئی ہوں۔“ وہ مضمحل قدموں کے ساتھ اس کے پارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”اوہ گڈ..... اندر آؤ۔ دیکھ..... دیکھ ٹویڈر سوٹ ہوم!“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ وہ خاموشی سے کوئی تاثر دیے بغیر صوفے پر بیٹھ گئی۔

”شیل ڈارلنگ، ڈونٹ یو وری۔ میں تمہارے لیے کافی لاتا ہوں۔“ وہ ہمیشہ سے شہلا کے بجائے شیل ہی کہتا۔

”تھیک یو۔“ اس نے کافی لیتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے کافی کے سپ لیتی رہی اور بچوں کے بارے میں سوچتی رہی۔

”شیل میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہی ہو؟“ وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

”کیا.....؟“ شہلا نے حیرت سے پوچھا۔

”تم ایسٹرن ویمن سوچتا بہت ہے۔ میری مدد رائیگلو ایڈین ویمن تھا۔ ہر وقت خاموش سوچوں میں گم، کھویا کھویا سا.....“

”اب وہ کہاں ہیں؟“ اس نے نادانستہ پوچھا۔

”معلوم نہیں، دو سال پہلے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں چلا گیا۔ اب پتا نہیں کہاں ہے؟“ شہلا پھر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ کیا اس نے

تھیک فیصلہ کیا تھا۔ وہ پیٹر کو نظر انداز کر کے پھر سوچنے لگی۔

”ہاں، منصور نے تو مجھے ایک نہ ایک دن چھوڑنا ہی تھا اور اب تو اسے بھگ بھی پڑ چکی تھی کہ شزا، شادی سے پہلے اسے طلاق دینے کو کہہ

رہی تھی۔ کیا یہ اچھا نہیں کہ اس نے خود ہی یہ فیصلہ کر لیا۔ ابھی تو اس کے پاس آپشن تھا۔ قدرت نے پیٹر کو آپشن بنا کر ہی تو بھیجا تھا۔ اگر پیٹر نہ ہوتا تو

وہ کہاں جاتی۔ واپس سید صاحب اور حیدر کے پاس..... نہیں کبھی نہیں۔ اب وہاں میرا کوئی نہیں۔ پیٹر بولڈ ہے۔ اسٹرنگ ہے۔ اس نے میری ذات

کو سہارا دیا ہے۔ جہاں منصور ہر وقت مجھے ذلیل کرتا رہا ہے۔ پیٹر نے مجھے عزت دی ہے اور ایک انسان کو دنیا میں کیا چاہیے۔ یہی کہ وہ عزت سے

زندہ رہے۔ جہاں جائے عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ تنہائی میں اور محفل میں بھی اس کا شوہر اس کی عزت کرے اور..... منصور نے نہ تو شوہر

ہونے کا حق ادا کیا۔ شاید انسان ہونے کا..... اور نہ ہی مسلمان ہونے کا۔ ایسے بد قماش مسلمان سے تو ایک غیر مسلم اچھا انسان بہتر ہے جو دوسروں

کو انسان سمجھے اور ان کو بھرپور عزت دے۔“ اس نے اپنے فیصلے کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

”لیکن سید صاحب کیا کہیں گے؟“ ایک لمحے کو سوچا بھری۔

”میں کون سی ان کی سگی اولاد ہوں اور ایسے بھی مجھ سے زیادہ انہیں اپنے شجرے، خون اور حسب نسب کی فکر ہے۔ انہوں نے بھی تو مجھے

انسان نہیں سمجھا پھر مجھے کیوں فکر کرنی چاہیے۔“

”اور بچے.....“ اس کا دل کٹنے لگا۔ ہر طرف شور مچا رہا ہونے لگا۔ اس نے اپنے دفاع کے لیے کچھ کہنا چاہا لیکن سارے الفاظ کہیں گم ہو

گئے۔ وہ جھنجھلا سی گئی۔

”میں صرف اور صرف انسان ہوں۔ مجھے بھی زندہ رہنے کا مکمل حق ہے۔ مجھے بھی عزت چاہیے، ایک تحفظ چاہیے۔ مجھے اپنے بارے میں

بہتر فیصلہ کرنے کا پورا حق ہے۔“ اس نے اپنے آپ کو مطمئن کیا۔ پیٹر اس کے چہرے پر ابھرتے تاثرات حیرت سے دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

”ہیل پلیرز پلیس، تم ریٹ کرو۔ شام کو چرچ چلیں گے۔“

”چرچ..... کس لیے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ویڈیو کے لیے اور کس لیے۔“

”ویڈیو.....“ وہ بڑبڑائی۔ اس کے دگ وپے میں انجانا سا خوف سراپت کر گیا۔ اس نے جبر جبری سی لی مگر خاموش رہی۔

”ہیل ڈارلنگ، تم کیا سوچتا رہتا ہے۔“ قصص اپنا آپ بدلنا پڑے گا۔ کیا تمہارا سوچ اس لڑکی شوزا کے ساتھ خوش نہیں۔ تو مہر تم کیوں

اواس ہوتا ہے۔ قصص بھی خوش رہنے کا اتنا ہی رائٹ ہے جتنا اسے ہے۔“ شہلا کی سوچ پھر بدل گئی۔ اس نے زخمی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔

”او کے..... گیٹ ریڈی..... میں تمہارا براڈ ایڈل ڈریس اور رنگ لے کر آؤں گا۔ اتنی دیر تم ریٹ کرو۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

وہ وہیں صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ بچے اسے بار بار یاد آ رہے تھے۔ سید صاحب سفید ریش واڈھی اور اونچے نیچے شیلے والے باعزت، پاک

باز قصص، عزت و ناموس اور خون کی امانت و حفاظت کے لیے جان دینے والے..... اور..... بی بی بی..... سر سے پاؤں تک باپردہ، تقدس و پاکیزگی کا

چلتا پھرتا نمونہ اور وہ خود کیا تھی؟ لب سڑک، گھڑنگ، کٹیف، کٹجے کپڑے میں لپٹا نحیف و حقیر وجود۔ کیا اس نے ان دو عظیم ہستیوں کے سایہ

حافظت میں پرورش پائی تھی؟ بی بی بی کی آغوش کی گرمی اور ان کی محبت پر شاید اس کے اندر کا چھپا کینہ پن غالب آ گیا تھا۔ شاید اس کے جینو میں

عی نور تھا۔ جیسے اس کو جنم دینے والوں میں..... شاید وہ کسی کے گناہوں کا شرمیلی یا پھر کسی مجبور و بے کس، روانہوں سے جکڑی ماں کا جگر گوشہ یا پھر کسی

مطلبس باپ کی ناقص حسرتوں کا شاہکار..... وہ کیا تھی؟ وہ تو ساری زندگی اسی شہادت میں سرگرواں رہی تھی۔ کس سے پوچھتی۔ سید صاحب سے، بی

بی بی سے یا پھر حیدر سے۔ جو سب اس کے وجود کو مانتے تھے مگر اس کی شہادت کے انکاری تھے۔ کون تھی وہ؟ وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ اس لیے

ماننے سے بھی انکاری تھے۔ وہ اس گھر کی کیا تھی۔ بی بی، ملازمہ، رشتے دار یا باندی۔ کوئی بھی تو تعین نہ کر سکا۔

حیدر اس کے خوب صورت فیچر زدہ کچھ کر اسے Egyption Beauty کہتا تھا۔ ملک منصور کسی انگریز کی اولاد کہتا تھا۔ شاید وہ انگریز،

ہندو تھا۔ کرچن یا پھر یہودی اور..... پیڑا سے ایٹھواٹھ بن کہتا تھا۔ وہ خود کو کیا سمجھتی تھی۔ اس کے پاس تو شہادت کا کوئی خاندانی پرندہ تھا۔ وہ کبھی کبھی بے

خیالی میں ارد گرد چلتے پھرتے انسانوں کو گھور گھور کر دیکھتی۔ شاید کسی سے اس کی شکل ملتی ہو۔ شاید کوئی اسے یہ کہے کہ وہ ان کی کھوئی ہوئی اولاد تھی۔ نہیں

جھکی ہوئی، دھتکاری ہوئی۔ جیسے ریختے والا بے بس کیڑا..... کہتے تھے جب وہ ملی تھی تو اس کے سارے جسم پر جوہنیاں چٹنی ہوئی تھیں اور جب سے

اب تک وہ ان کے ڈنگ اپنی روح میں بھی محسوس کرتی تھی۔ اس کا ذہن مسلسل سوچ رہا تھا۔ جو ہوا تھا ٹھیک ہوا تھا یا پھر سب کچھ غلط، الٹ پلٹ ہو گیا

تھا۔ وہ کیسے اپنے آپ کو سمجھائے۔



شام ہو رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ پیڑا سامنے تھا۔ اس کے ہاتھوں میں گفٹس تھے وہ اسے دیکھ کر مسکرایا ”اب تم جلدی سے

تیار ہو جاؤ پھر چرچ چلتے ہیں۔“

اس نے بے دلی سے ہمایڈل ڈریس پہنا تو اس کا سارا جسم لرز نے لگا۔ وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔ سید صاحب کی اٹنے سالوں کی ریاضت اور پی بی جی کی آغوش کی تربیت سب اکارت گئی تھی۔ وہ کتنی بے خانماں اور حقیر لگی تھی۔ خزاں کے سرد جھوکوں سے اپنے نحیف وجود کو نہ بچا سکی اور زرد پھڑپھڑاتے پتے کی مانند اس کو ادھر ادھر اڑائے دے رہی تھی۔ وجود کی صداقت کے لیے کردار کی شرط ضروری ہوتی ہے اور وہ تو بہت پورے کردار والی لگی۔ اس کے اندر مسلسل ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔

”اٹھو ناب کس کا انتظار ہے؟“ پیڑ نے اس کے گرد محبت سے بازو جمائے کر کے ہوئے کہا تو وہ چونک سی گئی۔
 ”یہ بس..... یہ لہجہ..... یہ قربت کتنی نا آشنا ہے۔ اس میں وفا کی چپائی محبت کی مٹھاس اور غلوں کی چاشنی کتنی کم ہے۔“ اس نے دکھ سے سوچا۔
 ”بہت اسارٹ لگ رہی ہو۔ دیری پر مبنی..... تم تو بالکل بھی ایسٹرن نہیں لگتیں تمہارے فیچر..... تم مریک میٹھالوجی کی گود بس (Goddess) لگتی ہو۔ دیری اسٹریچ، اد کے لیواٹ ایڈجسٹی پی۔“ وہ اس کا بازو تھام کر چلا۔
 جیسے ہی اس نے چرچ کے اندر قدم رکھا اس کا سارا وجود دھوبالا ہونے لگا۔ عمر کا لہا سفر جو وہ طے کر کے آئی تھی۔ خدا سے آشنائی کے سفر میں تو اس نے کسی کو بھی نہیں سراہا تھا۔ احدا حد کہتے وہ ایک دم تخلیق کے سامنے کھڑی تھی۔



سید صاحب کے گھر کی مقدس اور روح پرور فضا میں سانس لیتے لیتے وہ اچانک چرچ کی سنجیدہ اور سوگوار فضا میں دم لینے کو رکھ کر تیسرا وجود نکال دیا۔ وہ کون سی کرکٹن ہو رہی ہوں۔ ہلا خراس نے اپنے آپ کو سمجھایا اور اس نے بے خبری میں نہ جانے کہاں کہاں دستخط کیے۔ جو وہ کہتا رہا۔ کسی روٹ کے مانند وہ کرتی رہی۔ کاغذی کارروائی مکمل ہوئی تو وہ درمیری اور کرائسٹ کے مجسموں کے سامنے کھڑا منہ میں کچھ بڑا تار ہا اور وہ خاموشی سے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ اسے تو کسی دعا کی کوئی حاجت ہی نہ تھی۔

دعا کس کے لیے کرے۔ اپنے بے قراں وجود کے لیے۔ اپنے مصوم بچوں کے لیے یا پھر..... پیٹر کے لیے جو اس کا کچھ بھی نہیں لگتا تھا گو کدہ مسز پیٹرین گئی تھی۔ وہ کسی ایک کا بھی قصین نہ کر سکی۔ پیٹر اسے محبت سے گھرا لیا۔ دونوں تھا تھے۔ پیٹر اس سے بیٹھی بیٹھی مسخو کن باتیں کر رہا تھا۔ محبت کی باتیں..... ملن کی باتیں..... دلوں کی باتیں..... چاہتوں کی باتیں..... وہ سن رہی تھی اور وہ اس کے وجود کا احاطہ کر رہا تھا مگر اس کو پیٹر سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کے سامنے تو حیدر تھا۔ وہی اس کی محبت، چاہت، عشق اور جنوں تھا۔ وہی تھا جس کے نہ ملنے کے رد عمل نے اسے اتنا شدید جذباتی کر دیا تھا۔

حیدر اپنی بھرپور شخصیت و چاہت اور رعب و دبدبے کے ساتھ مکمل طور پر سید زادہ۔ سید شہاب الدین کا اکلوتا بھتیجا سید ضرار الدین حیدر۔ ان کی جائداد اور گدی کا اکلوتا جانشین۔ خون کی لمانوں کا پاسدار۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، قارئین کو ایغا یڈ سرجن..... مگر روایات کا پابند۔ وہ بھی اس سے محبت کرتا تھا مگر اس کی محبت، مصلحت میں بدل گئی جب سید صاحب نے اس کو یہ راز بتا دیا اور وہ سب کچھ دروازے کی اوٹ میں کھڑی سن رہی تھی۔ حیدر ان سے بحث کر رہا تھا۔ وہ اسے سمجھا رہے تھے اور وہ سمجھ نہیں رہا تھا اور بالآخر تنگ آ کر انھوں نے وہ سب کچھ بتا دیا جس کو سن کر اس کا وجود ریت کے ذروں سے بھی زیادہ حقیر ہو گیا۔

"حیدر خون کی امانتوں سے انحراف ممکن نہیں۔ سیدوں کو اپنے وجود سے زیادہ اپنے خون کا مان رکھنا ہوتا ہے۔ ناموس کی حفاظت، نام کی حفاظت، جان سے زیادہ کرنا سیدوں کا شیوہ ہے۔ سید سر تو کٹا سکتا ہے مگر مصلحتوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈال سکتا۔ میں نے مرحوم بھائی کی نشانی کو اپنے سینے سے لگا کر پالا ہے۔ تمہاری ہر بات مانی مگر وہ مت کہو جو میں مان نہیں سکتا۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ قطعی ممکن نہیں۔ شہلا کون ہے؟ کیا ہے؟ خدا کا ہی راز ہے۔ اس کی شناخت، پہچان سب کچھ پردہ اسرار میں ہے۔ وہ تو ایک صبح ہماری گاڑی کے آگے یوں آگئی جیسے کوئی کتابیلی..... ہم انسان تھے اور وہ بھی انسان تھی۔ انسانیت کے ناتے اسے سینے سے لگا لیا۔ اگر ہم اسے نہ اٹھاتے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے وہ آج کہاں ہوتی۔ جو سر راہ قدموں سے لپٹے اور جسے ہم اپنے وجود اور خون کی آبیاری سے جوان کریں۔ کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں..... سنو حیدر یہ سب ناممکنات میں سے ہے اور جان لو کہ خون بہانا تو سیدوں کا شیوہ رہا ہے۔ چاہے وہ اپنے عزیز ہی کیوں نہ ہوں۔" سید صاحب اپنی عبا کا کونہ غصے سے جھٹک کر گویا اسے دم کی دے کر کرے سے چلنے لگے پھر ایک دم رکے۔

"اور ویسے بھی ایسا کرنے سے تم ایک سید زادی کا حق مارو گے۔ ہماری بیٹیوں کا یوں حق مارا جائے ہمیں گوارا نہیں اور یہ ناقابل معافی جرم ہے۔" وہ بوجھل قدموں سے باہر نکل آیا۔

”سید صاحب..... میں نے اسی دن کے لیے آپ سے کہا تھا کہ اس بچی کو گھر میں نہ رکھیں۔ نہ جانے کون ہے۔ کس کے وجود کا حصہ ہے مگر آپ نہ مانے۔ یاد ہے آپ نے اس وقت کیا کہا تھا کہ ہم اپنی زندگی دے کر دوسروں کو زندگی دینا چاہتے ہیں۔ کسی کو یوں موت کے آگے نہیں بھیج سکتے اور اب آپ کیوں بچھڑا رہے ہیں۔“ بی بی جی بھی ہارعب انداز میں بولی۔

”زہرہ خاتون ہم اپنی کسی بات سے منکر نہیں۔ کیا وہ بچی اس گھر میں ہماری بچیوں کی طرح آسانٹوں سے بھرپور زندگی میں نہیں پئی۔ ہم نے اس کی تربیت میں کسی چیز کی نہیں کی۔ خدا گواہ ہے ہم نے اپنی سیدہ فاطمہ اور سیدہ قسم کی طرح ہمیشہ اسے عزیز از جان رکھا ہے لیکن شادی بیاہ تو نسلوں کے دوام کا مسئلہ ہے اور نسلوں کے خون کی پاکیزگی کی ضمانت تو جینز کے پاک ہونے پر ہے اور ایک دفعہ جینز میں یوں فٹنار پیدا ہو جائے تو آئندہ نسلیں ذہنی انتشار اور عباد کی نذر ہو جاتی ہیں۔ انشاء اللہ ہم اسے اپنی بیٹیوں کی طرح ہی بیاہیں گے۔ اسے اپنی جائداد سے حصہ بھی دیں گے۔ تم دیکھنا کسی قسم کی کمی نہیں ہونے دیں گے۔“ سید صاحب نے جواب دیا۔

”سید صاحب میرا خیال ہے کہ بہت بات بڑھنے سے بہتر ہے کہ اسے بلا کر آپ ساری بات سمجھا دیں۔ وہ سمجھدار ہے سمجھ جائے گی۔“ بی بی جی نے مشورہ دیا تو سید صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

پنیر بہت خوش تھا اور اس کے لیے ناشتا تیار ہاتھا۔ اس نے نکیل پر بہت اہتمام سے اس کے لیے کافی اور سیٹرو چڑھ رکھے تھے ”آج تم ریٹ کرنا..... پھر اس کے بعد زندگی کی روٹین سیٹ کریں گے۔“ وہ مسکراتا ہوا بولا۔

”تم گھر کب آؤ گئے؟“

”لیٹ ناٹ..... کیوں..... خیریت تو ہے؟“ اس کی مسکراہٹ میں نہ جانے کتنے ملبوم پوشیدہ تھے۔ وہ چونک گئی اور پھر کہیں کھوسی گئی۔

”کیا واقعی مجھے اس شخص سے محبت ہے۔ دیار غیر میں ایک بالکل اجنبی شخص..... کیا میں نے اس کی محبت کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔“

”شیل تم کیوں پوچھ رہی ہو، کیا کوئی کام ہے؟“

”اوہ..... ہاں..... ہاں..... وہ میرے ڈاکو منٹس..... ان کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور میں یہاں، آئی مین.....“

”ناٹ ایٹ آل۔ میں نے اس کیسی میں بات کر لی ہے اور اب تم میری رائف ہو۔ اب تمہیں ڈاکو منٹس کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ڈونٹ تھنک اباؤٹ دین۔ اپوری تھنک از سیلڈ۔“ وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولا تو وہ خاموش ہو گئی۔ پنیر کے چہرے پر ابھی بھی مسکراہٹ تھی۔ اس کی نلی آنکھوں میں شرارت سی بھری تھی۔ گوکہ وہ درمیانی عمر کا خوب صورت نقوش والا انسان تھا۔ جس کے گرے بال اسے قدرے سویرے بناتے تھے لیکن وہ اکثر حرکتوں اور باتوں میں بالکل بچوں جیسا رویا پاتا تھا۔ ہر بات کو لاکھلی لیتا تھا۔

لندن میں آئے دو ماہ ہو چکے تھے اور پنیر سے ملاقات صرف ایک ماہ پہلے ہوئی تھی اور اب وہ شخص اس کے لیے لازمی جز بننا چاہتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس سے اپنے دکھ شہر کرنا شروع ہو گئی تھی۔ منصور تو زیادہ وقت شزا کے ساتھ باہر ہی گزارتا۔ اس پر تو بس شزا کا بھوت سوار ہوا تھا۔ وہ اپنا بزنس، سیاست اور گھر سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ صرف شزا اس کے من میں بس رہی تھی وہ ہر ممکن اسے خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا ”شکر ہے منصور

نے مجھے طلاق نہیں دی۔ میں نے خودی ہے۔ ورنہ منصور کے اس طمانچے کو میں ساری زندگی کیسے سہہ پاتی۔ شکر ہے پیڑمیری زندگی میں آ گیا اور میں اس ذلت سے بچ گئی۔“ وہ سوچنے لگی۔

”مضیل تم نے بتایا نہیں کہ تم کیوں مجھے گھر آنے کے بارے میں کہہ رہی تھیں؟“ وہ اپنے بیک میں کچھ کتابیں اور کارڈز رکھتے ہوئے بولا۔
”بس یونہی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”بھئی آج کل کرس اور نواہڑ کی وجہ سے بڑی ہوں۔ کارڈز کی سیل بہت ہو رہی ہے۔ تم تو جانتی ہو بہت مصروف ہوتا ہوں لیکن جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔ اوکے ٹیک کیئر ڈارنگ..... آئی لو یوسوچ۔“ وہ محبت سے اسے گلے لگاتا ہوا بولا ”دروازہ ابھی طرح لاک کر لو۔“ وہ ہائے کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

باہر شدید سردی تھی۔ گہری دھند میں چند قدم کے فاصلے پر پڑی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ دروازہ بند کر کے کمرے کے آگے بنی چھوٹی سی بالکونی میں کھڑی ہو گئی۔ اس کا اپارٹمنٹ زمین سے کافی اونچا تھا۔ نیچے چلنے والے لوگ سب دیکھتے ہوئے کیڑے لگ رہے تھے۔ اس نے گہری سانس لی۔ ٹھنڈا بخ جھونکا اسے اپنے پیچھے پڑوں میں سرایت کرتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دیوڑھیں تھیں۔
وہ ایسی ہی سرد شام تھی۔ شاید سبیر کی ایک شام..... سب اپنے اپنے کمروں میں بیٹرز کے سامنے دیکھے تھے۔ جب سید صاحب نے اسے بلایا۔

”آؤ شہلا بیٹی۔“ وہ ہمیشہ بیٹیوں کو اٹھ کر ملنے تھے کیونکہ یہی سنت رسول ﷺ ہے۔

”اسلام علیکم بابا!“ اس نے ادب سے سران کے آگے جھکایا۔

”علیکم اسلام۔ کیسی ہے میری بیٹی۔“ انھوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”ٹھیک ہوں، آپ نے مجھے بلایا؟“

”ہاں، ادھر بیٹھو میرے پاس اور جو میں کہوں توجہ سے سننا اور پھر اس پر غور کرنا۔ تمہاری دونوں بہنیں سیدہ فاطمہ اور سیدہ تبسم اپنے اپنے کمروں کی ہو چکیں اب تم ہو..... مگر بیٹی ایک مسئلہ ہے۔“ سید صاحب کے لہجے میں کچکا پھٹ تھی اور وہ اس کی وجہ جانتی تھی۔
”جی فرمائیے، میں سن رہی ہوں۔“

”سیدزادوں اور سیدزادیوں کے رشتے آپس میں ہی ملے ہوتے ہیں۔ یہی ہماری روایات رہی ہیں۔ تم بھی میری بچیوں کی طرح ہو۔ کیا میں نے تم میں اور ان میں کوئی فرق روا رکھا؟“
”نہیں بابا..... ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔“

”شکر ہے میرا مولا..... لیکن میری بیٹی اگر حیدر سیدزادہ نہ ہوتا تو مجھے تمہارے اور اس کے رشتے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ میں جانتا ہوں تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔ ایک جگہ پہلے بڑھے ہو مگر دونوں کا ملاپ ممکن نہیں۔ میں بھی تعلیم یافتہ ہوں اور مانتا ہوں کہ محبت بہت بڑا جذبہ ہے۔ مگر اسی محبت کے لیے بہت سی قربانیاں بھی دینا پڑتی ہیں۔ انسان اس میں مغل و خرد کھو بیٹھتا ہے مگر اس سے بڑھ کر آزمائش بھی کوئی نہیں.....

لیکن اب....." ان کو الفاظ نڈل رہے تھے۔

"بابا تو پھر میں کون ہوں؟" اسی سوال سے تو وہ ڈرتے تھے۔ چند لمحے خاموش رہے۔

"بتائیے نا بابا..... میں کون ہوں۔ کس کی بیٹی ہوں؟"

"میں نہیں جانتا۔ سید صاحب نے منہ دوسری طرف کر کے کہا۔

"تو پھر آپ نے مجھے کہاں سے اٹھایا؟"

"پل کے پاس کچی جگہ سے۔" انھوں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تو آپ نے مجھے وہاں ہی کیوں نہ پھینک دیا۔"

"ہمارے خون میں انسانیت کی یوں بے حرمتی شامل نہیں۔"

"نام اور پہچان کے بغیر ادھورا وجود..... جسے نہ اپنے آغاز کا علم ہے اور نہ شاید اختتام کا۔ وہ کیسے جیے..... بابا..... اس دنیا میں ہم جیسے لوگوں کا جینا کتنا مشکل ہے۔ یہ معاشرہ ہمیں کن نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ کاش آپ مجھے وہیں مرنے دیتے تو زندگی کا یہ دکھ اور طاب تو سہنا نہ پڑتا۔ بابا آپ نے جو سائنات مجھے دیا تھا۔ یوں لگتا ہے آج خود ہی جھین رہے ہیں۔" وہ سسکنے لگی۔

"میں خود تمہاری اچھی جگہ شادی کر ادس گا اور کسی بھی شے کی نہیں ہونے دوں گا۔ بس بیٹی ہی ایک مسئلہ تھا۔ مجھے مجبور کچھ کر دینا پڑا۔"

وہ کمرے سے روتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اس کے گلے میں پھانس تھی۔ جیسے کوئی چیز گلے میں اٹک گئی ہو اور اس کا ٹکنا مشکل ہو گیا تھا۔

تیز دھاراً لہ اندر ہی اندر سے کاٹ رہا تھا۔ کبھی کبھی ان دیکھی اشیاء اور غیر متعین صورت حال انسان کو کتنا بے بس بنا دیتی ہیں۔ مولے مولے آنسو اس کے رخساروں پر گرے اور پھر گرتے ہی گئے۔ وہ کتنی ہی دیر حسرت و یاس کی تصویر بنی اپنے "کل" پر آنسو بہاتی رہی۔

وہ کھانا بنا کر پیڑ کی مختصر تھی۔ جیسے کبھی کوئی نئی چیز پکا کر حیدر کی مختصر ہوا کرتی تھی۔ وہ کھانا جاتا اور مسکرا مسکرا کر نقص نکالتا جاتا اور وہ اسے کوئی رہتی۔ اس نے تو کبھی زندگی کا تصور بھی حیدر کے بغیر نہیں کیا تھا۔ اس کے ساتھ بچپن گزرا۔ اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی تک ہر شام وہ اسے سارے دن کی روداد سنایا کرتی۔ جب کبھی وہ کہیں گیا ہوتا اور لیٹ ہو جاتا تو وہ شدت سے اس کی مختصر رہتی اور جب تک اسے سب کچھ سناتا نہ لیتی اسے چھین نہ آتا۔ جب وہ امریکا پڑھنے جا رہا تھا تو وہ اسے دہائی کھڑی تھی۔

"یہ جدائی ہماری محبت کو اور مضبوط کرے گی۔" وہ جاتے ہوئے آہستہ سے بولا مگر اس کے آنے کے بعد تو ہر طرف دراڑیں ہی پڑ گئیں۔

"حیدر تم کہاں ہو۔ دیکھو یہ سب کیا ہو گیا ہے؟" ایک دم اس کے منہ سے حیدر نکلا اور وہ اونچی آواز میں سسکنے لگی۔ وہ جو اس کے دکھ میں دھکی اور خوشیوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ کہاں چلا گیا تھا۔ جب اس نے تیغس میں یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا تو حیدر کی خوشی کی اعتناء نہ تھی۔ وہ بار بار اسے مبارک باد دیتا تو وہ جھینپ سی جاتی اور آج حیدر تم مجھ پر آنسو کرو گے یاد رکھی ہو گے۔ کاش ایک لمحہ کو تم نظر آ جاؤ تو میں اپنے سارے دکھ تمہیں بتا دوں۔ میرا وجود کچھ کچھ ہی ہو چکا ہے۔

اس نے بڑے اہتمام سے کھانا نیکل پر چن دیا تھا۔ پٹیرات کو بہت دیر سے آیا۔ وہ کھانا کھا رہا تھا اور اس کی تعریفیں بھی کر رہا تھا۔ ایسی تعریفیں جو زندگی میں ملک منصور نے کبھی نہیں کی تھیں۔ بحیثیت بیوی وہ ایسی تعریفیں اس سے سننا چاہتی تھی مگر وہ تو اس کی ذات کو ہی اہمیت دیتا تھا۔ تعریفیں تو دور کی بات تھی۔

”میں نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ پٹیرتم یوں اچانک میری زندگی میں آ جاؤ گے۔ قسمت بھی کبھی کبھی کیسے کیسے لوگوں سے ملا دیتی ہے جن کے بارے میں انسان کبھی سوچتا بھی نہیں۔“ وہ اسے دیکھ کر ہار سو جتی۔

آج سے ٹھیک ایک مہینے قبل پٹیر اس دیار غیر میں اس کے لیے ہائل اجنبی تھا اور اب دونوں کیسے مضبوط رشتے میں بندھ گئے تھے۔ اس کے لیے اس نے اپنا نام نہاد گھر، شوہر، بچے، ملک، شہر اپنی ادھوری پچان سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ کیا صرف پٹیر کے لیے..... نہیں صرف اس عزت کے لیے..... اس ریگڑ کے لیے جو بحیثیت انسان پٹیر نے اس کو دیا۔ ایک انسان ہونے کے ناتے اس کا احترام کیا تھا اور اس نے اپنا سب کچھ اس کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ پٹیر کی بہت بڑی بک شاپ تھی ایک دن وہ بچوں اور ملک منصور کے ساتھ اس کی شاپ پر گئی۔ بچے اپنی اپنی پسند کی کتابیں خرید رہے تھے۔ وہ بھی یونہی کتابیں دیکھنے لگی۔ مینتھس سے ریلیٹڈ ایک کتاب اسے پسند آ گئی۔

اس نے منصور سے دبے الفاظ میں کتاب خریدنے کو کہا تو جیسے وہ بھڑک اٹھا اسے قطعی توقع نہ تھی۔ اتنا امیر کبیر شخص اور محض ایک کتاب خریدنے پر اس کی یوں بے عزتی کرے گا۔ اس کا چہرہ شرمندگی سے لال بھسوکا ہو گیا۔ پہلے یہ بے عزتی کمرے اور گھر میں ہوئی تھی اور اب سرعام، دیار غیر میں گویا اس نے سارے زمانے کو اس راز میں شریک کر لیا تھا۔ اس کو یوں لگ رہا تھا جیسے سر بازار اس نے اس کے وجود پر چابک مارے تھے۔ بچے سہم کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس بے عزتی کی وجہ سے وہ ساری رات سو نہ سکی۔

شادی کے بعد ایک ایک مل اس نے منصور کے ساتھ اذیت میں گزارا تھا۔ اس شخص نے اسے بے حد ذلیل کیا تھا۔ ہر لمحے، ہر آن، ہر موقع پر..... اس کی روح شکستہ ہو چکی تھی۔ ہر وقت حیدر کے طعنے..... حیدر کے نام پر ذلیل کرنا مگر وہ خاموش رہتی۔ اس کے پاس کوئی آپشن نہ تھا۔ وہ اس کا سا تباہ تھا۔ مضبوط نہ سہی مگر تھا تو سہی۔ اس کا محافظ تھا۔ اس کا نام اس سے منسوب تھا مگر شکستہ وجود اور ذلت کا شدید احساس لیے۔ منصور کی اس سے وابستگی ہی ایسی تھی۔

اگلے دن سخت سردی تھی۔ ہلکی ہلکی ہارش نے جہاں بزرے کو نیا رنگ دیا تھا وہیں سرسبز سرسبز بھی دخل کر خوب صورت ہو گئی تھیں۔ سب سو رہے تھے وہ ہا ہر لان میں آ گئی۔ کل رات کی بے عزتی نے اسے ساری رات سونے نہ دیا تھا اور اب بھی اس کے اندر شدید تکلیف تھی۔ اس لیے وہ سخت سردی میں بھی تازہ دم ہوا کے جھونکے اپنے وجود میں سمونے کے لیے آ گئی۔ اچانک پٹیر سائیکل پر سوار اس کے پاس آ کر رکا۔ وہ قدرے بھیگ چکا تھا۔ اس کی سپید رنگت شدید سردی کے باعث سرخ ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا۔

”آپ کل ہماری شاپ پر آیا تھا۔ یہ بک آپ کے لیے گفٹ ہے۔ آپ کو یہ پسند تھا.....“ وہ بہت اپنائیت سے بولا۔

”تو تمہیں کس..... مجھے اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ قدرے دکھائی سے بولی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے، پوری شاپ میں یہی تو آپ کو پسند آتی تھی نا اور ویسے بھی گفت واپس نہیں کرتے۔“ اس کے لہجے میں بہت اصرار تھا۔
”میں نے کہا..... اب مجھے اس کی ضرورت نہیں!“

”مجھے معلوم ہے یہ آپ کو بہت پسند ہے۔ یو آر اے گڈ وین۔ دیری ٹائس، آئی ریلی ریسپیکٹ یو۔ آپ کے سسٹم نے رات کو ہائی بکس کی جگہ کیا تو ان میں اس کا ڈیزینگ کارڈ بھی تھا۔ اس لیے ایڈریس ڈسکریٹ نے میں دیر نہیں لگی۔ میں آپ کو رات کو ہی یہ کتاب دے دیتا مگر وہ بہت غصے میں تھا۔ اس لیے اب لایا ہوں۔ ایکسپٹ اٹ پلیز۔“ اس نے خوب صورت چٹنگ میں لپٹی کتاب اس کی طرف بدحوالی تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔

یہ کتاب نہیں تھی اس کے نازک احساسات کا احترام تھا اور کسی نے تو خیال رکھا تھا۔ اس کے جذبات کو کسی نے تو محسوس کیا تھا۔
”تھینک یو..... تھینک یو سوچ.....“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے کو بے تاب تھے۔

”نوٹیز..... ٹس پارٹ آف لائف۔ آپ کو جو بک پسند ہو۔ میری شاپ سے آ کر لے جائیں۔ بی یو..... یو آر اے ٹائس پرسن۔“
وہ مسکراتا ہوا چلا گیا اور وہ اسے جانتا ہوا دیکھتی رہی۔ ایسے نازک احساسات کا ادراک اور احساس کسی کسی کو ہوتا ہے ہر کوئی اس قابل کہاں؟ ہر کوئی کب کسی کے لیے ایسا درد محسوس کر پاتا ہے۔ یا خدا یا میری اتنی Negation کیوں ہوتی ہے۔ ہر قدم پر پیدائش سے لے کر اب تک میں یہی تو فیس کرتی آئی ہوں۔ انسان کی عزت اتنی مشروط کیوں ہو گئی ہے اور پھر عزت کے لیے ہی دنیا کی ہر شے مشروط کیوں ہے۔ اس کی ذات، زندگی، نام، شخصیت، شناخت، پہچان، محبت اور عزت۔ سب کچھ ہی تو مشروط ہوتا ہے اور وہ اس معاملے میں کتنی بد قسمت رہی تھی۔ وہ بہت باسیلقہ، اطاعت گزار، اچھے اخلاق والی ایک عمدہ انسان بھی جاتی تھی اور ان میں سے کچھ بھی اس کے کام نہ آ سکا۔ وہ دھکاری ہوئی مخلوق کے طور پر ہی جانی جاتی تھی۔ سب کچھ کتنا بے معنی، فضول اور بے وقعت ہو گیا تھا۔ جب پیڑ نے اس کو عزت دی تو وہ سب کچھ چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ شوہر بچے، گھر اور شہری یادیں بھی۔



”خیر انسان کی زندگی بہت اہم ہے اور تم ہر وقت ڈپرےڈ رہتی ہو۔ دیکھو یہ سائنس کے کرشمے، نئی نئی ایجادات۔ سب اس کو زندہ رکھنے کی جدوجہد کے سوز سزتو ہیں۔“ پیڑ اسے سمجھا رہا تھا۔
”ہاں، میں بھی یہی سوچتی ہوں کہ کبھی کبھی جدوجہد، تہذیب و ثقافت، اخلاق، مذہب فلسفے اور تاریخ سب پر پانی پھیر دیتی ہے۔ انسان یکسر اپنی حیثیت بھول جاتا ہے اور اپنے منصب سے ہٹ کر وہ لغو، بے معنی اور کمینہ حرکتیں کرتا ہے۔“ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔
”خیر تم کیوں ایسا ٹیکل کرتا ہے۔ کیا تم بچھڑتا ہے؟“ پیڑ نے اس کے چہرے پر پھیلی یاسیت دیکھ کر کہا۔
”بے معنی زندگی میں بچھڑاؤ کیسے؟“
”تم بہت مسٹر ٹائس ہو رہا ہے۔“

”ہاں تم ویسٹرن لوگ بہت سی باتوں کو سمجھ کر بھی نا سمجھنے کی ایکنگ کرتے ہو تو اسے Mysticism کا نام دے دیتے ہو۔“ پیٹر اس کی بات سن کر کھٹکھٹا کر ہنس دیا۔

”ویری انٹر سٹنگ!“ وہ کتنی ہی دیر ہنستا رہا اور کافی کے سپ لیتا رہا۔ وہ اسے ہنستا ہوا دیکھتی رہی اور حیدر اس کے حواسوں پر چھانے لگا۔

”شہلا تمہاری ذات بہت منفرد ہے۔ تم جیسی لڑکی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ نہ یہاں نہ امریکا میں۔ کاش ہم یہاں نہ ہوتے۔ باہر کے کسی ملک میں ہوتے۔ جہاں ہماری پہچان میں ٹک نہ کرتی۔ ہم صرف اپنی محبت کی آبیاری کرتے۔ کاش ایسا ہو سکتا۔ زندگی کی حقیقت تو جذبیوں کی چٹائیوں سے وابستہ ہے مگر جوش و جنوں ہونے کے باوجود رنگوں میں دوڑنے والے خون کی حرمت کی پاسداری زیادہ ضروری ہے۔ ہم انسان تو نہ ہوئے بس مٹی کے پتکے ہوئے۔ ہماری ڈوریں کس کے ہاتھوں میں ہیں۔ ہم کیا جانتے ہیں۔“ حیدر اس کی رخصتی سے ایک روز قبل اس کے پاس آ کر کہہ رہا تھا ”جو ہوا بھرتی ہوا۔ میری وجہ سے اس گھر کا پورا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ یہ مجھے کبھی گوارا نہ تھا۔“

”ہم تم نہ ہوں گے خاک میں نہیں ہو کر“

”آٹا مٹا دینے سے چیزیں مٹ تو نہیں جایا کرتیں۔ دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ تم خوشبو کی طرح میرے اندر زندہ رہو گی۔ کسی کا کسی کے لیے خواہش کرنا، اسے چاہنا، اس سے عشق کرنا کیا اس کے اپنے بس میں ہوتا ہے۔ کیا ہوا کے جھونکے سے اس کی لطافت اور خوشبو چھنی جا سکتی ہے۔“ حیدر کے الفاظ بازگشت کی طرح اس کے لاشعور کے پردوں سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ اندر ہی اندر سن رہی تھی۔

دل کی دنیا کن کن ناموں سے آباد ہوتی ہے۔ کسے خبر ہوتی ہے۔ دلوں تک کوئی نہیں پہنچ پاتا۔ پیٹر سامنے تھا اور حیدر اندر..... ظاہر اور باطن میں کتنا فرق ہے۔ حیدر تو سنہری یاد تھا۔ اس کے وجود کے ایک ایک حصے میں رہی بسی خوشبو اور پیٹر تو اس کے وجود کا احاطہ کرنے کے باوجود بھی اس مقام پر نہ پہنچ پایا تھا۔ وہ جہاں تھا وہیں کھڑا تھا۔ وہ اب اس کا لائف پارٹنر تھا۔ ہنس کھ، زندہ دل اور قدر کرنے والا انسان۔ ملک منصور سے قدرے مختلف..... مگر ان میں سے کوئی بھی تو حیدر جیسا نہ تھا۔

”شہل اٹھو باہر چلتے ہیں۔“ پیٹر نے کافی کاک کیکل پر رکھتے ہوئے کہا۔

”کہاں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”یونیورسٹی گھومتے ہیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے۔ آج بہت دنوں کے بعد فرصت جوئی ہے۔“

”اچھا.....“ اس نے لاگ کوٹ پہنا اور اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔

”شہل تم بہت اچھا انسان ہو پھر تمہارے سسٹم نے ایسا کیوں کیا؟“

”کیا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”مس بی بیو، اس ریل ویری بیڈ ٹرانسلٹ اورز۔“ وہ ہنس دی اور اس کی ہنسی میں جیسے سارے جہاں کا درد سمٹ آیا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔

”پیٹر کیا انسان کا اچھا ہونا اس کی قسمت بدل سکتا ہے؟“

”شاید..... It may be۔“ وہ شانے اچکا کر بولا۔

”کبھی نہیں..... اور نہ ہی برا ہوتا۔“

”آئی ڈونٹ ایمگری۔“

”پرسنل ایکسپریسز ویوز (Views) کو بدل دیجے ہیں۔“ شہلانے جواب دیا۔

وہ یونہی سڑک پر گھومتے چلے جا رہے تھے۔ لوجوان لڑکے لڑکیاں، بچے، بوڑھے سب آ جا رہے تھے۔ ہنیر اس کو مختلف جوکس بھی سنارہا تھا اور اسے ہنسانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

”شیل لائف انجوائے کرو، یہ ایک دفعہ ہی ملتی ہے۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

”اور یہ کتنی ٹریجڈی ہے کہ کوئی شے ایک دفعہ ہی ملے اور وہ بھی اچھی نہ ملے۔“ اس نے ڈکھ سے کہا۔

”کارڈ سیک، اپنی لائف یوں مت اسپائل کرو۔ نسو، گاؤ، گھومو، پھرو..... تم آزاد ہو۔ تم جہاں چاہو جاؤ، کھاؤ پیو۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ تم

ٹیچکل ایسٹرن ویمن کی طرح کھانا بنا کر گھر میں میرا انتظار کرو۔“

”ہنیر کوئی آزادی بھی تو مکمل نہیں ہوتی۔ قید و بند سے آزاد تو دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔ نہ کوئی جذبہ نہ کوئی خیال نہ کوئی انسان تو پھر آزادی

کہاں ہے..... کہیں نہیں؟“ وہ اپنی ہی لے میں بولی۔

”یہ دیکھو سب لوگ آزادی سے گھوم پھر رہے ہیں نا؟“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”تو اس کا مطلب ہے کہ یہ سب آزاد ہیں؟“

”آئی تھنک سو.....“ ہنیر نے مسکرا کر جواب دیا۔

”بٹ آئی ڈونٹ۔“

”شیل پو آ رسو.....“

”مسٹر۔س.....“ وہ جلدی سے ہات کاٹ کر بولی۔

”اوہ ٹیس، بٹ انیجسٹ لو۔“ وہ ہنس کر بولا۔

”شاید.....“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”او کے تم ادھر بیٹھو۔ میں تمہارے لیے آکس کریم لاتا ہوں۔“ اس نے اسے پارک میں ایک بیچ پر بٹھایا اور خود آکس کریم لینے چلا گیا۔

ہنیر تھا سن درمیانی عمر کا خوب رو آوی تھا۔ اس کی سفید رنگت، نیلی آنکھیں اور گرے بال اسے دوسرے انگریزوں سے قدرے منفرد

بناتے تھے۔ وہ اس کی وجہ اپنا رشتہ کسی اینگلو انڈین سے بتاتا تھا۔ ہوا میں قدرے خشکی تھی۔ اس لیے دو سٹ کر بیٹھی تھی۔ سامنے سے ہنیر آ رہا تھا اور اس

کے ساتھ ٹنگریا لے بلوٹے بالوں والی ایک لڑکی آ رہی تھی۔

”شیل اس سے ملو۔ مائی ایکس وائف سون بلکروڈ۔“ پیٹر مسکرا کر اسے یوں بتا رہا تھا جیسے دونوں میں کوئی بہت اچھا رشتہ ہو۔

”ہیلو.....“ لڑکی نے خوش دلی سے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”شی از یور سیکنڈ وائف؟“ سون نے مسکرا کر پوچھا۔

”نو..... تھرڈ..... تینسی واز سیکنڈ۔ شی لونڈو د جان ناؤ۔“

”آئی سی!“ وہ مسکرا کر بولی اور شہلا اس کا سر میں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بہت سی ممکنات کے بارے میں سوچتی رہی۔

پیٹر نے ایک آکس کریم اسے دی، ایک سون کو اور اپنے لیے ایک اور لینے چلا گیا۔ وہ اس کے ساتھ ہی بیچ پر بیٹھ گئی۔ دونوں کافی دیر

خاموش رہیں پھر خود ہی اس نے سکوت توڑا۔

”تمہاری شادی کب ہوا؟“ سون نے پوچھا۔

”چھ روز پہلے۔“

”تم ایسٹرن ہو؟“

”ہاں پاکستانی.....“ وہ آہستہ سے بولی۔

”لیکن تم ایسٹرن نہیں لگتا۔“

”شاید۔“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”تم نے پیٹر سے شادی کیوں کیا؟“

”معلوم نہیں۔“ اس نے خلا میں گھورتے ہوئے گہری سانس لی۔

”اور تمہاری میریڈ لائف کیسی ہے؟“

”کون سی؟“ اس نے ایک دم چمک کر پوچھا۔

”کیا اور بھی تھی؟“ سون نے گہری نظروں سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں..... میرے کڈز تھے اور سسویٹ بھی۔“

”تو کیا تم نے پیٹر کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا؟“ اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں..... شاید..... ہاں..... آئی ڈونٹ لو۔“ وہ نرمی سے ہنسی تھی۔

”یو آر سو سٹریس۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ پیٹر آچکا تھا اس کے ہاتھ میں آکس کریم تھی۔

”سون تم نے میری وائف کو مس گا ہیڈ تو نہیں کیا؟“ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”اوہ..... نو..... نو..... ڈارلنگ..... شی از دیری ہاؤس!“

”آئی تو۔“ وہ مسکرایا۔

”اب میں چلتی ہوں۔“ تھینکس فار آئس کریم۔“ وہ ہائے کہتے ہوئے چلی گئی۔ وہ سون اور پیٹر کے بارے میں سوچتی رہی۔

”سون بہت ائیر سیو ہے۔ مجھے بہت Snub کرتی تھی۔ بہت جھگڑا تو۔“

”کس بات پر؟“ شہلانے حیرانی سے پوچھا۔

”یونہی، بیکار باتوں پر..... آئس ہرنیچر، آؤ چلتے ہیں۔“ وہ آہستہ آہستہ ہاتھ کرتے ہوئے اپنے اپارٹمنٹ کی طرف لوٹ آئے۔



سون مسلسل اس کے ذہن میں تھی۔ خوب صورت، نازک سی اور عام سی بھی ہر کردار اندر ہی اندر ایک دوسرے سے کتنا ملتا جلتا بھی ہوتا ہے اور نہیں بھی۔ وہ اپنی Negation کے بعد بھی کتنی خوش تھی جیسے وہ اب تھی۔ منصور سے مشروط معاہدے کے باوجود بھی وہ کتنی غیر اہم اور کمزور رہی تھی۔ سید صاحب نے منصور کی ہر ممکن خفیس کی تھیں کہ وہ اسے طلاق نہ دے۔ انھوں نے اپنی جائیداد کا مخصوص حصہ بھی اس کے نام کر دیا تھا اور اس کا سارا اختیار ملک منصور کو دیا تھا۔

”لیکن اس کا ماضی داغ دار ہے..... اور میں ایسی رذیل عورت کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتا۔“ ملک منصور غصے سے فرمایا۔

”اگر تم میرے عزیز از جان دوست معراج الدین کے بیٹے نہ ہوتے تو قسم خدا کی تمہارے گلے گلے کر داکرتوں کے آگے ذال دیتا۔“ تھیں یہ بھی حیا نہیں کہ وہ کس اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور تم اس کے بارے میں فضول یا وہ کوئی کر رہے ہو۔“ سید صاحب کا غصہ عروج پر تھا۔

”اس خاندان سے اس کا تعلق صرف نام تھا ہی ہے نا خون کا رشتہ تو نہیں۔ آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے میں کوئی محل سے کورا آدمی ہوں۔ اگر وہ آپ کے خاندان کی ہوتی تو اس وقت میری جگہ حیدر اس کا شوہر ہوتا۔ آپ نے میرے ساتھ سنگین مذاق کیا ہے۔ نہ جانے وہ کون ہے اور اس کو میرے گھر کو..... مجھے جاہ کرنے کے لیے بھیج دیا ہے۔ کیا میں کوئی کم تر اور بے حیثیت انسان ہوں۔ ہزار ایک زمین اور سیاسی اثر و رسوخ کا مالک ہوں۔ شہر میں میری دو فیکٹریاں ہیں۔ آپ نے میرے ساتھ کھانے کا سودا کیا ہے۔ سید صاحب میں بزنس میں نقصان ہونے پر کسی ملازم کو نہیں بلاتا تو کیا میں شہلا کو بخش دوں گا۔ اب وہ سسکتی رہے گی۔ اس گھر میں اس کی حیثیت جانور سے بھی بدتر ہوگی۔ آپ دیکھیے گا نہ وہ شکایت کر سکے گی۔ نہ آپ کے سامنے رو سکے گی اور نہ ہی حیدر کو بھلا پائے گی۔ یہی اس کی سزا ہے۔“ وہ الفاظ چبا چبا کر بولا۔

سید صاحب جو کسی کی تلخ بات گوارا نہ کر سکتے تھے۔ ایک دم کمزور پڑ گئے۔ انہیں شدت سے احساس ہوا کہ وہ تو بیٹی کے باپ تھے اور بیٹی کا باپ اندر ہی اندر نہ جانے کیا کچھ برداشت کر لیتا ہے اور کچھ کہہ بھی نہیں پاتا۔ انہیں اب اس کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ان کا سارا غصہ اور طیش ہوا ہو گیا۔ چہرے پر فکر، غم اور سنجیدگی کی لہریں نمودار ہو گئیں۔

”منصور وہ کوئی رذیل مخلوق نہیں۔ میرے ایک دوست کی بیٹی ہے۔“ انھوں نے اسے بچانے کے لیے ذمگی میں پہلی دفعہ جھوٹ بولا تھا۔

”سید صاحب کیوں جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے اس کے بارے میں تحقیقات کروالی ہیں۔ وہ آپ کو سڑک پر ملی تھی۔ حقیر..... ذرہ

خاک..... رذیل ذات..... جس کی نہ کوئی شناخت ہے نہ نام..... اور حیدر سے اس کا معاشرہ بھی کوئی چمکی بات نہیں!" ملک منصور بدتمیزی کی حدیں پار کرنے لگا۔

"دیکھو بیٹا، میری اور تمہارے باپ کی دوستی مثالی رہی ہے۔ اس دوستی کی خاطر ان سب باتوں کو بھول جاؤ۔ یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں۔ تمہیں خواہ مخواہ وہم ہو گیا ہے۔ وہ بہت اچھی سلیقہ شعار بچی ہے۔ مجھے یقین ہے تمہیں ہر طرح سے سکھ دے گی۔" سید صاحب کے لہجے میں ہلاکی لٹکتی تھی۔

"اسے اتنا حق ملے گا تو سکھ دے گی نا۔" وہ بھی تلخی سے بولا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تم سمجھوتا کر لو۔ کسی بھی بات پر میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔" سید صاحب نے آخری بار اٹھنا کی۔
 "نھیک ہے، آپ کی خاطر وہ اس گھر میں رہے گی مگر..... اس کے لیے آپ کو ایک شرط ماننا پڑے گی۔" ملک منصور کے لہجے سے عیاری نکلتی تھی۔

"ہاں..... کہو..... میں ضرور ماننے کی کوشش کروں گا۔" وہ بے مبری سے بولے۔

"آپ شہر والی رائس مل میرے نام کر دیں۔" وہ قدرے ڈھٹائی سے بولا۔

"اوہ.....!" وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ ہر راستہ مسدود نظر آ رہا تھا۔

"نھیک ہے، چند روز تک تمہیں کاغذات مل جائیں گے۔" سید صاحب ہار مانتے ہوئے شگفتگی سے دوچار ہوتے ہوئے بولے۔ وہ ریت کی عمارت کے مانند بالکل شکستہ ہو گئے تھے۔ ملک منصور کے چہرے پر طرہ مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے اسے بسانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ وہ اسے بالکل بینیوں کی طرح چاہتے تھے۔ وہ ایسے سوئے کاسن کر بیٹھے تھے میں آگئی۔

"اتنا مشروط وجود، اتنا مشروط رشتہ۔" اتنی مشروط زندگی۔ مرد ہر رشتہ کیوں مشروط بنا دیتا ہے۔ ہر تعلق مشروط کیوں ہے۔ وہ اس رات اتنا روئی کہ شاید آنسو ختم ہو گئے تھے مگر آنکھیں برساتا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ ملک منصور چند دنوں میں ہی رائس مل بیچ کر انگلیڈز چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنا بزنس سیٹ کیا۔ زیادہ تر وقت وہ انگلیڈز میں ہی رہتا اور وسیع و عریض حویلی میں وہ اس کی بوڑھی بھری ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ یہاں چند نوکر اور جانوروں کی بہتات تھی۔ اس حویلی کے چپے چپے سے وحشت اور ویرانی ٹپکتی تھی۔ وہ سارا دن گائے، بھینس، گھوڑے، مرغیاں اور بکریاں دیکھتی رہتی۔ نہ کسی سے بات نہ کسی سے دکھ سکھ شیئر کرتی۔ وہ اس گھر میں کیا تھی؟ مالک، ملازمہ، ہانڈی یا پھر زرخیز فلام۔ وہ آج تک قصین نہیں کر سکی تھی، وہ اس کے بعد کبھی شہنشاہ کا شہنشاہ سید نہ گئی۔ شادی کے بعد وہ کبھی حیدر کے سامنے نہ گئی۔ بس اس حویلی کی خاک میں خاک ہو گئی۔

ملک منصور جب بھی انگلیڈز سے آتا تو نئی نئی لڑکیوں سے وابستگی کی یادیں بھی لے کر آتا۔ جتنے دن رہتا۔ ہر رات اس پر تشدد کرتا۔ کبھی طرہ لہجے میں تو کبھی چابک ہاتھ میں تمام کر۔ اتنی بڑی حویلی میں وہ ایک تنہا تنہا کراہتی مرضی سے ادھر سے ادھر نہیں رکھ سکتی تھی۔ زندگی کا حاصل کیا تھا؟ وہ تو ہر شے اور جذبے کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔ منصور اس کا کیا تھا اور وہ اس سے کس شے کی طالب تھی یہ بحث اور طلب ہی ختم ہو چکی تھی۔

اس نے سرد آہ بھری۔

پتھر کافی اور سینڈ وچڑے لے کر آ گیا تھا اور سلیقے سے لڑے بھا کر اس کے سامنے رکھ دی "اتنا مت سوچا کرو، یو پر پٹی دیکھن۔" وہ محبت سے بولا۔
 "اوہ تم!" وہ ایک دم مسکرا دی۔ کہاں اتنی ذلت اور کہاں اتنا مان۔

"کل تم تیار رہنا۔ میں نے تمہارے لیے ایک اسکول میں بات کی ہے۔ تم ایزائے مقصس ٹیچر جوائن کرنا۔ یوں فارغ بیٹھ کر نکل آ جاؤ گی۔" پتھر نے کہا۔

"ٹھیک ہے، یہ تم نے اچھا کیا۔ واقعی میرے ذہن کو رنگ لگ چکا ہے۔"
 "پتھر سینڈ وچڑ بہت ٹھسٹی ہیں۔" وہ تعریف کرتے ہوئے بولی۔
 "اچھے ہیں نا، میں روز تمہارے لیے بنایا کروں گا۔" وہ خوش ہو کر بولا۔
 "تھینک یو۔" وہ بھی مسکرا دی۔

"میں اور بھی اچھی اچھی چیزیں بناتا ہوں۔ تمہیں بنا کر کھلاؤں گا۔"
 "حظاً؟" وہ مقصس انداز میں بولی۔

"حظاً..... کیک، بائیل پائز، پز اور غیر وہ غیر....."
 "اس کا مطلب ہے تم اچھے لگ بھی ہو۔"

"سنگ نہیں بیکر..... اور اب میں شاپ پر جا رہا ہوں۔ فروٹ میں نے فرنیج میں رکھ دیا ہے۔ ضرور کھا لینا۔ اوکے گڈ بائے اینڈ ٹھک کیئر۔" وہ مسکراتا ہوا ہا ہر نکل گیا اور آسوس کی آنکھوں میں جھلکانے لگے۔

پتھر واقعی اتنا ٹھس انسان ہے۔ اتنا محبت کرنے والا تو پھر سوسن نے اسے کیوں چھوڑ دیا۔ شاید کوئی کسی کے لیے سٹسٹیکشن اور کسی کے لیے سٹسٹیکشن کا باعث بننا ہے۔ کتنا تضاد ہے سوچ میں یا پھر رویے میں۔ کہیں دن، کہیں رات۔ کسی کے لیے اندھیرا اور کسی کے لیے روشنی۔

اس نے اوپر تلے شفق، آفاق اور فلک کو جہم دیا۔ منصور کو بچوں سے بہت محبت تھی اور اس سے بہت نفرت۔ نفرت کے ملاپ سے محبت نے جہم لیا تھا۔ عجیب مضحکہ خیز بات تھی۔ وہ اس کے وجود سے نفرت کرتا تھا۔ اس کا سایہ تنگ اسے گوارا نہ تھا اور اس کے وجود سے پھوٹنے والی کونپلوں پر وہ جان دیتا تھا۔ بے نام نے نام والوں کو تخلیق کیا تھا۔ وہ بچوں کی ہر خواہش پوری کرتا اور اس کی ہر خواہش کو رد کرتا بلکہ اس کے پاس تو انکھار کا حق ہی نہ تھا۔ ملازم بھی رعب سے اپنا حق مانگ سکتے تھے مگر وہ تو اس کے گھر میں کچھ بھی نہ مانگ سکتی تھی اور کس سے مانگتی۔ لینے والے سے پہلے اپنے وجود اور حیثیت کا تعین تو کرواتی۔ وہ بچوں کو بہت گھماتا پھراتا اور اس کو کبھی نہیں۔ پہلے شفق اور آفاق اکیلے باپ کے ساتھ جاتے۔ اب جب سے فلک پیدا ہوئی تھی تو اسے بھی کبھی کبھار شفق کے اصرار پر کھلی سیٹ پر بٹھا لیتا۔ شفق دونوں کے وجود کا مرتع تھی۔ ملک منصور تو دیسے بھی اپنی خوب صورت اور ڈھنگ پر سٹائش کی وجہ سے ہر خاص و عام میں مقبول تھا اور اس کے فیچر بھی کسی سے کم نہ تھے اور شفق تو بالکل ماں پر مگنی تھی۔ شفق جیسے جیسے بڑی ہو رہی

تھی ماں کی حیثیت کا اعجاز کر رہی تھی۔ اس نے ہی ضد کر کے شہر کے اسکول میں داخلہ لیا اور اس کی وجہ سے سب کو شہر شگفت ہونا پڑا۔

ملک منصور نے ڈیفنس میں چار کنال پر محیط بڑا سا گھر انہیں لے کر دیا۔ ہر طرح کی آسائشیں میسر تھیں۔ اس دلدادہ بچوں نے چھٹیاں انگلینڈ میں گزارنے کی ضد کی تھی اور اب کی بار اسے بھی جانا پڑا کیونکہ ملک بہت چھوٹی تھی۔ شفق اور آفاق کے بے حد اصرار پر اسے بھی لے کر جانا پڑا۔ جوں جوں ملک منصور کی امارت میں اضافہ ہو رہا تھا اس کی سیاسی حیثیت بھی بڑھ رہی تھی اور سماجی بھی۔ وہ آئے دن مختلف تقاریب میں خصوصی طور پر مدعو کیا جاتا کیونکہ وہ گلیسرز اور متحرک شخصیت کا مالک تھا۔ ہر روز نئی لڑکیوں کے ساتھ گھومتا۔ کبھی کسی این جی او کی روح رواں کے ساتھ۔ کبھی کسی پارٹی ورکر کے ساتھ اور کبھی کسی مشہور اداکارہ کے ساتھ تو کبھی ماڈلز کے ساتھ دیکھا جاتا۔ نت نئی فیشن اینبل لڑکیاں بلا روک ٹوک اس کے گھر آتی جاتیں۔ کسی کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ ان کے آنے جانے کی نوعیت پوچھ سکتا؟

منصور دو دن سے گھر نہیں آیا تھا۔ اس نے شفق کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ ضروری کام سے کہیں جا رہا ہے۔ شفق نے ماں کو بتا دیا تھا اور اس نے خاموشی سے سن لیا تھا۔ ناشتا ٹیبل پر لگ چکا تھا۔ وہ بچوں کو اٹھا کر لائی تو اچانک سامنے منصور بیٹھا تھا۔ خوش باش، گھبراہٹ سے گئی۔ وہ چونک سی گئی مگر کچھ بھی پوچھنے کی جرات نہ کر سکی۔

”ہیلو پاپا..... آپ یہاں.....؟“ شفق نے حیرت سے پوچھا۔

”ہیلو ڈیئر، ہاں میں رات کو آ گیا تھا۔ بس کام ختم ہو گیا تھا۔“

”پاپا آج چھٹی ہے مھو منے چلیں گے۔ آج زو چلیں گے۔“ آفاق خوشی سے بولا۔

”ٹھیک ہے بیٹا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ شفق روز اخبار میں چل اور اسکرینل دیکھنے کی عادی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ اخبار لے کر بیٹھ گئی اور پھر

ایک دم چونک گئی۔

”مما..... خود بچہ میں پاپا.....!“ وہ حیرت سے بولی۔

”کہاں، مجھے دکھاؤ۔“ آفاق اس سے اخبار چھیننے لگا۔

”مگر یہ ساتھ کون ہے؟“ شفق نے حیرت سے پوچھا۔

”پورنوما۔“ ملک منصور مسکراتے ہوئے بولا۔

”نہیں، ہماری ماما تو یہ ہیں۔“ آفاق غصے سے بولا۔

”شی اداے ملے مگر۔“ منصور نے اس کی تعریف کرنا چاہی۔

”بٹ وی ہیٹ ہر۔“ شفق غصے سے بولی۔ اس کا موڈ سخت آف ہو گیا تھا۔

شہلا خاموشی سے سختی رہی۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ انڈر کرکرے میں چلی گئی۔

تو منصور نے بلا خراس مگر سے شادی کر لی جس کا آج کل اس کے ساتھ چرچا تھا۔ اسے کوئی خاص دکھ نہ ہوا۔ منصور کے ساتھ اس کا

رشتہ بس نام کارہ گیا تھا۔ وہ پہلے کون سا اس کا تھا جواسے دکھ ہوتا۔ منصور بہت خوش تھا۔ بچوں کو باہر لے کر جانا چاہتا تو کوئی بھی ساتھ نہ گیا۔ شفق کا دل ٹوٹ سا گیا تھا۔ وہ سارا دن کمرے میں بند رہی اور روتی رہی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں نہ جانے کیوں اس نے اس بات کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔ اس نے سارا دن کسی سے بات نہ کی۔ آقا کی بھی روٹھاروٹھارہا۔ آہستہ آہستہ دونوں ماں باپ سے متنفر ہونے لگے تھے۔



بی بی جی کی وفات کی خبر ملی تو وہ چونک سی گئی۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ بی بی جی یوں اچانک اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گی۔ ان کی محبت اور پیار بھر اس سب کچھ کتنا منفرد تھا اور اس میں کتنی مٹھاس تھی۔ کیا ان سب کو بھلانا آسان ہے۔ اسے شدید صدمہ ہوا۔ منصور نے خود ہی گاڑی نکالی اور ملازم کے ہاتھ اس کو پیغام بھیجا۔ وہ خاموشی سے بچوں کو لے کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ کبھی بھی منصور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر نہیں بیٹھی تھی۔ نہ ہی منصور نے کبھی اسے یہ حق دیا تھا۔ وہ ہمیشہ شفق کو آگے بٹھاتا تھا۔ وہ سارا راستہ روتی رہی۔ وہ شفق کی پیدائش کے بعد اب پہلی دفعہ کا شانہ سید جا رہی تھی۔ وہ تو ان راستوں کو کھوجتی رہی۔ انھیں اپنے اندر تلاش کرتی رہی جو کبھی اس کے تھے اور اب اس کے جانے کے بعد سب کچھ کتنا بدل چکا تھا۔ گاؤں میں کافی ترقی ہو چکی تھی مگر اس کی نگاہیں تو ان کچھ کچھ راستوں اور پگڈنڈیوں کو تلاش کرتی رہیں جن پر وہ حیدر کے سنگ چلا کرتی تھی۔

حویلی میں سب لوگ جمع تھے۔ سید صاحب بہت بوز مے ہو چکے تھے۔ حیدر ان کے ساتھ ساتھ بھر رہا تھا۔ حیدر نے وہی حلیہ اپنالیا تھا جو کبھی سید صاحب کا ہوتا تھا۔ بس اس کی نظر کی ٹپک کا نمبر بڑھ گیا تھا۔ حیدر کی اپنے نخیالی رشتے داروں میں شادی ہوئی تھی اور اس کی ایک بیٹی تھی شہلا۔ وہ نام سن کر چونک سی گئی۔ وہ روتی ہوئی بہنوں کے گلے لگی۔ تبسم آپا بھی کافی دیر اس کے گلے لگ کے روتی رہیں۔ کبھی وہ اس گھر اور اس کی آسائشوں میں ان کے ساتھ برابر کی جیسے دار تھی اور اب وہ اس گھر میں اجنبی تھی، مہمان تھی۔ سید صاحب نے اس کے سر پر پیار دیا تو وہ جی بھر کر روتی۔ جنازے کے بعد وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”بی بی جی کو کیا ہوا تھا؟“ اس نے پوچھا۔

”ہونا کیا تھا بس بڑھا پا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا بیماری ہو سکتی ہے؟“ سید صاحب خاموش ہو گئے۔

”ہا ہا انہوں نے مجھے کبھی یاد نہ کیا؟“

”کرتی تھی۔ بہت زیادہ..... مگر میں نے خود ہی بلانا مناسب نہ سمجھا۔“

”کیوں..... میں اس قدر غیر ہو گئی ہوں۔“

”نہیں، منصور کے ڈر سے۔ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔“

”تو کیا اب وہ مجھ سے خوش ہے؟“ اس کے لہجے میں ہلا کا درد تھا۔

”منصور نے شادی کر لی ہے؟“ سید صاحب نے آہستہ سے پوچھا۔

”کیا فرق پڑتا ہے۔ میں اس کے گھر میں قالموشے سے بھی کم حیثیت رکھتی ہوں۔“

”میں تمہارا گنہگار ہوں۔“ سید صاحب کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

”آپ اپنے دل سے ہر وہم نکال دیں۔ کیا قسمت سے بھی کوئی ٹک سکا ہے۔ یہ سب میرا منصب ہے جو مجھے مل کر رہتا ہے۔“ اس نے سید صاحب کی تسخنی کرنا چاہی۔

اچانک حیدر کمرے میں آیا تو ٹھٹک سا گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ مدبر لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جیسے خزاں کا کوئی موسم ٹھہر سا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ ہی دکھ تھا ”کیسی ہو؟“ وہ جیسے مت کچا کر کے بولا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا اور وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

تین دن شہلا وہاں رہی حیدر نے اس دوران منصور کی بہت آؤ بھگت کی۔ اس کے بچوں کو بہت پیار کیا۔ جانے سے پہلے وہ سب سے مل رہی تھی۔ وہ کچن میں تسم آ پاسے ملنے لگی تو حیدر وہاں کھڑا تھا۔

”تم اس قدر کیوں بدل گئی ہو۔ تم وہ شہلا ہی نہیں لگ رہی۔ خوش رہا کرو۔“ حیدر نے کہا۔

”کیا پاتا آسان ہے؟“ وہ آہستہ سے بولی۔

”ناممکن تو نہیں، کوشش کیوں نہیں کرتی۔“

”میرے لیے اب سب کچھ ناممکن ہے۔“ اس نے آہ بھر کر کہا۔

”کیا زندگی بونہی گزار دو گی؟“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”شاید۔“

”تمہیں یوں دیکھ کر مجھ دکھ ہوتا ہے۔“ وہ قدرے افسردگی سے بولا۔

”کیوں؟“

”کیا تم نہیں جانتی؟“

”حیدر ماضی کو وہاں دفن کر دو جہاں سوائے تاریکیوں کے کچھ بھی نہ ہو۔ اب میں آئندہ یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔“ وہ کہہ کر باہر نکل کر منصور

باہر کھڑا ساری باتیں سن رہا تھا۔ وہ جا کر خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گھر آتے ہی منصور نے اسے ٹیلیفون گالیوں سے نوازا تھا۔ مرد کا گندہ ترین ہتھیار،

جو عزت اور لحاظ کے تمام بت پاش پاش کر دیتا ہے۔ مرد کو اونچے منصب پر بٹھا کر جب عورت اپنے بارے میں پہلی دفعہ ایسے الفاظ سنتی ہے تو اس کا بس

فہم چلتا کہ اس شخص کو اپنے قدموں تلے روند ڈالے۔ کیننگی کی بدترین شکل..... جسے مرد ادا کر کے خوش ہوتا ہے۔ عورت کی تذلیل کے احساس سے اس

کی انا تسکین پاتی ہے۔ ملک منصور بھی اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا۔ جب وہ ایک سے بڑھ کر ایک ٹیلیفون گالی اسے دے رہا تھا۔

”منصور گالیاں مت دیں!“ وہ پہلی دفعہ چلائی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”تم جو اپنے عاشق سے مل کر آئی ہو۔ اس خوشی میں پھولوں کے ہار پہناؤں۔“

”میرے اور حیدر کے تعلقات بہت اچھے اور پاکیزہ تھے اور مجھے کبھی بھی اس پر شرمندگی نہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو پسند کیا اور عزت دی۔ ایسی عزت جو شاید ہی کوئی مرد کسی عورت کو دے سکے۔ میرا اور اس کا کوئی تھراڈ کلاس انجمن نہیں تھا۔“ اس نے ہلکا خرمٹ کر کے کہا۔

منصور کو تو جیسے کسی بچھونے کاٹ لیا ہو۔ اسے قطعی توقع نہ تھی کہ وہ یوں اس کے سامنے بولے گی۔ اس نے جو اس کو مارنا شروع کیا تو رکنے پر ہی نہ رہا تھا۔ اس کے سر سے خون بہنے لگا۔

”تمہاری یہ جرأت کہ مجھ سے اس طرح بات کرو۔“ وہ غصے سے بے لگا ہو کر بولا۔

”پاپا بس کریں۔“ شفیق نہ جانے کہاں سے آگئی تھی۔ اس نے آکر باپ کو روکا تھا۔ شفیق کے کہنے پر وہ رکا تھا اور نہ آج تو وہ اس کی یوٹی بوٹی کرنے پر حلا تھا۔

شفیق اور آفاق دونوں ماں کا سرد ہار ہے تھے اور رو بھی رہے تھے اس کا پور پور، رداں رداں جل رہا تھا۔ سب کچھ اسے یاد آ رہا تھا۔ باہر ٹیرس پر خوشگوار ہوا کا جھونکا اس کے بالوں کو چھونے لگا مگر اندر کی آگ سے تن بدن جل رہا تھا۔ پیٹرا سے ٹیرس پر کھڑا دیکھ کر پیچھے سے ہاتھ ہلا رہا تھا مگر وہ تو شدید احساس ذلت میں جل رہی تھی۔ اب وہ باہر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ جب وہ اچانک چونک کر مڑی اور دروازہ کھولا۔

”بھیل تم کیا کرتا ہے۔۔۔۔؟“ وہ اسے دیکھ کر بھنجا کر بولا۔

”کیوں؟“

”میں تمہیں نیچے ہلا رہا تھا۔“

”کب؟“

”اوہ مائی گاڈ! بھیل ڈارنگ اپنی سوچوں سے باہر نکل آؤ۔ اپنا پاسٹ کہیں پھینک دو۔ کہیں تاریک گوشے میں۔ صرف پریذنٹ کو دیکھو۔ کسی کو یاد نہ رکھو۔ بس تم یہاں ہو اور میں تمہارے ساتھ۔“ وہ اس کے ساتھ لپٹتے ہوئے بولا۔

”زندگی کتنا تنے سال کہاں گم کر دوں، وہ لمبے وہ یادیں۔ وہ باتیں اور بہت کچھ۔ بھلانا بھی چاہوں تو نہیں بھلا سکتی۔“ وہ اندر دگی سے بولی۔

”او کے بکل سے تم اسکول جوائن کرو گی پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کون سے اسکول؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میں نے تمہارے لیے چاب ڈھونڈی ہے بتایا تو تھا اور تم اسکول میں تنہا پڑھاؤ گی۔ کل انٹرویو ہے لیکن ابھی صبح چلتے ہیں۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔

”نہیں، میرا دل نہیں چاہ رہا۔“

”اوہ گاڈ! ایک تو میں تمہارے دل سے بہت تنگ ہوں۔ تم اس کو سمجھانا کیوں نہیں۔“ وہ بھنجا کر بولا۔

”کیا سمجھاؤں؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”جو میں کہتا ہوں۔“

”تم کیا کہتے ہو؟“

”لو.....رومانس اینڈ.....“ وہ شرارت سے بولا۔

”یہ ایسی باتیں نہیں سمجھتا۔“

”اٹس ویری اسٹوپ۔“ نادانستہ پیئر کے منہ سے نکلا تو شہلا کھلکھلا کر ہنس دی ”جھینکس گاڈ۔ تم ہنسی تو.....“ اور وہ خود بھی ہنسنے لگ پڑا

”پب چلیں؟“

”نہیں۔“

”مردوی دیکھنے چلیں۔“

”نہیں۔“

”تھیٹر۔“

”نہیں۔“

”تو پھر.....؟“

”باتیں کرتے ہیں۔ میری زندگی میں اچھی باتوں کی کمی رہی ہے۔ تم باتیں کرو۔ میں بس سنتا چاہتی ہوں۔ اچھی باتوں سے بڑھ کر دنیا

میں کوئی قیمتی شے نہیں، ہے نا پیئر۔“

”اوہ نو.....تم پھر سید ہو جاتی ہو۔“ پیئر اکتاہٹ سے بولا۔

”اب نہیں ہوتی، تم باتیں کرو۔ میں سنتی ہوں۔“

”نہیں تم کرو، میں سنتا ہوں۔“

”کیا..... کون سی باتیں۔ کیسی اور کس کے متعلق!“ اس نے خود سے سوال کیا۔ دونوں خاموش ہو گئے اور پھر کھلکھلا کر ہنس دیے۔

”پیئر تم بہت Jolly ہو.....“

”اور تمہیں بھی ایسا ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ مسکراتا ہوا بولا۔

”تم اتنے اچھے کیوں ہو؟“

”کتنا اچھا؟“ پیئر اپنی تعریف سننے کے موڈ میں تھا۔

”بہت سے لوگوں سے اچھے ہو۔ ویری ٹائٹس پارٹنر اینڈ سویٹ سویٹ۔“

”کیا سب سے اچھا نہیں؟“ پیئر نے ہنسنے ہوئے پوچھا۔

”معلوم نہیں.....“ حیدر کی ہلکی سی ایک دم اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئی اور وہ کھوی گئی ”نہیں..... اس سے بڑھ کر کوئی بھی نہیں۔“ اس کے دل نے کہا۔

”تم بھی بہت اچھی ہو۔ معلوم نہیں تمہارے سپیڈ نے کیوں ایسا کیا؟“

”کیا؟“ جیسے وہ خواب سے بیدار ہو گئی ہو۔

”یوں کس بلی ہو..... وہ بہت برا انسان تھا۔ تم نے اتنے سال کیوں اس کے ساتھ ضائع کیے۔ اسے دوسرے دن ہی کیوں نہ چھوڑ دیا۔“

”ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ ہم زندگی کی آخری سانسوں تک رشتہ بھاتے ہیں۔ کوئی کوئی میری طرح راستے میں چھوڑ دیتا ہے۔“

”ویری اسٹریچ..... کس کے انتھار میں زندگی یوں ضائع کی جائے؟“

”شاید کسی بھڑے کے..... مگر ہم جیسوں کے ساتھ بھڑے بھی نہیں ہوتے۔“

”You mean miracles۔“ وہ وضاحت کے موڈ میں بولا۔

”ہاں Miracles۔“

”تو کیا تمہارا اور میرا ملاپ۔ ایسٹ اینڈ ویسٹ۔ کیا یہ Miracle نہیں۔“

”ہاں یہ بھی ہے..... لیکن پتیر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم کسی اور بھڑے کے خنجر ہوتے ہیں۔ دعائیں کسی اور کے لیے مانگتے ہیں لیکن کچھ

اور بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ زندگی اتنی مشکل کیوں ہے۔ اس میں اتنے Jerks کیوں ہیں۔ اتنے مختلف موڈ کہ ہم خود ہی حیران ہو جاتے ہیں کہ ہم

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

جا کہاں رہے تھے اور پہنچ کہاں گئے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”پلیز ڈیٹیل ایسی مشکل باتوں سے نکل آؤ۔ تم تھیں پڑھتی رہی ہو اس لیے اتنے اینگلز والی باتیں کرتی ہو۔ میں تمہارا پاسٹ نہیں جانتا

چاہتا۔ میں بس یہ جانتا چاہتا ہوں کہ تم خوش ہو کہ نہیں۔ کیا تم میرے ساتھ خوش ہو؟“

”ہاں..... بہت.....“

”کیا تمہارے اندر کوئی کارنر خالی تو نہیں رہ گیا۔ میں نے تو تمہیں بھر پور محبت دینے کی کوشش کی ہے۔ ایکسٹریم لو.....“ وہ مسکرا کر بولا۔

”ہاں.....“ وہ آہستہ سے بولی۔

”جھینکس ڈارلنگ، آئی ایم سٹیفائیڈ ناؤ۔“ وہ اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے بولا اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی ”تم جسے محبت کا نام

دیتے ہو وہ محبت تو نہیں۔ پتیر وہ تو کچھ اور ہے۔ میرے اندر محبت کا کارنا بھی خالی ہے۔ حیدر کے بعد تو کوئی اس کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا۔ وہ تو

ہمیشہ خالی رہے گا۔ تمہاری محبت میں وہ سب کچھ نہیں جو مجھے چاہیے۔“ اس نے آہ بھر کر سوچا اور اس کی طرف دیکھا وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

بعض لوگ کیسے آسانی سے مطمئن ہو جاتے ہیں جیسے پتیر..... جیسے منصور اور بعض لوگ کبھی مطمئن نہیں ہوتے جیسے میں جیسے حیدر۔ وہ اس کی

آنکھوں میں گہری گہری دیکھ چکی تھی اور اس گہری گہری کارنا بھی جانتی تھی۔ کیا زندگی یوں ہی گزر جائے گی۔ اس نے پتیر کے لو پر کھیل پھیلاتے ہوئے سوچا تھا۔

شزا ملک کی سپر اسٹار ماڈل تھی اور ماڈلنگ کے سلسلے میں ہی وہ لندن گئی تھی۔ جب ایک شو کے دوران ملک منصور سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ملک منصور کو گلیسر لائف اور گلیسر لوگ بہت پسند تھے۔ اس سے قبل وہ ایک عدد سنگر اور ایکٹر لیس کو طلاق دے چکا تھا اور اب شزا سے چوتھی شادی کے موڈ میں تھا۔ شہلا کی طلاق کے بعد اسے قدرے دم چکا سا لگا تھا۔ گوکہ پہلے وہ خود بھی یہی چاہتی تھی۔ کیونکہ واپس ایک اس نے شفق اور آفاق کو بہت افسردہ اور تنہا دیکھا۔ شفق اپنی عمر سے زیادہ سمجھنا اور سوچنا شروع ہو گئی تھی اور آفاق روڈ ہوتا جا رہا تھا۔ دونوں باپ کی طرف عجیب نظروں سے دیکھتے۔ اسی لیے اس نے شزا کے ساتھ میریس لائف گزارنے کا سوچا تھا۔ دونوں نے ملک واپس آتے ہی شادی کر لی۔ اخباروں کے خصوصی ایڈیشن میں ان کی تصویریں شائع ہوئیں۔ شہلا نے بھی ایک دن اخبار میں دیکھا اور آہ بھر کر رہ گئی۔ ملک منصور کے چہرے پر جو خوشی اور مسرت کی جھلک تھی وہ جب اس کے ساتھ منسوب رہی کبھی دیکھنا نصیب نہ ہوئی تھی۔

شادی کے بعد دونوں سوئٹزر لینڈ چلے گئے۔ بچے گھر میں بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ گاؤں سے یوڈی دادی اور ایک پرائیوٹ فادر نوکر اکرم آ گئے تھے۔ دادی کی قوتِ سماعت بہت زیادہ متاثر ہو چکی تھی۔ جیج جیج کر کوئی بھی بات سمجھنا پڑتی تھی۔ بچے دادی سے اسی لیے بات ہی نہ کرتے تھے۔ البتہ اکرم گھر..... کا بہت خیال رکھتا تھا۔ بچے ایک دم شدید تنہائی کا شکار ہو گئے تھے۔ کب تک کہیو، مویز اور فریڈ ز سے جی بہلاتے۔ خود ہی آپس میں باتیں کرتے پھر چپ کر جاتے یا پھر رونے لگتے۔ شفق، لک کا بہت خیال رکھتی۔ اس کے لیے آ پار بھی ہوئی تھی۔ جو سارا دن اس کے پاس رہتی اور رات کو اسے سلا کر چلی جاتی۔ وہ شفق کے پاس ہی سوتی تھی۔

فلک سورجی تھی اور شفق اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ کر ہوم ورک کر رہی تھی کہ وہ ایک دم روتی ہوئی اٹھ گئی۔ وہ ماما..... ماما پکار رہی تھی۔ شفق نے اسے گود میں لیا مگر وہ اس سے سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

”چپ کرو، کیوں شور کر رہی ہو۔ ہماری کوئی ممانہیں۔ وہ ہماری کچھ نہیں لگتی۔“ شفق نے اسے غصے سے ڈانٹا، آفاق ان کی آوازیں سن کر اٹھ ا گیا۔

”کیا ہوا، کیوں شور کر رہی ہو؟“

”ماما کے پاس جانے کی ہمد کر رہی ہے۔“ شفق بے بسی سے بولی۔

”اس کو بتاؤ کہ نہ ہماری ممانہیں نہ پاپا۔“

”بھائی تو پھر کون ہے ہمارا؟“ شفق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”کوئی بھی نہیں۔ دیکھو اس گھر میں کون ہے ہمارا..... نہ ماما..... نہ پاپا۔ شفق کیا گھرا لیے ہوتے ہیں۔ جہاں نہ ممانہیں نہ پاپا۔ صرف

دادی بلو کر اور بچے ہیں۔ شفق جب میں بڑا ہوں گا تو ان کو.....“ غصے سے ایک دم اس کے نتھنے پھولنے لگے۔

”تو کیا کرو گے؟“

”سب کو شوٹ کر دوں گا۔“ وہ غصے سے بولتا ہوا ہر کھل گیا۔

فلک رو رہی تھی اور وہ اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہیلف سے اپنے سارے کھلونے نکال کر اس کے سامنے رکھے مگر وہ سب کو اٹھا اٹھا کر پھینک رہی تھی۔ صرف ماما..... ماما کی رٹ لگا رہی تھی۔

”اچھا چلو، دادی امی کے پاس چلتے ہیں۔“ وہ اسے زبردستی اٹھا کر لے گئی اور دادی کی گود میں بٹھا دیا۔ وہ نہیں..... نہیں کی خند کر رہی تھی۔
دادی کی ہڈیاں اور نحیف و نزار جسم اسے چھبے لگا۔ دادی نے اسے اپنی آغوش میں سینے کی کوشش کی۔ وہ مضطرب تھی۔ محبت بھرا کوئی لمس چاہتی تھی۔
دادی کے پیار کرنے پر سٹ سی گئی اور تھوڑی دیر بعد سو گئی۔ شفق ان کے پاس پٹھی ہوم ورک کر رہی تھی۔ جب رات گئے ملک منصور کا فون آیا تو وہ
مجموعہ اٹھی۔

”آفاق، جلدی سے آؤ۔ پاپا کا فون ہے۔“ وہ خوشی سے چلائی۔

آغا اور پھر بیٹھ گیا۔

”آفاق بات کرو پاپا سے.....“ اس نے بات کرنے کے بعد فون اسے پکڑنا چاہا۔

”مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔“

”آفاق بدتیزی مت کرو۔“ شفق پڑی بہن ہونے کے ناطے اسے ڈانٹتے ہوئے بولی۔

”میں کوئی بدتمیزی نہیں کر رہا۔ مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔“ اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”پاپا آفاق آپ سے ناراض ہے۔ اس لیے باہر چلا گیا ہے۔“ اس نے فون رکھنے سے پہلے کہا۔

”آفاق تم اتنے غصے میں کیوں آ جاتے ہو۔ تم کچھ بھی نہیں سمجھتے۔“

"کچھ مت سمجھاؤ۔" وہ غصے سے بولا۔

”تم پاپا سے کیوں ناراض ہو؟“

”بہت سی باتیں ہیں۔“

"خـ...خـ"

وہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شفق نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ اس کے ساتھ لگ کر سسکنے لگا۔ "شفق آئی بیٹ

پاپا۔ آئی مس ماما۔۔۔۔۔ آئی لومما۔۔۔۔۔ بٹ آئی بیٹ ہر۔۔۔۔۔" وہ مسلسل بول رہا تھا اور شفق بھی اس کی باتیں سن کر رو رہی تھی۔



منصور اور شہزاد ایک پہاڑی پر بنے خوبصورت ریسٹورنٹ میں آبشار کے کنارے بیٹھے سو فٹ ڈرنک پی رہے تھے۔ حدنگاہ خوبصورت مناظر پھیلے ہوئے تھے۔ سبھی کچھ تو تھا۔ نیلگوں آسمان، سرسبز اونچے پہاڑ، خوبصورت فضا جس میں مہک ہی مہک تھی اور اس کے دامن میں خوبصورت..... محبت بھرے وجود ادھر ادھر بیٹھے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شہزاد کچھ خاموش سی بیٹھی تھی۔

”منصور آپ کو آپ کی بھئی چھوڑ گئی۔ آپ کو اس کا افسوس نہیں۔“ اچانک شزانے اس سے پوچھا۔
 ”نہیں!“ وہ قدرے بے پروائی سے بولا۔
 ”کیوں؟“

”کیونکہ وہ کبھی میرے لیے اہم نہ تھی۔ وہ کبھی بھی میری ذات کا حصہ نہ بن سکی۔ میری سوچوں پر حاوی نہ ہو سکی اور میرے وجود کو اپنے سحر اور حصار میں نہ لے سکی۔“
 ”مگر وہ تھی تو بہت خوبصورت۔“

”ہاں..... مگر اس خوبصورتی میں نہ ادائیگی، نہ دل فریبی وہ دل رجمانے کے فن سے نا آشنا تھی۔ وہ صرف ایک ذمہ دار لاش تھی۔ جس میں زندگی تھی مگر نہ حرارت تھی، نہ خوشبو..... اور نہ ہی کسی قسم کی تفتیش۔“

”منصور جب ایک عورت مرد کو دھکا دے۔ اسے یوں چھوڑ جائے۔ کسی اور کے لیے..... تو کیا یہ مرد کے منہ پر طمانچہ نہیں؟“ شزانے معنی خیز لٹکا ہوں سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

منصور نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا اور تھملا کر جگہ بدلی۔ اس نے اس بات پر کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ کیونکہ اس نے کبھی اس کو اہمیت ہی نہ دی تھی۔ شزا کی بات کسی نشتر کی طرح اس کے دل پر لگی۔ وہ جتنی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ شزا کی بات پر اندر ہی اندر تھملا تا رہا۔
 ”منصور..... مجھ سے قبل آپ کی زندگی میں کتنی عورتیں آئی ہیں؟“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
 www.pdfbooksfree.pk

”شزا تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو؟“
 ”بتائیں نا۔“ وہ ہنست تھی۔

”اتنا اچھا خوشگوار ماحول، ہر طرف حسن ہے۔ خوبصورتی ہے۔ محبت ہے اور تم کیسی فضول باتیں لے بیٹھی ہو۔“ وہ خفگی سے بولا۔
 ”یونہی پوچھنے میں حرج ہی کیا ہے؟“

”بہت سی..... مگر اب تو کوئی نہیں۔ اب تو صرف تم ہو۔“
 ”اور میرے بعد.....؟“ وہ اندر کے خوف سے مجبور ہو کر بول پڑی۔
 ”پلیز اس کا پک کو بند کر دو۔“

”اچھا تو شہلا کے ساتھ آپ کے کیا اختلافات تھے؟“
 ”شزا تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیوں دیکھوں کی طرح جرج کر رہی ہو؟“
 ”یونہی پوچھ رہی ہوں۔ اگر آپ نہیں بتانا چاہتے تو رہنے دیں۔“
 ”ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ جب مجھے ملی تو اس کا ماضی داغدار تھا۔“

”کیا مطلب؟“

”اس کا اپنے کزن سے افیئر تھا۔“

”لیکن ماضی تو آپ کا بھی اچھا نہیں تھا اور شاید حال بھی..... مگر وہ تو آپ کے وجود کو برداشت کرتی رہی۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟“

”شزا پلیز! اگر تم ان فضول باتوں کو نہیں چھوڑ سکتی تو میں جا رہا ہوں۔“

”اچھا اب نہیں پوچھتی۔“ شزا خاموشی سے ہتھپار ڈالتے ہوئے بولی اور پھر دلوں خوبصورت مناظر کی باتیں کرنے لگے۔ محبت کی

خوبصورتی کی اور آنے والی زندگی کی۔ ایسی زندگی جس میں صرف لطف ہی لطف تھا۔ خوشی ہی خوشی۔ شزا تھوڑی دیر بعد اس کی باتوں پر قہقہے لگا رہی تھی اور وہ ان قہقہوں سے محفوظ ہو رہا تھا۔

منصور نے اسے جی بھر کر شاپنگ کروائی اور اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ جس چیز پر ہاتھ رکھتی وہی خرید کر دیتا۔ وہ جو چاہتی وہی بھی کرتا۔ اسے کسی بھی لمحے ملک منصور میں ایسی کوئی بات نظر نہ آئی جو اس کے اندر چھپے خدشات کو توانا کرتی۔

”شزا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب تمہارے بعد کسی اور سے شادی نہیں کروں گا۔“ ایک دن ملک منصور نے مسکراتے ہوئے کہا تو جیسے اس

کے دل کی کلی کھل اٹھی۔

”کیا یہ سچ ہے؟“ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں، مجھے تم سے وہ سب کچھ مل گیا ہے۔ جس کی میرے دل کو تنہا تھی۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”جھینکس فار کلمینٹ۔“ وہ یوں قاتحانہ مسکرائی جیسے ساری دنیا اس نے فتح کر لی ہو اور اب پوری دنیا پر اس کا ہی راج ہو۔



شہلا کو جب سے جاب ملی تھی وہ بہت مصروف ہو گئی تھی۔ صبح اسکول جاتی اور رات کو دیر تک پیئیر کی شاپ پر اس کی مدد کرتی۔ زندگی مشین

بنی جا رہی تھی مگر وہ خوش تھی۔ اپنے آپ کو بھولنا اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ ماضی کو وہ کڑوی گولی کی طرح گل چکی تھی مگر کبھی کبھی وہ بے سبب اداس ہو جاتی۔

کبھی کبھی ماضی راتوں کو خواب میں کبھی فلک، شفق اور آفاق کی صورت میں تو کبھی حیدر اور سید صاحب کی صورت میں سامنے آ جاتا تو وہ چونک جاتی

اور تڑپنے لگتی۔ ماضی کو پرانی مضبوط عمارتوں کی طرح منہدم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ قدم قدم پر پرانی باتیں یاد آتی ہیں۔ کسی طرح فرار ممکن

نہیں۔ زندگی سے ماضی سے، آواز سے اور انجام سے۔

”ہیلو نیسی.....“ ایک خوبصورت، دلیلی پتل اور نیلی آنکھوں والی لڑکی کو پیئیر دیکھ کر مسکرایا۔

”ہیلو پیئیر، بہت چنڈم لگ رہے ہو۔“

”اوہ نیسی.....“ وہ شرمناک بولا۔ وہ کتابیں شیلٹ میں لگا رہی تھی۔ پیئیر کی آواز میں خوشی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا۔

”میٹ یو مائی وائف شیلٹ۔ شہلا.....“ پیئیر نے اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس کا تعارف کروایا۔

”ہاؤ ٹائس، ایسٹرن ویمن!“ نینسی حیرت سے بولی۔

”اوہ ٹائس..... تم بتاؤ جان کیا ہے؟“

”اس کو میں نے چھوڑ دیا۔ بہت چرچہ کرتا تھا۔ اب میں ٹونی کے ساتھ رہتی ہوں۔“

”کون ٹونی؟“

”مائی ہاس۔“

”آئی سی..... کوئی کتاب پسند ہے تو لے لو!“ پیٹر نے خوش دلی سے اسے آفر کی۔



نینسی کو دیکھ کر شہلا سوچ میں پڑ گئی۔ پیٹر کیسا سچیدہ انسان ہے۔ یا تو وہ بہت بے وقوف تھا یا بہت ہوشیار۔ ایسی محبت سے اس سے پیش آ رہا تھا، کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اس کی انیس واٹف تھی۔ اگر ایسی محبت اور عزت وہ ان کو اپنی میریلے لائف میں دیتا تھا تو پھر دلوں نے اسے کیوں چھوڑا یا اس نے کیوں چھوڑا؟ کیا یہ یہاں کے لوگوں کا ایسا تھا؟ یا پھر یہی زندگی تھی۔ اگر یہی زندگی تھی تو پھر بہت تلخ تھی۔ وہ نینسی کی طرف دیکھ کر سوچتی رہی۔ نینسی نے ایک کتاب پسند کی تھی اور پیٹر نے خواہ سے اچھی طرح پیک کر کے دی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔

”ٹھیل کیا سوچ رہی ہو؟“ پیٹر نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں..... کچھ نہیں۔“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree

”اگر تم میرے بارے میں سوچ رہی ہو تو پوچھ لو۔“

”ہاں، میں سوچ رہی ہوں کہ تم سوسن اور نینسی سے اتنی محبت سے ملتے ہو تو پھر انہیں کیوں چھوڑا؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”بس اتنی ہی بات..... سوسن ڈرنک بہت کرتی تھی اور اکثر ٹائٹس گھر کے باہر ہی رہتی تھی۔ میں نے ایک دفعہ غصے سے ڈانا تو مجھے چھوڑ کر

چلی گئی اور نینسی جان کے ساتھ بہت فریج تھی۔ میری غیر موجودگی میں جان اکثر میرے بیڈروم میں ہوتا۔ نینسی کو میں نے بھٹا چاہا تو کہنے لگی تمہیں

چھوڑ سکتی ہوں جان کو نہیں..... اور پھر ایک دن بغیر بتائے وہ نہ جانے جان کے ساتھ کہاں چلی گئی..... آج تین سال بعد چلی ہے۔“

”تو کیا تم ان سے محبت نہیں کرتے تھے کہ وہ اتنی آسانی سے تمہیں چھوڑ کر چلی گئیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”آئی ڈونٹ نو کہ تم محبت کس کو کہتے ہو؟..... رومائس کو یا سیکس کو؟ یا پھر کسی اور شے کو۔ اس معاملے میں تم مشرقی عورتیں بہت کھیڑ ہوتی

ہو۔ تم لوگوں کے ساتھ مردوں کا رویہ انتہائی ناروا ہوتا ہے مگر تم لوگ پھر بھی نہیں بولتے اور ساری زندگی یونہی گزار دیتے ہو۔ کبھی فیملی کی خاطر، کبھی

بچوں اور کبھی اپنے والدین کی خاطر..... میری مادر بھی یہی بتاتی تھیں۔“ وہ خاموش ہو گیا اور اسے یوں لگا جیسے پیٹر نے اس کے منہ پر طمانچہ مارا ہو۔

اس نے تو کسی کا لحاظ کیے بغیر، کسی سے محبت کیے بغیر دلوں کو چھوڑ دیا۔ فیملی کو بھی، بچوں کو بھی اور سید صاحب کو بھی۔ وہ ایسٹرن ویمن کی کٹی گری

سے باہر ہو گئی تھی مگر اب ویسٹرن سوسائٹی کا حصہ بننے سے ہچکچا رہی تھی۔

”کیا بات ہے شہیل! تم کن سوچوں میں ڈوب جاتی ہو؟“ پیٹر نے اسے شکر دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں، سوچ رہی ہوں کہ کبھی تم ان کی طرح مجھے بھی تو تنہا نہیں چھوڑ دو گے؟“

”بس..... اتنی سی بات..... ڈیئر، اگر تم آج جانا چاہتی ہو تو جاسکتی ہو، میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ میں تمہیں کیوں روکوں گا، یو آر

فری.....!“ اس نے صاف گوئی سے کہا تو وہ پھٹی پھٹی لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے قطعی توقع نہ تھی کہ وہ اسے یوں جواب دے گا۔ اتنی

زبردست لٹی۔ اس کی تو ذرہ بھر بھی اہمیت نہ تھی۔ جیسے اچانک دودھ میں گرے ہال کو کوئی باہر نکال پیسکے۔ ایسے ہی پیٹر اسے ٹریٹ کر رہا تھا۔ کیا ہر

عورت، مرد کی زندگی میں صرف اتنی سی اہمیت رکھتی ہے؟ اتنی سی شناسائی، جسے اتنا مضبوط رشتہ سمجھتی ہے، جس کے لیے اپنی ہستی داؤ پر لگانے کو تیار ہو

جاتی ہے۔ مرد کے نزدیک تو کچھ بھی نہیں۔ کیا ہر عورت ایسی تردید برداشت کر سکتی ہے یا پھر وہی..... منصور..... پیٹر..... حیدر..... سید صاحب.....

ان میں سے کسی ایک کے لیے بھی تو وہ اہم نہ تھی۔ ہر کسی نے اسے اتنی آسانی سے نکال دیا تھا اور اب جس کے لیے اس نے اپنی اولاد چھوڑی تھی، وہ

سب سے زیادہ شکر لگا تھا۔ خدا ایسی دھڑک کر کسی کے مقدر میں نہ لکھے۔ پہلے دن ہی وہ کسی کی گود سے نکالی گئی تھی پھر کسی کے در سے..... دل سے اور

اب تو کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ کبھی وجہ جانے بغیر تو کبھی وجہ بتائے بغیر۔

”شہیل! تم میری بات سن کر سوچ میں کیوں گم ہو گئیں؟ ہر شخص اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا ہارٹ ہے، باڈی ہے، مائنڈ

ہے۔ جو چاہے وہ کرے۔ میں سوشل ہیئرئیز کا قائل نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے بیک اٹھا کر باہر نکل آئی۔

شرق و مغرب کا یہ عجیب تضاد تھا۔ مشرقی مرد عورت پر چلاتا ہے، مگر سے قدم مت نکالنا اور نہ تمہارے نکلے نکلے کر دوں گا اور مغربی

مرد کہتا ہے..... جاؤ، تم ابھی جاؤ۔ تم آزاد ہو۔ جب مرد نکالتا ہے تو مشرقی عورت کہتی ہے خدا کے لیے مجھے مگر سے مت نکالو۔ میں تمہاری داسی

ہوں، جہنم جہنم سے تمہاری باندی۔ میں تو جہد کر کے نکلی تھی کہ تمہارے مگر سے میرا جنازہ نکلے گا۔ تم نکال دو گے تو میں کہاں جاؤں گی؟ مغربی مرد

جب مغربی عورت کو روکنا چاہتا ہے تو وہ کہتی ہے، مجھے مت روکنا، میں جا رہی ہوں۔ میں اپنے قول و فعل میں آزاد ہوں۔ اتنا گہرا تضاد.....! وہ کیا

چاہتی تھی، وہ تو مغربی عورت کی طرح اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آئی تھی اور اب مشرقی عورت کی طرح اندر سے شدید آرزو تھی کہ پیٹر اس کے

دوسوں کو رد کر دے اور کہے کہ میں تو تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔ میں تمہاری ڈھال بنوں گا۔ اس کی ڈیماٹریز یہ تو نہیں تھیں..... نہ مشرقی

عورت والی، نہ مغربی عورت والی۔ نہ خواہشوں کے عین جزیروں سے چاہیے تھے نہ محبت کے پتے دھارے میں سیراب ہونے کی تمنا۔ اس کی تو آرزو

ہی اور تھی..... وہ تو صرف اپنے وجود اپنی ذات کی شناسائی اور شناخت کے سفر میں سرگرداں تھی۔ اس کا تعلق نہ مشرق سے تھا نہ مغرب سے۔ وہ تو

انسانوں کے جہوم میں اپنا وجود اور شناخت ڈھونڈنے آئی تھی۔ شاید اب یہاں بھی کچھ ممکن نہیں تھا۔ اس نے سرد آہ بھری اور اپارٹمنٹ کا دروازہ

کھول کر اندر چلی گئی۔ باہر شدید دھند تھی۔



موسم سرما کی شدید بارشوں نے ہر طرف طوفان برپا کر رکھا تھا۔ کئی دیہات زیرِ آب آ گئے تھے۔ دسمبر کی ان بے سنسان راتوں میں بچوں کو شدید خوف محسوس ہوتا۔ منصور اور شزا کو گئے ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ شاید وہ ورلڈ فور پر چلے گئے تھے۔ بس فون ہر روز آتا تھا کہ جلد آ رہے ہیں۔ ہردن، ہر شام انتظار میں کٹ جاتی۔ بچے جھنجھلا سے گئے تھے۔ یوڈھی دادی سر شام ہی سو جاتیں۔ بس اکرم ان کا حال پوچھتا اور خیال رکھتا۔ نوکرا کام کر کے چلے جاتے۔ اکرم کی بیٹی رانی کھانا پکا کر چلی جاتی پھر وہ سردنٹ کو اسٹریس باہر نہ نکلتی۔ اکرم کٹھی کے اوپر والی منزل پر ایک کمرے میں رہتا تھا۔ ایسی ہی ایک بے رستہ رات کو فلک کو شدید بخار ہو گیا، اسے ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ دادی سو رہی تھیں۔ شفق بار بار اس کے کپڑے بدلتی اور وہ بار بار تے کرتی۔ دھنگ آ گئی تھی۔

”آفاق! کیا مصیبت ہے..... مجھ سے نہیں یہ سنبھال جاتی۔“ شفق غصے سے بولی۔

”اچھا، میں اکرم چاچا کو بلا کر لاتا ہوں۔ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتے ہیں۔“ آفاق جلدی سے انہیں بلا لایا۔

”کیا بات ہے چھوٹی بی بی! کیا ہوا فلک بی بی کو؟“ اکرم فلک کو پکڑتے ہوئے بولا۔

”چاچا، اسے بہت بخار ہے۔ کپڑے خراب کر رہی ہے۔“ وہ روہا نسی ہو کر بولی۔

”اچھا، میں ڈرائیور کو بلا تا ہوں۔ آپ میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو۔ فلک بی بی کو میں اٹھا لیتا ہوں۔“

اکرم گاڑی میں آگے بیٹھ گیا۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ بارش تھوڑی دیر کے لیے تھمی تھی مگر باہر شدید ٹھنڈ تھی۔ کہیں اکا دکا کلینک کھلے تھے۔

اکرم اسے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے اسے دو تین انجکشن لگائے اور دوائیں بھی دیں۔ جیسے ہی وہ گھر لوٹے تو لائٹ چلی گئی۔ فلک نیند میں بھی بار بار ڈر رہی تھی۔ اکرم اسے بیڈ پر لٹا کر جانے لگا تو شفق نے اسے روک لیا۔

”اکرم چاچا! آپ مت جاؤ۔ باہر بہت اندھیرا ہے اور ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔“ شفق نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

”اچھا بی بی! میں ادھر ہی رک جاتا ہوں۔“ وہ نیچے کارپٹ پر لیٹ گیا۔ ایک دم زور سے بجلی کڑکی تو شفق فلک کو اٹھا کر اکرم کے ساتھ لیٹ

گئی۔ آفاق دادی کے ساتھ سو رہا تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو اکرم کے ایک طرف شفق تھی اور دوسری طرف فلک۔ اور وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ شفق کی آنکھوں سے

شدید احساسِ محرومی اور ایک عجیب سے خوف، دکھ سے آنسو نکلنے لگے۔ اگر آج مماء، پاپا ہوتے تو کیا اکرم یہاں ہوتا؟ اور دوسرے ہی لمحے اسے ماں

باپ سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی۔ کیا مماء، پاپا ایسے ہوتے ہیں۔ فلک بیمار ہے اور ہم کتنے اکیلے ہیں..... اور وہ دونوں ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔

اسے ان سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی۔ وہ آہستہ سے فلک کو اٹھا کر بیڈ پر لے آئی۔ اسے اندھیرا اندر کوئی چیز بہت بری لگ رہی تھی۔

”اکرم چاچا، اب آپ جاؤ۔“ وہ قدرے بے رخی سے بولی۔

”اوہ، میں ادھر ہی سو گیا..... اب فلک بی بی کیسی ہے؟ اسے دوائیں دیں، ٹھیک ہو جائے گی۔“ وہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

وہ اسے بار بار دوائیں دیتی رہی مگر اس کا بخار کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔ سارا دن اسی طرح گزر گیا۔ رات پھر گہری ہونے لگی تھی اور

فلک کو بخار پہلے سے بھی زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ وہ اور آفاق اس کے پاس بیٹھے تھے۔ دادی کی بھی طبیعت خراب تھی۔ وہ بھی دوائیں کھا کر لیٹیں تھیں۔

”شفق! اکرم چاچا کو بلا لاؤں؟“ آفاق نے رائے دی۔

”نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔“ اس کورات کا اکرم پر بہت غصہ تھا۔

”لیکن فلک اب آنکھیں بھی نہیں کھول رہی۔“ آفاق پریشان ہو کر بولا۔

”تو اکرم چاچا کیا کر لے گا؟“ اس کے اندر نہ جانے کیا چیز کلک رہی تھی کہ اب وہ اکرم کے نام سے ہی غصہ کرنے لگی تھی اور اس کو قلعی

نہیں بلانا چاہتی تھی۔

”تو پھر کیا کریں؟“ آفاق پریشانی سے بولا۔

”میں پھر سیرپ دیتی ہوں۔“ اس نے اٹھ کر زبردستی اسے سیرپ کی آدمی شیشی پلا دی۔

”شفق! اتنا زیادہ سیرپ پلا دیا۔“ آفاق نے حیرت سے پوچھا۔

”تو اور کیا کروں..... اسی لیے زیادہ پلایا ہے کہ جلد آرام آئے گا۔“ اس کی حالت آہستہ آہستہ بگڑ رہی تھی۔ کبھی وہ آنکھیں بند کرتی، کبھی

کھولتی ایک دم وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

”شکر ہے سیرپ سے اسے نیند تو آ گئی۔“ شفق نے کبل اس کے گرد اچھی طرح لپیٹ دیا۔ آفاق بھی اونگھنے لگا۔ وہ بھی سارے دن کی

تھکی تھی۔ وہ بھی فلک کے ساتھ لگ کر سو گئی۔

صبح دادی کی آنکھ کھلی تو وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے کمرے میں آئیں۔ تینوں بچے سو رہے تھے۔ دادی نے فلک کے جسم پر ہاتھ رکھا

تو چونک گئیں۔ وہ سرد، اکڑا پڑا تھا۔ انھوں نے سانسیں چیک کیں تو وہ بھی نہیں آ رہی تھیں۔ انھوں نے گھبرا کر شفق اور آفاق کو مجبوراً شروع کر دیا۔

”اٹھو..... دیکھو، یہ مر گئی ہے۔“ دادی زور زور سے چیختی لگیں۔

”کون.....؟“ شفق بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

”ادھر دیکھو.....“ دادی نے فلک کو مجبوراً مگر وہ تو مہری نیند سو رہی تھی۔

”میں نے قسمیں کھا تھا کہ اکرم چاچا کو بلا لا تا ہوں۔ تم ہی نہیں مانیں اور اب فلک مر گئی ہے۔“ آفاق زور زور سے رونے لگا۔ دادی بھی

رورہی تھیں اکرم ان کی آوازیں سن کر مجھے بھاگتا ہوا آیا۔

”اکرم چاچا! پلیز پاپا کو بلاؤ..... پلیز، جلدی کرو۔“ شفق روتے ہوئے بولی۔

”ہاں..... ہاں، مجھے ان کا نمبر دو۔“ اکرم جلدی سے بولا۔

”اکرم چاچا..... ماما کو بھی فون کر دو۔“ آفاق آہستہ سے بولا۔

اکرم باہر نکل گیا منصور کے جتنے کونٹیکٹ نمبرز تھے، اس نے ملانے کی کوشش کی۔ مگر رابطہ نہ ہوسکا۔ شہلا کا تو کوئی نمبر ہی نہ تھا جس پر وہ رابطہ کرتا۔

کچھ لمحہ نہیں آ رہا تھا۔ بچے بے تابی سے ماما پاپا کو بلا رہے تھے۔ ہر آہٹ پر باہر دوڑ کر جاتے۔ اکرم شدید شش و پنج میں مبتلا تھا۔ کیا کرے، کسے بلائے؟

سید صاحب فجر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو خاندانی روایات کے مطابق حیدر سب سے پہلے ان کو سلام کرنے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ "حیدر! بہت دن ہوئے منصور اور شہلا کی کوئی خبر نہیں آئی۔ سب خیریت تو ہے نا۔ ان لوگوں کی طرف سے میں بہت پریشان رہتا ہوں۔" سید صاحب نے مشکرانہ انداز میں پوچھا۔ حیدر صبح سویرے کوئی ایسی بات بتا کر ان کو پریشان نہیں کرنا چاہ رہا تھا مگر اب خود سید صاحب پوچھ رہے تھے تو اسے بتانا ہی پڑا۔

"تایا ابا! منصور نے کسی ماڈل سے شادی کر لی ہے اور اب اپنی بیوی کے ساتھ ہے۔"

"بد بخت.....!" سید صاحب ایک دم غصے سے بولے۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا "اور شہلا کہاں ہے؟"

"وہ انگلینڈ میں ہے۔"

"کیا بچے بھی اس کے پاس ہیں؟"

"نہیں..... وہ اکیلی....."

"وہ اکیلی کس کے پاس ہے؟"

"اس نے منصور سے طلاق لے لی ہے اور اب.....؟" حیدر خاموش ہو گیا۔

"اب کیا.....؟" وہ چمکے۔

"اس نے کسی انگریز سے شادی کر لی ہے۔"

"کیا.....؟" سید صاحب جلال میں آ گئے۔ جہاں کھڑے تھے، وہیں بیٹھ گئے۔ ان کا جسم غصے سے کانپ رہا تھا اور وہ مرغ بھل کی طرح

تڑپ رہے تھے۔ حیدر اندازہ کر رہا تھا کہ وہ کس قدر اذیت میں تھے۔

"بد بخت..... نامراد..... ہذا ات....." وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہے تھے۔

"تایا ابا! آپ بیٹھ جائیں..... آپ کا بی بی ہائی ہو رہا ہے۔"

"حیدر! گاڑی نکالو، آج رات میں نے خواب میں اسکے بچوں کو بہت اذیت میں دیکھا ہے۔ نہ جانے کس حال میں ہوں گے۔ میں ان

کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ خدا خیر کرے۔" وہ پریشانی کے عالم میں کمرے کا چکر لگا رہے تھے۔

حیدر گاڑی نکالنے گیراج کی طرف جا رہا تھا کہ فون بج اٹھا۔

"کون..... کب..... کیسے....." وہ اہم ابھی پہنچ رہے ہیں۔ "اس نے فون بند کر دیا۔ سارا راستہ وہ خاموش رہا۔ سید صاحب اس کے

ساتھ بیٹھے بار بار پہلو بدل رہے تھے۔

"حیدر! کیا بات ہے..... تم کچھ پریشان لگ رہے ہو..... درنگاڑی چلاتے ہوئے تم ضرور کوئی نہ کوئی بات کرتے ہو، آج خاموش کیوں ہو؟"

"تایا ابا! آپ نے رات کو جو خواب دیکھا تھا، وہ پورا ہو گیا ہے۔"

”کیا مطلب.....؟“ وہ ایک دم چمکے۔

”اکرم کا فون آیا تھا۔ منصور کی چھوٹی بیٹی فلک رات کو فوت ہو گئی ہے۔“

”کیا..... اُف میرے خدایا.....! یہ لوگ کتنے ظالم ہیں!“ انھوں نے سر پیٹ کے ساتھ لگا دیا۔ حیدر کی آنکھوں میں بھی آنسو جم رہے تھے۔

”حیدر اتم ہمیں گنہگار نہ سمجھتا۔ ہم مجبور تھے..... ہم جانتے ہیں تم بھی اپنی زندگی سے خوش نہیں ہو۔ تمہاری بیوی تمہیں کچھ اہمیت نہیں

دیتی۔ اس کی دولت نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔ تم خوش ہو اور نہ ہی شہلا۔ نہ جانے اس نے کیوں اس انگریز سے شادی کر لی۔ درندہ دلی

نہ تھی۔ وہ ہمارا خون نہیں..... مگر پھر بھی ایک رشتہ تو رہا ہے..... اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اچھی بیٹی تھی، معلوم نہیں قدرت بھی کیسے کیسے

آزماتی ہے۔ تم اور شہلا، مجھے قطعی اس رشتے پر اعتراض نہ تھا۔ اگر تم سادات میں سے نہ ہوتے، ہمیں اپنی جانوں سے زیادہ اپنے آبا کی ناموس کی

پر دا ہے۔ میرا دل اندر ہی اندر کٹتا رہتا ہے۔“

”تایا! آپ پریشان نہ ہوا کریں۔ میں نے اس جذبے کو اپنے اندر سے ختم کر دیا ہے۔ زندگی کے دن پورے ہی تو کرنے ہیں۔“ حیدر

کے لہجے میں بلا کی شکستگی اور دکھ تھا۔

”خدا تمہیں اس کا اجر دے.....“ سید صاحب نے رقت بھرے لہجے میں اپنا لہزاں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا۔

میت لان میں تھی اور گھر کے چند ملازموں کے سوا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ دادی اس کے سر ہانے بیٹھی آہیں بھر رہی تھیں۔ شفق اور آفاق

سب سے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ جیسے ہی گاڑی پورچ میں داخل ہوئی، حیدر اور سید صاحب باہر نکلے تو بچے چیختے ہوئے ان کے ساتھ چمٹ گئے۔ وہ

اس شدت سے رو رہے تھے کہ درود پوار کانپ رہے تھے۔ سید صاحب اور حیدر ان کو گود میں اٹھا کر دلا سادے رہے تھے۔ سید صاحب اور حیدر نے

اس کی تدفین کا بندوبست کیا اور ان کا جگر گوشہ لحد میں اتار آئے جو دنیا میں اپنے اپنے وجود کے احساس اور محرم میں جھلا تھے۔

”حیدر! ہم بچوں کو ساتھ گاؤں لے جاتے ہیں.....“ سید صاحب نے رائے دی۔

”نہیں تاتا!..... پھر دادی لماں گھر میں اکیلی ہوں گی۔ وہ کس کے پاس رہیں گی؟ اگر وہ بھی سرگئیں تو.....“ شفق نے ایک دم کہا تو سید

صاحب چمک گئے۔

”ٹھیک ہے..... پھر میں ہی ادھر دو تین دن تک رک جاتا ہوں..... منصور کو خود اطلاع دو کہ وہ جلدی پہنچے۔ اب میں بچوں کو یوں تھا چھوڑ

کر نہیں جاسکتا۔“

”ٹھیک ہے تایا! میں شام کو چکر لگایا کروں گا۔“

”ٹھیک ہے..... اور بہنوں کو بھی اطلاع دینا۔ بچوں کو ان کی بہن رمدی کی بھی ضرورت ہے..... اور ہونکے تو طاہرہ کو بھی لے آنا۔“

”جی اچھا.....!“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

”شہلا! تم کہاں ہو؟ کس کا بدلہ کس سے لیا تم تو بہت جی تھی۔ پھر جموٹ کو کیسے بھول گیا۔ تم سید خاندان کی ساری روایات بھول گئیں۔ تم

نے پاکیزہ محبت کے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ تفلکس اور پاکیزگی کے مقابلے میں غلامت اور مہنگی کو قبول کیا۔ تم تو کہتی تھیں، حیدرا میں نے زندگی میں صرف تم سے محبت کی ہے۔ نہ اس سے پہلے کسی سے اور نہ اس کے بعد کسی اور سے کرسکوں گی تو پھر تم نے دیارِ غیر میں ایک اجنبی انگریز کو اپنے لیے منتخب کیوں کیا؟ کیا واقعی تم اس کی محبت میں اتنی دیوانی ہو گئی تھیں کہ اپنے بچوں کو بھی چھوڑ دیا۔ بچے تو تمہارے اپنے تھے۔ تم نے اپنے آپ کو اس حد تک گرا دیا کہ تم اتنی سنگ دل کیسے ہو سکتی ہو۔ تم نے حیدر کی ذات کی بھی نفی کر دی اور اپنی ذات کا بھی بھرم کھو دیا۔ تم نے بیٹی کو بھی مار دیا۔ اتنے سال خاموشی سے اذیتیں سہجے سہجے تم نے بلا غرایب فیصلہ کیوں کیا؟ کاش..... تم مجھے کبھی ملو تو ضرور تم سے پوچھوں کہ تمہاری ساری وقائیں کیوں ایک دم بدل گئیں؟ محبت کرنے والے تو فنا ہو جاتے ہیں مگر یوں جھا تو نہیں کرتے۔ مجھے تو اب کسی پر اعتبار نہیں رہا۔ میں تو آنکھیں بند کر کے تمہیں یاد کرتا تھا کہ طاہرہ نہ سہی، تم تو مجھ سے سچی محبت کرتی ہو۔ تم نے میری روح کو اپنے حصار میں قید کر رکھا تھا۔ میں تو اب بھی تمہارے سحر میں جتلا ہوں۔ طاہرہ کے لیے تو صرف جسم ہوں اور تمہارے لیے روح..... میرا دل و دماغ تو صرف تمہارا تھا۔ میری سوچوں پر تم حاوی تھی۔ تم نے مجھ سے بھی سب کچھ چھین لیا اور بچوں سے بھی۔ آج تمہارے بچے کیسے بلک رہے تھے..... تم بہت سنگ دل ہو۔ تمہارے وجود کے حصے تو یہاں ہیں اور تم کہاں سرگرداں ہو؟ تم ایسی نہیں ہو سکتی..... میں کیسے تمہارے کٹھور پن پر یقین کر لوں.....؟“

حیدر اپنے جھٹیل میں اس سے باتیں کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ ڈرائیونگ بھی کر رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس کے ساتھ بیٹھی ہو اور وہ اس سے باتیں کر رہا ہو مگر وہ مکمل خاموشی سے سب کچھ سن رہی ہو۔

”منصور آج تو بہت انجوائے کیا ہے۔“ شزا اور منصور نیا گرافال پر سارا دن انجوائے کر کے لوٹے تھے۔

”ہاں، واقعی..... قدرتی مناظر بہت لطف دیتے ہیں۔“

”منصور اب گھر کب چلیں گے؟“

”کیوں..... تمہارا دل بھر گیا ہے؟ اتنی خوبصورت اور حسین جگہوں پر گھومنے کے باوجود بھی تمہیں گھر کی یاد آ رہی ہے؟“ منصور نے

حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، گھر تو گھر ہی ہوتا ہے نا۔ اب تو میں اتنا گھوم چکی ہوں کہ اب کچھ آرام کرنا چاہتی ہوں اور اب میں اپنا گھریٹ کرنا چاہتی

ہوں۔“

”اگر تم اتنی اداس ہو رہی ہو تو کل ہی چلے چلتے ہیں۔“

”کل نہیں..... چند دنوں تک۔“

”کافی دن ہو گئے ہیں۔ بچوں سے بات نہیں ہوئی۔ ٹھہر، ذرا فون کرتا ہوں۔“ وہ نمبر ملانے لگا۔ مسلسل بیلز ہو رہی تھیں مگر کوئی فون نہیں

اٹھا رہا تھا۔ بہت دیر بعد اکرم نے فون اٹھایا۔

”ہاں اکرم! خیریت تو ہے نا..... بچے کہاں ہیں؟ کیا سید صاحب ادھر..... نہیں..... کیوں..... مائی گاڈ!..... میں پہنچ رہا ہوں۔“ اس نے

اکرم سے بات کر کے فون بند کیا تو آنسو اس کی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔

”منصور! خیریت تو ہے نا، آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟ پلیز..... بتائیں، کیا ہوا..... پولیس؟“ شزا مسلسل پوچھ رہی تھی مگر وہ روتا

جار رہا تھا۔

”فلک..... فلک مر گئی۔“

”اوہ..... گاڈ! کب..... کیسے.....؟“

”میری بچی قبر میں سو رہی ہے اور میں یہاں نیا گرافال.....“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گیا۔

”میں ابھی پکینگ کرتی ہوں۔ آپ سٹیشن کنفرم کروائیں۔ ہم جلدی ٹکٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ شزا نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی،

وہ نمبر ملانے لگا۔

”منصور! کیا آپ شہلا کو نہیں بتائیں گے، وہ بھی تو ماں ہے۔“

”نہیں، رہنے دو..... اس مردود کو..... یہ اسی ذلیل عورت کی کارستانی ہے۔ میری بچی اسی کی وجہ سے مر گئی۔“ اس کے لہجے میں نفرت ہی

نفرت تھی۔ غم اور غصہ بھی۔

”شہل! میں بہت دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ ادا ہو، کیا بات ہے؟“ پیٹر نے اسے گم صدمہ دیکھ کر پوچھا۔
 ”پیٹر! مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔ اگر ہمارا کوئی بے بی ہو جائے.....“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
 ”اوہ..... نو..... نیورا یور..... آئی ڈونٹ وائٹ یگ ہاسٹراڈ۔“

”کیا مطلب..... جو انسان کی سروائیول کا باعث بنے تم اس سے اکتائے ہوئے ہو؟“
 ”مجھے کوئی سروائیول نہیں چاہیے۔ جو انسان کی پرسنل لائف کو اسپائل کر کے رکھ دیں وہ کیا سروائیول کا باعث نہیں گئے؟ بچے تو دیکھن کو
 ہیلپ کرتے ہیں کہ وہ مین کو ایکسپلیمٹ کرے۔ ایوٹھی ایڈنٹاٹھلی..... آئی ہیٹ کڈز۔“ وہ اس کی بات سن کر بھڑک اٹھا۔
 ”تو کیا ساری عمر بونٹی.....؟“

”کیا فرق پڑتا ہے..... ویسے بھی تو بچے چھوڑ جاتے ہیں نا۔ کون سا آخری عمر میں ساتھ دیتے ہیں۔ میرے قادر نے گریڈ قادر کو چھوڑ دیا
 اور وہ اولڈ نرسنگ ہوم میں کب مر..... کے معلوم؟ اور میں نے اپنے قادر کو چند سال کی عمر میں چھوڑ دیا تو میرا بے بی تو مجھے دس سال کی عمر میں ہی
 چھوڑ دے گا تو کیا فائدہ.....“

”تو پھر یہ شادی..... یہ نہ ہی پابندی کیوں.....؟“
 ”شادی کا بچوں سے کیا تعلق.....؟“
 ”پیٹر..... میں تمہاری بات سمجھنے سے قاصر ہوں..... تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ ہمارے ہاں شادی تو بچوں کے لیے ہی کی جاتی ہے کیونکہ
 انہیں ہی تو انسان کی ایوولوشن اور سروائیول کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور تم اس حقیقت سے انکار کر رہے ہو۔“
 ”اسی لیے تم لوگ خوار ہوتے ہو۔ تم لوگوں کے گھر مرغی کے ڈربے ہوتے ہیں جو بچوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ تم لوگ اپنی ساری
 زندگیاں ان کے لیے برباد کر دیتے ہو اور پھر اسی طرح مر جاتے ہو۔ تم تو ان کی زندگیاں گزارتے ہو تمہاری اپنی زندگیاں کہاں گئیں..... آئی ہیٹ
 ج ڈیم لائف!“

”پیٹر! آئی ایم گونینگ نو ہیو یور بے بی.....!“ وہ آہستہ سے بولی۔
 ”وہاٹ نان سینس..... جسٹہ کل ہم..... کل ہم..... کل ہم۔“
 ”نہیں، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں خود اپنے ہاتھوں سے کیسا سے ماروں؟ نیورا یور.....“ وہ روتے ہوئے بولی۔
 ”شہل! اگر تمہیں کڈز اچھے پسند ہیں تو پھر اپنے بچوں کو کیوں چھوڑا؟ تم ان کے لیے اپنے ہسپتال کے پاس رہ سکتی تھیں۔“ پیٹر کی بات
 نے اس کی روح پر چابک مارا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اس کے منہ پر طمانچہ مارا ہو۔

تو کیا سب مرد ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو بچانے کے لیے دوسرے کی عزت کو کتنی آسانی سے داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ وہ ہمیشہ
 اس کو انڈی وچ جیٹل پیگ کہہ کر اسے اس کے رائٹس کے بارے میں یقین دلاتا رہتا تھا۔ اب ایسے ہی ایک انڈی وچ جیٹل کو مارنے کے درپے تھا۔ اب

تو اس کی ٹون ہی بدل گئی تھی۔

”تو پھر یہ یلیٹین شپ.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”اس میٹر آف ایموشنل ایڈجسٹمنٹس انجوائے منٹ۔“ وہ قدرے ڈھٹائی سے بولا۔

”پنیر اس کے علاوہ عورت کی مرد کے لیے کوئی اہمیت نہیں.....؟“

”نہیں..... اور ہونی بھی نہیں چاہیے..... اس کے علاوہ عورت اور کیا ہو سکتی ہے؟“

”اور وہ جو تقدس..... احترام، عقیدت، محبت..... در میری کے نام کرتے ہو، وہ سب کیا ہے؟“ اس کی آواز کپکپانے لگی۔

”They're just rituals“ وہ بے باکی سے بولا۔

”بس..... اور کوئی رشتہ نہیں؟“ شہلانے حیرت سے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔“

”پنیر اتم اتنے مختلف ہو، جو تم نظر آتے ہو؟“

”شعل! میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ اگر تم اس وقت بھی کڈز کی باتیں کرتی تب بھی میں یہی کہتا۔ میں تو اب بھی یہی کہہ رہا

ہوں۔ اے ویمن از لائیک اے مین۔ ٹھنک لیس، ٹھنک مور۔ اس کو بھی مرد کی طرح جینے کا حق ہے۔ زعمہ رہے، انجوائے کرے، گھوڑے پھرے۔ وہ

آزاد ہے اور اگر وہ یہ چاہتی ہے کہ مرد اس کی پوجا کرے تو یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ آدی کیوں ایسا کرے؟ اس میں کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ اگر مرد اپنی

ضرورت پوری کرتا ہے تو وہ بھی تو اپنی Desireا پوری کر رہی ہوتی ہے تو پھر ایسی کیا خاص بات ہے؟ آدی اس کو کیوں سر پر بٹھائے۔ شعل! میں

بے بی کو اون نہیں کر سکتا، اب میں جا رہا ہوں۔ بہتر ہے تم جلد کوئی فیصلہ کر لو.....“ وہ قطعیت سے بولا۔

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اسے اس کی قطعیت سے خوف سا آ گیا تھا۔ پنیر کو تو وہ بہت نازک احساسات کا مالک سمجھتی تھی۔ وہ بھی ایسا ہی نکلا تھا

جیسا مشرقی مرد۔ جو کہتا ہے، اب تمہارے بیٹی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر ہوئی تو اس کا بدلہ تم سے لیا جائے گا یا تو تمہیں گھر سے نکال دیا جائے گا یا پھر

اسے ختم کر دیا جائے گا۔ اور مغربی مرد کہہ رہا ہے اسے نہ بیٹا چاہیے اور نہ بیٹی۔ اس نے تو عورت کی حیثیت بالکل ہی مفر کر دی ہے۔ وہاں نئی روایتی

لہاوے میں ہوتی ہے اور یہاں نئے کلچر اور نئی ڈیمانڈز کے مطابق۔ لہاوہ کچھ تو اندر سے دونوں ایک سے ہیں، مشرقی و مغربی، شمالی و جنوبی۔ سب.....

گارے کے بت ہیں۔ اندر بھی تو خام ہی ہوں گے۔

اولاد آدم بھی کبھی بدل سکتی ہے۔ چاہے مرد ہو یا عورت۔ نہ مرثت نہ تقاضے، نہ روایات نہ اصول، نہ بندشیں، نہ رسم و رواج۔ تو وہ کس کو

بدلنے لگی تھی۔ اس نے کیسے مان لیا تھا کہ وہ اپنے وجود کی نئی شناخت حاصل کر پائے گی۔ اس نے جو کچھ کھو چا تھا وہ کچھ دیا تو نہ تھا۔ جو کچھ ماضی میں

حاصل کیا تھا اس پر تو اب مہر ثبت ہو گئی تھی۔ جتنا جتنا انسان حقیقت کو کھوجنے لگا ہے، اتنا اتنا مایوس ہوتا جاتا ہے۔ ٹھیکو فیملی کو اس کو اپنے حصار میں

مضبوطی سے جکڑنے لگتی ہیں۔ کیا فرق تھا قدیم پتھر کے انسانوں میں اور آج کے انسانوں میں، جن کے اندر آج بھی اسٹون ایج کے انسانوں جیسے

خفت دل ہیں یا پھر آئس ایج کے انسانوں میں۔ کیا آج کے لوگ وحشی درندے نہیں۔ فرق تو کہیں بھی نہیں۔ تو پھر یہ کیسی کھوج تھی، کیسی شناخت تھی۔ وہ کس کو تلاش کرنے لگی تھی۔

اپنے وجود کو، اس کی نسبت کو..... اب سب کچھ گنڈھور ہوا تھا۔ وہ تو اس دکھ کو مٹانے لگی تھی جو اس کو اندر ہی اندر کاٹا رہتا تھا۔ اس طمانچے کو مٹانے لگی تھی کہ وہ کس کی اولاد تھی۔ وہ تو صرف یہ ایکسپلور کرنے لگی تھی کہ وہ ایک ذمہ وجود ہے جسے کسی شناخت کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ اسے اپنے ماں باپ پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کس کے گناہوں کا پھل تھی جو ہر اسی نہیں ہو رہا تھا۔ گناہ کا پھل کتنا کڑوا، کیلا اور بدبودار ہوتا ہے، کاش کوئی اس سے پوچھے۔ وہ اندر سے کتنی سزا مند زدہ تھی۔ کیسی بدبودار..... کوئی اپنانے کو تیار نہ تھا۔ کاش میں مردہ ہی جنم لیتی اور مجھ میں کوئی شعور بیدار نہ ہوا ہوتا۔

”میں کیا کروں؟ میں کیسی دھکاری ہوئی ہوں۔ پوری کائنات سے دھکاری ہوئی۔ مشرق سے بھی اور مغرب سے بھی۔“ اسے شفق، آفاق اور لک شمدت سے یاد آنے لگے۔ نہ جانے کیوں اسے فلک یاد آ رہی تھی۔ وہ رخصت ہوتے ہوئے کتنا تڑپ رہی تھی۔ کتنا رو رہی تھی۔ شفق کتنی ناراض تھی اور آفاق کیسے منہ بسور رہا تھا۔ مگر اس نے بھی سب کو دھکار دیا تھا۔ منصور نے تو بچوں کو اس سے بدظن کر دیا تھا کہ وہ دوسری شادی کرنے جا رہی ہے۔ ان کو کیا معلوم کہ وہ زندگی کے کس عذاب سے گزر رہی تھی۔ وہ تو کچھ اور ہی تلاش کرنے لگی تھی۔ جس کا ملنا اب شاید ناممکن تھا۔ اس نے شدید غصہ کا سودا کیا تھا۔ جن کو آج اس نے دھکارا تھا، کل وہ ضرور اسے قدموں تلے روندیں گے۔ اس کے پاس تو اپنا کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ نہ نام نہاد گھر، نہ شوہر، نہ بچے نہ کوئی پہچان۔ نہ وہ ماں بن سکی تھی، نہ بیوی اور نہ ہی کسی کی دوست۔ تھ ہے ایسی زندگی پر جس میں کسی سے کوئی رشتہ نہ بن سکے۔ کوئی تو اپنا ہونا چاہیے۔ کوئی ایک تو بھری کائنات میں ہو، کوئی تو تنہائی کے لمحوں میں سرگوشی کر سکے۔ ”پتیر، میں تمہارے بچے کو ضرور جہنم دوں گی۔ چاہے تم مجھے چھوڑ ہی دو۔“ مستقبل کے لیے کچھ تو ڈپازٹ کروانا چاہیے۔ اس نے اسے چھوڑنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ پتیر نے کچھ بھی نہیں کہا بلکہ بہت سکون سے اسے طلاق دے دی۔ ایک دفعہ بھی نہیں روکا۔ جیسے یہ اس کے لیے نارمل روٹین تھی۔ شادیاں اور طلاقیں۔ تینسی اور سوسن اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئیں۔



آدھے گھنٹے سے زیادہ گزر چکا تھا اور وہ جتانی سے کالج کے باہر گاڑی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس کا منہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسے بار بار سہیل پر غصہ آ رہا تھا لیکن وہ ایسا بے پروا تو کبھی بھی نہ تھا۔ وہ تو ہمیشہ ناٹم سے پہلے کالج گیٹ پر موجود ہوتا تھا تو پھر آج کیا ہوا تھا؟ وہ ابھی سہیل کے ہارے میں سوچ رہی تھی کہ سہیل نے ایک دم اس کے پاس آ کر بیک لگائی۔ بیک کی تیز آواز نے وہاں موجود سب لوگوں کو چوٹا دیا۔ سہیل نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور جلدی سے باہر نکل کر گاڑی کا فرنٹ ڈور اس کے لیے کھولا۔ وہ دھڑام سے بیک سمیت بیٹھ گئی۔

”آئی ایم سوری..... ٹریفک جام تھی اور ملک صاحب کو اچانک میننگ میں جانا پڑا اس لیے دیر ہو گئی۔“ سہیل نے وضاحت کی۔

وہ منہ پھیلانے لگی تھی اور کار سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

”چلو اب موڑ ٹھیک کر لو۔ کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے۔“ وہ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”گاڑی میں کتنی اسمبل ہے۔ اے سی کام نہیں کر رہا۔ کتنا بھس ہے؟“ وہ آگے بڑھ کر بولی۔

سہیل نے جلدی سے اتر فریڈر اسٹر اپرے کیا۔ جسمین کی سونڈھی سونڈھی خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ شفق کے لمبوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ تازگی کا خوبصورت سا احساس اس کے دگ وپے میں سرایت کر گیا۔ اس نے گاڑی میں سے اے دیکھا۔ سہیل بھی مسکرا رہا تھا۔ اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

”ایکسپلاٹ کرنا خوب آتا ہے۔“ وہ ذریعہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”اور جو اپنی خوشی سے ایکسپلاٹ ہوں تو.....؟“ وہ بھی خورا بولا۔ ”شفق اچھیں معلوم ہے، آج پنی سی میں پارٹی ور کر دی میننگ ہے اور تمہارے پاپا پارٹی کے لیڈر منتخب ہو رہے ہیں۔“ سہیل پر جوش لہجے میں بولا۔

”ہونہہ..... جو گھر کوٹہ سنبھال سکا، وہ ملک کو کیا سنبھالے گا۔“ اس کے لہجے میں شدید نفرت تھی۔

”تمہیں تو ہر دوسرے بندے سے بس شکوے، شکایتیں ہی ہیں اور کچھ نہیں۔“ سہیل نے کہا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیونکہ یہاں ہر شخص بس دوسرے کو ایکسپلاٹ ہی تو کر رہا ہے۔ ہر ایک مفاد پرست اور سٹالٹش ہے۔ بس اپنی ذات اور انا کی تسکین

چاہتا ہے۔ ہر کسی کو بس اپنی ہی خوشیاں عزیز ہیں۔ وہ اپنی خوشیاں چاہتا ہے۔ کسی دوسرے کی کسی کو پروا نہیں۔“ وہ غصے میں بولتی گئی۔

”میرا خیال ہے آج واقعی شدید گرمی ہے اور کچھ تمہارے دماغ کو بھی چڑھ گئی ہے۔ گنے کا ٹھنڈا رس پیو گی؟“ سہیل نے جوس کارنر کے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

سامنے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

”نہیں!“ وہ منہ پھلا کر بولی۔

”خدا کے لیے یوں ناراض ہونا چھوڑ دو اور پھر کھانے پینے سے کیسی ناراضگی۔ ویسے بھی تم اکیلی جان کس کس کو ٹھیک کرو گی۔ رہنے دو جس

حال میں ہے۔ اپنی جان کیوں ہلکان کرتی ہو۔ اب بتاؤ جوس پینا ہے کونسی ورنہ چلیں؟“ سہیل نے آہستہ سے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔

”لے آؤ.....“ وہ آہستہ سے بولی۔

”یہ ہوئی نا بات.....“ وہ دو گلاس جوس کے لے آیا۔ ٹھنڈا غج جوس پی کر اس کا موڈ قدرے بہتر ہو گیا۔

”کیا کالج میں آج کسی سے لڑائی ہوئی ہے۔“ سہیل نے اس کا موڈ بہتر دیکھ کر چھینڑنا چاہا۔

”ہاں..... تم سے.....“ وہ مصنوعی غصے سے بولی۔

”مجھ سے تو تم ہر وقت لڑتی رہتی ہو۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔“ سہیل نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

گھر قریب آ رہا تھا۔ اس لیے سہیل نے خود بخود گاڑی روکی اور وہ دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ سہیل نے مراد اس پر سیٹ کیا۔ یہی

ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ شفق کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر سہیل کو ملک منصور کی ڈانٹ ڈپٹ کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جب کبھی دوا سے شفق کے ساتھ

ڈرائیونگ کرتے ہوئے دیکھتے تھے۔

”سہیل، کیا شام کو فارغ ہو؟“ اس نے گاڑی سے اترتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں؟“

”مجھے کہیں جانا ہے۔“

”نہیں..... بتا پتا تو ہے ملک صاحب کی میٹنگ ہے اور میں وہاں ہی ہوں۔“

”کل چلیں گے..... اوکے، خدا حافظ!“ وہ کہہ کر مڑی تھی کہ سزا جلدی سے ہا ہرنگی۔ وہ اس سے ٹکرانے ہی لگی تھی۔ شفق نے مگھور کر اسے

دیکھا اور وہ سواری کبھی ہوئی سہیل کی طرف مڑی۔

”سہیل! مجھے بہت جلدی ہے۔ مجھے میرے آفس ڈراپ کر دو۔“ وہ جلدی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”جی جیکم صاحب!“ وہ گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔

شفق اندر داخل ہوئی تو ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ مکمل ڈسنے والی خاموشی۔ اتنی وسیع و عریض کوفی کے خوبصورت کمروں اور برآمدوں میں ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی اور امپورٹینڈ شے رکھی تھی مگر بہت کچھ سب کے لیے بے معنی تھا۔ سب اپنے آپ کو ایک بے جان شے سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی اور بستر پر لیٹ گئی۔ کب تک سوتی رہی، کب آنکھ کھلی، اسے کچھ خبر نہ تھی۔ گھر میں کون آتا تھا، کون نہیں؟ کسے خبر تھی۔ گھر تھا یا سرائے؟ ہر کوئی ایک دوسرے کی ذات سے بے خبر تھا۔ ہر کوئی اپنی اپنی مرضی کا مالک تھا۔ کوئی کسی کے دکھ سکھ اور کسی بھی معاملے میں دخل نہیں دیتا تھا۔ صرف شفق اور آفاق آپس میں ایک دوسرے کی لپٹوں میں کبھی شہر کرتے تھے۔ ملک کی وفات کے بعد دونوں سزا سے شدید نفرت کرتے تھے اور ملک منصور سے تو کوئی بھی ڈھنگ سے بات نہیں کرتا تھا۔ سزا نے شادی کے بعد ماڈلنگ چھوڑ کر ایک این جی او جوائن کر رکھی تھی۔ اکثر فارن ڈیپلیمیشن کے ساتھ مصروف رہتی۔ سزا سے منصور کے دو بچے تھے اور وہ دونوں مری کونونٹ پر پرنٹیشن میں پڑھتے تھے۔ اس لیے وہ بچوں کے مینجمنٹ سے مکمل آزاد تھی۔ ملک منصور نے سزا سے جو وعدے، اقرار سوئزر لینڈ میں کیے تھے وہ چند ماہ بعد ہی ہوا ہو گئے۔ ہر چند ماہ بعد نئے نئے اسکینڈلز سننے میں آتے۔ کبھی کسی سیکرٹری کے ساتھ۔ کبھی کسی ماڈل اور ایکٹریس کے ساتھ۔ سزا بھی لب ان باتوں کی عادی ہو گئی تھی۔ وہ بھی اسے کچھ نہ کہتی۔ اس نے بھی اپنے لیے ایسی بہت سی مصروفیات ڈھونڈ لی تھیں۔ آفاق کہاں گم رہتا، کسے خبر تھی۔ وہ سزا کو سخت ناپسند کرتا تھا مگر باپ اس کے لیے بالکل ہی ناقابل برداشت تھا۔ ملک منصور کروڑوں کی جائیداد کا مالک نامور سیاسی شخصیت اولاد کے معاملے میں بالکل جی دست تھا۔

پارٹی میٹنگ میں اسے پارٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ آئندہ انتخابات میں اس کی جیت اور فٹنری کفرم تھی۔ اس لیے اس کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ رات کو دیر سے آیا تو یہ خبر سنائی۔ آفاق اٹھ کر اندر چلا آیا۔ شفق نے بھی ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ صرف سزا خوش ہوئی کیونکہ اس کی ذات اور مفاد سب کچھ منصور سے وابستہ تھا۔

”تم اٹھ کر کیوں آ گئے؟“ شفق آفاق کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔

”تو اور کیا کرتا..... ان کی منافقت پر خوش ہوتا۔ ہمارا باپ کتنا کمینہ شخص ہے۔ شاید پارٹی ورکرز کو معلوم نہیں۔ کیا ایسا شخص دوسروں کے بارے میں ہمدردی سے سوچ سکتا ہے؟ جسے معلوم ہی نہیں کہ انسانیت کیا ہوتی ہے۔ جس کی اولاد سسک سسک کر مر گئی اور وہ پیش کرتا رہا۔ آئی بیٹ بچے فادر.....“ وہ غصے سے کمرے کی چیزوں کو ٹھوکریں مارتا ہوا بولا۔

”اچھا چھوڑو، اس بات کو..... تم یہ بتاؤ، تم سارا سارا دن کہاں گھومتے رہتے ہو۔ کل رات کو بھی لیٹ آئے اور آج سارا دن تم گھر نہیں آئے۔“ شفیق نے اس کا موڈ دیکھ کر بات بدلنا چاہی۔

”شفیق یہ گھر مجھے کائنات کو دوڑاتا ہے..... یہ کمرہ، یہ دروازے، سب کچھ۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں کہیں دور چلا جاؤں اور پھر کبھی واپس نہ آؤں لیکن یہی سوچ کر پھر رک جاتا ہوں کہ اس گھر کے دروازے تو ہماری تنہائیوں کے ساتھی رہے ہیں اور کون تھا اس وقت..... شفیق، تمہیں وہ رات یاد ہے، وہ ترپٹا..... چیختا..... چلاتا..... میرے کانوں میں ابھی تک سب کچھ گونجتا ہے۔ لٹک کارونا..... اور ہمارا بے بسی سے ادھر ادھر دے کے لیے دوڑتا۔ دل چاہتا ہے فوراً کہیں بھاگ جاؤں۔“ وہ آہ بھر کر بولا۔

”مجھے چھوڑ کر..... بالکل تنہا..... کس کے سہارے؟“ شفیق نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”یہی بات تو مجھے یہاں سے جانے نہیں دیتی.....“ وہ نہ کب کا جا چکا ہوتا۔“

”مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے تم اپنی اسٹینڈیز میں سیریس نہیں، کیا بات ہے..... کہیں تمہارا بھی تو سیاست جو ان کرنے کا ارادہ نہیں؟“ اس نے ذرا موڈ بدلنے کی کوشش کی۔

”اوہ نو..... آئی جسٹ بیٹ پولیٹکس۔ شفیق، میرا کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا..... میرے اندر آہستہ آہستہ تلخی اور اداسی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے یہ سوچ بہت دلاتی ہے کہ اس دنیا میں ہمارا کوئی بھی نہیں، نہ ماں نہ باپ۔“ وہ دکھ سے بولا۔

”کیوں نہیں..... نانا، بابا اور حیدر بالکل تو ہمارے اپنے ہیں نا!“

”ہاں وہ غیر ہو کر بھی کتنے اپنے اپنے سے لگتے ہیں اور اپنے بالکل غیر۔ مگر انھوں نے بھی تو ہمیں کب کا چھوڑ دیا ہے۔ وہ بھی پاپا کی جہ سے.....“

”اچھا ان باتوں کو چھوڑو اور اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دو۔“

”شفیق، میرا دل پڑھائی میں بالکل نہیں لگتا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ بس کسی روز کسی کا میرے ہاتھوں تل ہو جائے گا۔“

”خدا کے لیے آفاق! ایسی باتیں مت کرو۔ اگر تم نے کچھ ایسا کیا تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔ میں بھی بہت کمزور ہو چکی ہوں۔“ وہ روہاسی ہو کر بولی۔

”چھوڑو، ان باتوں کو..... اب تم جاؤ۔ میں سونا چاہتا ہوں۔“ وہ کمرے کی لائٹ آف کرتے ہوئے بولا اور اسے چارونا چارٹھنا پڑا۔

اگلے دن وہ دیر تک سوتا رہا۔ ناشتا بھی کمرے میں کیا اور کپیوٹر پر سی ڈی لگا کر دیکھنے لگا۔ جب نرسین صفائی کرنے کے لیے اس کے کمرے میں آئی، وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھتا رہا۔ نرسین مائی بابا کی بیٹی تھی اور پیچھے کوارٹر میں اکرم کی جگہ رہتی تھی۔ اکرم اب زمینوں کی دیکھ بھال

کے لیے گاؤں چلا گیا تھا۔ کبھی کبھار شہر آتا۔ نسرین اپنے دو چھوٹے بہن بھائیوں اور ماں باپ کے ساتھ کوارٹر میں رہتی۔ نسرین جیڑ طراری، لٹش پش کرتی، ناز و نخرے سے چلتی تو ہر دیکھنے والا ایک بار ضرور مسکرا کر دیکھتا۔

”صاحب جی! آپ ذرا ہا ہر چلے جائیں، میں صفائی تو کر لوں۔“ وہ بڑی ادا سے جھاڑن ہلاتے ہوئے بولا۔

”کر لو صفائی..... میں تمہیں کیا کہہ رہا ہوں۔“

”آپ کے یہاں ہوتے ہوئے صفائی لھیک طرح سے نہیں ہوتی۔“

”کیوں... اور ویسے بھی کیا کرنا ہے اتنی صفائی کا؟“ وہ خاموشی سے آہستہ آہستہ شنگ کرنے لگی۔

”نسرین! تم میرے ساتھ یورپ کی سیر کو چلو گی؟“ وہ ایک دم بولا۔

”کیوں جی، خیریت تو ہے نا..... اور کس لیے؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”سیر کس لیے کرتے ہیں..... ظاہر ہے، دل خوش کرنے کے لیے۔“

”پر میرا دل تو یہاں ہی بڑا راضی ہے۔ اماں بے گندہ ہے..... نیلو ہے۔ میں ان کے ساتھ کھیلتی ہوں۔ بڑا عروہ آتا ہے۔ میں وہاں جا کر

کیا کروں گی؟“

”اچھی طرح سوچ لو؟“

”سوچ لیا.....“ وہ معصوم ارادے سے بولی۔

”اچھا ایک بات بتاؤ۔ اگر تمہاری شادی ہو جاتی ہے اور پھر تمہارے تین بچے ہو جاتے ہیں تو کیا تم ان کو چھوڑ کر دوسری شادی کر لو گی؟“

”نہ جی..... تو بہ استغفار..... اللہ معاف کرے..... مجھے کیڑے پڑیں جی، میں کیوں ایسا کروں گی۔ تو بہ استغفار!“ وہ کانوں کو ہاتھ

لگاتے ہوئے بولی۔

”اگر کوئی تمہیں بہت امیر کبیر، پیسے والا آ دی مل جائے تو؟“

”کبھی بھی نہیں، میرا دماغ خراب ہے۔“

”اور اگر تمہارا پہلا شوہرا چھانہ ہوا تو۔“

”پھر بھی نہیں جی!“

”کیوں؟“

”اپنے تین بچوں کے لیے..... ان بے چاروں کا کیا قصور..... ان کو کس کے آ سرے پر چھوڑ دوں گی..... نہ جی، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔“

”تم کرو گی..... اور ضرور کرو گی۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم بچوں کو بھی چھوڑ دو گی اور گھر کو بھی.....“ وہ آہستہ آہستہ فیسے میں آ رہا تھا۔

”میں کبھی بھی ایسا نہیں کروں گی۔“ وہ بھی بھندھتی۔

”تم ضرور ایسا کرو گی تم عورتیں ہوتی ہی مکار ہو۔“ اس نے دو تین چھڑا سے لگا دیے۔ اس نے جو چلانا شروع کیا، خدا کی پناہ!

”چپ رہو، آواز مت نکالنا ورنہ.....“ اس نے جیب سے ریوا لور نکال کر اسے دکھایا۔ وہ ڈر کر خاموش ہو گئی اور جلدی سے باہر کی طرف بھاگی۔ اور وہ اس کی اس حرکت پر کتنی ہی دیر ہستار ہا اور انجوائے کرتا رہا۔ اسے یوں ڈرا دمکا کر جو لطف آیا تھا وہ پہلے کبھی نہیں آیا تھا پھر اگلے ہی لمحے وہ افسردہ ہو گیا۔ ایک ان پڑھ، جاہل، گنوار سی لڑکی اپنے بچوں کو کبھی نہیں چھوڑ سکتی، شوہر کو چھوڑ سکتی ہے مگر بچوں کو نہیں اور وہ تعلیم یافتہ، کلچرڈ عورت، ساری اخلاقیات بھول گئی، اس نے ہمیں یوں چھوڑ دیا جیسے ہم انسان کے نہیں، جانور کے بچے ہوں۔

”یا خدایا! حیرت اس دنیا میں مجھوں کا اتنا فقدان کیوں ہے؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”آفاق اتم نے نسرین کو کیا کہا ہے؟“ شفق قدرے غصے میں اس کے کمرے میں آ کر بولی۔

”کچھ نہیں..... کچھ بھی تو نہیں.....“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”وہ رو کیوں رہی ہے؟“

”مجھے کیا معلوم..... بلاؤ اسے میرے سامنے!“

”نسرین! اندر آؤ۔“ شفق اسے اندر بلاتی رہی مگر وہ نہ آئی۔

”میں نے تمہیں کیا کہا ہے..... بولو؟“ وہ خود ہی اس کے سامنے گیا تو وہ سہم سی گئی۔

”کچھ نہیں.....“ وہ ڈرتے ہوئے بولی۔

”آفاق اتم اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ ورنہ میں تمہیں ٹھیک کر دوں گی۔“ شفق غصے سے بولی۔

”تم..... اور مجھے..... ویسے بھی عورت کسی کو کیا ٹھیک کر سکتی ہے۔ وہ تو صرف تباہ و برباد کرتی ہے۔“

”وہاٹ ڈو یو مین.....“ شفق کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

”کچھ نہیں، میں بحث کے موڈ میں نہیں۔“ اس نے پانچ سو کا نوٹ جیب سے نکال کر نسرین کی طرف پھینکا..... ”بند کر دیو نا دھونا“ وہ

دھمکی دیتا ہوا باہر نکل گیا اور شفق حیرت سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ یہ لڑکا کتنا بگڑ چکا ہے، اس نے دل میں سوچا۔

”نسرین اب آئندہ تم اس کے کمرے میں کبھی مت جانا..... اور یہ پیسے رکھ لو۔ سوٹ سلوا لیتا۔“ شفق نے اسے دلا سا دیا۔

سوٹ کے نام پر وہ اندر ہی اندر خوش ہو گئی اور نوٹ دوپٹے کے پلو میں باندھ لیا۔



”شفق! تمہارے پاپا کے تو وارے نیارے ہو گئے ہیں اور تم بھی.....“ سہیل اسے کالج چھوڑنے جا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ راستے میں اسے

ملک منصور کی ساری باتیں بتاتا کرتا تھا۔ سہیل کو پچھلے پانچ سالوں سے ملک منصور نے پرسنل ڈرائیور رکھا تھا۔ بی اے میں تھا جب اسے باپ کی بیماری

کی وجہ سے تعلیم چھوڑنا پڑی۔ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خوبصورت، اسٹارٹ نو جوان تھا۔ ہمیشہ ویل ڈریسڈ رہتا۔ مہنگے پرفیوٹر لگاتا۔ جب

کالج کے سامنے کھڑا ہوتا تو کسی ریکس زادے سے کم نہ لگتا۔ لڑکیاں اکثر اس کو دیکھ کر سرگوشیاں کرتیں اور جب معلوم ہوتا کہ وہ شفق کا ڈرائیور ہے تو

سب پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹنے لگتے۔ سہیل شفق میں گہری دلچسپی لیتا تھا اور یہ دلچسپی آہستہ آہستہ محبت کی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ شفق کو بھی وہ

اچھا لگتا تھا۔ اس لیے اس کی کڑوی کیلی باتوں پر جہاں ناراض ہوتی، وہاں مسکرا بھی دیتی۔

”شفق! تم نے پوچھا نہیں کہ میں کیا بات کر رہا تھا؟“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں..... سہیل! تمہیں معلوم ہے کہ مجھے پاپا اور ان کی ایکٹیو ڈیشیز سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے ان کی باتیں مت

سنایا کرو۔“

”آخر تم اپنے پاپا سے اتنی اکڑی اکڑی کیوں رہتی ہو؟“

”تم سے مطلب.....؟“ وہ قدرے درشتی سے بولی۔

”اف تو یہ..... کس چیز کا ناشتا کیا ہے، ایف 16 بنی ہوئی ہو۔“

”اچھا تم مجھ سے ان کے بارے میں کوئی بات نہ کیا کرو۔“

”تو پھر کیسی باتیں کروں؟“

”مجھے نہیں معلوم.....“ وہ منہ پھلا کر بولی۔

”یقیناً تم میٹھی میٹھی، روٹیک، باتیں سننا چاہتی ہو..... اچھا ٹھہرو، میں نے ایک نئی کیسٹ خریدی ہے۔ بہت روٹیک سونگز ہیں.....“ اس

نے کیسٹ آن کی۔ اتنا فاسٹ میوزک کہ خدا کی پناہ..... اس کی ہنسی نکل گئی۔

”تم ہنستی ہوئی اتنی اچھی لگتی ہو..... کیوں ہر وقت فحشے میں رہتی ہو؟“ سہیل نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”سہیل! میرے اندر صرف نفرت، غم، غصہ اور دکھ ہی دکھ ہے۔ جو ہر وقت لاوے کی طرح اہلکار ہوتا ہے۔ میں اپنے اندر جہنم لینے والے

مثنیٰ جذبیوں سے لڑ کر تھک گئی ہوں۔ اب سکون چاہتی ہوں مگر سکون کہیں نہیں..... کیا کروں، غصہ نہ کروں تو کیا کروں؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو

تیرنے لگے اور اس کی آواز میں شدید دکھ سے کپکپاہٹ سی پیدا ہو گئی۔

”تم اپنا ہر دکھ مجھے کیوں نہیں دے دیتی؟“ سہیل نے محبت سے اس کے ہاتھ کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

”کچھ غم صرف انسان کے اپنے ہوتے ہیں۔ وہ نہ تو کسی کے ساتھ شیئر کیے جاسکتے ہیں اور نہ ہی دیے جاسکتے ہیں۔ وہ تو ازل سے انسان

کی رگوں میں گردش کرتے لہو کی مانند سفر کرتے رہتے ہیں۔ ہر سانس جب آہ بھر کر نکلتی ہے تو وہ ایسے ہی فموں کا دھواں ہوتا ہے۔ شاید ایسے غم انسان

کی پیدائش پر ہی اسے خدا کی طرف سے امانت کی صورت میں ملتے ہیں جن کو وہ زمانے کی ہوا سے بھی بچا کر اندر ہی اندر سنبھال کر رکھتا ہے..... کیسی

مجیب بات ہے نا.....“ دو موٹے موٹے آنسو اس کے رخساروں پر پھسل گئے۔ کالج آچکا تھا سہیل نے بریک لگائی۔ اس نے نشو سے آنسو صاف

کیے اور باہر نکل گئی۔

”سنو شفق! تمہارے اندر جتنا بھی دکھ، غصہ ہے، ان سب سمیت تم مجھے عزیز از جان ہو۔ آئی ریٹل لو یو۔“ سہیل کی آواز میں محبت کی

سچائی تھی۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے باہر نکل گئی۔

راہ چلتی لڑکیوں کو تنگ کرنے میں اسے ہمیشہ لطف آتا۔ ہر روز کبھی کسی لڑکی کے پیچھے ہو لیتا تو کبھی کسی اور کے پیچھے۔ ان کے بالکل قریب جا کر زور سے ہارن بجاتا اور جب وہ خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگتیں تو ان کے سب سے چہرے کو دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوتی۔ وہ تیزی سے ان کے پاس سے گزر جاتا۔ انھیں یوں تنگ کر کے اسے بہت مزہ آتا۔ پھر کھلکھلا کر ہنستا رہتا۔ آج وہ مسلسل ایک فقیرنی کے پیچھے پڑا تھا۔ اس کے قریب جا کر زور سے ہارن بجاتا۔ وہ کندے سندے کپڑوں میں ملبوس کالے رنگ کا پھنپھناتا، بھاری سا تھیلہ اٹھائے ہوئے تھی۔ جس میں اس نے نہ جانے کیا گندمند اور مٹن کے ڈبے باندھے کر رکھے تھے۔ کبھی ایک کندھے سے اتارتی تو دوسرے پر رکھتی۔ اسے اس لڑکے کے پیچھے نہیں لگ رہے تھے۔ کبھی سڑک کے ایک کنارے کی طرف چلتی تو کبھی ایک دم دوسری جانب ہو جاتی۔ مگر وہ ہانپتے آ رہا تھا۔ تنگ آ کر وہ سڑک پر تن کر کھڑی ہو گئی۔ وہ غصے میں پھری شیرنی کی طرح اس کی طرف آئی۔ آفاق کی آنکھوں میں شرارت تھی اور لبوں پر شریری مسکراہٹ۔

”اوتے باؤ اڈو راہا ہر تو نکل ا“ اس نے جی کڑا کر کے کہا۔ آفاق اس کی بات سن کر ایک دم چوٹا اور باہر نکل آیا۔

”کیا تکلیف ہے تجھے۔ کیوں میرے پیچھے آ رہا ہے؟“ وہ غصے سے بولی۔

”میں نے تجھے کیا کہا ہے، میں تو اپنے راستے پر جا رہا ہوں۔“

”بنو مت..... یہ کبھی بہتی کا راستہ تیرے باپ کے محل کو نہیں جاتا۔ تو کس کو پاگل بنا رہا ہے۔ اگر تیرا دماغ ٹھیک نہیں تو ٹھیک کر دوں؟“ وہ

غصے سے بولی۔

”زیادہ بک بک مت کر.....“ وہ بھی غصے سے بولا۔

”ورنہ.....“ اس نے جی کڑا کر کے پوچھا اس نے تڑاخ سے تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ وہ حیرت سے اپنا گال سہلانے لگی پھر جواب اس نے

بھی ویسا ہی زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ آفاق کو قطعی امید نہ تھی۔ وہ تو لڑکیوں کو تنگ کر کے خوش ہونے کا عادی تھا اور اب جو اینٹ کا جواب پتھر سے ملتا تو تھلا اٹھا۔

”اب آتا میرے پیچھے..... حیرتی ہڈیاں کتوں کے آگے ڈال دینا تو مشکل نام نہیں میرا۔ ستا تو نے.....!“ وہ دانت کچکچا کر بولی۔

”دیکھ لوں گا.....“ اس نے گاڑی واپس موڑی۔ وہ ابھی تک اپنا گال سہلا رہا تھا۔ وہ تو اپنی ذات کے گھمنڈ میں جلتا تھا۔ اس عام سی

فقیرنی نے اس کو کیسے تڑاخ سے تھپڑ مارا تھا۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ جیسے آتش فشاں پھٹ چکا ہو اور لاوا اپنے کو بس راستہ تلاش کر رہا ہو۔ اس کا بدن

جل رہا تھا۔ وہ ساری رات نہیں سو سکا۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ سخت ذہنی اذیت میں جلتا تھا۔ اذیت پسند

فحش جب خود اذیت میں ہوتا ہے تو کتنا تھلا تا ہے۔ وہ اب محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ساری زندگی ایسے تھپڑ لگانا چاہتا تھا

کہ اس کی روح تک چھلتی ہو جائے اور ساری زندگی ایسے تھپڑوں کی جگہ محسوس کرتی رہے پھر وہ بہت کچھ سوچتا رہا۔ مگر سو نہ سکا۔



سہیل اسے لینے آیا تھا۔ شام کا لکھا اندھیرا بھل رہا تھا۔

”اب بولو، کہاں جانا ہے؟“

”زویا کی طرف.....“

”وہ جو تمہاری بھڑی ہوئی کھلی ہے؟ اس کی طرف مت چلنا کرو۔“

”تم سے مطلب.....؟“

”کیوں، مجھے کیوں نہیں..... میرا سب کچھ تو اب تم ہی ہو۔“

”اچھا..... بار بار مت بتلایا کرو۔ مجھے ایسے پوزیشن لوگ بالکل پسند نہیں۔“ وہ اکتاہٹ سے بولی۔

”شفق تم ایک نامور سیاست دان کی بیٹی ہو اور پولیس تمہارے پیچھے ہے۔ تم جو چاہو کرو، یہ اب ممکن نہیں رہا۔“ اس نے سمجھانے کی سعی کی۔

”مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں اور سنو میرا ہٹا وجود ہے۔ میری اپنی ذات اور شخصیت ہے۔ پایا کی ذات اور ان کی حیثیت میرے لیے قطعی اہم

نہیں۔“ وہ غلغلے سے بولی۔

”اچھا، ویسے تمہیں ادھر کیا کام ہے؟“

”ہے نا کچھ۔“

”شفق! وہ اچھی لڑکی نہیں۔“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksf

”کیوں، تم کیسے جانتے ہو؟“ اس نے ٹھک کر پوچھا۔

”ہں، میں جانتا ہوں نا..... اسی لیے کہہ رہا ہوں۔“

”تم مردوں کا کیا ہے، جو منہ نہ لگائے اس کو کہہ دیا اچھی لڑکی نہیں۔ تمہارا لوگوں کو جانچنے کا بیٹا نہ اور ہے اور میرا کچھ اور.....“

”شفق! تم کیوں ہر بات کو الٹا رنگ دیتی ہو؟“

”تم بھی مجھ سے ایسی باتیں مت کیا کرو۔“

”اچھا بابا، نہیں کرتا.....“ وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔

”جب تم سر نہ رکرتے ہوتا تو دنیا کے سب سے اچھے اور عظیم انسان کہتے ہو۔“ وہ خود ہی کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

”چلو تم کسی طرح تو خوش ہوتی ہو، چاہے کسی کی انا کو کچل کر ہی۔“ سہیل نے مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا اور اسے زویا کے عظیم

الشان گھر کے سامنے ڈراپ کیا۔ وہ رات آٹھ بجے آنے کا کہہ کر اندر چلی گئی۔

زویا، سہیل کو بہت نا پسند تھی۔ وہ ایک دردناک شفق کے گھر آئی تھی مگر اس کی حرکتیں اور فیشن ایسا بے ہودہ ہوتا تھا کہ اسے دیکھ کر اسے

کراہت سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ کسی کو آتے جاتے، چلتے پھرتے نہ دیکھا۔ عجیب سا بڑا سرا رنل نما گھر تھا۔ شفق زویا میں کیونکر

انٹرنیڈ تھی، رات آٹھ بجے تک وہ کیا کرے گی؟ وہ سوچتا ہوا واپس چلا گیا۔ زویا اسے دیکھ کر قدرے گھڑے ہوئے بولی۔

”شفیق! تم میرے کیوں آئی ہو۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ مظلوم ہے، آج میں نے تمہارا نئے میوزیکل بینڈ سوئٹھ سے تعارف کروانا ہے۔“

”کہاں ہے؟“ شفیق بے چینی سے بولی۔

”آؤ، ملواتی ہوں۔“ وہ اسے گھر کے پیچھے ایک بڑے سے بال میں لے گئی۔ اس کا گھر پورا کلچرل کیلیکس لگتا تھا۔ نت نئے جدید موسیقی کے آلات، رنگ برنگی جلتی بجھتی لائٹس اور لڑکوں کی ایک عجیب و غریب تعداد وہاں انشرومنٹس کے سامنے براجمان تھی۔ ایک حصہ سولہ سو گ کے لیے اور دوسرا گروپ ڈانس کے لیے مخصوص تھا۔ عجیب سا ماحول لگ رہا تھا۔ زویا نے سب سے اس کا تعارف کروایا۔ کچھ یونیورسٹی اور میڈیکل کالجز کے بڑے لکھے میزک کے ریسٹائز کے لڑکیاں تھیں۔ اسے کہیں بھی کوئی بزرگ نظر نہیں آیا۔

”زویا، تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟“ شفیق نے حیرت سے پوچھا۔

”کون سے گھر والے.....؟“ وہ بے پردائی سے بولی۔

”میرا مطلب ہے تمہاری امی اور بہن بھائی وغیرہ۔“

”یہاں کوئی نہیں، سوائے میرے اور چچا کیدار کے۔“

”اتنے بڑے گھر میں تم بالکل تنہا رہتی ہو؟“ شفیق نے حیرت سے پوچھا۔

”شفیق، تم کیا فضول باتیں لے بیٹھی ہو۔ اپنے کام سے مطلب رکھو۔ یہاں بیٹھو، میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔“ وہ کہہ کر نہ جانے کہاں

چلی گئی۔ وہ زویا کے بارے میں سوچنے لگی۔ زویا سے اس کی جان بچپان تھوڑا سیر کے فائل ایگزاحر میں ہوئی تھی۔ زویا اسے بڑی خوش مزاج، ہنسنے ہنسانے والی زندہ دل لڑکی لگی۔ پھر آہستہ آہستہ دونوں میں دوستی گہری ہونا شروع ہو گئی۔ زویا باتوں کی دہنی تھی۔ باتوں سے دوسروں کو متاثر کرنے کا فن اسے خوب آتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے شفیق کو اعتماد میں لے لیا۔ وہ کافی باتیں اس سے شیئر کرنے لگی تھی۔ زویا تو اس کے لیے کسی مسما سے کم نہ تھی۔ وہ اس پر اندھا اعتماد کرنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ جس طرف اسے لگاتی، وہ آسانی سے لگ جاتی۔ زویا کی کسی بات کو چیلنج کرنے کا اس میں حوصلہ نہ تھا۔ اب دونوں فوراً تھوڑا سیر میں تھیں۔ لڑکیاں فائل ایگزاحر کے لیے زور شور سے تیاریوں میں مصروف تھیں۔ وہ فونل کے پیچھے بھاگ رہی تھیں مگر اس پر عجیب دھن سوار تھی۔ جب سے ملک منصور کی سیاسی حیثیت میں اضافہ ہوا تھا۔ اسے ان کی ذات سے وابستگی پر قلق سارہتا۔ وہ اپنی ذاتی شخصیت اور اس کی شناخت کے چکروں میں تھی۔ وہ خود کچھ ایسا کرنا چاہتی تھی جس سے وہ خود پہچانی جائے۔ اسے کسی کی ذات کی شناسائی اور تعارف کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے نزدیک تعلیم، دولت اور انٹیلیس سب کچھ بے معنی تھا۔ زویا نے جب اسے اپنے سوئٹھ بینڈ کے بارے میں بتایا تو وہ بھی اسے جوائن کرنے کے لیے بے چین نظر آنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد زویا آ گئی۔ وہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

اس کے پیچھے لہا سا لڑکا تھا۔ کندھوں سے نیچے لٹکتی زانیں، گلے میں مٹل کے لیے لکھن اور چھو۔ مختلف قسم کی رنگرز..... رنگین شیشوں

والی عینک اس نے لگا رکھی تھی۔ عجیب سی بے ہنگم شخصیت تھی۔

”اس سے طویہ عابد ہے۔ ہمارے سونٹ کا ہیڈ ماسٹر۔ بہت میلنڈ میوزیشن ایڈنگر۔“

”ہیلو.....“ عابد نے سر جھکا کر کہا۔

”ہیلو.....“ وہ بھی آہستہ سے بولی۔

”عابد شفیق کو گانے کا بہت شوق ہے۔ مگر اس نے کبھی کچھ گایا نہیں۔ تم تو ٹیلنٹ ہنگ میں ماہر ہو۔ پلیز، اس کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دو۔“ زویا کے لہجے میں اچھا بھی تھی اور تسنن بھی۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں مگر اس میں وقت تو لگے گا۔ ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی آواز کیسی ہے اور ان کو کتنی ریاضت اور پریکٹس کی ضرورت ہے۔ آپ کچھ گا کر سنا لیں۔“ عابد نے اسے کہا۔

”مم..... میں..... میں..... اس وقت۔“ وہ زور سے ہو کر بولی۔

”ہاں..... ہاں، گھبراؤ نہیں..... عابد بہت نائس ہے۔“ زویا نے اسے تسلی دی۔ بہت مشکل سے اس نے دل پاکستان گایا تو عابد نے حیرت سے زویا کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

”عابد! تم بولتے کیوں نہیں، کیا یہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتی؟“ زویا نے حیرت سے پوچھا۔

”بہت وقت لگے گا۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”چلو، امید تو بندھی ہے۔ شفیق! تم حوصلہ مت ہارو۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور عابد! پلیز، اس کو آخری ٹیلنٹیشن دو۔“

”ٹھیک ہے..... کل سے کچھ کریں گے۔“ وہ بدولی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”زویا، کیا واقعی میں گاسکون گی.....“ اس کے جانے کے بعد شفیق نے پوچھا۔

”اور نہیں تو کیا..... آج کل اتنے بے سرے لوگ گروہیں بنا رہے ہیں اور ویسے بھی گروہیں میں سریلی آواز کم اور میوزک کا شور ہی اتنا ہوتا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ کون، کیا گارہا ہے؟ عابد جب تمہارے ساتھ گائے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آؤ، ہم ان لوگوں کی ریہرسل دیکھتے ہیں۔“ وہ اسے لے کر پیچھے ہال میں چلی گئی، جسے وہ ہال روم کہتی تھی۔

ٹھیک آٹھ بجے سہیل اسے لینے آ گیا۔ وہ قدرے ناراض لگ رہا تھا۔

”سہیل! تم کچھ خفا لگ رہے ہو؟“

”کچھ نہیں.....“ وہ بے پناہ تائی سے بولا۔

”پھر بھی..... ہوا کیا ہے؟“

”تم یہ بتاؤ کہ یہاں کیوں آئی ہو؟“

”اب تو روز آنا پڑے گا۔“

”کیا مطلب.....؟“ اس نے جھٹکے سے گاڑی روکی اور اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں، بھئی، مجھے کچھ نوٹس تیار کرنا ہیں، اس سلسلے میں روز آنا پڑے گا۔“

”جو وقت تم یہاں آنے جانے میں ضائع کر دو گی۔ گھر بیٹھ کر آرام سے تیاری کر سکتی ہو۔“ وہ سچی سے بولا۔

”تم اتنے تلخ کیوں ہو رہے ہو؟“

”مجھے یہ گھر اور اس کے مکین کچھ مشکوک لگ رہے ہیں۔“

”تم کس سے ملے ہو؟“

”زویا کے ساتھ وہ لڑکا کون تھا؟ جو تمہیں گیٹ تک چھوڑنے آیا تھا؟“

”ننگ..... کوئی بھی نہیں..... زویا کا کزن تھا اور اگر تم نہیں آ سکتے تو میں خود آ جایا کروں گی۔“

”نہیں، میں خود چھوڑنے آیا کروں گا۔ تم اکیلی نہیں آؤ گی۔“ وہ رعب سے بولا تو وہ خاموش ہو گئی۔

گھر آ کر وہ ساری رات نہیں سو سکی۔ کبھی عابد کے بارے میں سوچتی تو کبھی سہیل کے بارے میں۔ کبھی زویا سامنے آتی تو کبھی سوکھٹ

بیٹہ۔ وہ عجیب غریبے میں پڑ گئی تھی۔ ساری رات سوچتے اور جاگنے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

ملک منصور کا اپنی سیکرٹری صبرین گل کے ساتھ زبردست اسکیٹڈل ہر ایک اخبار کی مسالے دار خبر بنا ہوا تھا۔ شزانے بھی پڑھا اور خاموش ہو

گئی۔ ملک منصور دو دن سے گھر نہیں آیا تھا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ چاہے رات کے دو تین بج جائیں، وہ گھر ضرور آتا تھا۔ شزانے اس

کے موبائل پر کامیٹ کرنے کی کوشش کی مگر وہ بھی آف تھا۔ وہ کہاں تھا وہ اسے فریس آؤٹ کرنا چاہتی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے شدید عدم تحفظ کا

احساس تک کر رہا تھا۔ منصور نے جو وعدے اقرار اس سے کیے تھے، سب وقتی ثابت ہوئے۔ وہ حسن کے سامنے کہاں ظہر سکتا تھا۔ کردار کی مضبوطی

اور نفس پر قابو تو اسے کبھی بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی فطرت کی رنگینیوں سے شادی کے فوراً بعد ہی آگاہ ہو گئی تھی۔ اسے کسی قسم کی ٹکیل ڈالنا محض

خود فریبی تھی۔ وہ بہت شاطر مرد تھا، جو عورت کی کمزوریوں سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ وہ جان بوجھ کر ایسی عورتیں منتخب کرتا جو آسانی سے انکسپلائٹ

ہو سکتی تھیں۔ شزاکا تعلق معاشرے کے جس طبقے سے تھا، وہاں صرف گیسرں وجود زندہ رہ سکتے ہیں اور اب بچے ہونے کے بعد تو ملک منصور نے

اسے قطعی ان سرگرمیوں کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ صرف این جی او تک محدود تھی۔ وہ بار بار کمرے کا چکر لگا رہی تھی۔ اسے شاکل اور سیر شدت سے

یاد آ رہے تھے۔ نہ نیند آ رہی تھی نہ چین..... وہ اپنے آپ کو سخت اذیت میں محسوس کر رہی تھی۔ رنجشوں نے اس کی آنکھوں کو سرخ کر رکھا تھا۔ زندگی کا

غذاب کس کس صورت میں جمیلنا پڑتا ہے، ہر کوئی اپنی اپنی جگہ اذیت سہہ رہا تھا۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر شزاکا آنکھیں، شفق کی سرخ سوچی آنکھوں کا مشاہدہ کر رہی تھیں اور شفق کی جاگتی آنکھیں آفاق کے انفرادہ

اڑے چہرے پر بخند تھیں۔ سب دیکھ رہے تھے۔ اندر ہی اندر کچھ محسوس کر رہے تھے مگر کوئی کسی سے کچھ بھی نہیں پوچھ سکتا تھا اور کیوں پوچھتا، کس نام سے پوچھتا۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ گم کشتہ استعارہ تھا۔

آفاق چائے کا کپ نچل پر پھینکتے ہوئے میٹھے سے اٹھا اور گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر نکل گیا۔ اس کے اندر آگ دہک رہی تھی۔ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ بدلہ لینا چاہتا تھا۔ جب تک بدلہ نہیں لے گا، اس کا اندر یونہی دہکتا رہے گا۔ اس کی سوچیں منتشر رہیں گی۔ اسے کچھ کرنا تھا۔ یہی سوچ کر وہ اسی راستے پر چل پڑا جہاں کل گیا تھا اور چلتے چلتے اس کی جھلکیں جا پہنچا اور اب اسے ادھر ادھر تلاش کر رہا تھا۔

”اوئے بابو، کیا چاہیے.....؟ ادھر کیا ڈھونڈ رہے ہو؟“ ایک موٹا تازہ سا کالی رنگت والا آدمی باہر نکلا اور بڑے رعب سے پوچھنے لگا۔

”وہ..... وہ..... یہاں پر.....“ وہ ہکھلانے لگا۔

”کون..... بولو، کیا اولوں آں کر رہے ہو؟“ وہ غصے سے بولا۔

”یہاں پر وہ لڑکی..... کل.....“

”کون..... مگھتی.....؟“

”ہاں.....“

”کیا کام ہے اس سے؟“

”اس نے اک کام کہا تھا۔ وہی بتانے آیا ہوں۔“ جلدی سے اس نے بہانہ گھڑا۔

”مگھتی اور کام..... کیوں مذاق کرتا ہے۔ وہ اک ہتھ جوڑ کے لگائے گی تو سارا کچھ بھول جائے گا۔ وہ لڑکی نہیں پتا ہے۔ چل گیا نا تو لگ

پتا جائے گا۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

”کیوں ہاتھ لگائے گی، میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ قدرے سختی سے بولا۔

”اگر تو نے جھوٹ بولا نا تو تجھے چھوڑے گی نہیں۔ یہ تو سوچ لے۔ بڑی جی دار ہے۔“

”اچھا تم اسے بلواتو دو..... میں جانوں اور میرا کام.....“

”دیکھنا، کوئی ایسی ویسی بات نہ کرنا ورنہ مگھتی سمیت یہاں کے لوگ بھی تجھے نہیں چھوڑیں گے۔“ وہ پھر اسے سمجھہ کرنے لگا۔

”اچھا، بلاؤ تو سہی۔“ وہ ہمت کر کے بولا۔ وہ خطر تھا اور خوف زدہ بھی، جب وہ آگئی۔

”اوئے تو..... ٹھہر جا، آج تجھے زندہ نہیں جانے دیتا۔“ اس نے پاس سے ہی ایک موٹا سا ڈنڈا اٹھایا اور اس کی جانب لگی۔ اس کا باپ

فقیر اس کے پیچھے تھا۔

”اری بد بخت! مرے تو..... ٹھہر تو جا۔ اسے بات تو کرنے دے، کہتا کیا ہے؟“ فقیر نے اس کے ہاتھ سے ڈنڈا چھیننے ہوئے کہا۔

”میں نے آپ سے بات کرنی ہے۔“ آفاق نے فقیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... بول، کسی اچھے گھر کا لگتا ہے۔ ادھر کیا کرنے آیا ہے؟“

”مجھے آپ کی بیٹی سے شادی کرنی ہے اور میں یہ شادی بر قیمت پر کرنا چاہتا ہوں۔ چاہے آپ مجھ سے پیسہ لے لیں۔“ اس نے پینٹ کی جیب سے نوٹوں کی دو گنڈیاں فقیرے کی جانب بڑھائیں۔ ”یہ دس ہزار ہیں.....“ مگھتی میرے گھر میں بہت خوش رہے گی۔“

مگھتی کے ہاتھ سے ڈنڈا ایک دم نیچے گر گیا اور وہ حیرت سے دیکھنے لگی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس قدر بے وقوف ہوگا۔

”مگر یہ سب کچھ.....“ فقیرے کے منہ میں پانی آ رہا تھا، کبھی وہ نوٹوں کو دیکھ رہا تھا، کبھی آفاق کو اور کبھی مگھتی کو۔

”ابا! یہ بہت برا لڑکا ہے، میں اس کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔“ مگھتی ایک دم اس کے سامنے جا کر بولی۔

”مگھتی! میں اتنا برا بھی نہیں۔“ وہ بڑی ملائمت سے بولا تو وہ خاموش ہو گئی اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”تو تو چپ کر مر..... ابھی میں زندہ ہو، میں ہی فیصلہ کروں گا کہ کیا کرنا ہے۔ چنا، تو ہمیں سوچنے کا وقت تو دے..... اور حیرے گھر والے.....؟“ فقیرے نے اس سے کہا۔

”میرے گھر والے نہیں ہیں اور میں نے شادی بھی آج اور اسی وقت کرنی ہے۔“

”بیٹا! یوں جھٹلی پر سرسوں نہیں بھاتے..... شادی بیاہ تو زندگی کے معاملے ہوتے ہیں۔ اتنی جلدی تو سب کچھ طے نہیں ہو سکتا۔“ فقیرے نے پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”دیکھنا بھالنا کیا ہے، میں آپ کے سامنے ہوں۔ مگھتی یہ ہے، مولوی صاحب کو بلائیں اور نکاح کرویں۔“

”ابا، میں اس سے نکاح نہیں کرنے کی۔ یہ دھوکا ہے؟“ مگھتی پاؤں مگھتی اندر دھکیلی گئی۔

”کر لے..... بے وقوفی نہ کر..... نکاح ہی کرے گا نا۔ بھگا کر تو نہیں لے جا رہا۔ یہاں رہ کر ساری زندگی کوڑا ہی جمع کرتی رہے گی۔ تو تو بڑے نصیب والی ہے۔ موٹر والا تجھے بیاہنے آیا ہے۔ اس کے گھر میں راج کرے گی۔ ورنہ یہاں کی لڑکیوں کے نصیب بھی راکھ کی سیاہی سے لکھے ہوتے ہیں۔ کوڑے میں پلٹی ہیں اور بیمار ہو کر مر جاتی ہیں۔ کبھی کسی کا اچھا نصیب دیکھا ہے تو نے۔ کس آس پر تو میرے در پر بیٹھی رہے گی۔ میں بیمار رہتا ہوں۔ حیرے یہاں چار پیسے وہ دے رہا ہے۔ ہم بھی کوئی کٹیا سی بنائیں گے۔ میں اپنا علاج کروا لوں گا۔“ فقیرے نے فوراً ہی ساری منصوبہ بندی اسے سمجھا دی۔

”لیکن ابا! مجھے ڈر لگے ہے..... یہ موٹروں والے بڑے فریبی، دغا باز لوگ ہوتے ہیں۔ میری مگھتی کے ساتھ بھی کچھ دغا کیا تو پھر مر جائے گی۔ دیکھ پھر مگھتی حیرے پر نہ آئے گی۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔

”نہ میری دمی ایوں اور اس نہیں ہوتے۔ دیکھنا، نیلی چھتری والا کتنا کرم کرے گا۔ تو تو مگھتی ہی نہ رہے گی۔ میری موٹر والی میم صاب بن جائے گی۔“ فقیرے نے اسے سبز باغ دکھائے۔

”اچھا، جو تیری مرضی.....“ وہ ہتھپڑا ڈالتے ہوئے بولی۔

”جاتو ہمیشہ خوش رہو۔“ فقیر خوش خوش ہاں ہر نکل آیا۔

”جاہا بوا! مولوی کو لے آ..... وہ راضی ہوگئی ہے۔“

ہوسکتا ہے آفاق کو واقعی اس سے محبت ہوگئی ہو۔ بے شک وہ گندی مندی رہتی تھی لیکن ہستی میں رہنے والی سب لڑکیوں میں وہ خوبصورت سمجھی جاتی تھی۔ مگر وہ فقیرنی بھی تھی۔ وہ عجیب شش و پنج میں مبتلا تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ مولوی صاحب کو لے آیا۔ دس ہزار حق مہر کے عوض اس سے نکاح کیا گیا۔ جو اس نے فقیرے کو دے دیے تھے۔ نہ جانے کس کے بوسیدہ سے گونے کناری والے کپڑے اسے پہنائے گئے۔ سرخ سرخی اور گالوں پر لالی خوب بھر بھر کر تھوپی گئی۔

”ابا، ان پیسوں سے علاج ضرور کرانا۔“ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ہاں..... ہاں، تو فکر نہ کر..... تو خوش رہو۔“ فقیرے نے اسے دعاؤں کے سائے میں رخصت کیا۔ سارا راستہ خاموشی چھائی رہی۔

”بابو! تو خوش تو ہے نا! کیا تجھے مجھ سے محبت ہوگئی ہے؟“ منگنی نے محبت سے پوچھا۔

”میں کوئی بابو نہیں، میرا نام آفاق ہے اور تم بھی منگنی نہیں، کچھ اور ہو اور مجھے تم سے کوئی محبت نہیں، سنا تم نے؟“ وہ غصے سے جھجلا کر بولا۔ وہ خاموش ہوگئی۔

”اچھا تو کیا نام رکھوں میں، میں تو شروع سے ہی یہی ہوں، آج کیوں اپنا نام بدلوں؟“

”میں نے کہا نا..... مجھ سے فضول بحث مت کرو اور اپنا نام کچھ اور رکھو۔“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”اچھا، تو چھوڑ رکھ لوں؟“ وہ خوش خوش بولی۔

”کیا بکواس نام ہے.....“ وہ منہ چڑھا کر بولا۔

”تو بھاگی رکھ لوں؟“

”شٹ اپ..... ناں سیس.....“

”اچھا تو ناراض کا ہے کوہر ہے ہو؟“ وہ سارا راستہ منہ بسور کر بیٹھی رہی۔ جب وہ اسے لے کر گھر آیا تو ہر نظر میں استفہام تھا، حیرانی تھی۔

شفق حیرانی سے کبھی آفاق کی طرف دیکھتی تو کبھی منگنی کی طرف۔ اس کی آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں۔

”آفاق! یہ کون ہے؟“ شفق نے حیرت سے پوچھا۔

”کون ہو سکتی ہے..... ظاہر ہے میری بیوی ہے مگر!“

”سم.....!“ منگنی خود ہی بڑبڑائی۔

”مگر.....“ شفا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہا۔

”کیوں، اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ جب ماڈل اور ایکٹرز یہاں رہ سکتی ہیں تو یہ کیوں نہیں.....؟“ وہ اس کا دفاع کر رہا تھا مگر وہ

ان سب کے درمیان کڑی حقیر سا، بے وقعت سا ذرا رنگ رہی تھی۔

اسی لمحے ملک منصور اندر داخل ہوا۔

”یہ کیا ہنگامہ چاوریہ کون ہے؟“ وہ غصے میں دہاڑتے ہوئے بولا۔

”یہ میری بیوی ہے۔“

”کیا..... تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟..... یہ تو شکل سے ہی کوئی بھکارن لگتی ہے۔“ وہ ناک سیکڑ کر بولا۔

”بھکارن تھی..... مگر اب نہیں۔ اب یہ اس گھر کی بہو چاوریہ آپ کی عزت۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو، تمہاری اس بکواس کو میں آسانی سے قبول کر لوں گا۔ پر خوروار، کھواب میں ٹاٹ کا بیچہ نہ بھی نہیں

لگتا۔“ وہ پھر دہاڑا۔

”مگر آپ تو ہمیشہ لگاتے رہے ہیں۔ ساڈا اور ایکٹریز کا۔ وہ بھی تو کھواب میں ٹاٹ ہی نہیں.....“

”شٹ اپ، یون آف.....“ وہ غصے سے دہاڑا۔

”بس..... ایک ہی دفعہ میں تھلانے لگے اور مت بھولیے، میں آپ کا ہی بیٹا ہوں۔“

”دفعہ ہو جاؤ میری نظروں سے..... اور پھر میرے سامنے مت آنا اور سنو، اس کو میں یہاں دوبارہ نہ دیکھوں۔“

”یہ یہیں رہے گی، میرے ساتھ اور میں دیکھتا ہوں کہ یہاں سے کون جاتا ہے۔ ہم نے بھی تو بہت برداشت کیا ہے، ہم بھی تو چاہتے تھے

کہ بہت سے لوگ اس گھر میں نظر نہ آئیں مگر وہ نظر آ رہے ہیں تو پھر یہ بھی نہیں رہے گی۔“ اس نے جلی سے شزا کی طرف دیکھ کر کہا۔

منصور نے تراخ سے تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور پاؤں پٹختا ہوا اندر چلا گیا۔ ہر کوئی اپنی جگہ گنگ سا کھڑا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے

آفاق کو یوں تھپڑ مارا تھا۔ وہ وہیں پر کھڑا اپنا گال سہلانا رہا۔ ابھی پہلے تھپڑ کی الایت کم نہ ہونے پائی تھی، اوپر سے حرید ایک اور اس کو سہنا پڑا تھا۔ شزا

بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”آفاق، یہ تم نے کیا کیا..... ابھی تو تم نے سیکنڈ ایئر کے ایگزاحر دینے ہیں اور تم نے شادی بھی کر لی اور وہ بھی اس سے؟“ شفق اسے

جھنجھوڑ کر پوچھنے لگی۔

”میرے لیے زندگی میں کچھ بھی اہم نہیں۔ نہ تعلیم، نہ اسٹیٹس، نہ کچھ اور..... میرے لیے تو زندگی ہی اہم نہیں.....“ وہ مایوسانہ لہجے میں بولا۔

”تم کیوں ایسا کہہ رہے ہو؟“

”شفق! یہ تم پوچھ رہی ہو..... میں کیوں زندہ ہوں..... کس کے لیے..... ہمارے ہونے کا تو کوئی جواز ہی نہیں، ہم زندہ ہیں اس لیے کہ

ہم ہیں۔ کاش ہم نہ ہوتے، اس ہونے نہ ہونے کے چکر میں انسان کتنا دکھ سہتا ہے، کتنا کرب..... میں بہت ٹوٹ چکا ہوں۔“ اس کی آنکھوں سے

آنسو بہنے لگے۔

”تو کیا تم اس سے محبت کرتے تھے اس لیے.....؟“

”محبت اور اس سے.....؟“ وہ طہریہ ہنسی ہنسا۔

”تو پھر یہ سب کیا ہے؟“

”ایسا بندھن جو میرے ماں باپ میں تھا۔ میں وہی ایکسپرینس کرنا چاہتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ایسا بندھن کب تک چلتا

ہے..... اس جسٹ این ایڈوچر.....“

”یہ کیا حماقت ہے۔ تم تو بالکل ہی بہک گئے ہو۔“ شفیق ناراض ہو کر بولی۔

”یہ زندگی ہی سب سے بڑی حماقت ہے..... تم اور کس حماقت کی بات کرتی ہو؟“

”اچھا ادھر بیٹھو..... اس غریب کو تم کس بات کی سزا دینے جا رہے ہو؟“

”سزا تو یہاں ساری زندگی سب کی..... میرے ساتھ۔“

”دیکھو پلیز! کوئی زیادتی نہ کرنا۔“ شفیق خوف زدہ ہو کر بولی۔

”ادھر بیٹھو، میں کچھ لاتی ہوں۔“ وہ بیٹی کے دو گلاس ان کے لیے لائی۔ وہ شوپ شوپ کر کے ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گئی۔ شفیق

مسلل اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کسی طرح بھی ان کے ماحول میں فٹ ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اگر اس کی ٹوک پلک سنواری جائے، تب بھی

نہیں۔ اس کے وجود میں ایسی سزا انداز اور بوسیدگی، رگ رگ میں سائی مفلسی اور چہرے پر پھیلی حسرت و یاسیت، وہ تو اس گھر کے کونے کھد رے میں بھی

سمانے کے لائق نہ تھی۔ تو پھر یہ سب کیسے چلے گا؟ وہ حیرت سے سوچتی رہی۔

”آؤ، میں تمہیں قہہارا کرادکھا دوں.....“ شفیق کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ ہلا خرا یک دم اسے لے کر آفاق کے کمرے میں چلی

گئی۔ وہ بھی اس کے حکم پر روبرو کی طرح اٹھ کر چل دی۔ آفاق کا کراجدید آرائش و زیبائش سے آراستہ تھا۔ اتنا خوبصورت کمرہ تو اس نے خواب

میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ کہاں اس کی گھاس پھوس سے بنی جھونپڑی، ذرا سی تیز ہوا چلتی تو جھولنے لگتی تھی۔ ہارٹس ہوتی تو پر تالے کی طرح پہنے لگتی۔

فرش ترتر ہو جاتا، کہیں بیٹھنے کی صاف جگہ نہیں ملتی اور اب ہر طرح سے مکمل خوبصورت آرام وہ کمرہ اس کا ہوگا۔ نرم گداز بستر، خوبصورت کبل چھت

سے لٹکا جھومر، رنگ برنگی تصویریں، کتنا خوبصورت تھا سب کچھ۔ وہ جھجکتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔ شفیق باہر نکل گئی۔ وہ حیرت سے..... ہر چیز کو دیکھ

رہی تھی۔ وہ اٹھ کر ٹیبل یسپ کو دیکھنے لگی جس میں سے ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز آرہی تھی۔

”اس کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ مت لگاؤ۔“ آفاق ایک دم پیچھے سے آ کر بولا۔ ”اور سنو، اپنی اوقات بھی کبھی مت بھولنا۔ چلو ادھر کونے

میں سو جاؤ۔ یہ لو چادر.....“ اس نے دور سے چادر اسے پھینک کر دی۔ وہ بہت کچھ کہتا چاہتی تھی۔ اس کے تو سارے خواب ایک دم چکنا چور ہو گئے۔

”کیوں، میں نے کیا گناہ کیا ہے؟“ وہ روتے ہوئے قریب آ کر بولی۔

”تمہارے وجود میں بدیو ہے..... تم تو گندگی کا ڈھیر ہو..... تم میرے وجود میں نہیں سما سکتی۔“

”تو پھر کیوں بیاہ کے لائے ہو؟ کیا تکلیف تھی تمہیں؟“

”تھی بہت تکلیف..... بہت جلد تمہیں بھی اس تکلیف کا پتا چل جائے گا۔“

”میں واپس جا رہی ہوں۔“ وہ گلا پھاڑتے ہوئے بولی۔

”واپس کا سوچنا بھی مت اور خبردار..... اوپچی آواز میں مجھ سے بات کی.....“

”میں تو چیخ چیخ کر لوگوں کو بتاؤں گی.....“

”کیا بتاؤ گی؟“ اس نے وحشیوں کی طرح اسے مارنا بیٹنا شروع کیا۔ وہ اس کے ہلکے پھلکے وجود کو ہوا میں اٹھا کر یوں زمین پر مار رہا تھا

جیسے وہ کوئی ریڑی کی گیند ہو اور جیسے ہی وہ آواز نکالتی تو اس کے گلے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جاتا۔

”خبردار! جو تمہاری آواز نکلی، اسی کمرے میں زندہ گاڑ دوں گا۔“ اس نے جیب سے ریو اور نکال کر اس کو دکھاتے ہوئے کہا۔

اس کی ناک اور منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ جسے وہ اپنے سرخ گوٹے والے دوپٹے سے بار بار صاف کر رہی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھی مگر رو

رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کا وجود بری طرح دکھ رہا تھا۔ اتنی اذیت، اتنا کرب دے کر بھی اس کے اندر کی آگ ٹھنڈی نہیں ہو رہی

تھی۔ پہلے وہ اپنا طہہ کسی پر نہیں نکال سکتا تھا۔ اب تو بیٹا جاگتا وجود اس کے ہاتھ لگا تھا۔ جس پر وہ جو چاہے گا کرے گا۔ وہ تھک کر صوفے پر بیٹھ گیا

اور اسے دیکھنے لگا۔ وہ اس کی نظروں سے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ جتنی شدت سے آنسو بہا رہی تھی، اسے اتنا ہی لطف آ رہا تھا۔ عورت روتی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہے۔ شاید اسی لیے قدرت نے اسے

فراوانی سے آنسوؤں کا ذخیرہ دیا ہے۔ جاؤ بہاتی رہو۔ کبھی کم نہ ہوں گے۔ وہ اسے پاؤں سے ٹھوکر مارتا ہوا اپنے بستر میں ٹھس گیا۔ وہ وہیں زمین پر

بیٹھی کراہتی رہی۔ وہ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا اور وہ گرم گرم آنسوؤں سے اپنی مرہم پٹی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب وہ بھکارن تھی تو

کتنی خوش تھی۔ بے مسکون نیند کے مزے لوٹتی تھی اور اب اس قیمتی گھر کے قیمتی کمرے میں اس کی حیثیت ٹوٹے فرنیچر جیسی بھی نہ تھی۔ اتنی ذلت..... اتنی

رسوائی تو اس نے بھکارن ہو کر بھی زندگی میں نہیں سہی تھی۔ کیسا قید خانہ تھا۔ صرف دس ہزار کے عوض اس کے باپ نے اس کی حیاتی کا سودا کر دیا تھا۔

کتنے رنگین اور سرسبز باغ دکھائے تھے جو صرف ایک ہی رات میں راکھ کا ڈھیر ثابت ہوئے تھے۔

صبح جب وہ دیر سے بیدار ہوا تو وہ اسی جگہ پر ٹھہری سی بنی بیٹھی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرے پر چوٹوں کے

نشانات ابھی باقی تھے۔ آفاق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم..... تم ابھی تک یہاں ہو..... کیا ہوا..... اور یہ خون..... یہ سب کہاں سے آیا کیا تمہیں بہت درد ہو رہا ہے؟ اٹھو صوفے پر بیٹھو.....“

اس نے الماری سے مرہم نکال کر اس کے لگا دیا۔ چین کلرزدیں اور چائے منگوا کر اسے چائے دی۔ اب تم سو جاؤ۔“ اس نے اسے زمین پر بچھے میٹرز پر

لٹا دیا۔ وہ حیرت سے مسلسل اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ کیسا عجیب انسان تھا۔ رات کو وہ کسی وحشی سے کم نہیں لگ رہا تھا اور اب جو اس نے شفیق

انسان کا روپ دھارا تو سارے رزم پھر سے رہنے لگے۔ محبت کا پہلا دھڑکنے سے اندر کی تمام تکالیف پھر سے متحرک ہونے لگیں۔ انسان کیا ہوتا ہے،

اتنا برا بھی اور اتنا اچھا بھی۔

رات کو وہ وحشی درندے سے بھی بدتر لگ رہا تھا اور اب کسی فرشتے سے کم دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس کے اندر خوف بھی کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا اور خوشی بھی لگی روشنی کے مانند تھوڑا سا سرور دے رہی تھی۔ وہ اسے مکمل اوڑھا کر خود ہا ہر نکل گیا اور وہ گہری نیند سو گئی۔



”آؤ..... میرے ساتھ ہم آواز ہو کر گاؤ۔“ عابد نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”میں..... کیسے.....؟“ وہ بے اعتمادی سے بولی۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں.....“ عابد نے اس کے خوبصورت چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”مگر میں.....“ وہ جھینپ کر بولی۔ اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہونے لگا۔

”گاؤ..... سارے..... گا..... ما..... پا..... دھا..... نی..... سا..... سات نر، کائنات کے سات رنگ، سات زمیں..... سات آسمان۔

کیا میرے اندر کے سات نر تمہارے اندر کے سات نروں کو متحرک نہیں کر سکتے۔ سب کچھ ممکن ہے۔ ہر گلے میں ساز ہے اور ہر آواز میں سوز۔ بے ہنگم شور میں بھی روغم ہوتا ہے اور بے ترتیب لے میں بھی نر۔ مجھے امید ہے کہ تم بہت جلد گانا سیکھ لو گی۔“ اس نے اچانک اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی انگلیاں پیالو پر رکھیں۔ اس کا وجود کاٹنے لگا۔ وہ مکمل طور پر اس کے اختیار میں تھی۔ اس کے اندر برقی روی دوڑنے لگی۔ منجھ سا کن وجود میں حرکت سی پیدا ہونے لگی۔

”تم بہت جلد سیکھ لو گی..... تم سب کچھ کر سکتی ہو۔ بس کوشش کرو۔ دیکھنا، بہت جلد میں اپنے نر تمہارے اندر جگا دوں گا اور ہم ایک آواز

بن کر دنیا میں پھیل چا دیں گے۔“ عابد نے اعتماد لہجے میں بولا۔

”نہیں، میں منفرد آواز بننا چاہتی ہوں۔“ وہ ایک دم ہاتھ چھڑا کر بولی۔

”کیوں؟“

”اس لیے کہ میرا اپنا وجود ہے۔ میں اپنے ٹیلنٹ کو خود انکسپلور کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی شناخت دنیا میں خود پیدا کرنا چاہتی ہوں۔ میرا

ٹیلنٹ میری ذات کی شناخت ہے۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ زمانہ مجھے کس حد تک قبول کرتا ہے؟“ وہ بڑے جوش لہجے میں بولی۔

”پھر کیا ہوگا؟“ اس نے حیرت سے مسکرا کر پوچھا۔

”معلوم نہیں..... مگر کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوگا۔“

”تم کیوں ان چکروں میں پڑتی ہو۔ جیسا ہے ویسا ہی چلنے دو۔ اس انکسپلوریشن کا قائدہ.....؟“

”قائدہ یا نقصان میں نہیں جانتی۔ میں بس اپنے اندر کی تسکین چاہتی ہوں۔ میرے اندر ایک طوفان برپا رہتا ہے۔ میں کچھ ایسا کرنا

چاہتی ہوں کہ جو سب سے منفرد ہو۔ جس میں میرے باپ کی شخصیت کا عکس نہ ہو۔ میری کامیابیاں صرف میری ہوں۔ میرے اندر بہت اداسیاں اور

بے چینیاں ہیں۔ میں اپنے اندر کبھی محرومیوں کو ختم کرنا چاہتی ہوں ورنہ زندگی یونہی بربادی میں گزر جائے گی۔“

”تمہاری سوچوں میں توازن کیوں نہیں؟“ عابد نے حیرت سے پوچھا۔

”کبھی بے ربط سوچوں..... بے ترتیب زاویوں..... آڑی ترچھی لکیروں اور سوچوں کے تصور سے توازن اور ہم آہنگ سوچوں اور مثبت نظریات نے بھی جنم لیا ہے؟“ وہ بے لگان بولتی گئی۔

”تم کس کی تلاش میں ہو؟“

”معلوم نہیں..... مجھے تو آج تک یہی معلوم نہیں ہو سکا کہ میں کیا ہوں اور مجھے کس شے کی ضرورت اور تلاش ہے۔ میں بس ہوں، جیسے ریگن ہوا کیڑا یہ نہیں جانتا، وہ کس لیے ریگ رہا ہے اور اسے کس کی تلاش ہے اور اسی تلاش میں وہ کسی دن پاؤں تلے آ کر مر جاتا ہے۔ میں نے زندگی تو یونہی گزار دی مگر اب ایسی بے بسی سے مرنا نہیں چاہتی۔“

”مگر یہ سب تمہارے ساتھ ہی کیوں ہے؟ زویا تو ایسی نہیں؟“

”آپ کو معلوم ہے جب جنرل ڈسٹرب ہوں تو ایب نارملٹی جنم لیتی ہے اور پھر اس سے انتشار جنم لیتا ہے۔ سوچ کا اور فکر کا۔ یہ سب کچھ جنرل ایرر کی وجہ سے ہے۔ یہ اضطراب اور انتشار کو جنم دیتا ہے اور انتشار پانگل پن اور دیوانگی کو۔ میں اور میرا بھائی اس منافقوں کی سوسائٹی کے شاید ایب نارمل کردار ہیں۔ شیزوفرینک کریکٹرز..... یا پھر بہت نارمل اور پوزیٹو۔“ وہ ایک دم بولنا شروع ہوئی تو بولتی گئی۔

”تمہارا ذہن بہت متحرک ہے، کیا پڑھتی ہو؟“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”نفسیات اور فلسفہ.....“

”شاید اسی لیے..... مگر اتنا کچھ مت سوچا کرو۔“

”تو پھر کیا سوچوں.....؟“

”کچھ اچھا بھی تو سوچ سکتی ہو، خوبصورت.....“

”خوبصورت سوچ، خوبصورت ماحول سے پیدا ہوتی ہے اور میری آنکھوں نے تو کوئی خوبصورتی دیکھی ہی نہیں۔ کانوں نے خوبصورت باتیں ہی نہیں سنیں اور جسم نے خوبصورت احساسات اور لمس کو کبھی مس ہی نہیں کیا تو میں ابھی سوچ کہاں سے لاؤں۔“ وہ قدرے بے بسی سے بولی۔

”اچھا..... تم آج میرے گانے کو صرف سنو۔ ایس ایچ ڈاؤنلڈ یعنی آواز کا اتار چڑھاؤ۔ کہاں میوزک سلو آتا ہے اور کہاں فاسٹ۔ کہاں ردیم ہوتا ہے اور کہاں آواز..... اور سب کچھ بھول کر سنو۔“

”کیوں..... کچھ پانے کے لیے اپنے آپ کو بھلانا ضروری ہے کیا؟“

”ہاں..... یہی قانون فطرت ہے۔ کسی بھی شے کو پانے کے لیے جی لگن ضروری ہے اور جی لگن کے لیے اپنے آپ کو کبھی بھلانا ضروری ہے۔“

”لیکن میں ان چیزوں کی پروا نہیں کرتی۔ آپ مجھے شروں کے بغیر ہی سکھائیں۔“

”اچھا ہاں!“ اس نے گٹار پکڑ کر گانا شروع کیا۔ وہ اتنے بڑے جوش انداز میں گارہا تھا کہ وہ واقعی اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ ساز، سُر اور آواز میں مکمل ہم آہنگی بے حد بھلی لگ رہی تھی۔ وہ بہت اچھا گارہا تھا۔ قدرت نے اسے آواز بھی خوبصورت دی تھی یا پھر اس کا پیشہ ہی یہی تھا۔ اس کے باپ اور دادا بھی شادی بیاہ کے موقع پر بیٹہ ہا ہے بجاتے اور گاتے تھے..... وہ ذات کا میراثی تھا۔ انسانوں کے جھوم میں ریگلتا ہوا کیڑا۔ حقیر ذرہ مگر اب وہ میوزک ماسٹر تھا۔ گروپ انچارج، لے اور سُر کو جاننے والا۔ موسیقی کا رسیا۔

”میں آپ جیسا کبھی بھی نہیں گا سکتی۔“ وہ اس کے گانا ختم کرنے پر بولی۔

”کیوں؟“

”میرے جنموں میں طمانیت ہی نہیں۔ موسیقیت تو اندر سے جنم لیتی ہے، جب اندر سکون ہو، تناسب ہو، ہم آہنگی ہو۔ مجھے معلوم ہے میں کبھی بھی اچھا نہیں گا سکوں گی۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولی اور بیک اٹھا کر چل دی۔

”یار! تمہاری سہیلی تو مجھے پاگل لگتی ہے۔“ عابد نے اس کے جانے کے بعد زویا سے کہا۔

”ہاں، ہے تو سہی مگر تھوڑی سی۔“

”تھوڑی سی نہیں، بہت زیادہ.....“

”ارے بھئی میگلکینڈ چائلڈ ہے..... تو ظاہر ہے، ایسی ہی ہوگی نا!“

”کیا مطلب؟“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pakvirtuallibrary.com

”فضول بات ہے چھوڑ واسے۔ اب تو اکثریت ہی ایسی ہے۔“ زویا منہ ہٹا کر بولی۔

”ویسے یہ نمونہ تمہیں ملا کہاں سے؟“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”کالج میں ہی جان پہچان ہوئی اور جب مجھے اس کے فاور کا معلوم ہوا کہ وہ زیر دست پلٹنے لگی پر سنالٹی ہیں۔ پھر تو میں نے خود ہی دوستی بنالی۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ ایسے لوگوں سے تو میں دوستیاں بنانے میں ماہر ہوں۔“ زویا نے آنکھ دپا کر کہا۔

”آئی سی..... اسی لیے..... میں سوچ رہا تھا کہ اس دوستی کے پیچھے کیا راز ہو سکتا ہے؟“

”اچھا، یہ مٹاؤ کہ تمہارا اپنا الیم کب آ رہا ہے؟“ زویا نے اس سے پوچھا۔

”بہت جلد.....“

”سپر ہٹ ہوگا.....“ زویا خوشامدی لہجے میں بولی۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”میں جانتی ہوں کہ تم نے بہت محنت کی ہے۔“

”لیکن صرف محنت کسی کو شہرت کی بلند یوں تک نہیں پہنچا سکتی۔“

”تو پھر کیا چاہیے؟“

”سکو ٹیکس..... ایڈز مرن.....“

”کیا مطلب.....؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”بڑے لوگوں کی اسپانسر شپ اور ان کے سپورٹنگ چنڈز“ وہ مایوسی سے بولا۔

”تو شوق سے بات کیوں نہیں کرتے۔ آخر اس کی دوستی کس کام آئے گی۔ اپنے قادر کو کہے تاکہ وہ تمہیں اسپانسر کریں؟“

”بہت مشکل ہے۔ وہ بہت عجیب و غریب قسم کی لڑکی ہے۔ مجھے اس کی باتوں سے، باپ کے لیے نفرت کی بو آتی ہے۔ وہ اپنی فیملی کو بھی

ناپسند کرتی ہے اور شاید اپنے باپ کو بھی۔ میرا نہیں خیال کہ وہ میرے لیے اپنے باپ سے بات کرے گی۔ اس کی انفرادیت معلوم ہے کیا ہے، وہ ان

چیزوں کو اہمیت دیتی ہے جنہیں نظر انداز کرنا چاہیے..... جنہیں نظر انداز کرنا چاہیے، انہیں وبال جان بنالیتی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہ اس سلسلے میں

کچھ کر سکے گی۔“ عابد قدرے مایوسی سے بولا۔

”بات کر لینے میں کیا حرج ہے؟“ زویا نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے..... کل آئے گی تو بات کروں گا۔ مگر مجھے امید نہیں۔“

”میرے پاپا اور تمہیں سپورٹ کریں گے..... مائی فٹ..... جو ہمیں کسی معاملے میں سپورٹ نہ کر سکے وہ تمہیں کیا کریں گے اور پیسے

بھی، وہ صرف اسی بندے کو سپورٹ کرتے ہیں جہاں انہیں کوئی فائدہ مقصود ہو۔ تم تو ان کے لیے قطعی اہم نہیں۔ تم جس خوش فہمی میں مبتلا ہو، سب

نکال دو۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

”اچھا اگر تمہارا البم بنایا جائے؟“

”میرا البم..... ہاؤ فٹی..... گا ناؤ تنگ کا آتا نہیں، البم خاک بناؤ گے۔“ وہ بہت بے باک اور منہ پھٹ ہوتی جارہی تھی۔

”اچھا تو ایک کنسرٹ میں ساتھ دو گی.....“ وہ اسے درغلز رہا تھا۔

”مگر یہ سب کیسے ممکن ہے..... مجھے تو کسی بھی بات کا کوئی تجربہ نہیں۔“

”اس دفعہ تو تم صرف ساتھ دو گی، پھر آہستہ آہستہ تم میں اعتماد آنے لگے گا تو پھر کوئی مشکل نہیں ہوگی۔“

”ٹھیک ہے، سوچ کر بتاؤں گی۔“ شوق کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”موقع اچھا ہے..... اس کو یوں سوچنے میں ضائع مت کرنا۔“

”ٹھیک ہے، ایک دو دن میں بتا دوں گی۔“

”ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا۔“ وہ شوق لہجے میں بولا۔ سہیل اسے لینے آیا مگر قدرے خفا لگ رہا تھا۔

”تم ناراض کیوں ہو..... کیا بات ہے؟“ شوق نے اس کے تئو روکھ کر پوچھا۔

”تم مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو..... کیا تمہیں خود معلوم نہیں کہ تم کتنی بدل گئی ہو۔ تم پہلے والی شوق نہیں لگتیں..... تمہارے لہجے میں کتنی بے باکی آتی جا رہی ہے اور ہاتھوں میں عجیب سی بناوٹ..... تم وہاں کیا کرتی رہتی ہو۔“

”کچھ بھی نہیں، تم تو خواہ مخواہ میرے بارے میں مشکوک رہتے ہو۔“

”میں نہیں، ملک صاحب پوچھ رہے تھے۔“

”کیا پوچھ رہے تھے؟“ اس نے تیزی سے چہرہ ہلکا کر دیا۔

”تم کہاں جاتی ہو..... اور کس لیے.....“

”اچھا..... تو انہیں فرمت مل گئی.....؟“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

”ہاں، وہ اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔“

”بڑی بات ہے، آج کل ان کی ریشم میں اور کوئی نہیں.....؟“

”کیا فضول باتیں کرتی ہو۔“ وہ خشمگین لہجے میں بولا۔

”بات تم نے خود ہی شروع کی ہے۔“

”یہ بتاؤ، تم کب تک یہاں آتی رہو گی؟“

”معلوم نہیں لیکن میں اب خود ہی آیا کروں گی..... میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ وہ اب طیش میں آ چکا تھا۔

”زویا کہہ رہی تھی اس کا ڈرائیور.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”نام مت لو..... اس طبیعت کا میرے سامنے.....“

”آخر تم کیوں زویا سے اتنے الرجک ہو؟“

”بس تم کہیں نہیں جایا کرو گی..... جہاں بھی جانا ہوگا، میں خود چھوڑ کر آؤں گا۔“ اس کے جواب سے اسے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ وہ اس کو کیسے سمجھاتی کہ عابد سے اس کی کنٹنٹ ہے مگر عابد کا نام لے کر وہ اسے حریفہ نہیں دلاتا چاہتی تھی۔

”تمہارے سائیکز امزکب ہیں؟“

”ابھی ایک دو ماہ ہیں۔“

”شکر ہے یہاں سے تو جان چھوٹے گی۔“ وہ اس کا جواب سن کر ایک دم چوکی اور ذہن میں مختلف جواز ڈھونڈنے لگی۔ سبیل اس کی تنہائیوں کا قابلِ اعتماد ساتھی رہا تھا۔ وہ اکثر اپنا غصہ اس پر نکالتی اور وہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کر جاتا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کتنی تنہا اور اس تنہی۔ وہ اس سے عمر میں دس سال بڑا تھا۔ سمجھدار تھا۔ اس لیے اس کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس کی حماقتوں اور بدتمیزیوں کو نظر انداز کرتا تھا۔ اسے محبت

سے اور ڈانٹ سے سمجھاتا تھا۔ وہ اس سے بے شمار شکوے شکایتیں کرتی۔ اپنی ہر بات اس کو سناتی۔ اپنی سسلیوں کی کالج کی، ٹیچر زکی، کوئی بھی بات اس سے نہ چھپاتی۔ مگر جب سے وہ زویا کے گھر جانا شروع ہوئی تھی، وہ اسے کوئی بات نہیں بتاتی تھی۔ نہ زویا کی نہ اپنی مصروفیت کی اور سبیل اس بات کو بہت محسوس کر رہا تھا۔ وہاں ایسا کیا تھا جو وہ بتانا نہیں چاہتی تھی اور اچانک وہاں خود جا کر وہ اسے قصہ نہیں دلانا چاہتا تھا۔ وہ کیسے اتنی جلدی بدل گئی تھی۔ اس کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے ہالکل نیا وجود جنم لے رہا تھا۔



سحر نہاد دھوکہ تیار ہو جاؤ، آج تمہارے لیے نئے کپڑے بھی خریدنے ہیں اور قمیصیں پارلر بھی لے کر جانا ہے۔“ اتفاق نے ایک دم مسکرا کر اس سے کہا تو وہ چونک سی گئی۔

”جی..... تم کتنے اچھے ہو۔“ وہ قدرے خوشی سے چلائی۔

پچھلی رات اس نے زندگی میں پہلی بار جتنی جسمانی اذیت سہی تھی، اب اس کی آواز اور خوشی میں اس کرب کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ کیا ہر عورت ایسی ہی سخت جاں اور ڈھیت ہوتی ہے۔ اتنی تنخیاں سہہ کر بھی ایک اچھی بات کی خاطر سب کچھ بھول جاتی ہے۔ اندر ہی اندر کہتے پروگرامز بناتی ہے، بلند و بانگ دھوے کرتی ہے کہ اب اس شخص کو کبھی زندگی میں منہ نہ لگائے گی۔ جس نے اس کی انا کو پکڑا ہے اس کے وجود کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے درپے ہے مگر جب مرد صرف ایک دفعہ مسکرا کر دیکھتا ہے تو سارے گلے شکوے، دھوے ہوا ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک مسکراہٹ کی خاطر ایک دلا سے کے بدلے، پھر وہی پہلے جیسی وفا، پہلے جیسی عزائیں..... اور محبتیں۔ یہ عورت بھی کیا مخلوق ہے؟ وہ مجرم بنا گاڑی چلاتے ہوئے خود ہی سوچ رہا تھا اور وہ اس کی ستم ظریفی پر مسکرا رہی تھی۔ اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ اس نے ایک دفعہ بھی شکوہ نہیں کیا تھا۔ ایک دفعہ بھی اسے یاد نہیں دلایا تھا۔ مبادا وہ پھر کہیں ناراض نہ ہو جائے اور اگر وہ ناراض ہو گیا تو وہ زندہ در گور ہو جائے گی۔ یہ دنیا اور اس کی زمین اس کے لیے کتنی کم پڑ جائے گی، شاید اس کا کہیں بھی ٹھکانا نہ ہے۔

مرد اور عورت کی کٹھالی بھی کتنی عجیب و غریب ہے نہ سلجھنے والی تھی اور نہ سمجھ آنے والی۔ کیا ہر عورت ایسی ہی ہوتی ہے، سب کچھ بھولنے والی، ایک فقیرنی، کم ذات عورت میں اتنا حوصلہ ہے تو اس تعلیم یافتہ میں اتنا بھی حوصلہ نہ تھا کہ خاموشی سے کچھ اور برداشت کر لیتی۔ اس نے خود ماں کو باپ سے مار کھاتے دیکھا تھا۔ اس کے ذہن میں سب کچھ نقش تھا اور وہ ایسی ہی مار مٹکتی کو مار کر اپنے بچپن کے شدید ہیجانی جذبات کا کھار سس کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بھی کبھی مٹکتی کی طرح لب نہ کھولے تھے تو پھر اچانک وہ کیوں بدل گئی؟ اس نے کیوں اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو حیرنے لگے۔

”اوئے ہا بوا! تو کوئی بات نہیں کرے ہے..... کوئی اچھی بات کرنا.....“ وہ قدرے لاڈ سے بولی۔

”کیا بولوں..... بولنے کے لیے کچھ ہو تو بولوں..... اور سنو، تم یہ اپنی زبان ذرا بدلو.....“ وہ غصے سے ڈانٹتے ہوئے بولا۔

”میں کیوں بدلوں اپنی زبان..... جو بچپن سے سیکھا ہے وہ کیسے بدل دوں۔ میری بولی میرے علاقے کی ہے، میں کا ہے کو بدلوں.....؟“

”اب قمیص اگر میرے گھر میں رہنا ہے تو اپنی زبان اور بولی کو بدلو..... ورنہ.....“ اس نے غصے سے گھور کر اسے دیکھا۔

"اچھا لھیک ہے، کوشش کرو ہوں۔" وہ ایک دم اس کی دھمکی سے ڈر گئی۔ اس نے خود ہی اپنی پسند کے اچھے اچھے کپڑے اسے خرید کر دیے۔ پارلر لے کر گیا۔ اس کی کنگ کروائی، فیٹل کروایا۔ سب کچھ ہو گیا۔ وہ تھوڑی سی بدلی، زیادہ نہیں۔ وہ پریشان ہو گیا۔ جب وہ بات کرتی، ماضی کی جھلک نمایاں ہو جاتی۔ وہ ماضی میں جس طرح لے میں سب سے اونچی بھرپور آواز لگاتی تھی، تو سوائے ہوئے بھی جاگ پڑتے تھے۔ یہ کم بخت منگنی صبح آ کر بہت جگ کرتی ہے، بہت شور مچاتی ہے۔ لوگ اسے گھر کتے۔

"ارے کون سا روز روز آتی ہوں۔ منگنی کو دو گے تو اللہ بہت دے گا۔" وہ ہونٹوں کو پھیلا کر اور منہ کو کھول کھول کر بات کرتی تو اس کا دہانہ قدرے پھیل جاتا اور یہ دہانہ اب اتنا پھیل چکا تھا کہ بات کرتے یا چستے ہوئے کھٹ سے پورے بتیس دانٹوں کی قطار کو بھر پور طریقے سے ظاہر کرتا۔

"ماضی کو کھرچ کھرچ کر صاف کرنا ہوگا۔" آفاق نے اس کی طرف دیکھ کر سوچا۔

"باؤ، کیسی لگوں ہوں؟" اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کا پورا وجود مختلف قسم کے قیمتی ہاڈی اسپرے، میئر اسپرے وغیرہ سے معطر ہو رہا تھا۔ وہ کچھ رسپانس چاہتی تھی۔ محبت بھرا س..... بھر پور..... پہلے وہ اپنے حقیر وجود کو اس کے قائل نہیں سمجھتی تھی اور آج تو وہ اپنے آپ کو قدرے اہم سمجھ رہی تھی۔ اس کے اندر کچھ کچھ خود اعتمادی اور خوش فہمی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی..... اور اس کی مسکراہٹ اسے زبر لگ رہی تھی۔

"اپنا آپ مت بھولو....." اس نے اسے جھڑکا۔

"ہاں تو کیا ہوا میں..... واقعی میں تو بھول ہی گئی....." وہ ایک دم خاموش ہو گئی اور سوچنے لگی۔ کبھی کسی کا ماضی بھی بدلا ہے۔ میں منگنی ہوں، منگنی فقیرنی۔ پہلے در در پر مانگنی پھرتی تھی، اب ایک ہی ور کی پالتو کتیا ہو گئی ہوں۔ یہ کبھی مجھے سحر کہتا ہے تو کبھی منگنی کا ماضی یاد دلاتا ہے۔ دو متضاد نام، دو مختلف وجود۔ ایک بدن دو وجود۔ دو شخصیتیں، دو ورخ۔ ہر ورخ تکلیفوں سے بھر پور، منگنی فقیرنی مر گئی، جس دن اس کی شادی ہوئی اور اب وہ سحر ہے۔ امیروں کی بہو اور امیر زادے کی دلہن۔ وہی کرنا پڑے گا جیسا وہ کہتا ہے۔ پہلا زوال ختم، جو فقیر کہتا تھا، وہ کرتی رہی تھی، اب جو آفاق کہے گا، وہ کرنا پڑے گا۔ اب نہ جانے کیا کیا کچھ سہنا پڑے گا۔ اس نے دکھ سے سوچا۔

وہ گھر میں داخل ہوئی تو ہر ایک نے اس کی طرف چونک کر حیرت سے دیکھا۔ وہ پنک کاشن کے اسٹائش سوٹ اور ہاب اسٹائل میئر کٹ میں قدرے مختلف لگ رہی تھی۔

"سحر اتم اچھی لگ رہی ہو۔" شفیق نے قدرے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

شرانے بھی حیران کن لگا ہوں سے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ اس نے کبھی بھی ان کے معاملات میں مداخلت اندازی کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی رائے دینے کی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دونوں بہن بھائی اسے کتنا ناپسند کرتے تھے۔ اس کی ہر بات کا الٹا مطلب لیتے تھے اور اس پر کتنا طعنے کرتے تھے۔ شادی کے بعد اس نے ایک دو دفعہ قاصدے مٹانے کی کوشش کی مگر اسے برے رسپانس کا سامنا کرنا پڑا اس لیے وہ خاموش رہتی تھی۔

آفاق آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹا تھا۔ نہ جانے کیوں، آج اسے اس سے بہت محبت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کو اپنی ذات اور حیثیت بھولتے ہوئے وہ اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی اور وارنٹی میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ وہ ایک دم چونک کر اٹھا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔

”تم..... تمہاری یہ جرات..... میرے بستر پر تم کیوں بیٹھیں..... اور تم کیوں اپنا آپ بھول جاتی ہو۔ یہ کپڑے، یہ میک اپ، یہ خوشبوئیں کبھی بھی تمہارا سزا مندزداد وجود نہیں بدل سکتیں.....“ اس نے اس انداز میں جوتا اٹھا کر اسے مارنا شروع کیا جیسے پھین میں اس نے ایک دفعہ باپ کو اس کی ماں کو مارتے دیکھا تھا۔ اسے تھوڑا تھوڑا یاد تھا، جب نانا باپا کوئی کاغذات لائے تھے اور اس کی ماں پہلی دفعہ کچھ بولی تھی۔ یونہی اس کے باپ کے بستر پر بیٹھ کر اس نے کچھ کہا تھا اور اسی طرح اس کے باپ نے اس کو دھنک کر رکھ دیا تھا۔ وہ اسے اٹھا اٹھا کر فٹ رہا تھا۔ کبھی اس کے گلے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوتا، کبھی اس کے بال کھینچتا اور وہ بغیر آواز لگا لے روئی رہی۔ ساری رات روئی رہی اور صبح ہونے پر وہ پھر نارمل تھا۔

”آئی ایم سوری انہ جانے کیوں تم جب بھی میرے سامنے آتی ہو، میں بدحواس ہو جاتا ہوں۔ سب کچھ بھول جاتا ہوں اور مجھے بہت کچھ یاد آنے لگتا ہے۔ میں بہت برا ہوں، آئی ایم ریلی سوری اؤ، مجھ کو، مجھے معاف کر دو۔ اوو، تمہارا تو بہت خون بہہ گیا ہے۔ سر پر اتنی گہری چوٹ آئی ہے۔“ اس نے اس کی چوڑی کی زخموں پر مرہم لگایا اور پہلی دفعہ اسے بستر پر لٹایا۔ وہ حیرت سے دیکھتی رہی، وہ اس کے قریب آیا۔

”تم مجھ سے محبت کرنا چاہتی ہو مگر میں..... میں تو محبت ہی نہیں کر سکتا۔ مجھے محبت کرنا آتی ہی نہیں۔ کیا تم جانتی ہو محبت کیسے کرتے ہیں؟ میں نے تو آج تک کسی کو محبت کرتے بھی نہیں دیکھا۔ تم کیوں یہ سب کرنا چاہتی ہو، جو میں نہیں کر سکتا؟“

”کیا میاں بیوی محبت نہیں کرتے؟“ اس نے پہلی دفعہ لب کھولے۔

”کون سے میاں بیوی..... میں نے تو کسی میاں بیوی کو محبت کرتے نہیں دیکھا۔ بس مارتے اور پیٹتے ہی دیکھا ہے۔“ وہ افسردگی سے بولا۔

”کس کو..... کون کس کو مارتا ہے؟“ وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔

”بس کچھ نہیں..... مجھ سے سوال مت کیا کرو۔“

”میں تم سے کچھ بھی نہیں چاہتی۔ نہ یہ تمہارا خوبصورت کمر، نہ تمہاری چیزیں، نہ دولت نہ گاڑی۔ ہم تو جھوپڑی میں پلنے والے لوگ ہیں۔ تھوڑے پر خوش ہونے والے۔ صرف مجھے ایک چیز دے دو۔“ اس نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

”کیا.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”صرف اپنے قریب آنے کی اجازت دے دو۔ جب تم مجھے دھکارتے ہو تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں انسان نہیں جانور ہوں۔ کوئی ذلیل کتیا ہوں، خارش والی۔ جس سے لوگ دور دور بھاگتے ہیں۔ تم مجھے جتنا مرضی مار لیا کرو، جو مرضی کرو مگر یوں نہ کیا کرو۔“ دور ونا شروع ہو گئی۔

”کیسے..... یہ سب.....؟“ اس نے حیرت سے دیکھ کر کہا۔

”اس طرح.....“ وہ اس کے سینے سے لگ گئی اور رونے لگی۔ محبت اور وارنٹی کا نیا انداز اس کے اندر بیچانی کیفیت پیدا کرنے لگا۔ اس کے اندر جذباتیت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ پہلی دفعہ کسی کو اسے قریب پا کر وہ بہت عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔

ہر رات پہلی سے زیادہ اذیت ناک ہوتی۔ وہ وحشی درد مند بن کر اسے خوب، مارتا، پیٹتا، جھتی اذیت دے سکتا، وہ اسے دیتا۔ شام کے تلخے اندھیرے پھلتے ہی اسے یہ خیال تنگ کرنے لگتا۔ ابھی بس ابھی..... چند لمحوں بعد وہ اس کے جسم کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دے گا۔ اس کا بدن

اب اذیت سنبے کا عادی ہو رہا تھا۔ عورت بھی کتنی سخت جان اور ڈھیٹ ہوتی ہے۔ صرف روشن اور چمک دار صبح کی خاطر سب کچھ سکتی ہے۔ جب وہ نارمل ہوتا، اس کی مرہم پٹی کرتا، اسے دوائیں دیتا تو وہ خوش ہو جاتی اور سارا دن پر سکون سوئی رہتی اور وہ باہر گھومتا رہتا۔ یہ کیسی زندگی تھی، جس کا نہ کوئی مقصد تھا، نہ کسی حاصل کی تمنا۔ وہ کیا کر رہے تھے۔ زندگی گزار رہے تھے یا بھر گزار رہے تھے مگر وہ مجبور تو نہ تھے۔ ایک دوسرے کو چھوڑ سکتے تھے۔ اتفاق اس کو چھوڑ سکتا تھا مگر وہ نہیں۔ اب تو کسی قیمت پر بھی نہیں۔ وہ اس سے شدید محبت کرنے لگی تھی، ایسی محبت جس میں نفرت زیادہ تھی اور محبت کم۔ جس میں لمس کم اور اذیت زیادہ تھی۔ ایسی محبت جس نے اس کے وجود کو..... اور اس کی روح کو زخمی کر چھوڑا تھا مگر وہ صرف اس کے محبت بھرے لمس کو یاد رکھتی باقی سب کچھ بھول جاتی، اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ ہر مرد، ہر عورت کے ساتھ ایسا ہی کرتا آیا ہے یا بھر صرف وہی؟ مگر اس نے اپنے باپ فقیرے کو بھی اس کی ماں کو مارے دیکھا تھا۔ اس کی ماں بھی اس کی طرح ڈھیٹ تھی۔ تو مرد چاہے جھوٹے ہی کا ہو یا محل کا۔ وہ کبھی بھی نہیں بدلتا اور عورت بھی نہیں بدلتی۔ چاہے کتیا میں سوئے چاہے آراستہ بیڈ پر۔ اس کا وجود ایک جیسا حقیر ہی رہتا ہے۔ نہ کبھی محبت بدلتی ہے اور نہ نفرت۔ وہ زیادہ تر وقت خاموش رہتی، کسی سے بھی کوئی بات نہ کرتی۔ اتفاق سے بھی بہت کم.....

”سحرا تم ٹھیک ہونا؟“ شفق نے اسے بہت دنوں کے بعد دیکھا تھا اور وہ اسے بہت مختلف لگ رہی تھی، بہت سنجیدہ اور خاموش سی۔
 ”ہاں.....“ وہ آہ بھر کر بولی۔

”کیا بات ہے؟ تم کچھ بولی نہیں۔“ شفق نے اسے کریدنا چاہا۔

”کیا کہوں..... کہنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں.....“

”تم اداس لگ رہی ہو؟“

”نہیں، ٹھیک ہوں۔“ وہ آہ بھر کر بولی۔

”سحرا، تم مجھ سے ہر بات کر سکتی ہو“ شفق نے اسے احاطہ بخشا۔

”کیا بات؟ کہنے کو کچھ بھی تو نہیں ہے۔“

”اتفاق تمہارے ساتھ ٹھیک ہے..... میرا مطلب ہے.....؟“

”ہاں، بہت اچھا ہے۔“ وہ قدرے اداسی سے بولی۔

”تم بہت بدل گئی ہو!“

”عورت ذات تو بدلتی ہی رہتی ہے، ہر گھڑی..... ہر وقت..... میں پہلے بچی تھی تو اور تھی، بڑی ہوئی تو اور ہو گئی، اب شادی ہو گئی تو اور ہو

گئی۔ میں نئے جنم لیتی ہوں تو پہلے والی مرنے جاتی ہوں۔ مرنے تک بدلتی ہی رہوں گی۔ معلوم نہیں عورت ذات کیوں اتنا بدلتی ہے۔“ اس نے افسردہ لہجے میں کہا تو شفق اس کی بات سن کر چوٹک گئی۔

”سحرا تم کیسی باتیں کرنے لگی ہو۔ تم نے..... میرا مطلب ہے کس سے یہ باتیں سیکھی ہیں؟“

”سیکھتی کہاں سے ہیں، یہ تو آپ ہی آپ اندر سے آتی ہیں اور جو اندر سے آتی ہیں۔ ان کو سکھانے والا کوئی بھی نہیں ہوتا۔ چاہیں کہاں سے آتی رہتی ہیں!“ وہ بولتی گئی۔

”ہاں..... تم صحیح کہہ رہی ہو۔ عورت لہو بہ لہو بدلتی رہتی ہے۔ نئی سوچ کے ساتھ نیا وجود جنم لیتا ہے۔ پہلا وجود ماضی بن جاتا ہے اور ماضی تو دفن ہی ہونے کے لیے ہوتا ہے..... اس کا بدلنا تو یقینی ہے۔“

شفق نے کہا تو وہ خاموشی سے سختی رہی۔



اس کی قربت نے اس کے اندر کو دہلا کر دیا تھا۔ وہ اک نئے لمس سے آشنا ہوا تھا۔ وہ لڑکیوں کو دور دور سے چھیڑنے اور ٹیز کرنے کا عادی تھا مگر یوں کسی کو قریب سے محسوس کرنے کا اتفاق اسے نہیں ہوا تھا۔ وہ اکثر خود ہی جھنجھلا جاتا۔ کیا یہ محبت ہے یا پھر سیکس..... جو بھی ہے، کیا اچھی قربت کے بعد کسی کو چھوڑنا ممکن ہے.....؟ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود..... وہ اس کے سامنے کارپٹ پر بیٹھی تھی اور وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

”کچھ نہیں..... شاید آنے والے دنوں کے بارے میں..... جب تم مجھے چھوڑ دو گی..... یا پھر میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“

”خدا نہ کرے!“ وہ ٹپ کر اس کی طرف بڑھی۔

”کیوں..... ایسا کیوں نہیں ہوگا؟“

”آفاق.....! میں تمہیں مرکز ہی چھوڑ دوں گی۔ میں تمہارے بغیر ایک ہل بھی نہیں رہ سکتی۔“

”جھوٹ مت بولو۔ تم سب عورتیں جھوٹ بولتی ہو۔ تم سب چھوڑ جاتی ہو۔ جھوٹی محبتیں کرتی ہو اور پھر.....“

”یہ تم کیسی باتیں کرتے ہو اور کس کی کرتے ہو.....؟“

”میری آنکھوں نے بڑی انہونی باتیں اور کرناک منظر دیکھے ہیں۔“

”مجھے نہیں بتاؤ گے؟“

”نہیں۔“

”کیوں.....؟“

”تم سمجھ نہیں سکو گی۔“

”میرے پاس دماغ ہے جواب پہلے سے زیادہ سوچتا ہے اور سمجھتا بھی ہے۔“

”مگر وہ کچھ نہیں سمجھ سکے گا جو میری آنکھوں نے دیکھا ہے۔“

”آنکھیں تو ہر وقت کچھ نہ کچھ دیکھتی ہی رہتی ہیں اور ہر منظر پہلے سے مختلف ہی ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوتا.....؟“

وہ اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ واقعی بدل چکی تھی۔ پہلے سے کتنی مختلف..... اس کی آواز، لب و لہجہ، قوت انسان کو بدلنے کے درپے ہوتی ہے۔ یہ سڑکوں پر مانتے والی بھکارن..... غلیظ، بدگو، ہڈیاں بکتے والی مگھتی..... گندگی اور تیل سے اٹی۔ جس کے سائے سے ہی لوگ دور بھاگتے تھے۔ اسے دور سے ہی دھتکار دیتے تھے۔ اسے گندی گالیوں سے نواز دیتے تھے وہ کبھی مسکرا کر گزر جاتی تو کبھی اس سے بھی بڑھ کر گالیاں دیتی۔ اب کتنی بدل چکی تھی۔ اس وسیع و عریض گھر میں آنے سے اس کا پہلا وجود مٹ چکا تھا۔ اب وہ اس کے وجود کا حصہ بن چکی تھی۔ اس نے اس کو کیسے خود بخود آپ ہی آپ منتخب کر لیا تھا۔ بے سوچے سمجھے گندگی کو اپنے وجود پر مل لیا تھا، نقصن سے بھرپور۔ سزاوند سے اٹا ہوا۔ تھ ہے تم پر..... ملک آفاق منصور، تھ ہے۔ ذمہ گی کے اس سفر میں تمہیں گندگی کا یہی ڈھیر پسند آیا۔ تم واقعی اس کے ہی قائل تھے..... یا پھر..... تم اس کے سر میں آگئے اور خود ہی اسے سر کا نام بھی دے دیا۔ بہت بے وقوف لگے، اس کے گلے میں پھانس ہی اٹکتے لگی اور وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

.....

”شفق! اگر تم ماڈلنگ شروع کر دو تو بہت کامیاب رہو گی۔“ زویا نے مشورہ دیا۔

”میں..... اور ماڈلنگ! کیوں مذاق کرتی ہو۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”یقین مانو، تم اچھی ماڈل بن سکتی ہو۔ تمہارا فیس کٹ..... تمہارے فیچرز..... تمہارا ٹیکر سب اس سے مطابقت رکھتے ہیں۔“

”زویا! تم کیوں اس کو ایسا کام کرنے کو کہہ رہی ہو۔ معلوم بھی ہے اس کے گھر والے.....“ عابد نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”عابد! یہ تم کیا ہر بات میں میرے گھر والوں کا ذکر چھیڑ دیتے ہو۔ یہ میری لائف ہے اور اس میں انٹرنیٹ کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں۔“

”اوکے..... اوکے، ڈارلنگ! ریٹیکس.....“ زویا نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”زویا! میں ماڈلنگ ضرور کروں گی۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں عابد کی طرف دیکھتے ہوئے زویا سے مخاطب ہوئی اور پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔

”گڈ! تم نے اس کی کمزوری پکڑ کر واقعی اچھا کام کیا ہے۔“ زویا نے عابد کو داد دی اور دونوں کھٹکھٹا کر ہنس دیے۔ دونوں شاطر ذہن

رکھتے تھے اور معصوم ذہنوں کو کس طرح مسخ کیا جاسکتا ہے، یہ فن انہیں خوب آتا تھا۔ دونوں ہنستے ہوئے اس کے پیچھے باہر آ گئے۔

”آئی ایم سوری! میرا مطلب تمہیں برٹ کرنا تو نہیں تھا۔“ عابد منہ بٹا کر بولا۔

”اوکے..... اس آل درائٹ!“ وہ خفگی سے بولی۔

”تم ہر بات پر کیوں للہیز اپ ہو جاتی ہو۔ تم بہت حساس ہو۔ اتنا پٹی ہونا اعصاب کے لیے بہت خطرناک ہوتا ہے۔“ وہ اب اسے نرمی

سے سمجھا رہا تھا۔

”یار ایہ کیا..... تم تو مذاق بھی نہیں سہہ پاتیں؟“ زویا نے بھی ہنسنے لگا۔

”مذاق..... مزاح..... ہلکا شوخیان..... ان سب کا میری ذمہ گی میں کوئی گنل ڈل نہیں۔ اس لیے مجھ سے سپاٹ لہجے میں سیدھی بات کیا کرو.....“

”او کے ڈیر! آئندہ کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جو تمہیں دکھ دے۔“ عابد نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا تو وہ مسکرا دی۔
 ”آؤ اب جینڈ مکمل ہو چکا ہے، ایک گانا تو گائیں۔“ عابد نے کہا۔
 ”کون سا.....؟“ زویا نے پوچھا۔
 ”وہی.....“

زندگی کی راہ میں
 جوں جوں گئے تھے سائیں

شوق کا موڈ کافی بھر ہو چکا تھا۔ عابد گتار لیے اس کے ارد گرد منڈلا رہا تھا اور وہ قدرے مفلوج ہو رہی تھی۔ محفل عروج پر تھی جب سہیل
 اسے لینے آ گیا۔

”یار! اپنے اس ڈرائیور سے جان چھڑاؤ..... کیا پروا ہے دانی کی طرح ہر وقت تمہارے گرد منڈلاتا رہتا ہے۔ لگتا ہے تمہارا ڈرائیور نہیں کچھ اور
 ہو۔ بہت پوزیسیو ہے تمہارے بارے میں۔ اگر یہ یونہی اسی طرح تمہیں راج کرتا رہا تو تم کچھ بھی نہیں کر پاؤ گی اور سنو، کل کنسرٹ ہے۔ اس کا
 بندوبست کر کے آنا.....“ زویا نے قدرے تھکسانہ لہجے میں کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ سہیل بھی روٹھا روٹھا سا لگ رہا تھا۔ دونوں خاموش رہے۔ وہ
 ساری رات پلاننگ کرتی رہی۔

اگلے دن وہ پھر اسے چھوڑنے گیا۔ وہ اس کی تیاری دیکھ کر چونک گیا۔ ”کیا آج وہیں کوئی پارٹی ہے.....؟“ سہیل نے اس کی طرف
 بھرپور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں تو.....“ وہ اچانک چوری پکڑے جانے پر ہکلائے لگی۔

”کب آؤں.....؟“ اس نے اسے ڈراپ کرتے ہوئے پوچھا۔

”آٹھ بجے.....“ وہ مسکرا کر بولی اور وہ گاڑی لے کر آگے چلا گیا۔

”خان..... رات کو آٹھ بجے یہ ڈرائیور مجھے لینے آئے تو کہنا کہ میں ابھی ابھی گھر چلی گئی ہوں کیونکہ صبح طبیعت خراب ہو گئی تھی۔“

چوکیدار نے اس کی بات پر اسے طرہ یہ مسکراہٹ سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ وہ اندر کی تمام باتوں کو سمجھ گیا ہے۔

”ہاں، بھئی تیار ہونا سب.....!“ عابد نے اسے آنا دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں۔“ زویا نے مسکرا کر جواب دیا۔

”شوق جم کون سا ڈریس پہنوں گی؟“ زویا نے معنی خیز اور تنقیدی نگاہوں سے اس کے لباس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”یہ ٹھیک تو ہیں۔ ابھی کل ہی تو یوتیک سے نیا خریدا ہے۔“

”اوہ.....“ کیسے پارٹی ڈراما کنسرٹ کے لیے موزوں نہیں۔ میں ابھی لاتی ہوں۔“ وہ بلیک لیدر جینز کے ساتھ سلیولیس نیٹ کا بلاؤز لے کر آئی۔

”کیا میں..... یہ پہنوں گی!“ شفق نے حیرت سے پوچھا۔

”یار تم نے تو ماڈلنگ بھی کرنی ہے۔ اس میں تو بہت مختلف ڈریسز پہننا پڑتے ہیں۔ اگر اس طرح جھجکتی رہیں تو کچھ بھی نہیں کر سکو گی۔“
زویا متحنا کر بولی۔

”میں جھجک نہیں رہی۔ لاؤ ابھی پہنتی ہوں۔“ جب دو ڈریس پہن کر نکلی تو جھینپ سی رہی تھی۔ جیسے پہلی دفعہ گناہ یا غلطی کرنے پر کسی کا اندر سرزنش کرتا ہے اور انسان شرمندگی محسوس کرتا ہے۔ وہ بھی سٹ رہی تھی۔ اپنا نیم عریاں جسم دیکھ کر اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

”گڈ..... بہت خوبصورت لگ رہی ہو..... اور سنو یہ پونی بھی کھول دو۔ میں اپنی بیوٹیشن کو بلاتی ہوں، وہ تمہارا میک اپ بھی کر دے گی۔“ اس نے موبائل پر فوراً نمبر ملا یا۔ وہ بات کرتے ہوئے ہا ہر لکل گئی۔

”ویری اسارٹ.....“ عابد کن آنکھیں سے اسے دیکھتا ہوا اس کے پاس آ گیا اور اس کے گرد اپنے بازو حائل کر دیے۔ وہ چونک سی گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی گرفت میں تھی۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“ وہ گھبرا کر بولی۔

”جب تم ہی مدہوش کرنے کے ورپے ہو تو کیا کروں؟“ وہ سرور سا ہو کر بولا۔

”وہ بس آرہی ہے۔“ زویا بولتی ہوئی اندر آئی۔ تب تک وہ اس سے علیحدہ ہو چکا تھا اور وہ غصے اور شرم سے سرخ ہو رہی تھی۔

”یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ بابا فرسٹ ٹائم تم نے یہ ڈریس پہنا ہے نا۔ اس لیے نروس ہو رہی ہو۔ ادھر بیٹھو اور یہ پانی پیو۔“ اس نے گلاس میں پانی ڈال کر اس کے آگے بڑھایا۔ پانی پیتے ہوئے اس کے ہاتھ مسلسل کانپ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی بیوٹیشن آئی اس نے تو اس کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ وہ آئینے میں بار بار دیکھ رہی تھی۔ ہر زاویے سے مختلف لگ رہی تھی۔ نیارخ..... نئی شخصیت..... نیا وجود..... جو نئے احساسات لیے ابھی ابھی جنم لے رہا تھا۔

”اگر تمہیں زیادہ گھبراہٹ محسوس ہو رہی ہے تو تم میرا بلیک گاؤن اوپر پہن لو۔“ زویا نے اس کی بڑھتی ہوئی گھبراہٹ دیکھ کر کہا۔

”یار اس طرح تو نہیں چلے گا۔ تمہارا پہلا کنسرٹ ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں پھر گھبراہٹ کیسی۔ تم میرے ساتھ گاؤ گی اور گانا کیا ہے۔ بس میرے ساتھ گنگنا نا ہی تو ہے۔“ عابد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ وہ نظریں جھکائے سب کچھ خاموشی سے سن رہی تھی۔ وہ نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ مبادا کہیں پھسل نہ جائے۔

”سات بجے ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“ عابد نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں تو نہیں جا رہی۔ میری کسٹ منٹ کہیں اور ہے۔“ زویا اٹھتے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب..... میں تمہارے بغیر قطعاً نہیں جاؤں گی۔“ وہ بے صبری سے بولی ”ڈونٹ بی سلی۔ بی کوئیڈنٹ۔ کب تک دوسروں کے سہارے چلو گی۔ خود چلنا سیکھو۔“ زویا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ خاموشی سے دونوں کی طرف بے بسی سے دیکھنے لگی۔ اس لمحے اسے یوں

محسوس ہونے لگا جیسے وہ ان دونوں کے درمیان ٹشل کا ک بن گئی ہو۔

”یہ ٹشو بھی لو اور اپنا پسینہ پونچھو۔ ابھی تو کنسرٹ شروع نہیں ہوا اور تم اتنی نروس ہو رہی ہو۔ ویسے آج تو تم قیامت لگ رہی ہو۔ یوں لگ رہا ہے جیسے چاند سارا حسن سمیٹ کر زمین پر اترا آیا ہے۔ مجھے تو قطعی یقین نہیں تھا کہ تم اس قدر حسین بھی لگ سکتی ہو۔ میں محسوس دیکھتا ہوں تو اپنے آپ پر کاغذ نہیں رہتا۔“ عابد بہت رو میٹھک موڈ میں بول رہا تھا اور اس کا دل اس کی باتوں پر دھڑک رہا تھا۔ عابد گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ وینڈو کار سے باہر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”تم اس قدر نروس کیوں ہو رہی ہو؟“

”نن..... نہیں..... شاید یہ میری زندگی کا پہلا شو ہے۔“

”ہاں سمجھتا ہوں..... مگر میں ہوں نا پھر کسی پریشانی۔ جب گرنے لگو گی تو میری ہانہیں محسوس خورا سمیٹ لیں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تو وہ مزید گھبرا گئی۔ اسے نہ جانے کیوں عابد سے گھن آنے لگی تھی۔ وہ اپنی لمٹس کر اس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے قبل اس نے اسے ایک میوزیشن، سنگر اور زویا کے دوست کی حیثیت سے عزت دی تھی۔ اسے اس سے کوئی محبت نہیں تھی۔ محبت تو وہ صرف سہیل سے کرتی تھی۔ ایک لمحے کو اسے یوں احساس ہونے لگا جیسے سہیل اسے صحیح بات پر ڈانٹتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کیسے لوگ تھے۔ اسے زویا پر بھی حسد آ رہا تھا۔ جو پہلے تو اسے دلار سے بلاتی تھی اور اب کیسے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ پورے جنڈ کے ساتھ اسے اکیلے بھیج دیا تھا۔ اسے زویا کی کوئی چال سی محسوس ہونے لگی۔ اس کے اندر شدید خوف طاری تھا۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ ایک تو اسے ایسا ڈر لیس پہنا دیا تھا دوسرے عابد اس کے ساتھ تھا۔ گو کہ اس نے گاؤں پہن رکھا تھا مگر اپنی حیرانی سے وہ اچھی طرح آگاہ تھی۔ وہ بار بار گاؤں ٹھیک کر رہی تھی۔

”یہ گاؤں تم اتار کیوں نہیں دیتیں۔ اتنی اسمارٹ لگ رہی تھیں۔ خواہو وہ یہ فضول سا گاؤں پہن لیا ہے۔“ عابد اس کی پریشانی بھانپتے ہوئے بولا۔

”نہیں..... میں اسی طرح ٹھیک ہوں۔“ اس نے پہلو ہدل کر کہا۔

”کنسرٹ شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ مختلف نئے پرانے گروپس ریہرسل میں مصروف تھے۔ اوپن ایئر میں کافی زیادہ کراؤ جمع ہو رہا تھا۔ اس کی نظریں لوگوں پر ہی تھیں۔ اسے بار بار یوں احساس ہو رہا تھا جیسے اس نے یہاں آ کر فاش فلطی کی ہو۔ عابد اس کو بار بار آہز رو کر رہا تھا۔ کنسرٹ سے پہلے سب نے ڈرنک کی۔ عابد نے اسے بھی گلاس تھمپا تو وہ چونک گئی۔

”نہیں..... میں یہ نہیں پیوں گی۔“ وہ درشتی سے بولی۔

”یہ بہت ضروری ہے۔ سرور اور مستی کے لیے۔ آڈینٹس جوش چاہتی ہے۔ تھرل چاہتی ہے اور اس کے بغیر ہم لوگ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ تم دیکھنا ایک دم کتنا کونفیڈنس آ جائے گا اور تم اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتا ہو محسوس کر دو گی۔ بہت اوپر میرے سنگ..... ہادلوں میں.....“

”خدا کے لیے۔ پلیز آئی ڈونٹ وانٹ اٹ.....“ وہ ملتھیانہ انداز میں بے بسی سے بولی۔

”یہ بہت ضروری ہے اور یوں سب کے سامنے تماشاست ہو۔ لو شاباش۔“ اس نے زبردستی گلاس اسے تھمایا۔ اس کی آنکھوں میں ایک دفعہ پھر بے بسی سے آنسو تیرنے لگے۔

”یہ نی، یہ اسی سب ختم ہو جائے گی۔ بس ایک دلع پنی کر تو دیکھو۔“ اس نے بغیر کچھ کہے سے وہ گلاس پنی لیا۔ اس کے بعد وہ کہاں تھی اور کیا کچھ ہوا اسے یاد نہیں تھا۔ بس شور و ہنگامہ مستی اور جوش ہی جوش تھا۔ وہ کب اور کیسے گھر پہنچی اسے کچھ یاد نہ تھا۔



باہر عجیب و غریب قسم کی آوازیں آرہی تھیں۔ سحر کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی گیٹ کو عجیب انداز سے دھکا دے رہا تھا اور پھر جیسے کسی کے گرنے اور گاڑی کی چرچاہٹ کی آواز آئی۔ اس نے آفاق کی طرف دیکھا وہ گہری غیند سو رہا تھا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ تین بج رہے تھے۔ شزا مری بچوں سے ملنے گئی ہوئی تھی اور منصور نہ جانے کہاں تھا۔ اسے شفق کی فکر تھی وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ بے قدموں سے باہر نکلی اور شفق کو گیٹ کے سامنے دیکھ کر چونک گئی۔ چونکہ آج ہی چھٹی لے کر گیا تھا۔ وہ شفق کو اندر لے کر آئی تو چونک گئی۔ وہ نشے میں دھت تھی۔ گاؤن اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کا بلاؤز جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کی حالت کچھ اور ہی کہانی سنارہی تھی۔ سحر کو اس کی حالت دیکھ کر شدید دکھ ہو رہا تھا۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا وہ اس سے بالکل بے خبر تھی۔ وہ اسے اس کے کمرے میں لے کر آئی اس کے کپڑے بدلے اور اسے اس کے بستر میں لٹا دیا اور خود اپنے کمرے میں آ گئی۔ شفق کی حالت بار بار اس کے سامنے آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اسے اس گھر میں صرف شفق ہی تو اچھی لگتی تھی اور وہ کس حالت کو جا پہنچی تھی۔ اس گھر کی حالت تو اس کی بھونپڑی سے بھی بدتر تھی۔ اسے یاد تھا جب تک اس کی ماں تھی وہ بہت بڑی ڈھال تھی اس کے لیے شاید یہ بچے تو بغیر کسی سہارے اور ڈھال کے پروان چڑھتے تھے۔

ایسے لوگوں کا کیا مستقبل ہوتا ہے۔ اس گھر کا تو شیرازہ بالکل بکھر چکا تھا اور ابھی نہ جانے کیا کچھ ہونا باقی تھا۔ وہ ساری رات نہ سو سکی۔ دکھ کی شدید لہریں اس کے وجود کو تہہ و بالا کر رہی تھیں۔ یہ کیسا گھر اور کیسے لوگ تھے۔ ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز۔ کسی کو کسی کا کوئی احساس نہ تھا۔ نہ تعلق نہ واسطہ۔ ہر کوئی اپنی ذات میں مگن ایسا تو وہاں بھی نہیں ہوتا تھا جہاں سے وہ آئی تھی اور جو معاشرے کا رذیل ترین طبقہ سمجھا جاتا تھا مگر جہاں محبت کسی کھوٹ کے بغیر تھی اور یہ معاشرے کا اعلیٰ طبقہ تھا جہاں نہ محبت کا وجود تھا اور نفرت کا وجود بھی بہت مبہم اور مشکوک تھا۔ دوپہر بارہ بجے آفاق ناشتا کر کے باہر جا چکا تھا۔ اس نے شفق کے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا اور نہ ہی اس نے بتانا مناسب سمجھا۔ آفاق باہر گیا ہی تھا کہ سہیل پریشان سا کمرے میں داخل ہوا۔

”سحر بی بی، وہ شفق.....؟“ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

”ہاں، وہ اندر سو رہی ہے۔“ وہ جلدی سے اس کی بات کاٹ کر بولی۔

”اچھا..... کب آئی.....؟“ اس کا چہرہ ایک دم کھل گیا۔

”تمہارے جانے کے فوراً بعد۔“ اس نے بات گول کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا میں تو ساری رات پریشان رہا۔ سحر بلی آپ شفق کو ان لوگوں سے ملنے مت دیا کریں۔ وہ اچھے لوگ نہیں اور وہ زویا تو پوچھیں مت کیسی نجاست ہے؟“ سہیل قدرے پریشانی سے بولا تو وہ اس کو اس کے لیے یوں پریشان دیکھ کر چونک سی گئی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ وہ آدھ کر بولی اور وہ مطمئن سالوٹ آیا۔

وہ اٹھ کر اس کے کمرے میں گئی۔ وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ وہ اسے آوازیں دیتی رہی مگر اسے کوئی ہوش نہ تھا۔

شام کے سات بج رہے تھے۔ جب اس کی آنکھ کھلی اس کا سر قدرے بھاری ہو رہا تھا اور آنکھیں سرخ۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ سحر لاؤنج میں لی وی دیکھ رہی تھی۔

”ہیلو کیسی ہو؟“ شفق سوئی سوئی آواز میں بولی۔

”ادھر آؤ میرے پاس۔“ سحر نے اسے پیار سے اپنے پاس بلایا۔

”سحر مجھے چائے چاہیے۔“ وہ اس کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اچھا میں بابا کو کہتی ہوں۔“ وہ لگ کو چائے کا کہہ کر اس کے پاس آ گئی۔

”شفق تم رات کو کہاں سے آئی تھیں؟“ سحر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں؟“ شفق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”یونہی پوچھ رہی ہوں۔ کیونکہ اس سے پہلے تو تمہیں ایسے لباس..... نشے اور اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا۔“

”نشا اور کیسی حالت؟“ وہ ایک دم اچھل کر بولی۔

”تمہارا سارا لباس پٹنا ہوا تھا اور تمہاری حالت ناقابل بیان تھی پھر میں نے بیڈریس قمیص پہنا دیا۔“

”اوہ گاڈ..... یہ سب کیا ہو گیا؟“ وہ شرمندگی سے ہونٹ چبانے لگی۔ خوف، دکھ، شرمندگی اور ذلت کے گہرے سائے اس کے چہرے پر

چھانے لگے۔ چائے اس کے سامنے رکھی تھی اور وہ مسلسل رو رہی تھی۔ اس کو کچھ یاد نہیں تھا۔

”کیا تمہیں واقعی کچھ یاد نہیں؟“ سحر نے حیرانی سے پوچھا اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سحر اسے دلاسا دینا چاہتی تھی۔ اس کی دل جوئی کرنا

چاہتی تھی مگر اس کے پاس ایسے الفاظ ہی نہیں تھے جو ذہنوں پر مرہم جیسا کام کر سکیں۔ اسے یوں دگی دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔ شفق اٹھ کر اپنے

کمرے میں آ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ دل پھٹنے کو بے تاب تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے

سب کچھ چھن گیا ہو۔ شرم و حیا، تقدس، بھرم، عزت، لاج وہ تو راکھ سے بھی زیادہ کم وقعت ہو گئی تھی۔ وہ کن لوگوں کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ وہ جو

معاشرے میں اپنا مقام ڈھونڈنے لگی تھی۔ اپنے آپ کو منوانے، اپنی حیثیت جاننے۔ اپنے وجود کی تعریفی کے لیے..... اور اسے بدلے میں کیا ملا تھا۔

”تف ہے تم پر شفق منصور اتم نے بہت کھانے کا سودا کیا۔“ وہ مسلسل اپنے آپ کو ملامت کر رہی تھی۔ ایسا دکھ جو وہ کسی کو نہیں بتا سکتی تھی۔

اس کی روح تک اس سے گھٹاں ہو رہی تھی۔ ایک دم فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فون اٹھایا تو عابد بول رہا تھا۔ اس کی آواز میں بہت ایکا موصاف تھی۔

”ہیلو ڈارلنگ، تمہیں خوشخبری سنانا تھی۔ ہمارا کنسرٹ بہت کامیاب رہا اور تمہارا ڈانس بھی لوگوں نے بہت پسند کیا اور تم نے جو مجھے مدہوش کیا وہ تو میں بتائی نہیں سکتا۔ ابھی تک اس کے سحر میں ہوں۔ کب آ رہی ہو؟ میں بہت بے چین ہو رہا ہوں۔“ اس کی آواز میں مستی سی تھی۔

”بہت جلد..... مگر آؤں گی ضرور۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ اسے خود ہی حماقت سی محسوس ہونے لگی کہ اس نے کیوں وہاں دوبارہ جانے کا سوچا تھا۔ جبکہ وہ اس کو دلہل میں اتار چکا تھا۔



وہ آفاق کی آمد کی شدت سے غصہ تھی۔ شام کے سائے رات کی تاریکی کو اپنے وجود میں سمیٹنے کے لیے تیزی سے کوشاں تھے۔ وہ کھڑکی سے باہر پھیلتی تاریکی کو دیکھ کر خوف زدہ ہو رہی تھی۔ کہیں آج وہ پھر اسے روٹی کی طرح دھنک کر نہ رکھ دے لیکن نہیں..... آج نہیں۔ آج میں اسے بہت بڑی خوشخبری سناؤں گی۔ شاید وہ مجھ سے محبت کرنے لگے۔ میرے وجود سے اس کی شناسائی بڑھنے لگے۔ میرے وجود کو پھر وہ اپنے اندر سمیٹ لے۔ اس کے لبوں پر آپ ہی آپ مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ آفاق رات کو بہت دیر سے آیا۔ اس کے چہرے پر قدرے مایوسی اور غصہ سا چھایا تھا۔ وہ آ کر اپنے جوتے اتارنے لگا۔ وہ اس کے تہو تو دیکھ رہی تھی مگر پھر کچھ سوچ کر اس کی طرف بڑھی اور اس کے جوتے اتارنے میں مدد کرنے لگی۔

”بیچھے ہو مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں!“ وہ غصے سے بولا۔

”کیوں..... کیا میں تمہاری بیوی نہیں؟“ وہ محبت سے بولی۔

”یہ تم کیا ہر وقت بیوی بیوی کی رٹ لگائے رکھتی ہو۔ مجھے کیا بتانے کی کوشش کرتی رہی ہو۔ پتا نہیں کہاں سے تم میرے پلے پڑ گئی۔ گندگی سے بھرا وجود۔“ وہ کراہت سے بولا۔

”تم خود میری جھونپڑی تک گئے تھے میں تمہارے محل تک نہیں آئی تھی۔ لڑکیوں کو چھیلنے کا تمہیں خبط تھا مجھے لڑکوں کے بیچھے جانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ آوارہ تم تھے۔ میرا تو دھندلا ہی وہی تھا۔“ وہ بھی بہت دنوں سے ضبط کیے بیٹھی تھی۔ ایک دم غصے سے پھٹ گئی۔ اس کی باتیں سن کر وہ ایک دم طیش میں آ گیا اور اس کی ایسی پٹائی کی کہ ساری زندگی کی مار اس کے سامنے کچھ نہ تھی۔ وہ اس کے پیٹ پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا وہ مسلسل درد سے کرا رہی تھی۔ اس کو ایک دم دھکا دے کر وہ باہر نکل اور شفق کے کمرے کی طرف بھاگی۔ شفق اس کو اس حالت میں دیکھ کر چوکی۔ اس کے بیچھے کھڑا آفاق خوں خوار درندہ لگ رہا تھا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ شفق نے زور سے ایک تھپڑ آفاق کے چہرے پر مارا۔

”تم ہمارے درمیان میں نہ آؤ۔“ وہ غصے سے بولا۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے تم سے میں بچھ میں بات کرتی ہوں اور تم کیوں اتنا کرا رہی ہو۔ چلو گاڑی میں، میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتی ہوں۔“ وہ اس کا بازو دھکڑ کر اسے گاڑی میں بٹھا کر لے گئی۔ وہ درد سے تڑپ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی اس کی جان ہی نکل جائے گی۔

”سحر ہست کرو، یہ سب کیا ہے؟“ اس نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

”وہ باپ بننے والا تھا۔“ وہ مشکل بولی۔

”اوہ گاڈ..... وہ کیسا ظالم نکلا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اسے اسپتال کے ایمر جنسی روم میں رکھا گیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ دیا جلتے سے پہلے ہی بچہ گیا تھا۔ مزید یہ کہ وہ کبھی زندگی میں دوبارہ اس نہ بن سکے گی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے۔ پہلے اس نے اپنے آپ کو کبھی بھی اتنا ذلیل اور بے وقعت نہیں سمجھا تھا۔ آج تو واقعی وہ منگتی ہوئی تھی۔ در در سے بھیک مانگتے والی خالی مچولی لیے بیٹھی تھی۔ اب کوئی خیرات کسی کام نہیں آئے گی۔ وہ تو اس کے ظلم اور سفاکی کو کبھی محبت سے تعبیر کرتی آئی تھی۔ اس کی مار پیٹ کو بھی محبت کا ایک رخ جانتی تھی اور کبھی بھی اس سے شکوہ کرنے کا سوچ نہیں سکتی تھی۔ اب تو اس نے اس کے وجود کا ثبوت ہی چھین لیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سارے خواب ہی لوچ لیے تھے۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹیں ہی چھین لی تھیں۔ اب تک وہ کتنی دفعہ مری اور کتنی دفعہ زمرہ ہوئی تھی مگر اب کی بار تو ایسی مری تھی کہ زمرہ ہونا مشکل تھا۔ آفاق آیا تو بالکل خاموش تھا۔ جیسے اس کے سامنے اس کا مجرم کھڑا تھا۔ اس نے نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ اس سے کبھی نفرت کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ہر رات وہ اسے اذیت دیتا تھا مگر وہ کبھی بھی اس سے نفرت نہ کر سکی اور اب نفرت کا ایسا بیج خود ہی اس نے پودیا تھا۔ نہ جانے کب اس کے اندر سے وحشتیں اور درندگی کم ہوگی۔ نہ جانے وہ کیوں اسے لایا تھا اور کون اس کا لے وار تھا۔ نہ وہ باپ کی سنتا تھا نہ بہن کی۔ وہ بار بار اس سے سوری کر رہا تھا۔

”آفاق اب کسی قسم کے الفاظ مجھے بہلا نہیں سکیں گے۔“ وہ روتی ہوئی بولی۔

”آئی ایم سوری، مجھے تم نے کچھ بتایا ہی نہیں تھا تو مجھے کیسے معلوم ہوتا۔“

”مجھے کچھ کہنے کا موقع تو دیتے۔ میں تو اسی خوشی میں تمہاری منتظر تھی مگر تم تو بہت بڑے قاتل نکلتے۔ تم نے اس کی بھی جان لے لی اور مجھے بھی جیتے جی زندہ درگور کر دیا۔ میرے وجود سے امید کی کرن بھی چھین لی۔ میں اب کس کے سہارے جیوں گی۔ عورت کی زندگی تو اس کی زرخیزی میں ہوتی ہے۔ مگر وجود کیسے زندہ لاشوں کی طرح پھرتے ہیں تم مردوں کو کیا خبر..... میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ وہ روتے ہوئے بولی اور وہ شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔

وہ ہاسپٹل سے گھر آ چکی تھی۔ ہر وقت زمین پر پیشی کرے کے درود پوار کو دیکھتی رہتی۔ شفق اس کی دل جوئی کرنے کی کوشش کرتی مگر بے سود..... اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں چھتے تھے۔

”سحر تمہارے ساتھ جب اس نے پہلی دفعہ ایسا کیا تھا تو تم اس کو چھوڑ کر چلی کیوں نہ گئیں؟“ شفق نے محبت سے اس سے پوچھا۔

”کیسے چلی جاتی اور کہاں چلی جاتی۔ بابا تو میرے دس ہزار وصول کر چکا تھا اور اب میں وہاں جاتی تو وہ مجھے ایک پل بھی نہ رکھتا کہ کہیں آفاق اس سے پیسہ نہ چھین لے۔ میرا تو کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ میں کہاں جاتی۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”مجھے قطعی علم نہ تھا کہ وہ اس حد تک دل گرفتہ ہو چکا ہے اور تم نے مجھے بھی کبھی نہیں بتایا۔“

”میں کیسے بتاتی۔ میں تو یہی سمجھتی رہی کہ میاں بیوی کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنے باپ کو ماں کو مار تے دیکھا تھا۔ میری

آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ اب میرے ساتھ ہو رہا تھا تو مجھے کیسے علم ہوتا مگر جب علم ہوا تب کیا ہو گیا؟“ وہ آہ بھر کر بولی۔
 ”اب تم نے کیا سوچا ہے؟“

”سوچتے رہیں جنھوں نے کچھ کرنا ہو۔ میری تو سانسیں بھی بکی ہوئی ہیں۔ میں کیسے سوچ سکتی ہوں اور کیا سوچوں؟“
 ”اس طرح تو زندگی نہیں گزرے گی۔ تم ٹھیک ہو لو میں تمہیں کسی کلب لے کر چلوں گی تاکہ تمہارا دل بہل جائے۔“
 ”اب اس دل کا بہلنا بہت مشکل ہے۔“ وہ یاسیت سے بولی۔

”اس قدر مایوسی ٹھیک نہیں۔ اپنے آپ میں ہمت پیدا کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اسے حوصلہ دینے کی کوشش کرنے لگی جبکہ وہ خود بھی ذرا ذرا بکھر چکی تھی۔ سہیل باہر آچکا تھا اور اب مسلسل باران بج رہا تھا۔
 ”سحر تم آرام کرو۔ میں تھوڑی دیر تک آ جاؤں گی۔ میں سہیل کے ساتھ باہر جا رہی ہوں۔“ شفق بیگ احتیاط سے اٹھاتے ہوئے بولی وہ خالی خالی نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

”تم آج پھر اس کی طرف جا رہی ہو۔“ سہیل نے خشکیوں لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”ہاں بس آج آخری بار۔ اس کے بعد پھر کبھی نہیں۔“ وہ مطمئن لہجہ میں بولی ”سہیل تم ادھر ہی کھڑے رہنا۔ بس چند منٹوں کی بات ہے۔ میں آ رہی ہوں۔“ وہ بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے جلدی سے باہر نکلے۔

وہ تیزی سے گیٹ عبور کر گئی کیونکہ اس وقت گیٹ پر چوکیدار بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔
 ”آؤ، ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔“ زویا اور عابد اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر بولے۔
 ”مجھے بھی تم لوگوں سے ملنے کی جلدی تھی۔ اس نے جلدی سے ریوالور بیگ سے نکال کر سیدھا عابد پر فائر کیا۔ زویا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی طرف چھینٹنا چاہا مگر اس نے اس پر بھی فائر کر دیا اور ریوالور سمیت جلدی سے باہر نکلے اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔
 ”گاڑی جیز چلاؤ۔“ اس نے سہیل سے کہا۔ اس کی آواز میں شدید کپکپاہٹ تھی۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اور اس کا چہرہ اور ہونٹ خوف سے بالکل سفید ہو رہے تھے۔

”شفق یہ تم نے کیا کیا۔ کیا تم نے زویا کو مار دیا۔“ سہیل پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔
 ”ہاں، اس کو بھی اور عابد کو بھی۔“

”کون عابد؟“ سہیل نے حیرت سے پوچھا۔
 ”تمہاں کا شیطان ساتھی.....“

”شفق میں تمہیں بہت منع کرتا تھا۔“ سہیل نے شکوہ کیا۔
 ”اب اس کا خیاں وہ میں نے ہی بھگتا ہے نا!“

”انہوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟“ وہ گاڑی تیز دوڑاتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور وہ کچھ نہ بول سکی۔ سہیل نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور آہ بھری۔

”اب کہاں جانا ہے؟“ سہیل نے پوچھا۔

”تھانے لے چلو۔“

”بے وقوف مت ہو۔ ملک صاحب کے الیکشن سرپر ہیں اور تمہارا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تو سب کچھ چوہٹ ہو جائے گا۔“ سہیل شکرانہ لہجے میں بولا۔

”کیا تمہیں مجھ سے زیادہ میرے باپ کی سادگی کی فکر ہے۔“

”نہیں، تمہاری عزت کے جو پر فچی جلسوں میں اڑیں گے۔ میں وہ برداشت نہیں کر سکتا۔“ سہیل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرے پاس اب کہنے کو کچھ نہیں رہا۔“ وہ بے بسی سے بولی اس نے گاڑی خود ہی کچے کچے راستوں کی طرف کر دی۔ وہ کہاں جا رہی تھی اسے کچھ خبر نہ تھی۔ وہ اسے کہاں لے کر جا رہا تھا۔ اس نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ کون اس کے بارے میں فکر مند ہو گا۔ اسے اس کی بھی پروا نہ تھی۔ اس کے لیے کچھ بھی پرالیم نہیں رہی تھی۔ نہ زندگی نہ عزت اور نہ اس کے تھانے۔ اب وہ مکمل طور پر حالات کے رحم و کرم پر تھی۔

”رہو اور مجھے دو۔“ سہیل نے رہا اور اس سے لے لیا اور گاڑی کھڑی کر کے اسے کچی زمین میں وہاں دیا۔

”تم کیوں مجھے پچانے کی کوشش کر رہے ہو؟“ شنفق نے اس سے پوچھا۔

”کیونکہ تمہیں میں نے اپنے آپ سے بڑھ کر چاہا ہے۔“ وہ شکت لہجے میں بولا۔



”مسز پیٹر آپ کا لیٹر آیا ہے۔“ وارڈن نے اسے خط دیتے ہوئے کہا۔ وہ خط لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور جلدی جلدی کھول کر اسے پڑھنے لگی۔ وہ جانتی تھی کس کا خط تھا اسے ہمیشہ اسی خط کا تو انتظار رہتا تھا۔ ورنہ اب اس کی زندگی میں اور کیا باقی رہ گیا تھا۔ ولیم نے مزے مزے کی باتیں لکھی تھیں۔ وہ بار بار انہیں پڑھ کر مسکرانے لگی۔ ہر دوسری لائن میں آئی مس یو مام کا جملہ تھا۔ وہ خط پڑھ کر اسے چومنے لگی۔ اس کا دل اسے ملنے کوڑ پنے لگا۔

”مجھے اس سے ملنے جانا چاہیے۔“ اسی سوچ پر سوئی جیسے ایک سی گئی تھی۔ اس نے اگلے ہی دن کالج میں چھٹی کی درخواست دے دی۔

”مسز پیٹر، آپ ایک ہی تو تھیں کی لیکچرار ہیں۔ اگر آپ بھی چھٹی پر چلی جاتی ہیں تو اسٹوڈنٹس کا بہت ٹائم ویسٹ ہوگا۔ آپ کا نعم البدل بھی تو کوئی نہیں۔“ پرنسپل نے اس کی درخواست پڑھتے ہوئے کہا۔

”میڈم وہ تو ٹھیک ہے مگر میرا بیٹا بہت ڈسٹرب ہے۔ میں آج شام کو جاؤں گی اور پرسوں واپس آ جاؤں گی۔ لاہور سے مری کا قاصد بھی تو بہت ہے۔ کافی وقت لگ جاتا ہے۔“ وہ بے چینی سے بولی۔ مسز جمال نے افسردگی کے آثار اس کے چہرے پر دیکھے اور خاموشی سے چھٹی دے

دی۔ وہ خوشی خوشی ہاسٹل واپس آئی۔ اس کے لیے بہت سی چیزیں پیک کیں۔ جو وہ گا ہے بگا ہے اس کے لیے خریدتی رہتی تھی اور سامان پیک کر کے وارڈن کے پاس چلی گئی۔

”مس افضل، میں ایک روز کے لیے مری جا رہی ہوں۔ میرا بیٹا کچھ اپ سیٹ ہے۔ پرسوں لوٹ آؤں گی۔“

”اوکے، اپنا خیال رکھیے گا اور بچے کو بھی پیار کرنا۔“ مس افضل خوش دلی سے بولیں۔

”تھینک یو مس افضل۔“ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔

سارا راستہ وہ ولیم کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ ولیم اور پیٹر، ماضی کی کتاب کے صفحات سوچوں کے جھونکے سے بار بار الٹ پلٹ ہو رہے تھے۔ پیٹر بہت بدل گیا تھا جب سے اس نے اسے بتایا تھا کہ وہ ضرور بچے کو جنم دے گی۔ وہ اس سے ٹھیک طرح سے بات بھی نہ کرتا۔ اس نے ایسا رویہ اپنایا تھا کہ وہ جلدی سے یہاں سے چلی جائے۔

”تم یہاں سے جلدی چلی جاؤ۔“ وہ اس سے جلد از جلد چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے اسے کہی کہتا رہتا۔

”کہاں جاؤں؟ اپنے آشیانے کو تو میں نے خود ہی آگ لگا دی ہے۔ اب تو اس کی راکھ بھی ہوا میں منتشر ہو چکی ہوگی۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”میں نہیں جانتا مگر تم اب یہاں مزید نہیں رہ سکتیں۔“ وہ سخت لہجے میں بولا۔

”پیٹر میں تم سے کچھ بھی طلب نہیں کروں گی۔ بس اس کی شیڈن شپ تو ادھر کی ہو۔“

”یہ کبھی بھی نہیں ہوگا تا کہ وہ یہاں آ کر مجھے دوبارہ تنگ کرے۔ تم ایسٹرن ویمن بہت دور کی پلاننگ کرتی ہو۔“ اس کی باتوں اور لہجے

میں بلا کا طنز تھا۔

”نہیں، میرا تم سے وعدہ ہے۔ میں اسے کبھی تمہارے بارے میں نہیں بتاؤں گی۔ وہ کبھی تم سے کچھ طلب نہیں کرے گا۔“ اس کے لہجے

میں الجھتی تھی۔

”ٹھیک ہے تم ڈیلیوری تک ادھر رک سکتی ہو مگر بے بی کا سارا خرچہ تم خود افرارڈ کرو گی۔ میں جب اس کا وجود ہی نہیں چاہتا تو اس کے لیے

خرچہ کیوں کروں۔“ وہ اس قدر بے ہاکی سے بولا کہ وہ حیران رہ گئی۔ جانور بھی اپنے نومولود کی اتنی کیئر کرتے ہیں اور یہ کیسا عجیب شخص تھا۔ اسے

شدید دھچکا لگا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ اس شخص کو نہ جانے کس سے اتنا خوف تھا حالات کی ماری بے بس عورت سے یا اپنے ہی نئے وجود سے جو مستقبل

میں اس کے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔ اس سے قبل وہ تین بچوں کو جنم دے چکی تھی مگر ولیم کے لیے اس نے جتنی ذہنی و جسمانی مشقتیں اٹھائی تھیں صرف

وہی جانتی تھی۔ وہ دو دو جگہ جاب کرتی۔ رات گئے تک پیٹر کے ساتھ اس کی شاپ پر کام کرتی کیونکہ وہ اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ جو مصیبتیں اور

اذیتیں اٹھا رہی تھی۔ پیٹر سے شیزنک نہیں کر سکتی تھی کیونکہ یہ سب اس کی منتخب کردہ تھیں۔ جیسے جیسے ڈیلیوری کے دن قریب آ رہے تھے پیٹر زیادہ تر

باہر ہی رہتا اور جس دن اس نے بچے کو جنم دیا وہ اسے دیکھنے بھی نہیں آیا حالانکہ اس کی شکل و صورت پیٹر پر تھی۔

وہ جیسے ہی ولیم کو لے کر گھر آئی۔ اس نے کچھ ڈاکو منٹس پر اس کے سائن لے لیے۔

”اب تم مجھ سے اپنے اور بیٹے کے لیے بھی ڈیما غنیمتیں کر سکو گی۔“ اس نے طلاق کے کاغذات سائن کر کے اس کے حوالے کر دیے۔ وہ حیرانی سے اس شخص کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ انگریز قوم کس قدر شاطر اور ذی ہوش ہوتی ہے کہ خطرات کو پہلے سے ہی سمجھ کر ان کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ ان کی پلاننگ ہمیشہ سے قائل قسین رہی ہے اور اب وہ اس کی قائل ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ اپنے وجود کی شناخت کے نشے میں اس نے ایسے کاغذات سنبھالے تھے اور اب اپنے وجود کی بھاکے لیے۔ ماضی پر ت پر ت اس کے سامنے تھا۔ اس کا وجود راکھ کی مانند ہوا میں بکھر رہا تھا۔ عورت بھی کتنی سخت جان ہوتی ہے۔ کیسی کیسی باتیں سہتی رہتی ہے۔ کیا کچھ اپنے اندر چھپاتی رہتی ہے مگر بھی اسے کچھ نہیں ہوتا۔ روز و شب کا معمول اور زندگی کا سفر جاری و ساری رہتا ہے۔

حیدر بھی یہی کہتا تھا۔ جب وہ آخری بار سے ملا تھا۔

”کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ماضی کہیں دفن ہو جاتا ہے۔ حال بہت سارے تھکائے کرتا ہے اور مستقبل قربانیاں مانگتا ہے۔ شہلا جو لوگ زندگیاں گزار کر اب خاک میں پنہاں ہو گئے ہیں۔ انہیں کون پوچھتا ہے اور کون یاد کرتا ہے کہ انہوں نے کیا کیا کس کس کے تیاگ دیا۔ انہوں نے کیا کیا دکھ اپنے اندر سیٹھے۔ ان کے وجود نے کیا کچھ برداشت کیا۔ وہ بس یادوں کے دفینوں سے ایک جھونکے کی طرح کبھی کبھی آتے ہیں۔ دل سے ہو ک سی اٹھتی ہے اور بس..... کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بس یہی زندگی کا گورکھ دھندا ہے لیکن مستقبل تو ہر اک شخص سے متقاضی رہتا ہے۔ ہاں حیدر واقعی مستقبل متقاضی رہتا ہے۔ ماضی کو ٹوٹا ہے۔ حال کو تھوڑا اور کھٹکا ہے اور پھر کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ زندگی کی اس تپتی دھوپ میں صرف حیدر ہی اک شجر سایہ دار تھا جس کے سائے تلے وہ چند لمحوں کے لیے سستانے کو کتنی تھی اور یہ سایہ اس کے لیے کتنا قیمتی تھا۔ یہ صرف وہی جانتی تھی۔

سرائے عالمگیر سے آگے پٹھانوں کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ اونچی نیچی مٹی کی پہاڑیاں۔ کہیں کہیں گھاس پھوس اور جڑی بوٹیوں سے اٹی ہوئیں۔ اوپر دور تک پھیلا وسیع نیلگوں آسمان۔ زندگی بھی تو ایسی ہی ہے۔ نہ جانے ان ٹیلوں نے کتنے حادثات زمانہ سہے ہیں اور ابھی تک ان مٹ نقوش کی طرح ماضی کی داستانیں لیے کھڑے ہیں۔ حال کو سیٹھے اور مستقبل کا سامان کیے ہوئے زندگی کی طرح.....

کوچ ایک ریسٹورنٹ کے سامنے رکی۔ سب مسافر نیچے اتر گئے۔ اس نے بھی چائے کا کپ لیا۔ ولیم کے لیے کچھ چاکلیٹیں خریدیں اور واپس کوچ میں آ گئی۔ کوچ میں صرف دو تین مرد تھے مگر وہ اب کسی سے خوف زدہ نہیں تھی۔ مشرق و مغرب کے عجیب تجربات اس کے اندر موجود تھے تلخی کا حتی نتیجہ ہمیشہ بنتی ہوتا ہے اور اس کا وجود اب پتھر کا ہو گیا تھا۔ چٹان کی طرح سخت..... جواب بھی ماضی کی تلخ یادوں کے الاؤ میں ریزہ ریزہ ہوتا رہتا تھا۔ اس نے اپنے کھجڑی بالوں پر ہاتھ پھیرا اور سہری فریم والی نظر کی عینک دوبارہ صاف کر کے لگائی اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع ہو گئی۔ سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ شام داخل رہی تھی۔ سرسبز و شاداب بل کھاتی سڑکوں کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اوپر نیچے ڈھلوانوں پر موجود گھروں میں برقی قیتے روشن ہو چکے تھے۔ جیسے اندھیرے میں جگنو چمک رہے ہوں۔ مغرب کی اذان کہیں دور آ ہادی سے سنائی دی تو نادانستہ اس کے ہاتھ دوپٹے کی طرف اٹھ گئے۔ اس نے سر پر دوپٹا رکھنا چاہا اور پھر رک گئی۔ دوپٹا سر سے ڈھلک گیا۔ مسز پیٹر اور اذان کی تعظیم..... اس کے اندر کہیں سے طرہ قہقہہ ابھرا۔ کوچ میں ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ ڈرائیور نے شوخ و خنفل گانے لگائے ہوئے تھے اور بہت سے لوگ مسرور ہو رہے تھے۔

”بھائی اس مصیبت کو بند کرو۔ اذان کا وقت ہے۔ کچھ تو خیال کرو۔“ کہیں پیچھے سے آواز آئی تو ڈرائیور نے خشکیں لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا اور شپ بند کر دیا۔ اذان کی تعظیم سے وہ مسلمانیت کے دائرے میں تھا۔ ذرا سی چوں چرا کرتا تو ابھی ایک لمحے میں اس کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا۔ پندرہ منٹ اس نے انتظار کیا پھر آواز اونچی کر دی۔

”بند کرو اس کم بخت کو۔ بزرگ نماز پڑھ رہے ہیں۔“ پھر آواز آئی۔

”یار ایک تو یہ لوگ..... اور ان کی نمازیں!“ ڈرائیور بڑبڑانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر آواز اونچی کرنے کی کوشش کی۔

”بند کرو اسے۔ ابھی نماز پڑھی جا رہی ہے۔“ پھر آواز آئی۔

”آپ لوگوں نے ساری قضا نمازیں ابھی ہی پڑھنی ہیں۔“ ڈرائیور جھنجھلا کر بولا۔

”اور تم نے گانے سن کر امتحان دینا ہے۔“ ایک بزرگ کڑک دار آواز میں بولے۔

”باباجی میرے منہ مت لپے ورنہ.....“ وہ اکڑ کر بولا۔

”ورنہ کیا اونے؟“ بزرگ اس عمر میں بھی خاصے صحت مند تھے۔ اسی میں غلغلہ اٹھا۔ ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ اتنے خطرناک راستوں اور بلند یوں کا سفر کرنے والے کتنی پست ذہنیت رکھتے ہیں۔ اس نے سوچا۔ بہت سے لوگوں نے ڈرائیور کو سنبھالا۔ کچھ نے بزرگ کو سمجھایا۔ پورا گھنٹہ اسی میں صرف ہو گیا۔ اچھی خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اب وہ قدرے لیٹ پیچھے کی اسے یہ سوچ سوچ کر کوفت ہو رہی تھی۔ ان لوگوں کی چھوٹی سی بات اس کے لیے کتنے بڑے نقصان کا باعث بنے گی۔ اسے طبع بھی آ رہا تھا۔ وہ جو وقت سوچ کر آئی تھی۔ اس تک پہنچ جاتی تو ولیم اس کے ساتھ رات گزار سکتا تھا مگر اب تو اسے خود بھی رہائش کا مسئلہ ہوگا۔ لوگوں نے سمجھا سمجھا کر دونوں میں صلح کروائی اور پھر گاڑی چلنے لگی۔ اب باباجی آہستہ آہستہ نرم لہجے میں نصیحتیں کر رہے تھے اور ڈرائیور منہ پھلانے سن رہا تھا۔ اس کا موڈ سخت آف تھا۔ گانے بند ہو چکے تھے اور گاڑی اب فرائے بھرتی جا رہی تھی۔ اچانک کوئی گاڑی سامنے آئی تو وہ ایک دم زبردست بریک لگاتا۔

”خدا کے لیے بھائی غصہ تھوک دواور آرام سے ڈرائیور کرو۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ ہیں۔“ ایک آدمی بولا۔

”چھوٹے چھوٹے بچے ہیں تو مری میں کیا کرنے جا رہے ہو گھر بیٹھنا تھا۔“ ڈرائیور ہرگوئی میں خاصا ماہر تھا۔

”بھئی بچوں کو ہی تو گھمانے کے لیے لے کر جا رہا ہوں۔“ وہ آدمی منمنایا۔

”تو اب کرنے دو انھیں حرام۔“

”بھائی اس کے منہ نہ لگو۔ بڑا ہی منہ پھٹ ہے۔ بد لحاظ۔“ وہ بزرگ دوبارہ بولے۔

”بزرگ آپ پھر ناگ اڑا رہے ہیں۔“ وہ گاڑی بند کر کے ہاں پر نکل گیا۔ سب لوگ سخت پریشان ہو رہے تھے۔

”باباجی، آپ بھی خاموش نہیں رہ سکتے۔“ وہ آدمی دوبارہ بولا۔

”بھائی خدا کے لیے آ جاؤ۔ بہت دقت ہو گیا۔ کب مری پہنچیں گے۔“ ایک ادھیڑ عمر عورت نے اس کے پاس جا کر کہا۔

”ٹھیک ہے ماں جی۔ آپ کی عزت کرتا ہوں ورنہ“ اس نے گھور کر بڑے میاں کو دیکھا اور سر ٲٹس لگا یا۔

”بھائی آپ کے اس جھگڑے میں میرا کتنا نقصان ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ آپ کو تو معلوم نہیں۔ مجھے اپنے بیٹے سے ملنے جانا ہے اور اب اس قدر دیر ہو گئی ہے۔“ وہ تنگ آ کر یولی۔ ڈرائیور نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے گاڑی نہرو کی اور قدرے خاموشی سے چیز ڈرائیو کرنے لگا۔

رات بارہ بجے وہ مری پہنچی۔ موسم قدرے خشک ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی دھند نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک ہوٹل میں اس نے کمر الیا۔ کھانا کھا کر وہ کمرے میں آ گئی اور کھڑکی سے پردہ ہٹا کر نیچے دادی میں دیکھنے لگی۔ تاریکی میں جگنوؤں کے مانند ٹٹھلتی روشنیاں مری کی خوبصورتی میں اور اضافہ کر رہی تھیں۔ نیچے مل کھاتی سڑکوں پر ابھی تک لوگوں کی چہل چل جاری تھی۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کیلو، پٹے مسکراتے ہوئے اور قہقہے لگاتے ہوئے ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سب کی غنڈیں جیسے غائب ہو چکی تھیں۔ سب انجوائے کرنے کے موڈ میں تھے۔ یہ بھی تو زندگی کا ایک رخ ہے کتنا خوبصورت، کتنا حسین، کتنا دل فریب۔۔۔ مگر صرف چند لوگوں کے لیے۔ اس نے پردہ آگے سرکا دیا اور خاموشی سے آ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ ولیم اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ ابھی اور اسی وقت اس سے ملنا چاہتی تھی مگر بے بس تھی۔ اس وقت تو وہ خود بھی گہری نیند سو رہا ہوگا۔ کتنی جلدی وہ نو مولود بچے سے بیڈ سم لو جوان بن گیا تھا۔ وہ مری کولونٹ میں پڑھ رہا تھا، اولیول کا اسٹوڈنٹ تھا، ذہین و فطین، مشرق و مغرب کا حسین احتراج، اس کے نقوش اسٹرکچر سب پیئر پر تھا اور آنکھیں اور بال ماں پر۔ وہ پہلی ہی نظر میں خوبصورت نو جوان لگتا تھا۔ وہ بالکل کارز لگتا تھا۔

وہ کتنی تنہا اور بے آسرا تھی۔ جب وہ گود میں اسے اٹھائے دوبارہ اپنے ماضی کی طرف لوٹی تھی۔ دوبارہ اپنی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ جب وہ گئی تھی تو کتنے لوگ اس کے اپنے تھے اور اب لوٹی تھی تو دور دور تک بھی کوئی شناسا نظر نہ آیا۔ وہ تو بالکل ہی مختلف وجود لیے لوٹی تھی۔ یہ کیسا شناخت کا سفر تھا جس میں ایک بھی جاننے پہچاننے والا باقی نہیں رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے ورنگ و یمن ہاسٹل میں پناہ لی اور بہت تنگ و دو کے بعد ایک پرائیویٹ کالج میں جاب شروع کر دی۔ پہلے پہلے تو اتنی عسرت و تنگ دستی میں دن گزرے کہ ولیم جو بھی خواہش کرتا وہ کبھی پوری نہ کر پاتی پھر اس نے ٹیوٹنر یعنی شروع کر دیں اور حالات بہتر ہو گئے مگر اب ولیم کوئی خواہش نہیں کرتا تھا۔ وہ سمجھ دار ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے پرانے کھلونوں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ وہ بچپن سے ہی بہت ویل میزڈ اور سمجھ دار بچہ تھا۔ کبھی کوئی بد تمیزی نہ کرتا۔ سب لوگ اس سے مل کر بہت متاثر ہوتے تو وہ اسے اپنے لیے اعزاز سمجھتی۔ درنہ اس سے قبل ملک منصور کے بچے تو کسی شے سے محروم نہیں رہے تھے۔ وہ جو خواہش کرتے وہ ضرور پوری کرتا۔ ولیم کو یوں محروم دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوتا، آٹھ سالوں سے وہ مری میں پڑھ رہا تھا اور اب اسے بہت مس کرتا۔ اسے بھی دکھ ہوتا۔ اس کا تو سارا بچپن تنہائی کی نذر ہو گیا تھا۔ اسے اپنے پہلے بچوں کے لیے اتنا دکھ محسوس نہیں ہوتا جتنا ولیم کے لیے۔ ان کے پاس ملک منصور تھا۔ ان کی ہر خواہش پوری کرنے والا۔ ولیم کے پاس تو صرف ماں تھی اور وہ بھی تنگ دست..... وہ کیسا بے بس اور محروم بچہ تھا جس کے حصے میں محبتیں بھی پوری طرح نہیں آئی تھیں۔ اسی لیے وہ سب سے زیادہ ولیم سے محبت کرتی۔ کبھی کبھی لٹک کی یاد بھی بہت ستاتی۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب اس نے اسے چھوڑا تھا مگر شفق، آفاق اور ملک منصور کا سوچ کر مطمئن ہو جاتی۔ رات اس کی خیالوں میں گئی۔

”پلیز ویٹ..... ہی از کمنگ!“ ایک نن اسے وزیٹرز روم میں بٹھا کر بولی۔ وہ بے چینی سے پہلو بد لے لگی۔ جب وہ لاہور سے چلی تھی تو طبیعت میں ایسی بے گلی نہ تھی اور اب منزل پر پہنچ کر انتھارنا ممکن ہو رہا تھا۔ شاید انتھار کا فلسفہ ہی یہی تھا کہ جب تک جائے منزل تک پہنچ کر انسان کی بے چینیوں آخری حدوں کو نہ چھو لیں تب تک اس کا وجود مکمل نہیں ہوتا۔ ولیم اندر داخل ہوا تو وہ چمک سی گئی۔ وہ اس سے قدم میں کافی لمبا لگ رہا تھا۔ لمبا ترنگا خوبصورت نوجوان۔

”ولیم مائی ڈارلنگ..... مائی سویٹ ہارٹ۔“ وہ اسے والہانہ انداز میں چوم رہی تھی۔ خوشی اور جدائی سے اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔

”آج تم پورا دن میرے ساتھ گزارو گے۔ میں نے پریشانی لے لی ہے۔“

”ریلی!“ وہ خوشی سے اچھلا۔

”ہاں ڈیئر۔“ وہ پھر اسے گلے لگاتے ہوئے بولی۔

”مام..... میں یو پیٹارم چھینج کر کے آتا ہوں۔“

”اوکے، آئی ایم دیننگ ا!“ اس نے اپنی نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے کہا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ایک خوبصورت جگہ اسماٹھ

عورت اپنے دو بچوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ اسے چہرہ کچھ شناسا سا لگا۔ بار بار ذہن کے پردے پر شہید سی نمودار ہوتی۔ وہ اپنے ساتھ

ڈھیروں چیزیں لائی تھی اور بچوں کو دے رہی تھی۔

”یہ کون ہو سکتی ہے؟“ وہ مسلسل سوچ رہی تھی۔

”مما پاپائیں آئے۔“ مچھولی بچی روٹتے ہوئے بولی۔

”وہ مصروف تھے تم جانتی تو ہو۔“ ماں نے اسے سمجھایا۔ اس کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔

”اوہ گاڈ..... شزا.....“ ایک دم یہ نام اس کی زبان پر آ گیا اور اس کے لیے وہاں رکنا محال ہو گیا۔ وہ اس سے پچھنا چاہتی تھی۔ جیسے ہی

ولیم آ یا وہ اس کو لے کر جلدی سے باہر نکل گئی۔

”مما پاپا کو لے کر آتا تھا۔ آئی مس ہم.....“ وہ روتے ہوئے پاؤں پھنکتی باہر نکل گئی۔ وہ بہت ضدی ہو گئی تھی۔

”سمیر جاؤ بہن کو بلا کر لاؤ۔ میں اتنی دور سے آئی ہوں۔ اسے بولو مما سے تو ملو۔ کیا ممایو نہیں چلی جائے گی۔“ اس کی خوبصورت نیلی

آنکھیں آنسوؤں سے گھملائے لگیں۔

”او کے ممایا۔“ وہ چھوٹا تھا اس لیے کچھ نہ سمجھ سکا اور بہن کو منانے چلا گیا۔

”مائیں بچوں کے لیے کتنی مشکلات اٹھاتی ہیں اور باپ..... ان کے باپ کو تو ان کی پروا بھی نہیں اور بچے باپ کے لیے کس قدر تڑپ

رہے ہیں۔“ اس نے اک ادا سے ٹشو پیپر سے آنکھیں صاف کیں تاکہ مسکرا پھیل نہ جائے۔ شائل منہ مسورتی ہوئی اندر آ گئی۔

”ادھر آؤ مائی چائلڈ۔ سویٹ شائل۔“ وہ اسے لاڈ سے منانے لگی۔ اس کا موڈ ابھی تک سخت آف تھا اور وہ ماں سے بات بھی نہیں کرنا چاہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

رہی تھی۔

”آج میں تم لوگوں کو بہت گھماؤں گی۔“ شزا کی یہ خوش خبری انھیں کوئی خوشی نہ دے سکی۔ ڈرائیور باہر کھڑا تھا۔ وہ ان کو لے کر باہر آ گئی۔

ولیم کے ساتھ قدم سے قدم ملاتے ہوئے اسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ ایسی خوشی جو ایک ماں ہی محسوس کر سکتی ہے جب اس کی مٹھی سی کو نیل

تقاور درست بنتی ہے۔ اس کے ماہ و سال کی محنت اس کے سامنے ہوتی ہے وہ لمحے اس کے لیے کتنی بڑی نوید لاتے ہیں۔ جب وہ ان کو تقاور دیکھتی

ہے۔ ولیم مسلسل ہاتھیں کر رہا تھا۔ اس نے قہقہے کہاں دیاں اور وہ مسلسل بن بن کر ہنس رہی تھی۔ وہ ہانکل نہیں بول رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ بس

سننا چاہتی تھی۔ وہ اسے اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ اس کا بار بار پیار کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ ولیم بہت اچھے اور شائستہ لہجے میں اس سے باتیں کر رہا تھا۔

اس کا لہجہ بہت دھیمہ اور شستہ تھا۔ وہ اسے لے کر کافی دیر گھماتی رہی پھر شاہجگ کے لیے چلی گئی۔ دکانیں منت نئی چیزوں سے بھری پڑی تھیں اور لوگ

دھڑا دھڑ شاہجگ کر رہے تھے..... موسم ابر آلود تھا۔

”ولیم آج تم اپنی پسند کی جو چیز چاہو خرید سکتے ہو۔ آج تمہاری ممایو فورڈ کر سکتی ہے۔“ اس نے مسکرا کر اسے کہا تو وہ بھی مسکرا دیا۔

”او کے مام..... چاہے وہ کتنا ہی مہنگا کیوں نہ ہو؟“ اس نے مسکرا کر سوال کیا۔

”اٹ کین بی!“ اس نے جیسے ہوئے جواب دیا۔ وہ ہر شاپ پر مختلف چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ ہر شاپ پر اسٹینڈ میں مختلف قسم کے

لاکٹ لٹکتے نظر آ رہے تھے۔ کچھ اسٹارز کے مطابق تھے۔ کچھ پر اللہ، لوگوں کے نام، جانوروں کے فکڑا سکو، ایلیفینٹ اور بہت سی چیزیں بنی ہوئی تھیں۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ وہ ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ جیسے کسی خاص شے کو ڈھونڈ رہا ہو۔ چلتے چلتے وہ ایک دکان پر رکا اور ایک اسٹینڈ سے صلیب والا لاکٹ اتار اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا چھوٹا سا مجسمہ تھا۔

”مام، آئی لوٹ، اس رینگلی بیوٹی فل!“ اس نے لاکٹ چوم کر جلدی سے گلے میں بہن لیا۔

وہ ایک لمبے کولرزی گئی اور جلدی سے پے منٹ کر دی۔ اس کا ذہن منتشر ہو چکا تھا۔ ہوٹل میں کھانا کھانے کے دوران اس کی نظریں کراس پر تھیں۔ ولیم آج بہت خوش تھا۔ اس نے بہت سی من پسند چیزیں خریدی تھیں۔ وہ ایک دم اس کی نظروں کا مرکز دیکھ کر لاکٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

”مما..... آئی لو کرائسٹ..... اور میں کب سے ایسے لاکٹ کی تلاش میں تھا۔ کھل کر اس تو مل جاتا تھا مگر میں کرائسٹ والا چاہتا تھا۔ ممما مجھے کرائسٹ سے بہت شدید محبت محسوس ہوتی ہے۔ ماما صرف دو لوگ ہی تو میرے دل میں رہتے ہیں۔ آپ اور کرائسٹ.....“ وہ مسکرا کر بتا رہا تھا اور وہ اس کی باتوں سے اندر ہی اندر خوف محسوس کر رہی تھی۔ وہ ایسے باتیں کر رہا تھا جیسے کوئی سمجھدار، عقل مند مرد ہو۔ وہ جتنی دیر اس کے پاس رہی۔ اس کی سوچیں پریشان ہی رہیں۔ وہ جتنی خوش آئی تھی۔ اتنی خوش واپس نہیں جا رہی تھی۔

”مما..... آپ پریشان مت ہوا کریں۔ میں ہوں نا۔ آپ کو ہر روز خط لکھا کر دوں گا۔ میں آپ کو بہت مس کرتا ہوں۔ میں کراس پر لاہور آؤں گا تو ہم دونوں بہت انجوائے کریں گے۔ آپ کے اس وزٹ سے میں بہت فریٹ ہو گیا ہوں۔“ وہ بار بار اسے چوم رہا تھا اور پھر بائے بائے کہتا اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس کا دل بہت افسردہ ہو رہا تھا۔ اب جدائی کے ساتھ ساتھ ایک اور خدشہ بھی اندر کھٹک رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کوئی کاٹا سا دل میں چھب گیا ہو اور سارا جسم اضطراب میں مبتلا ہو گیا ہو۔ سارا سراسی حالت میں کتا۔ ورنہ وہ جب بھی اس سے مل کر آتی تو سارا وقت اس کی یادوں اور باتوں سے خوش ہوتی رہتی مگر اب اسے ولیم کی کوئی بات بھی یاد نہ تھی یا وہی تو صرف اس کی وہی ایک حرکت۔ اس نے تو ولیم کو کسی بھی مذہب کی کوئی تعلیم نہیں دی تھی۔ اس نے جب سے ملک منصور اور بچوں کو چھوڑا تھا اس کے ساتھ ساتھ ہر اس شے کو بھی چھوڑ دیا تھا جن سے وہ ماضی میں وابستہ رہی تھی۔ جب تک وہ سید صاحب کے گھر تھی۔ خدا اور اس کی خدائی پر یقین رکھتی تھی۔ ملک منصور کے گھر آئی تو خدا پر ایمان تو تھا مگر خدائی پر سے یقین اٹھ گیا تھا اور جب پیٹر سے شادی کی تو نہ خدا پر ایمان رہا نہ خدائی پر یقین۔ مذہب کے خانے پر اس نے شناخت کا بورڈ آویزاں کر دیا اور اسی شناخت کے لیے اتنے بڑے اسٹپس لے لیے مگر اب شناخت کا وجود بھی نہیں رہا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ اب اسے نہ مذہب کی ضرورت ہے نہ شناخت کی۔ بس اب زندگی کی سانسیں ہی پوری کرتی ہیں۔ دانستہ یا نادانستہ۔ اسے تو یہ بھی پکا یقین نہیں تھا کہ جب وہ پیدا ہوئی تو اس کا کوئی مذہب بھی تھا۔ اس نے تو وہی کچھ اپنا یا جو سید صاحب کا تھا مگر پیٹر نے اسے کچھ بھی اپنانے کے لیے نہیں کہا تھا۔ اس لیے اس نے کچھ بھی نہیں اپنایا۔ وہ مسز پیٹر کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ ماضی میں شہلا منصور تھی اور اب مسز پیٹر مگر اس کی یہ خام سوچ کس طرح ایک آزمائش بن کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ولیم کو کسی بھی مذہب کی کوئی بھی تعلیم نہیں دی تھی۔ صرف اسے اخلاقیات سکھائی تھی۔ وہ نہ تو کبھی اسے چرچ لے کر گئی اور نہ

عی مسجد..... وہ صرف اور صرف اسے ایک اچھا انسان بنانا چاہتی تھی۔ ایک عظیم انسان جس میں کوئی مذہبی تعصب نہ ہو صرف اپنی ذات اور اپنی خوبیوں پر اعتماد ہو۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ نہ جانے ولیم نے کیوں، کب اور کس وقت اپنے آپ کو کرچن مان لیا تھا۔ اس نے تو کبھی اس سے مذہب کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا پھر یہ سب کیسے ہو گیا۔ شاید اس نے اپنے نام سے ہی یہ اخذ کر لیا تھا۔ کیا جو چیز بھی انسان کو پیدائشی طور پر ملتی ہے وہ اس کے بارے میں اتنا پوزیسیو ہو جاتا ہے کہ پوچھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ وہ نہ جانے کیا کچھ مان بیٹھا تھا۔ اس کا دل اب کرچی کرچی ہو رہا تھا۔ وہ کر اس اور کرائسٹ کے بارے میں کس قدر بھٹی ہو گیا تھا۔ ان سے شدید محبت اور عقیدت کی لہر اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ کیا یہ سب فطری تھا یا جلی۔ اس نے کئی سال جس چیز کو اکتور کر دیا تھا وہ یوں اس طرح اچانک متقاضی ہو جائے گی۔ مستقبل ایک سوالیہ نشان بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ اندر ہی اندر خوف سے کانپ رہی تھی۔ وہ سوچوں کے کنور میں پھنسی تھی۔ وہ اسے کیسے اور کس طرح منع کرے۔ وہ شدید تذبذب میں تھی۔

زندگی میں آخر کیا کچھ متقاضی ہے؟

محبت.....؟

شیائست.....؟

پہ.....؟

وجود.....؟

یا پھر کچھ بھی نہیں۔

اب وہ ہستی کے طذاب میں مبتلا ہو رہی تھی۔ سخت اذیت میں تھی، ایسی اذیت جو کبھی تمام ٹیلیفون اور اذیتوں سے بڑھ کر تھی۔ نہ جانے ابھی کیا کیا کچھ اسے آزمانے کو بھتر تھا۔

ولیم اب کی بار بہت خوش تھا۔ ایک تو اسے ماں مل کر گئی تھی اور ماں کے ملنے پر اسے کرائسٹ والا کر اس بھی مل گیا۔ اس کی اپنی مہر دوستی تھی۔ "ولیم تمہاری ماما جلی گئیں؟" شکال نے اس کے پر سر ت چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں..... اور میں انھیں بہت مس کر رہا ہوں اور تمہاری ماما....."

"وہ ابھی ادھر ہی رہیں گی۔ کشمیر پوائنٹ پر ہمارا بہت خوبصورت گھر ہے۔ ماما جب بھی آتی ہیں وہیں رہتی ہیں پھر ہم بھی ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ میر ماما کے ساتھ ہی گیا ہے۔"

"تمہاری ماما ادھر ہی کیوں نہیں رہ جاتیں....."

"وہ بہت سوشل ہیں۔ لاہور میں ان کو بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں لیکن جب بھی ادھر آتی ہیں تو پھر کافی دن رہتی ہیں۔"

"تمہارے پاپا نہیں آتے.....؟"

"آتے ہیں..... لیکن....." ولیم کے سوال پر وہ افسردہ سی ہو گئی۔

”کیا مطلب.....؟“

”وہ فشر ہیں۔ اس لیے ان کے پاس ٹائم نہیں ہوتا..... مگر وہ ہم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ کبھی کبھی آ بھی جاتے ہیں۔ ولیم تمہارے

ڈیڑی کہاں ہیں؟“

”ان کی لڑتھ ہو چکی ہے۔“ وہ بہت سکون سے بولا۔

”تمہاری ماما بہت بہادر خاتون ہیں۔“

”نہیں، آف کورس!“ وہ فخریہ انداز میں بولا۔

”ولیم تم نے یہ کس گلے میں کیوں پہن رکھا ہے؟“

”اوہ..... نظر آ رہا ہے۔“ اس نے جلدی سے جھک کر دیکھا اور پھر اسے شرٹ کے اندر کر لیا۔

”آئی لوٹ، اس پارٹس آف مائی سول۔“ وہ محبت سے بولا۔

”رنگی..... سوانر بیچ!“ شائل نے حیرت سے کہا۔

”تم ماما کے ساتھ کیوں نہیں گئیں؟“ ولیم نے اس سے پوچھا۔

”میں ان سے ناراض ہوں۔“ وہ منہ مٹا کر بولی۔

”کیوں.....؟“

”بس ہوں..... کسی بات پر۔“

”سلی گرل ماما سے ناراض نہیں ہوتے۔ ماما لائک مدر میری اینڈ یونو۔ مدر میری لوز آل..... شی از سبیل آف لو، اونٹلی لو تھنک ایلیس۔“

”وہاٹ ڈو یو مین؟“ شائل نے حیرت سے پوچھا۔

”ماما سے صرف محبت کرنی چاہیے۔ خدہ نہیں ورنہ گاڈ ناراض ہو جاتا ہے۔“ شائل کو اس کی بات اچھی لگی اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔ موہاٹل اس

کے ہاتھ میں تھا اور وہ ماں کا نمبر ملتا رہی تھی۔ ولیم ہنستا ہوا اپنے روم میں چلا گیا۔

لاہور جانے سے پہلے شزا اس سے خصوصی طور پر ملنے آئی۔ جب سے شائل کا موڈ ٹھیک ہوا تھا اور اس نے اسے ولیم کے ہارے میں بتایا

تھا۔ وہ اس سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ جب آیا تو اس نے اسے بہت پیار کیا وہ اس کے لیے کافی گفٹس بھی لائی جو شائل نے خود اس کے لیے پسند کیے تھے۔

”ولیم بیٹا آپ کی ماما کیا کرتی ہیں؟“ شزا نے محبت سے پوچھا۔

”وہ کالج میں تھیں پڑھاتی ہیں۔“

”اوہ آئی سی، جب آپ لاہور آؤ تو ان کے ساتھ ہمارے گھر ضرور آنا۔“

”اوکے آئی۔“

”اور تمہارے پاپا کی ڈسٹھ کب ہوئی؟“

”میری برتھ سے پہلے۔“

”آپ اپنے پاپا کو کس تو کرتے ہو گے۔“

”نہیں آئی، میں جانتا ہوں کہ میں پاپا کو اس دنیا میں نہیں مل سکتا تو پھر ان کو یاد کر کے ماما کو کیوں ڈسٹرب کروں۔ میں اپنی ماما کو ہانکل ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔ وہ میرے لیے سب کچھ ہیں۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی میرے لیے قربان کی ہے۔ میرے لیے تو وہ سب کچھ ہی ہیں۔ ماما بھی اور پاپا بھی۔ ہاں پاپا کو میں امیجینیشن میں مل لیتا ہوں۔ ان سے بہت ساری باتیں کر لیتا ہوں۔“ وہ اس کی باتیں سن کر محظوظ ہو رہی تھی۔ وہ بچی طور پر کتنا مستعد تھا۔ اسے اس سے باتیں کر کے اچھا لگ رہا تھا۔

”اور، کے پیٹا، اب میں چلتی ہوں۔ لاہور آتا تو مجھ سے ضرور ملتا۔ بلکہ میں خود تم سے ملنے آؤں گی اور آپ کی ماما سے بھی ملنا چاہوں گی۔ جنھوں نے تمہاری سوچ کو اتنا پوزیٹو رکھا۔ اب میں چلتی ہوں۔“ اس نے باری باری سب کو پیار کیا اور پھر باہر نکل گئی۔

جب سے وہ مری سے لوٹی تھی۔ گم مسمی تھی۔ اس کے اندر کیا کیا کچھ ٹوٹ ٹوٹ کر نکھر اٹھا وہ کسی کو نہ بتا سکی۔ اس کا دل فٹکارا اور سوچیں منتشر ہو رہی تھیں۔ زندگی کس کس رنگ میں انسان کو آزما رہی ہے کبھی محض ایک سوچ ساری زندگی کے لیے وبال بن جاتی ہے تو کبھی کوئی ایک احساس شدید زیاں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اتنی خاموشی تو وہ زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ایسی خاموشی جس میں کرب ہی کرب تھا۔ نہ سکوت تھا نہ سکون بلکہ شورعی شور اور دکھ ہی دکھ۔ وارڈن نے بھی اس بات کو نوٹ کیا۔ وارڈن کے ساتھ اس کی بہت گہری دوستی تھی۔

”سبزہ پلیر کیا بات ہے آپ کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں۔ ویسے تو ٹھیک ہے نا؟“ ڈنر کے بعد مس افضال نے اس کے کمرے میں آ کر پوچھا۔

”ہاں، وہ تو ٹھیک ہے۔“ وہ پھر خاموش ہو گئی۔

”پھر آپ کیوں اپ سیٹ ہیں؟“

”ایسی کوئی بات نہیں مس افضال..... مگر نہ جانے کیوں زندگی میں کچھ ایسے موڑ اچانک آ جاتے ہیں کہ انسان کی سوچ اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ عقل خود حیران رہ جاتی ہے اور انسان بھی ہونٹ سادیکتا ہی رہ جاتا ہے۔ یہی کچھ میرے ساتھ ہوا ہے جو میں نے سوچا نہیں تھا۔ جس کو میں نے زندگی میں نظر انداز کیا۔ شاید اب وہ میری زندگی کی سب سے بڑی آزمائش بن جائے۔“ وہ بے خیالی میں بولتی گئی۔

”میں کبھی نہیں آپ کا کہہ رہی ہیں۔“ مس افضال نے حیرت سے پوچھا۔

”میں خود بھی نہیں سمجھی۔ میں تو شاید زندگی کو ہی نہیں سمجھ سکی۔ میں تو یہی نہیں جان سکی کہ زندگی میں اہم کیا ہے۔ سب سے اہم کس کو فرسٹ کیلگری میں رکھوں۔ مس افضال آپ نے جب گھر چھوڑا تو آپ کے لیے سب سے اہم کیا چیز تھی؟“ اس نے پوچھا۔

”میرے لیے میری ماں اور چھوٹے بہن بھائی۔ ابا کی حادثے میں جان چلی گئی تو میں سوچ میں پڑ گئی کیا کروں۔ کچھ سمجھ نہ آیا تو شہر چلی آئی۔ نہ کوئی راستہ تھا نہ کوئی منزل۔ سیدھی اس ہاسٹل میں آئی اس وقت یہاں کی انچارج مسز فیم تھیں۔ انھوں نے میری بڑی مدد کی یہاں میں نے

ایک آفس میں جاب شروع کر دی۔ ہر مہینے گھر پر پیسے بھجھتی رہی۔ میرا اور گھر کا رشتہ پیسے کی ڈوری میں بندھ گیا۔ میں یہاں کس کرب، اذیت اور تنہائی میں وقت گزارتی ہوں۔ کوئی بھی اس کا اندازہ نہ کر سکا پھر سب کسی نہ کسی قابل ہو گئے۔ اماں نے ایک ایک کر کے ان کی شادیاں کر دیں۔ مجھے انھوں نے شاید ہر جذبے ہر ضرورت سے عاری سمجھا۔ میں تو بس پیسہ چھاپنے والی مشین یا پھر روٹ بن گئی تھی یا پھر جو نظروں سے اوجھل رہتا ہے وہ ہر طرح سے مامون و محفوظ رہتا ہے۔ مجھے کسی نے نہ پوچھا کہ میری زندگی میں کسی اور شے کی خواہش ابھی باقی ہے یا نہیں۔ سب کی شادیاں ہو گئیں۔ اماں دو سال پہلے فوت ہو گئیں۔ بھائی نے آبائی گھر بیچ دیا اور خود کینیڈا چلا گیا۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ میں بڑھاپا کہاں اور کس کے سہارے گزاروں گی۔ کہنے لگا۔

”آپا میں آپ کو باقاعدگی سے خرچہ بھیجتا رہوں گا۔“ سال ہو گیا ہے نہ اس کا خط آیا اور نہ ہی خرچہ۔ اب تو اس ہاسٹل کے سوا میرا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔ شاید میرا میکا اور سسرال یہی ہے۔ گھر والوں نے سمجھا شاید میں ساری زندگی کے لیے ہی چلی گئی ہوں۔ اب ان کی زندگیوں میں نہ میری اہمیت ہے نہ جگہ۔ پہلے ان کے لیے کمالی تھی اور اب شاید..... نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے لیے۔ میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ شاید وہ لمحہ جب میں نے گاؤں سے شہر کی دہلیز پر قدم رکھا۔ میری زندگی میں آنے والی خوشیوں کو نگل گیا۔ کبھی کبھی کوئی ایک لہو انسان کو کتنا جاہ کر دیتا ہے اور وہی لہو ماضی کی بھینک پر چھائیں بن کر مستقبل کی گھات میں لگا رہتا ہے، نہ پھر حال رہتا ہے اور نہ ہی مستقبل۔ اب میں کہاں جاؤں۔ کوئی بھی تو نہیں پوچھتا۔ زندگی کے تیس سال یہاں گزار دیے۔ اپنی جوانی کا خود اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ دیا اور جن کی خاطر سب کچھ کیا ان کو احساس بھی نہیں۔ ”آفسوان کے جہریوں زدہ چہرے پر شکستہ راستے بنانے لگے۔“ ”محبوبوں اور قربانیوں کا یہ انجام بہت بھینک ہے مسز پیٹر، دکھا اندر ہی اندر کس طرح ہر وقت کچھ کے لگا رہتا ہے۔ کاش کوئی جان سکے۔ زندگی کے اس مقام پر کھڑی ہو کر سوچتی ہوں کہ زندگی کا حاصل کیا ہے؟“

”آپ دیکھتی ہیں۔ اس انفصال میرا جو دکھ ہے وہ میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتی مگر اس کی جھین اتنی شدید ہے کہ میرا وجود کرچی کرچی ہو رہا ہے۔ اس آگ سے میرا بدن جل رہا ہے۔ شاید وہی تپش محسوس کر کے آپ میرے پاس آئی ہیں۔“

”لیکن آپ کچھ تو بتائیں؟“ مس انفصال نے اصرار کیا۔

”کیا کہوں؟ کہنے سے میں اپنے آپ کو مزید مجرم سمجھوں گی۔ بس ایسا دکھ ہے جو کیکنس کی طرح میرے وجود کے گوشے گوشے کا احاطہ کر رہا ہے لیکن میں کہہ نہیں سکتی۔ آپ کا دکھ بالکل شفاف اور سمجھ آنے والا ہے اور میرا بہت پیچیدہ نہ سمجھ آنے والا۔ اسی لیے تو میں آج تک کسی سے اپنا دکھ شیئر بھی نہیں کر سکی۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

”مسز پیٹر ایک بات کہوں۔ اگر برا نہ منائیں تو.....“

”ہاں..... ہاں ضرور.....“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”ویسے تو یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے مگر میں یہ ضرور کہوں گی کہ آپ ویسے تو بہت اچھی ہیں مگر نہ تو کبھی چرچ مگنی ہیں نہ ویسے عبادت کرتی ہیں۔ زیادہ تر کرکٹ کھیلنے والے کے سٹڈے چرچ جاتے ہیں۔ آپ کو تو کبھی جاتے نہیں دیکھا۔ خدا کو یاد کریں مشکلات میں اک وہی تو آسرا نظر آتا

ہے۔ ورنہ ہم خانماں لوگوں کے پاس اب کیا رکھا ہے؟“ مس افضل نے اس سادگی سے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا کہ وہ تھلا نے لگی۔ شاید زندگی کا اذیت ناک مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔

”مگر میرا کسی پر یقین نہیں رہا۔“ وہ مشکل سے بولی۔

”ایسا ہوتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ جب بہت کرائس ہوں تو خدا پر بھی ایمان ڈولنے لگتا ہے مگر پھر اسی کی طرف لوٹنا پڑتا ہے۔ کیا کریں۔ اس کے محتاج جو ٹھہرے۔ اس نے ہمیں اتنا بے بس بتایا ہے کہ ہر لمحہ ہر وقت اس کو مدد کے لیے پکاریں۔ یہی وہ چاہتا ہے۔“

”مگر میں نے اس کو پکارنا عرصے سے چھوڑ دیا ہے۔ مجھے معلوم ہے نہ میری کوئی دعا میری قسمت بدل سکے گی اور نہ ہی کسی کی دعا میری تقدیر تو پھر اس امید اور آس کا قاعدہ؟“ وہ بے بسی سے آہ بھر کر بولی۔

”آپ شدید ڈسٹرب ہیں لیکن میں آپ کے لیے ضرور دعا کروں گی۔“

”شکریہ، مگر اس کا کوئی قاعدہ نہیں ہوگا۔“ مس افضل نے ہر ممکن طریقے سے اس کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور پھر واپس چلی گئیں۔ سردیوں کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کمرس کی تیاریاں بھی کمرس ڈنرز اور فنکشنز بھی عروج پر تھے۔ ولیم لاہور آنا چاہ رہا تھا۔ ہر سال وہ کچھ دنوں کے لیے لاہور آتا تو اس کے پاس ہی ٹھہرنا مگر اب وہ قہر کاٹھ سے ایک بھر پر نو جوان لگتا تھا۔ اس لیے اب وہ مین ہاسٹل میں ٹھہرنا قدرے ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اسے شدید ٹینشن ہو رہی تھی کہ وہ اسے کہاں ٹھہرائے۔ وہ انہی سوچوں میں گم مس افضل کے پاس چلی گئی۔

”مس افضل، ولیم لاہور آنا چاہتا ہے۔ کچھ نہیں آ رہا اس کو کہاں ٹھہراؤں۔ ظاہر ہے وہ ہاسٹل میں تو نہیں رہ سکتا۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی جگہ ہو تو پلیز بتائیے۔ صرف چند دنوں کی تو بات ہے۔“ مس افضل اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئیں۔

”ٹھیک ہے میں مس حیدر کو فون کرتی ہوں۔ شی از ٹائس لیڈی کوئی نہ کوئی راستہ تو نکل ہی آئے گا۔ آپ پریشان مت ہوں۔“

”کون..... مس..... حیدر..... حیدر..... بہت عرصے کے بعد یہ نام سن کر وہ ایک دم چمک سی گئی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ ”مسٹر حیدر وہ ظیفیر مفسر ہیں۔ بہت اچھے انسان ہیں۔ بہت ہی کوآپریٹو..... ان کی بیٹی مس حیدر بھی بہت سوشل ہیں دیل ایجوکیڈ اور ٹائس۔ ان جیسے چند لوگ اس شہر میں اور ہوں تو یہ شہر جنت بن جائے۔ وہ این جی اوز کو بھی سپورٹ کرتی ہیں اور عورتوں کے فلاحی ادارے بھی ان کی سپروائزنگ میں ہیں۔“

”اچھا..... آپ ان سے بات کریں۔“

”آپ اطمینان رکھیں۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

ماضی کی ایک اور چٹکاری اس کے دامن میں پھینکی گئی تھی۔ ماضی سے فرار ناممکن تھا۔ حال ہمیشہ ماضی کو کیوں جھنجھوڑتا رہتا ہے اور مستقبل ایک سوال بن کر حال اور ماضی کو مٹھلوک ٹکا ہوں سے دیکھتا رہتا ہے۔ حیدر تو ماضی میں کہیں گم ہو چکا تھا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے خود گم کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس میں کامیاب نہیں رہی تھی مگر وہ اس کے پرانے وجود کی شناخت کی ایک اہم کڑی تھا۔ اس کا جز تھا۔ اس کی روح کا

صبر تھا۔ اس سے اس نے ایسی محبت کی تھی جو کسی سے نہیں کر سکتی تھی۔ اگر اس کی زندگی میں کہیں محبت کا وجود تھا اور اس کو محبت سے شام سائی ہوئی تھی تو وہ صرف اور صرف حیدر کی وجہ سے ہوئی تھی۔ جب وہ شہلا تھی اور جب وہ شہلا منصور بنی تب بھی مگر جب سے وہ مسز پیئر بنی تھی۔ اس نے سارے حوالے خود ہی دفن کرنے کی کوشش کی تھی۔ گوکہ وہ ایک سایہ سا بن کر کبھی کبھی ابھرتا تھا مگر اب پیئر کا تعلق سب سے زیادہ مضبوط سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہ ولیم کا باپ تھا اور وہ اس کی بیوہ کی حیثیت سے زندہ تھی۔ ولیم کی صورت میں وہ ہمیشہ اس کے سامنے زندہ تھا مگر اس نے کبھی اسے اتنا اہم نہیں سمجھا تھا۔ وہ اس کی شناخت ضرور بنا تھا مگر محبت نہیں..... مگر جو شناخت نہیں بن سکا وہ محبت بن کر روح کی گہرائیوں تک میں زندہ تھا۔ ہمیشہ کے لیے وہ اس کی سانسوں میں سما گیا تھا۔ حیدر کے نام نے ہی اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی اور حیدر ہو۔ یہ محض اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے اور زندگی اتفاقات کا دوسرا نام ہی تو ہے۔

”مسز پیئر، ہاسٹل کے پیچھے ٹیکسی ہے۔ جب کبھی فارن فیلڈ گیشنز آتے ہیں تو وہیں ٹھہرتے ہیں۔ مس حیدر مان گئی ہیں۔ چند روز کے لیے میں آپ کو وہ کھول دیتی ہوں۔“ مسز افضل نے خوشی خوشی اسے بتایا۔

”تھینک یو ویری مچ مس افضل۔ میرا بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”ہاں، مسئلہ تو حل ہوتے ہی جاتے ہیں مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اپنی جگہ جوں کے توں بھی رہتے ہیں یا شاید زندگی خود ہی بہت بڑا مسئلہ ہے یا سمجھا۔“ وہ قدرے مایوسی سے بولی۔

”مس افضل، آپ تو دل چھوئے نہ کریں۔ آپ تو ہمیشہ ہمارے لیے سوری آف انسریشن رہی ہیں اور اب آپ ہی.....؟“ اس نے انھیں دلاسا دینے کی کوشش کی گوکہ وہ خود بھی جانتی تھی کہ یہ الفاظ محض ڈھکوسلا ہیں۔

”کیا کریں..... کبھی کبھی.....“ وہ ہٹا کچھ کہے نرم آنکھوں کو صاف کرتی باہر نکل گئی۔

ولیم آیا تو بہت خوش تھا۔ یوں لگ رہا تھا وہ پہلی دفعہ کمرس مٹانے لاہور آیا ہو۔ وہ اپنے ساتھ ڈھیروں گفٹس لایا تھا جو اس کے دوستوں نے اسے دیے تھے۔ اس نے بھی اس کے لیے بڑے پزیرے خرید کر رکھے تھے۔ ولیم نے کمرے میں چھوٹا سا کمرس لٹری بنایا۔ اس پر چھوٹے چھوٹے گفٹس لٹکائے۔ رنگ برنگی لائسن لگائیں۔ شاکل نے اسے خوب صورت سا ناکا ز گفٹ کیا تھا۔ وہ ہر کام بہت ایکساٹنڈ ہو کر کر رہا تھا اور وہ اس کو یوں بڑے جوش و کھیر سے کر رہا تھا سوچ رہی تھی۔

یہ مذہبی جنون اس میں کہاں سے آ گیا تھا۔ نہ پیئر مذہبی تھا اور نہ ہی وہ۔ نہ اس نے اسے ایسی کوئی تعلیم دی تھی اور نہ ہی کسی اور نے۔ تو پھر یہ سب..... اسے سوچ سوچ کر وحشت سی ہونے لگی۔

”مما، آپ ایک لے آئیں گی یا پھر میں واپسی پر لیتا آؤں۔“

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ آج رات چرچ نہیں جاتا۔“

”اوہ..... میں بھول ہی گئی۔ کل.....“ اس نے ہات اداوری چھوڑ دی۔

”آپ تو بس۔ میں خود ہی ہوتا ہوں۔“ وہ بغیر کچھ کہے باہر نکل گیا۔ وہ اس کو بھی روکنا چاہتی تھی مگر کیا کہے اور کیسے کہے۔ عجیب غمیسے میں پڑ گئی تھی۔ یہ بڑا کاس کے لیے چیلنج بننا چلا جا رہا تھا۔ اگر وہ کل اسے چرچ جانے کے لیے کہے گا تو وہ کیا جواب دے گی۔ وہ عجیب شش و پنج میں جتنا ہو گئی تھی۔ ساری رات نہ سوئی۔ کب اس کی آنکھ لگی اور کب وہ آبا مگر وہ صبح صبح تیار ہو کر اسے اٹھا رہا تھا۔

”مما! تمہیں نا۔ آج تو چرچ چلیں۔“ وہ نئی پینٹ شرٹ اور نیوی بلیو سوئٹر میں بہت پینڈ سم لگ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ یوں لگ رہا تھا ہنر اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”جینا میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میرے ہیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے پھر کبھی چلی جاؤں گی۔“

”آپ تو بس۔ نہ جانے کیوں ایسا کرتی ہیں۔“ وہ منہ بنا ہوا کہہ کر باہر نکل گیا اور وہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ اس کے جانے کے بعد مس افضال خوبصورت بو کے اور ولیم کے لیے گفت لے کر آئی۔

”ہائے مسز ہنر، یہ کیا۔ آپ نے کپڑے بھی نہیں بدلے۔“

”وہ اصل میں میری طبیعت خراب ہے نا۔ اس لیے.....“

”آئی سی۔ یہ ولیم کے لیے ہے۔“ انھوں نے گفت اسے دیتے ہوئے کہا۔

”آپ نے یہ تکلف کیوں کیا؟“

”مسز ہنر اب میری زندگی میں ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے علاوہ اور کیا باقی رہ گیا ہے۔ اب تو صرف دوستوں سے ملاقاتیں باقی رہ گئی ہیں اور ہاں آج کھانا میں آپ لوگوں کے ساتھ کھاؤں گی۔ اب میں چلتی ہوں۔ نیچے کچھ لڑکیاں آپ کو دوش کرنے آئی ہیں۔ ان کو اوپر ہی بھیج دوں۔“ مس افضال باہر نکلتے ہوئے بولیں۔

”کون ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”شاید آپ کی اسٹوڈنٹس ہیں۔“

”اچھا، ٹھیک ہے ان کو اوپر بھیج دیں۔“ اس نے قدرے حیرت سے کہا۔ کیونکہ اس سے قبل کبھی بھی کوئی بھی اسے کرسی دوش کرنے نہیں آیا تھا۔ آٹھ، دس لڑکیاں بو کے، ایک اور گلاس لے کر ”میری کرسی“ کہتی ہوئیں اندر داخل ہوئیں۔

”تھینک یو، آپ لوگ..... ادھر بیٹھیں۔“ اس نے ان کو چیر زور دیتے ہوئے کہا۔

”میڈم یہ کیا آپ نے آج ڈریس بھی چینیج نہیں کیا۔“ اس کی ایک شوخ و چٹیل سی اسٹوڈنٹ افرابولی۔

”بس یونی، میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ آپ لوگ بیٹھیں میں چائے لاتی ہوں۔“

”نہیں میڈم آپ آرام کریں۔ ہم خود ہی بنا لیتے ہیں بلکہ بنا کر آپ کو بھی پلاتے ہیں۔“ دو لڑکیاں جلدی سے اٹھ کر کچن کی طرف چل

دیں۔ انھوں نے اہتمام سے ٹیکل سجائی ناشتے کے لیے کچھ چیزیں فریج سے نکالیں۔ ایک کاٹ کر رکھا اور پھر سب چائے پیئے لگیں۔ خوب رونق ہو رہی تھی۔ ان کے قہقہے پورے کمرے میں گونج رہے تھے جب ولیم اندر داخل ہوا۔

”ولیم ان سے ملو۔ یہ میری اسٹوڈنٹس ہیں۔“

”ہیلو۔“ وہ سر کو قدرے جھکا کر بولا اور اندر کمرے میں چلا گیا۔

”میڈم آپ کا بیٹا تو بہت اسمارٹ ہے۔ بالکل فارزنگتا ہے۔“ طیبہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی اور ہونٹ چبانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد سب لڑکیاں چلی گئیں تو وہ اس کے پاس آئی۔

”آؤ بیٹا ناشتا کرو۔“

”مما مجھے بھوک نہیں۔ اب میں سونا چاہتا ہوں۔“ ہاں شام کو مجھے جلدی اٹھا دیجئے گا۔ میں نے Supper کے لیے قادر جانسن کے پاس

جانا ہے۔“

”کون قادر جانسن؟“ اس نے تھوڑی چڑھا کر پوچھا۔

”مما آج چرچ میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ پریز کے دوران وہ مسلسل مجھے دیکھتے رہے۔ جب سب لوگ جانے لگے تو وہ خود

میرے پاس آئے۔ مجھے بہت عیار کیا۔ گلے لگایا۔ مجھ سے مختلف باتیں پوچھتے رہے۔ کہنے لگے آؤ Supper میں ان کے ساتھ ہی کروں اور میں

نے وعدہ کر لیا ہے۔ وہ چرچ کے پیچھے ہی تو رہے ہیں۔ ان کی شخصیت بہت متاثر کن ہے۔“ اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ اس کی

آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ جیسے اس نے کوئی انوکھی قیمتی شے پائی ہو۔ وہ مسکراتا ہوا سونے کے لیے چلا گیا اور وہ پریٹن سی صوفے پر بیٹھ گئی۔

ہر طرف چڑی بکھری پڑی تھیں۔ کمر میں لڑکی کے ساتھ اکا دکا گفتگوں لگ رہے تھے۔ ٹیکل پر ایک اور برتن بکھرے ہوئے تھے۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے، یہ کیسا امتحان شروع ہونے والا ہے۔ انسان نے جن باتوں کے بارے میں کبھی سوچا نہیں ہوتا وہی کیوں ہوتی ہیں۔

ولیم کی باتوں سے اسے خوف آ رہا تھا۔ وہ کتنی سنجیدگی سے ساری گفتگو کر رہا تھا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ بچہ پر لگ رہا تھا۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی مگر اب

سب کچھ ناممکن لگ رہا تھا۔ اس کے اندر جو شعلہ بھڑک رہا تھا وہ بس آتش لٹاؤ بننے کو تیار تھا۔ اس نے جو کچھ ولیم کے لیے سوچا تھا وہ اس سے بالکل

مختلف سوچ رہا تھا جو کچھ وہ دیکھ رہی تھی بہت مبہم، غیر واضح اور دھندلا تھا۔ اس کے برعکس ولیم ہر منظر کو صاف اور واضح دیکھ رہا تھا۔ وہ زندگی کے ہر

مضمون کے بارے میں مشکوک تھی اور وہ تحقیق کا عملی جامہ پہنانے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ وہ ایسے موڑ پر کھڑی تھی جہاں کوئی راستہ بھی کسی منزل

کی طرف نہیں جاتا تھا۔ ماضی مذاہب تھا تو مستقبل کریماک۔ وہ کتنی ہی دیر گفتگوں پر سر رکھے گہری سوچ میں ڈوبی رہی۔ ولیم مقررہ وقت پر گھر سے نکل

کر جا چکا تھا اور وہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔

وہ اپنے آپ کو بہت دیک پر سنائی تصور کر رہی تھی جو اپنے بیٹے کو کسی بھی بات کے لیے نہیں روک سکتی تھی۔ چرچ کے پیچھے ایک کچا راستہ

جس پر کہیں کہیں سرخ نائل لگے تھے اور جس کے دونوں اطراف گھنی باڑیاں تھیں۔ مل کھاتا ہوا یہ راستہ قادر کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ ارد گرد سردا ملتا

جاسن اور ہائل برش کے درخت خصوصی طور پر نمایاں تھے۔ ابھی دھند اتنی گہری نہیں ہوئی تھی مگر پھر بھی وہ قدرے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ اچانک لکڑی کا ایک چھوٹا سا پھانگ نظر آیا۔ اس نے ہلکا سا اسے دھکا دیا تو وہ کھٹک چلا گیا۔ پختہ راہداری کے دونوں اطراف خوبصورت وسیع لان تھے۔ ان میں چھوٹے برقی قہقہے روشن تھے۔ ٹھنڈی ریخ ہوا کا جھونکا اس کے جسم سے ٹکرایا اس نے جھرجھری سی لی اور پرانے سینٹ کے اکھڑے ہوئے فرش کے آگے بڑے ہوئے برآمدے میں داخل ہوا۔ چھوٹا سا برآمدہ تھا اس میں ایک کھڑکی اور ایک دروازہ تھا۔ جس پر سفید اور زردی مائل پینٹ ہوا تھا۔ البتہ برآمدے کی دیواروں کو کرسس کی خوشی میں چھوٹے رنگ برنگی قہقہوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ خاصا عجیب سا اور فسرہ سا ماحول تھا۔ اس نے ادھر ادھر دھوڑنے کے بعد تیل بجائی۔ ایک بوڑھا سا آدمی باہر نکلا۔

”قادر سے ملتا ہے؟“

”کیا کام ہے؟“ وہ قدرے درشتی سے بولا۔

”انہوں نے مجھے بلایا ہے۔“

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”ولیم..... ولیم ہیکل۔“

”اچھا اندر آ جاؤ۔“ وہ اسے تاریک کشادہ کمرے میں لے گیا اور آگے بڑھ کر لائٹ آن کی۔

”جینو، ابھی وہ معروف ہیں۔ کچھ وقت لگے گا۔ باہر سردی ہے چائے پیو گے یا کافی۔“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”کافی۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”اچھا، ٹھیک ہے۔ میں بیٹر آن کر دیتا ہوں۔ اس کے پاس بیٹھ جاؤ۔“ اس نے آتش دان میں رکھے بیٹر کو آن کیا اور باہر نکل گیا۔ کمرے کی آرائش واضح طور پر نشان دہی کر رہی تھی کہ قادر کو جیسو سے کس قدر محبت تھی۔ کمرے میں رکھی کوئی بھی ایسی چیز نہ تھی جو ان کی ماویت پرستی کی طرف اشارہ کرتی سوائے کونے میں رکھے ایک کپیوٹر کے۔

کمرے میں مختلف پینٹنگز لگی تھیں۔ ایک دیوار پر بہت بڑی پینٹنگ آویزاں تھی۔ اس نے اس کے مچھے ڈیٹ پڑھی جو شاید چند عرصے میں بنائی گئی تھی۔ پینٹنگ میں جیسو، مدر میری ان کے شوہر جوزف۔ ان کے گرد جانور، بھیڑیں مقامی گندریے اور فرشتے خاص طور پر نمایاں تھے۔ فرشتے خدا کی حمد اور جیسو کی پیدائش کی خوشی منا رہے تھے۔ پینٹنگ میں ہر طرف نیلا رنگ نمایاں تھا جو خصوصی طور پر بہشتی رنگ سمجھا جاتا ہے۔ ایسی ہی پینٹنگ وہ مری اسکول میں نمائش کے دوران دیکھ چکا تھا اور اسے تب بھی یہ پینٹنگ بہت اچھی لگی تھی اور اب بھی۔ وہ آگے بڑھا تو مختلف اقسام اور اشکال کے بے شمار چھوٹے بڑے کراس بڑے فرینے سے شیلٹ پر سجائے گئے تھے۔ کارنر میں مدر میری کا پلاسٹر آف بوس کا بہت بڑا مجسمہ رکھا تھا۔ وہ دو تین سالہ جیسو کو اٹھائے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔ ان کے سر پر سنہری تاج انھیں کوئین آف ہیومنز ظاہر کر رہا تھا۔ دیوار پر ایک بہت بڑی پینٹنگ تھی جس نے پوری دیوار کا احاطہ کر رکھا تھا۔ جس میں جیسو کو صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ وہ ایک طرف کو مڑا۔ ایک لمبی سی مگر چھوٹی سی میز پر لہسا

کر اس رکھا تھا اور اس کے کونوں کے اندر جان، لیوک، مارک اور میتھی کی تصویریں بنی تھیں جو نیو-ٹیسٹ کی چار کتابوں کے آخر دیکھتے جاتے ہیں۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ خاصی دیر ہو چکی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا قادر کے آنے کے ابھی تک کوئی آثار نہ تھے۔ کافی بھی نہیں آئی تھی۔ البتہ بیٹر کی وجہ سے کمر اترے گرم ہو گیا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور سامنے دیوار پر جیسو کی چھوٹی سی پینٹنگ دیکھنے لگا جس میں ان کے ہاتھوں اور پاؤں پر پتھوں کے نشانات تھے اور ان سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں لرزا جذبات سے آنسو حیرنے لگے۔ کمرے میں ایسی ہی پینٹنگز چابجا آدیں اس تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ملازم کافی لے کر آ گیا۔

”قادر کب فارغ ہوں گے؟“ اس نے قدرے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کافی ہیں، تھوڑی دیر تک آ جائیں گے۔“ وہ کہہ کر باہر چلا گیا اور وہ کافی پینے کے بعد پھر کمرے میں انہی پینٹنگز کو دو بار دیکھنے لگا جیسے سب کچھ اپنے حافظے میں محفوظ کر رہا ہو۔

”ہیلو مائی سن، آئی ایم سوری۔“ قصص ویٹ کرنا پڑا۔“ قادر نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا اور اس کا ہاتھ چوما۔

ایک میٹھی سی لہر اس کے دہکے دہکے سر پر سرایت کر گئی۔ ایسا بیٹھاس اس نے اس سے پہلے اپنی زندگی میں کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

”مائی سن میں نے تمہاری آنکھوں میں ایک خاص چمک دیکھی ہے جو آج کل کے نوجوانوں میں بہت کم ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے گاؤں نے قصص سلیکٹ کر لیا ہے۔“

”سلیکٹ اور مجھے..... کس لیے قادر؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”تم جیسو کرائسٹ سے کتنی محبت کرتے ہو؟“ قادر نے اچانک پوچھا۔

”قادر بہت..... بہت زیادہ۔“ وہ شدت محبت سے بولا۔

”نہیں مائی سن! اس از دی ریزن..... یو آ رے ٹرو کہن! جب کرائسٹ کسی سے محبت کرتے ہیں تو وہ محبت آنکھوں کے دیے روشن کرنے لگتی ہے اور تمہاری آنکھوں میں جو چمک ہے وہ ہر ایک کو کہاں نصیب ہوتی ہے۔ وعدہ کرو..... مائی سن! وعدہ کرو کہ تم صرف اور صرف کرائسٹ کے بن کے رہو گے، تم سوچو گے تو صرف کرائسٹ کو..... تم کام کرو گے تو صرف کرائسٹ کے مشن کے لیے..... تم محبت کرو گے تو صرف کرائسٹ کے لیے..... تم جیو گے تو کرائسٹ کے لیے، جب تم لوگوں کی مشکلات کم کرو گے تو پھر دیکھنا، خداوند یسوع مسیح قصص کیا کچھ عطا کریں گے۔ یہ دنیا تمہاری منگی میں آ جائے گی اور تم زمین و آسمان کی قید سے آزاد ہو جاؤ گے۔ تم چلو گے تو یوں محسوس کرو گے جیسے کرائسٹ تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔ بات کرو گے تو وہ تمہارے ساتھ بولیں گے..... مائی ڈیر سن، یو آر سلیکیٹڈ۔“ انھوں نے پھر اسے گلے لگایا۔

قادر کے الفاظ اور شخصیت میں جانے کیا مہتابیں کشش تھی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ابھی بہت سارے الفاظ کے ملبوم سے وہ تابلہ تھا مگر جیسے کوئی شے روح میں اتر گئی تھی، وہ عجیب سے ٹرانس میں تھا۔

”اچھا ادھر آؤ..... یہ بتاؤ، تم نے لیوچر کے لیے کیا پلاننگ کی ہے؟“

”مما مجھے پائلٹ بنانا چاہتی ہے۔“

”اور تم خود کیا چاہتے ہو؟“

”میں نے ابھی کچھ ڈیپائمنڈ نہیں کیا۔“

”تو ابھی ڈیپائمنڈ کرلو۔ مائی سن کہ تم نے جیسو کے مشن کو آگے بڑھانا ہے۔ پائلٹ بن کر تم آسمان پر تو اڑو گے مگر دلوں پر حکومت کرنا اور انہیں تسخیر کرنا زیادہ مشکل اور ایڈوانس ہے۔ آؤ اب ڈنر کرتے ہیں۔“ وہ اسے محبت سے ڈائننگ روم میں لے گئے۔

ڈنر سادہ تھا مگر بہت لذیذ تھا۔ کھانے کے دوران میں وہ اس سے اس کے متعلق مختلف سوالات پوچھتے رہتے جو کچھ ممانے اسے بتایا تھا اور اس کے حافضے میں محفوظ تھا، وہ بتاتا رہا۔

”لگتا ہے تم چرچ بہت کم جانتے رہے ہو۔“ قادر کے اس سوال نے اسے چوکا دیا۔

”نہیں..... بس قادر..... پر مپس.....!“

”اس لیے تم کرکٹ کیس کے بارے میں بہت کم جانتے ہو۔ خیر تم بس اسی پر سوچو کہ جیسو تم سے کچھ چاہتے ہیں۔“

”لیکن قادر! میں کیا کر سکتا ہوں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تم مجھ سے میٹ پر رابطہ رکھو اور اپنا ڈھن بٹالو کہ تم نے چرچ جوائن کرنا ہے، اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی اہم کام نہیں۔“

”لیکن ماما.....!“

”میرے خیال میں اگر وہ بھی کرائسٹ سے محبت کرتی ہیں تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ کھانے کے بعد انہوں نے اسے کافی لٹریچر پڑھنے کے لیے دیا اور خود اسے گاڑی میں چھوڑنے اس کی انگیسی تک آئے۔

”او کے مائی سن، گڈ بائے..... اپنی ماما کو بھی چرچ لے کر آنا۔“

”اچھا..... لیکن وہ چرچ نہیں جانتی ہیں۔“

”کیوں مائی سن! وہ ایک گچی جیسائی عورت ہے؟“

”قادر!..... شی از!“ وہ اس بات کی تردید کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہتا تھا۔

”نو مائی سن!..... نو انکسکوز.....!“

”او کے..... قادر!“ وہ جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔ قادر کے الفاظ اس کے دل پر جیسے نقش ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے حافضے پر زور ڈالا۔ ماما کبھی بھی تو چرچ نہیں گئی تھیں اور آج بھی نہیں۔ اس کا مطلب ہے ماما کو جیسو سے محبت نہیں۔ وہ انہی سوچوں میں گم بیڑ صبا چڑھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”ولیم! مائی ڈیئر..... تم کہاں رہ گئے تھے۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“ وہ پریشانی سے بولی۔

”مما.....! میں فادر کے ساتھ بی بی تھا۔ میں آپ کو متا کر تو گیا تھا۔“

”انہوں نے قسمیں کیوں بلایا؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”مما، میں چرچ جو ان کرنے جا رہا ہوں۔“

”نومانی سن! میں نے تمہارے لیے دن رات پلاننگ کی ہے، وہ سب..... نہیں یہ کھیل نہیں ہو سکتا..... قسمیں صرف اور صرف پائلٹ بننا

ہے اور آئندہ تم فادر سے بھی نہیں ملو گے..... قسمیں صرف اور صرف ہواؤں میں اڑنا ہے۔“ وہ قدرے سختی سے بولی۔

”او کے ممما..... گڈ نائٹ!“ وہ اس کو نظر انداز کرتا ہوا چلا گیا۔

وہ وہیں بیٹھی سوچتی رہی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا، کیا کرے جو وہ سوچتی تھی، کہہ نہیں سکتی تھی۔ وہ زندگی میں جن جن لوگوں سے جو بھی کہنا

چاہتی تھی، کبھی نہ کہہ سکتی تھی۔ جو سوچتی تھی، وہ ذہن میں ہی رہ جاتا۔ بہت کچھ ہونے کے باوجود وہ خاموشی سے سرخڑ کر دیتی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کسی کو

بھی کنوس نہیں کر پائے گی تو خاموش رہنا ہی بہتر ہے اور اسی خاموشی کے آگے اس نے بار بار ہتھیار ڈالے تھے ہر بار خود ہی مجرم ٹھہری۔ جب وہ

یونیورسٹی میں تھی تو قدرے کونفیڈنٹ تھی مگر حیدر سے تعلق ٹوٹنے کے بعد اور اپنی ذات کی ذلت کے بعد اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے پاؤں

تسے سے زمین ہی کھینچ لی گئی ہو۔ وہ ہر بات کہتے ہوئے ڈرتی۔ ہر فیصلہ کرتے ہوئے جھجکتی اور ہر فیصلہ کرنے کے بعد پچھتاتی۔ وہ ماں ہونے کے

باوجود اپنا حق استعمال کرنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر مجبور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے خیالات اس تک پہنچانا چاہتی تھی مگر

کس طرح..... اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ولیم اور اس کے درمیان کیونیکیشن گپ تھا۔ اسے شدید پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے اس کا اسلامی نام

کیوں نہیں رکھا۔ اس نے ولیم کا نام پٹیر کے بتائے ہوئے نام پر کیوں رکھا۔ جو قسم اس کے وجود کا خواہاں نہیں تھا۔ جسے اس میں رتی بھر دلچسپی نہ تھی تو

اس نے کیونکر اصرار کیا تھا۔ وہ اس لمحے پٹیر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے تو ولیم کو ایک نظر بھی نہیں دیکھا تھا اور اس نے نادانستہ امتحانہ طور پر

نام کے سلسلے میں اس کی رائے لے لی۔

”یہ تمہارا بچہ ہے، میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ تم جو نام چاہو رکھو، قسمیں پورا اختیار ہے۔“ وہ بے درخی سے بولا۔

”مگر رائے دینے میں کیا حرج ہے۔ میرے پاس یہ تمہاری یاد اور نشانی ہوگا۔ کیا ہی اچھا ہوا اگر تم اسے نام دے دو۔“ نہ جانے کیوں وہ

جذباتی ہو رہی تھی۔

”ٹھیک ہے، ولیم پٹیر رکھ لو۔“ وہ بے اہتتائی سے بولا۔

”کیوں.....؟“

”یہ میرے گریڈ پا کا نام تھا۔ وہ میرے باپ سے بہتر تھا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمہارا بیٹا مجھ سے اور میرے باپ سے بہتر ہو۔“

یہی وہ لمحہ تھا جس نے اس کے لیے مسائل کھڑے کر دیے تھے۔ اسے اپنے امتحانہ فیصلے پر محسوس ہو رہا تھا۔ اگر وہ اس وقت اپنا فیصلہ سناتی

اور اپنے فیصلے پر قائم رہتی اور ولیم کے بجائے کوئی مسلم نام رکھتی تو آج وہ اس دور ہے پر نہ کھڑی ہوتی۔ اس کی اپنی قلمی اتکاؤں اعذاب بن کر سامنے آئے

گی، اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اب میں کیا کروں؟ وہ پچھتا رہی تھی۔ مجھے قادر سے مل کر بات کرنی چاہیے، ان کو ساری بات بتا دینی چاہیے۔ شاید وہ کچھ کر سکیں لیکن میں کس طرح اور کیسے ان کو ساری بات بتاؤں گی۔ کہاں سے شروع کروں گی اور ولیم کا ریمائڈیشن کیا ہوگا؟ وہ بہت ساری باتوں کو ترتیب دینے لگی اور پھر انہیں ترتیب سے جملوں میں پروئے لگی۔ ان کا سیاق و سباق قادر کے سوالوں کا جواب..... ولیم کی تسلی کیسے کرے گی؟ وہ جتنا سوچ رہی تھی، اتنا ہی بھڑکار رہی تھی..... ایک انجانا سا خوف دل میں سما گیا۔ ولیم کی جتنی بھی چھٹیاں تھیں، وہ ہر روز قادر سے ملنے جاتا۔ گھنٹوں نہ جانے وہاں کیا کیا کرتا رہتا۔ وہ کتنی دفعہ اسے روکنے کی کوشش کرتی مگر نہ پاتی۔ وہ اس کے معصوم ارادے اور آنکھوں میں پر عزم چمک دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی۔ ولیم اس کے بارے میں قدرے مشکوک تھا۔ اس سے کرکٹنگی کے بارے میں مختلف سوالات کرتا رہتا اور وہ ادھر ادھر ٹال جاتی۔

آج صبح وہ ولیم کو بتائے بغیر باہر چلی گئی تھی۔ کالج میں تو ونٹر ہالینڈز تھیں اور وہ کبھی بھی ولیم کو بتائے بغیر باہر نہیں جاتی تھی۔ وہ سو رہا تھا۔ ڈور تیل کافی دیر سے بند رہی تھی۔ وہ منہ بسورتا ہوا اٹھا اور دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے ایک دیہاتی پتلی، سانولی سی لڑکی کھڑی تھی۔ وہ خاص پریشان لگ رہی تھی۔

”مم..... میں اندر آ جاؤں؟ میڈم کہاں ہیں؟“ وہ قدرے گھبرائی ہوئی تھی۔

”وہ تو گھر پر نہیں ہیں، آپ کون ہیں؟“

”میں جوزفین ہوں۔ میم کی اسٹوڈنٹ، وہ کہاں گئی ہیں، مجھے ان سے بہت ضروری کام ہے۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں انتظار کروں؟“

”شیوہ!“ اس نے اسے راستہ دیا۔

وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گئی اور وہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فریش ہو کر آیا تو وہ بے چینی سے صوفے پر پہلو بدل رہی تھی۔ اس نے بنور دیکھا تو وہ رو رہی تھی۔

”کیا بات ہے..... آپ پریشان لگ رہی ہیں؟“

”نہن..... نہیں تو.....“ اس نے جلدی سے آنکھیں اپنی پتلیوں سے خشک کرتے ہوئے کہا۔

”اگر آپ کو کوئی مسئلہ ہے تو بتادیں۔ مما تو نہ جانے کب آئیں گی؟“

”وہ..... میری امی کی طبیعت بہت خراب ہے اور ہمارے پاس پیسہ نہیں، ان کو اسپتال لے کر جاتا ہے۔ میم اکثر کالج میں میری ہیلپ

کرتی رہی ہیں۔ اس وقت مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے میں ادھر ہی آ گئی۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”اوہ گاڈ! تو آپ نے پہلے نہیں بتایا۔ اتنی دیر آپ انتظار کرتی رہی، آپ چلیں میرے ساتھ۔“ اس نے دروازہ لاک کیا چابی گیٹ کپیر کو

دی اور اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے اپنے آپ کو بہت محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ وہ اسے شہر سے دور گندی سی جگہ بستی میں لے

گئی۔ ایک کمرے اور برآمدے پر مشتمل گھر میں لے جاتے ہوئے اسے جھجک بھی محسوس ہو رہی تھی مگر وہ مجبور تھی۔ ولیم کو دیکھ کر ارد گرد کے بچے اور

لوگ یوں اکٹھے ہو گئے جیسے کوئی شہزادہ راستہ بھول کر ادھر آ نکلا ہو اور ہر کوئی شہزادے کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب ہو۔ جوزفین کی چھ بہنیں تھیں اور

ایک دو سالہ بھائی۔ باپ ایک سال پہلے فیکٹری میں کام کرتے ہوئے ساتویں منزل سے گر کر مر گیا تھا۔ اب کمائی کا کوئی بھی آسرا نہ تھا۔ ماں لوگوں

کے گھروں میں کام کرتی تھی۔ ٹھنڈ لگ جانے سے اسے شدید نمونیا ہو گیا تھا۔ ساری رات اس نے شدید اذیت میں گزاری۔ ولیم جلدی سے ٹیکسی لے آیا اور جوزفین کے ساتھ اسے اسپتال میں لے گیا۔ اسے فوراً اسپتال میں ایڈمٹ کر لیا گیا۔ کچھ ضروری بل ادا کرنے کے بعد اس نے پانچ سو روپے جوزفین کے حوالے کیے۔

”میں ماما کے ساتھ دوبارہ چکر لگاؤں گا۔ اس وقت میرے پاس صرف یہی پیسے ہیں، آپ رکھ لیں۔“ اس کے لہجے میں نہایت مشاس اور نرمی تھی۔ جوزفین کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ صرف چند آنسو گرا کر اس کا شکر یہ ادا کیا۔

”تھینک یو..... آئی دل ریٹرن یوسون.....“ وہ بمشکل بولی۔

”ڈونٹ وری.....“ وہ کہہ کر باہر نکلا۔ اس کا دل عجیب سی خوشی اور سرور سے لبریز تھا۔ ایسی خوشی اس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی اسے قادر کے الفاظ یاد آنے لگے۔

”جب تم لوگوں کی مشکلات کم کرو گے تو پھر دیکھنا، خداوند یسوع مسیح تمہیں کیا کیا عطا کریں گے۔ یہ دنیا تمہاری مٹھی میں آ جائے گی۔ تم چلو گے تو یوں محسوس کرو گے جیسے کرائسٹ تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔ مائی سن! پورا آرسلیکٹیڈ..... پورا آرسلیکٹیڈ.....“ اس کے لبوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ قادر کے الفاظ اس کے ذہن میں مسلسل گونج رہے تھے۔ اسے آج جو خوشی ملی تھی وہ اس نے پہلے کبھی بھی زندگی میں محسوس نہ کی تھی۔ اسے گاؤں اور کرائسٹ سے محبت تو تھی ہی، اب کرائسٹ اس کی ذات کا سب سے اہم حصہ بن گئے تھے اور قادر..... تو جیسے کسی بیش بہا نعمت سے کم نہیں لگ رہے تھے۔ اس کے اندر کچھ کمر کرنے کا عزم جوان ہو چکا تھا۔ وہ وہی کرے گا جو قادر کہیں گے اور قادر جو کچھ بھی کہیں گے وہی سچ ہوگا۔ قادر پر اعتماد دینا دھندا کرنے کو دل چاہنے لگا۔ وہ واپس آیا تو ماں کو دیکھ کر چونکا۔ اس کی طبیعت بہت خراب تھی۔

”ماما، کیا ہوا..... آپ صبح صبح کہاں چلی گئی تھیں؟“

”میں مس انفصال کے پاس گئی تھی مگر تم کدھر چلے گئے تھے، بغیر بتائے۔ میں تمہارے لیے پریشان ہو رہی تھی۔“

جواب اس نے جوزفین کی ساری کہانی اسے سنادی۔

”اچھا کیا..... وہ بے چاری بہت دکھی لڑکی ہے۔ کوئی بھی تو آسرا نہیں۔ ہم شام کو اس کی ماں کو دیکھنے اسپتال چلیں گے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”ہاں، میں نے جوزفین سے وعدہ کیا تھا کہ میں ماما کو لے کر آؤں گا۔“ جوزفین کی ماں کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ جب وہ اسے

اسپتال ملتے گئے تو وہ بیڈ پر بیٹھی بچوں کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ جوزفین اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔

”میم! آپ..... آپ..... تھینک یو..... تھینک یو..... ویری مچ۔“ اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ وہ ان دونوں کا شکر یہ کیسے ادا کرے۔

”بیٹا! آپ پریشان نہ ہوں۔ خدا سب ٹھیک کرے گا۔ شکر ہے ولیم گھر پر تھا اور آپ کی مدد کر سکا۔“

”ہاں..... میں ان کی بہت شکر گزار ہوں۔“ احسان مندی اور شکر گزاری کے بوجھ تلے اس کی آنکھیں نہیں اٹھ رہی تھیں۔

”اٹس آل رائٹ..... آپ کی مدد سے مجھے جو خوشی ملی، وہ میرے لیے سب سے بڑا گفٹ ہے۔“ ولیم کے لہجے میں اعتماد اور غلوں تھا وہ

مسکرا کر بولا۔ ولیم کی چٹکی چٹکیاں ہاتی تھیں۔ وہ روزانہ قادر کو ملنے جاتا اور اب جانے سے پہلے بھی وہ ان کو ملنے جا رہا تھا۔ اس کو بھی اس نے اصرار کر کے ساتھ لے لیا تھا۔ قادر کی ہات غلط ہو رہی تھی۔ وہ واقعی ٹرو کر چن و چن تھی۔ اس کا دل قدرے مطمئن ہو گیا۔ قادر ان سے بہت محبت سے پیش آئے۔ سب نے شام کی چائے اکٹھے پی۔ قادر نے اسے ہانکل کالینسٹ ورڈن دیا۔

”اور مسز پنیر ایسا آپ کے لیے ہے۔“ انھوں نے ایک خوبصورت کراس اور مدد مہری کی لائف ہسٹری پر ایک کتاب اسے تحفہ دے۔

”تھینک یو قادر..... میں آپ سے ملنے دوبارہ آؤں گی۔“ اس کی زبان کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”ضرور..... اور آپ جرج بھی باقاعدگی سے آیا کریں۔“

”ہاں..... لیکن میری طبیعت لھیک نہیں رہتی اس لیے بہت کم باہر نکلتی ہوں۔ کالج اور ہاسٹل..... بس یہی میری مصروفیت ہے۔“

”خداوند خدا! آپ پر رحم کرے..... اور آپ کو شفا بخشے۔ خداوند یسوع مسیح آپ کا حامی و ناصر ہو۔“ انھوں نے ایک دم ہاتھ اٹھا کر

دعائیں شروع کیں تو ولیم نے بھی ہاتھ اٹھا لیے اور نادانستہ اسے بھی ہاتھ اٹھانے پڑے۔ اس کا ذہن عجیب کشش میں جٹا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اس نے ایک لمبے عرصے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے گو کہ دل ابھی بھی یکسوئی سے خالی تھا۔ پیڑ سے شادی کے بعد تو اس نے خدا سے اپنا ناتانائیکل منقطع کر لیا تھا۔ جب دعائیں نہ میرا مقدر بدل سکتی ہیں اور نہ ہی شائستگی تو یہ سب کچھ بے معنی ہے۔ خدا سے کیا رابطہ رکھا جائے؟ جب وہ میرا دکھ سمجھتے ہوئے بھی اسے کم نہ کرے۔ میری آزمائشوں میں میرا ساتھ نہ دے تو پھر سب تعلق بے معنی ہیں۔ اے بس سانسیں پوری کرنی تھیں اور وہ کر رہی تھی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”آپ دیکھیے گا، آپ کی روح کو سکون آ جائے گا۔“ قادر وثوق سے بولے۔

”خاک سکون آئے گا بلکہ سب کچھ اور منتشر ہو جائے گا۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ولیم مسرور تھا کہ قادر کی اور مہر کی ملاقات بہت

خوشگوار ماحول میں ہوئی تھی۔ اگلے دن وہ واپس مری چلا گیا اور وہ انسر وہی پھر کھوئی کھوئی رہنے لگی۔ اور ہاسٹل واپس آ گئی۔

”مسز پنیر کیا بات ہے؟ آپ بہت دنوں سے ابھی ابھی لگ رہی ہیں۔ کمرس والے دن بھی آپ بے حد پریشان لگ رہی تھیں۔ ایسی

کیا پریشانی ہے کہ آپ شیر بھی نہیں کر سکتیں۔“ مس الفضال نے اسے راستے میں روک کر پوچھا۔

”معلوم نہیں مگر طبیعت بہت بوجھل رہتی ہے۔ نہ جانے کیسی پریشانی ہے شاید آخری وقت قریب آ گیا ہے۔ آخری وقت میں ایسی ہی

اداسی اور پریشانی چھائی رہتی ہے۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”اللہ نہ کرے..... یہ آپ صبح صبح کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ حوصلہ مت ہاریں، ابھی تو ولیم کو آپ کی بہت ضرورت ہے۔“ مس الفضال نے

اسے تسلی دینا چاہی۔

”کسی کو کسی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی کسی کے لیے اہم نہیں ہوتا۔ سب زندہ رہتے ہیں کوئی کسی کے لیے نہیں مرنے والا۔“ وہ آہ بھر کر بولی۔

”اچھا، آپ پریشان نہ ہوں۔ شام کو سب خواتین کی ایک میٹنگ ہے۔ آپ نے بھی کامن روم میں پہنچنا ہے۔ آپ کی شرکت بہت

ضروری ہے۔ ایک اہم پروگرام ڈسکس کرنا ہے۔" مس افضل نے اسے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، ابھی چلتی ہوں۔ کالج سے دیر ہو رہی ہے۔" وہ بوجھل قدموں سے گیٹ سے باہر چلی گئی اور مس افضل اس کی باتوں پر دل مسوں کر رہ گئیں۔

شام کو سب خواتین مس افضل کے ہمراہ کاسن روم میں موجود تھیں۔ انچارج مسز شائستہ جبیں بھی ان کے ساتھ بیٹھی تھیں۔

"مس حیدر، کافی سوشل لگتی ہیں۔ انھوں نے خصوصی طور پر لیٹر بھیجا ہے کہ ورکنگ دیمن کے لیے بھی کچھ تفریح ہونی چاہیے۔ ایک فن فیئر ٹائپ فنکشن اور ہاں، اس کے ساتھ کچھ ایسے اسکلز بھی ہوں جو ان خواتین کے مسائل سے ریلیٹڈ ہوں۔" مسز شائستہ نے کہا۔

"لیکن مس حیدر کو اس میں اتنی دلچسپی کس لیے ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ان کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے مگر دوسری بیگمات تو نمبر بنانے کے چکروں میں رہتی ہیں۔ ان کے لیے تو یہ سب ان کے ہسپوڈز کی پوزیشن اسٹرونگ کرنے کے لیے ہوتا ہے ورنہ ان کے دل تو خلوص سے خالی ہوتے ہیں۔ بہر حال مسز پیٹر، آپ کالب دلچہ بہت اچھا ہے۔ آپ کمپیوٹرنگ کریں گی اور ایک اسکٹ بھی آپ تیار کر لیں۔ اور باقی کچھ ٹریڈ فیل پروگرامز ہوں گے۔ اس کے علاوہ اسٹار بھی کر لیں گے۔" مسز شائستہ نے کافی دیر ان سے پروگرام ڈسکس کیا اور مطمئن ہو کر چلی گئیں۔

"میڈم! چیف گیسٹ کون ہوگی؟" ایک خاتون نے جاتے جاتے انھیں روک کر پوچھا۔

"ظاہر ہے، مس شہلا حیدر ہی ہوں گی۔" ایک اور منشرکی مسز بھی ہیں۔ اگر ایک کو بلایا جائے اور دوسری کو نہ بلایا جائے تو پھر دونوں میں ٹھن جاتی ہے اور پھر پستے تو ہم جیسے لوگ ہیں۔ آپ لوگ چار پانچ روز میں مجھے فائل کر کے بتادیں پھر دعوت نامے بھی بھیجے ہیں۔ ہاسٹل کی مینجمنٹ کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے۔ جو ڈیفینڈنٹس چلاتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے بہت بڑی گید رنگ ہوگی۔"

شہلا حیدر نام جانا پچھانا سا بھی لگ رہا تھا اور نہیں بھی۔ وہاں بیٹھی خواتین کیا کیا پروگرامز بتاتی رہیں، اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اس کا ذہن تو ایک نٹلے پرائنگ گیا تھا۔ اسے جیسے کوئی پھانس سی چبھ گئی تھی۔ وہ بے چینی سے معذرت کرتی ہوئی اٹھ گئی۔

"آج کل مسز پیٹر کچھ ڈسٹرب ہیں۔" مس افضل نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

"ہاں..... شاید....." کوئی بھی کمنٹ نہ کر سکا کیونکہ وہاں رہنے والی ہر خاتون ہی ڈسٹرب تھی اور ہر ایک کو اپنا غم دوسری سے زیادہ لگتا تھا اور ویسے بھی مسز پیٹر نے کبھی بھی اپنی کوئی بات کسی سے شیئر نہیں کی تھی۔ سب یہی جانتے تھے کہ ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ اب بیٹے کو پال رہی ہیں۔ اس سے مزید کسی نے بھی جاننے کی خواہش نہ کی اور نہ اس نے بتانے کی۔

کس طرح اس نے فنکشن کے لیے اسکٹ تیار کیا، کس طرح وہ بے دلی سے اس سارے کام میں ایکٹو رہی، یہ صرف وہی جانتی تھی۔ کئی بار دل چاہا کہ مس افضل سے ایکسکس ذکر لے کہ وہ کوئی کام نہیں کر سکتی مگر وہ ان سے کچھ بھی نہ کہہ پاتی۔ خاموشی سے بنا کچھ کہے لوٹ آتی۔ مس افضل اور ہاسٹل کی دوسری خواتین بہت اکیسا پختہ تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت عرصے کے بعد ان کی یکسانیت سے بھرپور زندگیوں میں خوشی کا کوئی لمحہ آیا

ہو۔ کچھ چیخ شاید پلیزٹ چیخ۔ سب لوگ کچھ مختلف سوچ رہی تھیں۔ کپڑوں کے ہارے میں، گیٹ اپ کے ہارے میں..... اور بہت کچھ۔

”مسز پیٹر! شام کو دعوت نامے لکھنے ہیں۔ آپ دو تین لڑکیوں کو لے کر آجائے۔ لسٹ میں نے بتائی ہے، یہ کام بھی ہو جائے تاکہ کل ہی دعوت نامے بھیج دیے جائیں۔“ مس الفضال نے کہا۔

”جی ہاں..... ہم لوگ شام کو آجائیں گے۔“

شام کو وہ مدرخ اور نیلہ کے ساتھ مس الفضال کے کمرے میں چلی گئی۔ مدرخ اور نیلہ دونوں ہی بہت اکیٹو اور سوشل لڑکیاں تھیں۔ جنہیں ہاسٹل آئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے۔ اس لیے ہاسٹل کی یکسانیت اور اداسی کا اثر ابھی ان پر نہیں ہوا تھا۔

”مسز پیٹر! آپ نے کیسا ڈریس بنوایا ہے؟“ مدرخ نے ہنر جوش انداز میں پوچھا۔

”بھئی نکال لوں گی کوئی پرانی سا ڈھی۔“ وہ بے دلی سے بولی۔

”اور تم نے“ اب کی بار نیلہ نے اس سے پوچھا۔

”میرے پاس آج خرید کر دیں گے۔“ مدرخ اک ادا سے بولی۔

”کیا مطلب..... تمہارے پاس.....؟“ نیلہ کی آنکھوں میں شوخی تھی۔

”انتا کام کرتی ہوں۔ کیا ہے ایک سوٹ خرید کر دے دیں گے تو کوئی احسان تو نہیں کریں گے۔“ مدرخ نے قہقہہ لگا کر کہا تو دونوں ہنس دیں۔

”کاش..... میرے بھی کوئی لباس ہوتے۔ میں تو ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کرتی ہوں۔ وہاں کی پچھری پر پہل بات سیدھے منہ سے کرتی نہیں سوٹ خرید کر دینا تو ناممکن اور دور کی بات ہے۔“ مسز پیٹر ان کی باتیں سن کر مسکرا دیں۔

”مسز پیٹر یہ لسٹ لے لیں، ہارا احتیاط سے سب کے نام لکھوائے گا اور وی آئی پیز اور چیف گیٹ کے نام آپ خود لکھیں گے۔ بہت احتیاط سے..... میرا مطلب آپ سمجھ رہی ہیں نا.....“ مس الفضال نے ناموں کی لسٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”آپ بے فکر رہیے..... میں خود ہی یہ کام کرتی ہوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں اسٹور میں جا کر زرا کراکری چیک کر لوں۔“ مس الفضال اٹھتے ہوئے بولیں۔

”ٹھیک ہے.....“ وہ لسٹ لے کر پڑھنے لگی۔ ایک نام پر تو اس کا دل جیسے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مسز شزا منصور۔ تو کیا یہ وہی شزا ہے

جو انگلینڈ میں..... اس دن اور اب چیف گیٹ..... ماڈل..... اور اب چیف گیٹ..... اس کا جسم کپکپانے لگا۔ اسے اس بات کا افسوس نہ تھا کہ وہ

کیا بن چکی تھی، مگر اس بات پر کہ وہ کس طرح اس کے سامنے اپنے وجود اپنی شناخت کے لیے منصور اور اس کے بچوں کو دکھانے لگی تھی اور آج

وہ کہاں کھڑی تھی اور کنگ ویمن ہاسٹل میں۔ اکیڈمی کم کالج میں ایک ادنیٰ لیکچرار یا پھر عام سی ٹیچر..... کیا یہی وہ مقام تھا جس کو حاصل کرنے کے وہ

درپے تھی۔ اس وقت اس میں کتنی اتالیقی۔ کتنا اعتماد اور خودداری تھی اور سب کچھ اتالیقی اور عارضی ثابت ہوا کیونکہ یہ سب اس کی ذات کی خصوصیات

نہیں تھیں۔ وہ تو شروع سے ہی بزدل اور ڈرپوک تھی۔ نہ جانے اس وقت اس میں اتنی ہمت اور قوت کہاں سے آگئی تھی؟ اور اب شزا اسے دیکھ کر کیا

سوچے گی؟ وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ کاش وہ نہ آئے۔ اسے کوئی ضروری کام پڑ جائے اور وہ نہ آ سکے۔ دل ہی دل میں نہ جانے اس نے کتنی بار دعا کی۔ فنکشن تک وہ بے دلی اور بے اطمینانی محسوس کرتی رہی اور جس دن فنکشن تھا، وہ سخت بے چینی سے ادھر ادھر پھرتی رہی۔ اس افضال اور سزائے جہنم سے بھاگ دوڑ میں مصروف تھیں۔ خواتین کے مختلف اسٹالز پر خوب رونق تھی۔ باقاعدہ تقریب کا آغاز ہو چکا تھا۔ مس حیدر کو دیکھ کر وہ چونک سی گئی۔ وہ وہی تھی جو وہ سمجھ رہی تھی۔ وہ حیدر کی بیٹی تھی کیونکہ وہ کافی حد تک باپ پر تھی۔ وہی نین نقش اور دائیں آنکھ کے پاس سیاہ گل۔ بے اعتناء کا فیڈنٹ اور گرین فل۔ اس کی شاندار پرسنالٹی کے سامنے ہر ایک سچ نظر آ رہا تھا۔ وہ بیس ہائیکس برس کی دھان پان ہی لڑکی تھی۔ اسے دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی مگر وہ آگے جا کر اسے مل نہ سکی۔ البتہ سزائے جہنم میں بہت دیر سے آئی تھی۔ اس کی نگاہوں کا مرکز وہی تھی، وہ مہمان خواتین کے ساتھ اس قدر باتوں میں مصروف تھی کہ سزائے اس کی طرف بہت کم دھیان دیا۔ ویسے بھی گردن ایام نے اس کو قدرے بدل کر رکھ دیا تھا۔ سزائے کے بجائے منصور بھی ہوتا تو اسے بھی پہچاننے میں چند لمحوں کے گتے۔ اس نے مس افضال کی کہانی پہنچی ایک اسکرپٹ تیار کیا تھا جو خصوصی طور پر ان کی مرضی اور اجازت لے کر کیا گیا تھا۔ اس کی ایکٹنگ اتنی جاندار تھی کہ سب بہت متاثر ہوئے۔ ہاسٹل میں رہنے والی کئی خواتین تو باقاعدہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ مس حیدر نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو خاموشی سے آہ بھر کر رہ گئی۔ اس کے چہرے پر بھی افسردگی خصوصی طور پر نمایاں تھی۔ فنکشن کے اختتام پر سب نے اس کی ایکٹنگ اور کمپیئرنگ کو بہت سراہا۔

”ورنگ ویمن کے کتنے مسائل ہوتے ہیں، ہم لوگ تو کبھی جان ہی نہیں پائے۔“ مس حیدر نے سزائے جہنم سے کہا جو اس کا تعارف اس سے کروا رہی تھیں۔ اس کی نظریں تو بس مس حیدر کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ کسی طور بھی ادھر ادھر نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ کتنا خوبصورت کتابی چہرہ ہے اور اس چہرے سے وابستہ اس کی یادیں بھی کتنی خوبصورت تھیں۔

”مس حیدر ان لوگوں کے لیے ضرور کچھ کرنا چاہیے۔“ سزائے منصور کے لہجے میں عجب ماحول تھا جسے مس حیدر اور دوسری خواتین بھی محسوس کیے بغیر نہ کر سکیں۔

”میرا خیال ہے این جی اوز بھی کافی فنڈز اکٹھا چکی ہیں، اب ان کو بھی عوام کی فلاح و بہبود کے لیے متحرک ہونا چاہیے۔“ مس حیدر نے بھی جلدی سے جواب دیا تو سزائے جہنم ہٹ کر رہ گئی۔ دی آئی پی خواتین خوب ایک دوسرے کو پیٹ پیٹ کرنا رہی تھیں۔ ایسے مواقع تو کبھی کبھار ہی ان کو ملتے تھے جب وہ اپنے دلوں کی بھڑاس نکالتی تھیں۔ اس فنکشن نے تو ان کو اچھا موقع فراہم کر دیا تھا۔

”سزائے جہنم، مجھے آپ کا چہرہ اور نام کچھ آشنا سا لگ رہا ہے۔ میں کب سے ذہن پر دباؤ ڈال رہی ہوں مگر یاد نہیں آ رہا۔ میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے..... اصل میں میری یادداشت بہت خراب ہو چکی ہے۔ جب سے شادی ہوئی ہے۔ بچوں، گھر داری اور آفس کی مصروفیات کی وجہ سے ہر وقت ڈسٹرب رہتی ہوں۔“ وہ مجھلاہٹ آمیز انداز میں بول رہی تھی۔

”چلیں چھوڑیں، کبھی کبھی بہت سے چہرے ناقابل یقین حد تک ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں۔ یقیناً آپ نے کسی اور کو دیکھا ہوگا۔ وہ جلد از جلد اس سے جان چھڑانا چاہ رہی تھی اس لیے معذرت کرتے ہوئے جلدی سے وہ مس حیدر کی طرف مڑی جو مس افضال سے باتوں

میں مصروف تھی۔ مبادا وہ کہیں اسے پہچان نہ لے۔ وہ دل ہی دل میں اس سے چھٹکارا پانے کی پلاننگ کرنے لگی۔

”میں پاپا سے کہوں گی کہ وہ ہاسٹل کا وزٹ ضرور کریں۔ ظاہر ہے، وہ ویلفیئر منسٹر ہیں تو جب تک خواتین کی بہبود کے لیے کام نہیں ہوگا، معاشرے کی فلاح کیسے ممکن ہوگی۔“ وہ شستہ انگریزی میں جیز جیز بول رہی تھی۔ اس کے بولنے کا انداز..... اور لہجے میں ٹھہراؤ بہت حد تک سید صاحب اور حیدر سے ملتا تھا۔

”ہاں..... ضرور لیکن آنے سے پہلے ہمیں فون ضرور کر دیں۔“ مسز شائستہ جبین فوراً بولیں۔

”آپ بے فکر رہیے۔ وہ کسی پروڈکٹول کے قائل نہیں۔ اچانک وزٹ پر یقین رکھتے ہیں۔ اس طرح حالات کا بہتر طور پر ہتھ چل جاتا ہے۔“

”ہاں، ان کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے..... ان جیسے لوگ بہت کم ہیں۔“ مسز شائستہ نے تعریفی لہجے میں کہا۔

”ہاں، جب سے منسٹر بنے ہیں وہ تو جیسے گھر کو بھول ہی گئے ہیں۔ بروقت کچھ کرنے کا جذبہ ان کو محض سے نہیں بیٹھنے دیتا۔“ مس حیدر بھی

باپ سے بہت متاثر نظر آ رہی تھی۔

”ہم ان کی آمد کے خطرہ میں گئے۔“ مس افضل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اور آپ کی تو میں بہت تعریف کروں گی۔ آپ کی ایکٹنگ واقعی کمال کی تھی اور موضوع بھی بہت مناسب تھا۔ کیا نام ہے آپ کا؟“

اس نے اپنے مرمریں نازک ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

”مسز پیٹر..... یہ بہت ٹیلنٹڈ خاتون ہیں۔“ مس افضل جلدی سے بولنا چھیں۔

”وہ تو نظر آ رہا ہے۔ میرا دل تو چاہ رہا ہے کہ کچھ دیر اور رک جاؤں مگر ایک اور فنکشن بھی اینڈ کرنا ہے۔ جب سے پاپا منسٹر ہوئے ہیں۔“

خواتین کے فنکشنز مجھے ہی اینڈ کرنے پڑتے ہیں۔“

”کیوں..... مسز حیدر کہاں ہیں؟“ مسز شائستہ نے ایک دم پوچھا۔

”دراصل میری پیدائش کے دو سال بعد ان کی ڈیوٹی ہو گئی۔ اس لیے مجھے ہی پاپا کو سپورٹ کرنا پڑتا ہے۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

اسے ظاہرہ کی وفات کا سن کر قدرے صدمہ ہوا۔ وہ مس حیدر سے بہت کچھ سنتا چاہتی تھی۔ بہت سے لوگوں کے بارے میں جانتا چاہتی

تھی مگر سب کچھ ذہن سے جیسے محو ہو گیا تھا۔ مہمان خواتین جا چکی تھیں۔ وہ بھی واپس آ گئی۔ انتہائی تھکاوٹ کے باوجود بھی اس کا ذہن بہت متحرک

تھا۔ شہلا حیدر، ذہن تو جیسے گھوم بھر کر اس نام پر انک سا گیا تھا..... تو حیدر اسے بھول نہیں پایا تھا۔ ظاہرہ تو اس کا نام سننا گوارا نہیں کرتی تھی اور حیدر تو

شاید اسی نام کے سہارے جیتا تھا اسی لیے تو اس نے اپنی بیٹی کو یہ نام دیا تھا۔ اسے حیدر کی یاد ادا بھی بھی لگ رہی تھی اور دکھ بھی ہو رہا تھا۔ کوئی کہاں

سے کہاں پہنچ چکا تھا اور وہ دلدل میں پھنسی ہی چلی گئی تھی۔ اسے مس حیدر پر بہت پیار آ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسے ملنے جائے، اسے گلے

سے لگائے اور اس سے ڈھیروں باتیں کرے مگر وہ تو ان سب کے لیے شاید مر چکی تھی۔

شز بار بار اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ اس نے جب سے منصور کو چھوڑا تھا، اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ وہ بچوں کو بھی بھلا

دے۔ بہت بھلانے کے باوجود وہ اس کے ذہن میں محفوظ تھے۔ نہ جانے آج کیوں اس کا دل شدت سے بچوں کے لیے بھی تڑپنے لگا۔ جب تک ولیم اس کے پاس رہا۔ اس نے ان کو قدرے بھلائے ہی رکھا مگر اب اس کا دل جیسے اس کو سرزنش کر رہا تھا کہ اس نے ولیم کو ہی کیوں اپنی اولاد سمجھا، انہیں کیوں نہیں۔ شفق، آفاق..... اور فلک۔ فلک کتنا روٹی رہتی تھی اور جاتے ہوئے شفق اور آفاق کتنے ناراض تھے۔ اس نے توپٹ کر بھی ان کی خبر بھی نہ لی اور ان کو مٹانے کی کوشش بھی نہ کی۔ نہ ہی ان سے کوئی رابطہ رکھا۔ آخر وہ اس کے بچے بھی تو تھے۔ اس نے پرانا الیم الماری میں سے نکالا اور ان کی تصویروں کو پیار کرنے لگی۔ آنسو غلط جذبات سے اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ اسے بچوں سے اتنی شدید محبت محسوس ہو رہی تھی جو اس سے پہلے شاید کبھی اس نے محسوس نہ کی تھی۔ ایک دم نہ جانے سید صاحب کہاں سے ذہن کے پردے پر نمودار ہوئے۔ وہ تو سب کو بھلانے کی کوشش میں تھی مگر سب اپنی اپنی جگہ پر جوں کے توں موجود تھے۔

”کیا ماضی سے کبھی بھی فرار ممکن نہیں..... حال ہمیشہ ماضی کی طرف کیوں دھکیلتا ہے.....؟ اور مستقبل، ماضی اور حال سے تصدیق کیوں چاہتا ہے؟ اس نے اپنے ماضی سے نجات پانے کے لیے اپنے آپ کو کہاں کہاں گم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر ماضی پھر اس کے سامنے سوالیہ نشان بن کر کھڑا تھا۔ اس کا مطلب ہے اپنے وجود سے فرار کی ساری کوششیں بیکار ہیں..... اتنے برسوں میں اسے کسی نے کوئی طعنہ نہ دیا مگر اب یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی قوت رفتہ رفتہ اسے ماضی کی طرف لے جا کر اس کو کھوجنے کی جدوجہد میں تھی۔

”یا خدا یا..... یہ تو نے میرے ساتھ کیا کیا..... مجھے ہستی کے عذاب میں کیوں جکڑا کیا..... کیوں کیا؟ میرے پاس نہ کوئی راستہ ہے اور نہ ہی کوئی منزل۔ ہم جیسے بے خانماں اور نکھرے وجود کہاں جائیں۔ ہمارے لیے بھی تو اپنی اس زمین پر کوئی جائے پناہ رکھتا۔“ وہ سسکنے لگی۔ ایک دم ولیم اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ ولیم جن راستوں پر چل نکلا تھا وہ اس کی منزل تو نہیں..... اس کا مطلب ہے ولیم بھی ڈوب رہا ہے۔ کیا وہ بھی اپنی ماں کی طرح پونہ ساری زندگی منتشر رہے گا؟ نہیں، میں ولیم کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ مجھے اس کے لیے تو کچھ کرنا چاہیے؟ مجھے قادر سے جلد از جلد ملنا چاہیے۔ اس نے پکارا وہ کر لیا کہ وہ اگلے دن ضرور قادر سے ملے گی۔

اس نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا۔ بہت سے جملے ترتیب دیے۔ اپنے آپ کو ٹیمپرز لوز نہ کرنے کی ہدایت کی۔ میں آج ہر قیمت پر ولیم کو واپس لے کر رہوں گی۔ اس نے مصمم ارادہ کیا اور واپسی پر قادر سے ملنے چلی گئی۔

”مجھے قادر سے ملنا ہے۔“ اس نے بوڑھے ملازم کو کہا۔

”کیوں.....؟“ وہ بہت سوالات کرنے کا عادی تھا۔

”ان سے کہیے..... ولیم کی ماما ملنے آئی ہیں۔“ وہ قدرے بدو کھے انداز میں بولی۔

”آپ بیٹھیں، میں بلاتا ہوں۔“ وہ بے چینی سے ایک پرانے کاؤچ پر بیٹھی پہلو بدلتی رہی۔

”خیریت ہے سسر پتیر، آپ یوں اچانک.....؟ ولیم تو ٹھیک ہے نا؟“ قادر اسے دیکھ کر قدرے حیران ہوئے تھے۔

”ہاں، سب ٹھیک ہے..... لیکن میں آج آپ سے بہت اہم بات کرنے آئی ہوں۔“ اس نے لہجہ مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

”جی فرمائیے، میں سن رہا ہوں۔“ قادر بھی متحسّس لہجے میں بولے۔

”قادر..... ولیم کو اپنے راتے سے مت ہٹائیں۔ اسے تعلیم مکمل کرنے دیں۔ میں اسے پائلٹ بنانا چاہتی ہوں۔ میں نے زندگی میں صرف یہی ایک خواب دیکھا ہے۔ خدا کے لیے مجھے اس خواب کی حقیقت دیکھ لینے دیں۔ میں اس کے لیے کس قدر جدوجہد کر رہی ہوں۔ آپ شاید اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے اور میں نے جس طرح مشکل حالات میں اسے زمین کی بھول بھلیوں میں الجھا رہے ہیں۔“ وہ قدرے روہا ہنسی ہو کر بولی۔

”مسز پیٹر! یہ میرا نہیں گاڈ کا فیصلہ ہے۔ آپ کے بیٹے کی سول تمام لوگوں سے مختلف ہے۔ آپ فضاؤں کو کنٹرول کرنے کی بات کر رہی ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ دلوں کو کنٹرول کرے گا۔ خداوند نے اسے عام انسانوں سے ممتاز کیا ہے۔ اسے جو مشن سونپا جا رہا ہے وہ ہر ایک کو تو نہیں سونپا جا سکتا۔ گاڈ اپنے کچھ انجیل لوگ دنیا میں بھیجتا ہے جنہیں اہم کام کرنے ہوتے ہیں اور ولیم بھی گاڈ کا انجیل بندہ ہے۔ آپ نے جن حالات کا ذکر کیا ہے تو گاڈ کے انجیل بندے انہی حالات میں سے گزرتے ہیں، کیا آپ کرائسٹ کی لائف اور مدد میری کی مشکلات بھول گئی ہیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے، ولیم وہ کام کرے گا جو لاکھوں پائلٹس بھی نہیں کر سکتے۔ اور ولیم سے گاڈ کی محبت کرتے ہیں۔ وہ کرائسٹ کے مشن کو پھیلانے گا۔“ قادر کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ وہ مزید کچھ نہ بول سکی۔ وہ جو بہت کچھ کہنے آئی تھی، بالکل مزاحمت نہ کر سکی۔ وہ ولیم کو ہر قیمت پر واپس لینے آئی تھی اور پہلی ہی گفتگو میں ہتھیار ڈال دیے۔ وہ قادر کو کنوٹس نہ کر سکی۔ وہ قادر کو یہ بھی نہ بتا سکی کہ آپ کس سے مشن کو آگے بڑھانے کی بات کر رہے ہیں۔ جس کا کوئی مذہب ہی نہیں۔ عیسائیت کی رو سے تو وہ عیسائی بھی نہیں، آپ صرف نام سے دھوکے میں آ گئے۔ وہ سوچوں میں کم لفظوں کو پھر ترتیب دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ قادر نے اسے پھر چوکا دیا۔

”مسز پیٹر! آپ کہاں سے تعلق رکھتی ہیں؟“ قادر کے اس سوال پر وہ گڑبڑا ہنسی گئی۔ اسے اس غیر متوقع سوال کی قطعی امید نہ تھی۔

”میں پاکستان سے.....“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

”وہ تو میں جانتا ہوں..... مگر کس شہر سے.....؟“

”لاہور سے۔“

”میرا مطلب ہے..... آپ کے پیرش.....؟“

”سب مر گئے.....“ وہ بے اطمینانی سے بولی۔

”آپ میرا مطلب نہیں سمجھ رہی ہیں..... کس چرچ سے ان کا تعلق تھا اور آپ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ پائرسٹ؟“ قادر کے ادھورے جملے میں بہت سے معنی پوشیدہ تھے۔

”میں اب چلتی ہوں، میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔“ وہ قادر کے کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔

”اوکے..... مسز پیٹر..... آپ ریلیکس رہیں..... اور فکر نہ کریں۔ قدرت نے ولیم کو خود منتخب کیا ہے اس کے لیے راستہ بھی خود ہی بنائے

گی۔“ وہ ٹکڑاتی ہوئی بس اسٹاپ تک پہنچی۔ قادر نے ایک ہی وار میں اسے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ اچانک اس کے منہ پر وہی طمانچہ مارا تھا

جس کی جگہ وہ اپنے اندر کئی سالوں سے محسوس کرتی آرہی تھی۔

ماضی سے فرار ممکن نہیں..... حال ہمیشہ ماضی کی طرف دھکیلتا ہے اور مستقبل دونوں سے سوال کرتا ہے۔

انسان اس دنیا میں ایسی مخلوق ہے جس کا ماضی قدم قدم پر اسے منہ کے بل گراتا ہے کسی اور مخلوق کا ماضی اسے اتنی تکلیف نہیں دیتا جتنا انسان کو..... تف ہے اس زندگی پر۔ اس نے اپنے وجود کی شناخت اور مقام کے لیے بڑے بڑے قدم اٹھانے سے دریغ نہیں کیا تھا اور حاصل.....؟ وہ تو حاصل اور لا حاصل کے چکر میں بری طرح پھنس گئی تھی۔ وہ وہیں کھڑی تھی جہاں سے چلی تھی۔ وقت کے ساتھ نظریات تو بدلتے ہیں مگر حقیقتیں کبھی بدلتیں۔ زمانہ چاہے کتنے رنگ بدلے مگر انسان کا وجود۔ اس کا بیکر اور کائنات میں اس کا مقام کبھی بھی نہیں بدلتا۔ وہ وہی رہے گا جو ازل سے متعین کر دیا جاتا ہے۔ چاہے وہ خلاؤس کو تسخیر کر لے یا آسمان کی دستوں کو چھو لے۔ کبھی بھی کچھ نہیں بدلتا۔ نہ زندگی کے دکھ نہ سکھ۔ نہ احساسات نہ جذبات، نہ کبھی آنسو خون بہن سکتے ہیں، نہ خون کبھی آنسو۔ نہ ہنسی پھول کھلا سکتی ہے اور نہ دکھ دلوں کو خوش کر سکتے ہیں۔ ازلی حقیقتیں سب اپنی جگہ پر قائم رہتی ہیں۔ اس نے جو جو سوچا تھا، ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کا ہر قدم الٹا ہی پڑا تھا۔ خسارہ تب بھی تھا اور اب بھی مگر تب اس کا وجود ایک معما تھا اور اب ایک سوال..... تب اس کی حیثیت مفلوک نہ تھی اور اب حیثیت بھی مفلوک تھی اور وجود بھی۔ اب کس کو ایکسپلور کرنا تھا، کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔ واپسی کے سب راستے مسدود ہو چکے تھے۔

ولیم کے لیے وہ کچھ نہیں کر سکی تھی، اس کا اسے شدید قلق تھا۔ اب وہ دوسرے بچوں کے بارے میں جاننے کے لیے فکر مند تھی اور ان تک پہنچنے کا واحد ذریعہ شزا تھی۔ شزا کو دیکھنے کے بعد اس میں بچوں سے ملنے کی تڑپ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ وہ شزا سے ملنا چاہ رہی تھی۔ جلد از جلد..... اس نے ہاسٹل سے ہی اس کا فون نمبر لے کر رابطہ کیا مگر وہ مسلسل انگریج جا رہا تھا۔ جیسے جیسے فون بزی ملتا، اس کا دل اتنی ہی بے تابی اور بے چینی سے دھڑکتا نہ جانے کیوں وہ ہر صورت میں اس سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ کافی دیر بعد بتل گئی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ شزا کی سیکرٹری نے فون اٹھایا تھا۔

"مسز شزا سے بات کرنی ہے۔"

"میڈم تو نہیں ہیں، ضروری کام کے سلسلے میں باہر گئی ہیں۔" دوسری جانب سے آواز آئی۔

"مجھے بہت ضروری کام تھا۔ کس وقت ان سے بات ہو سکتی ہے؟" وہ بے تابی سے بولی۔

"آپ ان کے موبائل پر رابطہ کر لیں۔" اس نے جلدی سے موبائل نمبر لکھوا کر فون بند کر دیا۔ موبائل نمبر لے کر وہ گہری سوچ میں ڈوب

گئی۔ کیا واقعی اسے ضروری کام تھا؟ وہ کیسے اس سے بات کرے گی؟ کہیں شزا اس بات کو مانڈے ہی نہ کر لے۔ وہ اسی کشمکش میں جپٹا تھی جب رشیدہ اسے بلانے آئی۔

"میڈم صاحبہ جلدی سے آفس پہنچیں گی..... بڑی میڈم صاحبہ بلا رہی ہیں۔ جلدی کریں گی..... دیر نہ کریں۔" رشیدہ دیکھائی ہوئی تھی۔

"کیوں..... خیریت تو ہے نا۔" وہ رشیدہ کی بدحواسی دیکھ کر بولی۔

”بس جی، کوئی بڑے مہمان آئے ہیں۔“

”کون بھی..... کون آگیا؟“ وہ بھی ذرا حیرت سے بولی۔

”پانچمیں جی، اپر کوئی بڑے بڑے لوگ ہیں اور پولیس بھی ساتھ ہے۔“

”اچھا.....“ وہ سوچوں میں غم وہاں پہنچی تو مسز شائستہ جبین کے آفس کے باہر تھکھا سا لگا ہوا تھا۔ اس سے قبل تو کوئی بڑا آدمی یوں

اچانک نہیں آیا تھا، کون ہو سکتا ہے؟“ وہ حیران ہوتی ہوئی اندر چلی گئی، وہ جہاں تھی وہیں رک گئی۔

”آپے مسز پیٹر ایدر صاحب آئے ہیں۔“ مسز شائستہ جبین کے لہجے میں فخر و انبساط تھا۔

اس نے ایک نظر اسے دیکھا تو دیکھتی ہی رو گئی۔ اس کا جسم بری طرح لرزنے لگا۔ اس کے سامنے سید ضرار الدین حیدر ڈھلتی عمر، سرخ و

سفید رنگت، کچھڑی بالوں اور سفید کاتن کے اکڑے سوٹ میں اجلی اجلی نکمری شخصیت کے ساتھ براجمان تھا۔ حیدر نے بھی اسے پہچان لیا تھا اور ایک دم نظریں جھکا لی تھیں۔

”ادھر بیٹھے مسز پیٹر.....“ مس افضل نے اسے اپنے ساتھ بٹھایا۔ وہ بار بار مسز پیٹر کے نام پر چونک رہا تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ کر ان کی

باتیں سننے لگی۔ ایک دفعہ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو حیدر کی آنکھوں میں سرخی ہی نمودار ہونے لگی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ آنکھیں کب سرخ

ہوتی تھیں۔ اس کی آواز میں ارتعاش بھی پیدا ہو رہا تھا۔ جو چند لمبے قبل بہت بڑے اعتماد لہجے میں ان سے باتیں کر رہا تھا۔ ان کے مسائل سن رہا تھا۔

اب اندر ہی اندر جذبات سے مغلوب ہو کر رہ رہے ہوئے گلے کے ساتھ ان کے مسائل بے دلی سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے اس کے وجود کو نظر انداز

کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کا وجود تو جیسے پسینے میں نہا گیا تھا۔

”مسز پیٹر، آپ بھی تو کچھ بتائیں نا.....“ مسز شائستہ نے اچانک اس سے کہا تو وہ چونک سی گئی۔

حیدر ایک دم اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا لرزیدہ وجود کتنا بڑھا ہوا چمکا تھا۔ اس کے سفید بال، نظر کی عینک اور پڑا مردہ چہرہ..... کسی طور

بھی اس شہلا سے مماثلت نہیں رکھتا تھا وہ جس شہلا کو جانتا تھا۔ وہ تو حسن و جمال کا بیکر تھی اور اب ایسا حلیہ اس نے تو کبھی تصور میں بھی شہلا کو ایسا نہ

دیکھا تھا۔

”میں کیا بتاؤں..... حیدر صاحب، بہت ہمدرد انسان ہیں۔ آپ انھیں بتائیے نا کہ آپ نے جو لبا عرصہ یہاں گزارا ہے؟ آپ کو کن

مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ حکومت ان مسائل کو کیسے حل کر سکتی ہے۔“ مس افضل نے اسے حوصلہ دینا چاہا۔

”آپ کب سے یہاں ہیں؟“ حیدر کے اچانک سوال پر وہ مزید یکھلا گئی۔

”عالمی سولہ سترہ سال سے.....“ وہ نظریں چرا کر بولی۔

”کسی کے بارے میں بھی رائے دینے کے لیے یہ عرصہ کافی ہوتا ہے۔“ حیدر کے لہجے میں رعب اور اعتماد نمود کر رہا تھا۔

”ضروری نہیں، بعض اوقات انسان ساری زندگی گزارنے کے باوجود بھی کسی کے بارے میں اپنی رائے نہیں دے پاتا۔ یہ تو اپنے اپنے

تجربے کی بات ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"مز پٹر کچھ تو کہیے؟" مز شائستہ نے پھر اصرار کیا۔

"میڈم..... کیا آج تک کوئی کسی کے مسائل حل کر سکا ہے؟ کسی کی مشکلات ختم ہوئی ہیں۔ یہ سب بے معنی اور فضول ہے۔ میرے خیال میں کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ جو لوگ خود مجبور رہے ہیں، مصلحتوں اور مجبوریوں کی ڈوروں سے بندھے ہوں وہ دوسروں کے لیے کیا کر سکتے ہیں، یہ محض دعوے ہیں۔ الفاظ کا گورکھ دھندا۔ سب سے زیادہ نقصان تو ہم جیسے مجبور اور لاچار لوگوں کا ہوتا ہے۔ جوان باتوں کے دائرے میں آ کر سنہرے خواب بنا شروع کر دیتے ہیں مگر جب حقیقت کھلتی ہے تو ہم اپنے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ بے وقعت اور کمزور پاتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسی مہنگی کا کوئی فائدہ نہیں۔" وہ قدرے سختی سے بولی۔

"لگتا ہے آپ کو زندگی کا بہت تلخ تجربہ ہوا ہے۔" حیدر کی بات نے اسے شدید دھچکا لگایا۔

"زندگی بذات خود بہت تلخ ہے۔ تجربے بھی تو ویسے ہی ہوں گے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"اوه میڈم! آج تو میرے پاس وقت کچھ کم ہے لیکن جب اگلی دفعہ آؤں گا تو تفصیلاً بات ہوگی۔ آپ ہر قسم کے مسائل کے سلسلے میں مجھ سے رابطہ کر سکتی ہیں۔" وہ اٹھا تو سب لوگ اس کے ساتھ اٹھ گئے۔ جاتے ہوئے بھی اس کی نظروں کا محور ہی تھی۔ سب لوگ اسے باہر تک چھوڑنے آئے مگر وہ نہ آئی۔

"مز پٹر! آپ کو اتنا تلخ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ ہمارے مہمان تھے اور ویسے بھی انسان کو ایک دوسرے کا لحاظ رکھ کر بات کرنی چاہیے۔" مز شائستہ کے لہجے میں قدرے خشکی تھی۔

"میڈم! میں اس لیے اصرار کر رہی تھی کہ مجھے بولنے پر مجبور مت کریں کیونکہ سچ تو ہر حالت میں کڑوا ہی لگتا ہے۔ ویسے آپ بے فکر رہیے، میں ہر طرح کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔" وہ بڑا اعتماد لہجے میں بولی اور باہر نکل گئی۔

اس کے بعد کتنی چہ میگوئیاں ہوئیں، کتنے لوگوں نے اسے مورد الزام ٹھہرایا۔ اسے قلعی پروا نہیں تھی۔ اسے یاد تھا تو بس حیدر۔ جو اس کے حواسوں پر چھایا رہا۔ وہ بدل بھی چکا تھا اور نہیں بھی۔ اس کی ذات، اس کی شخصیت، اس کا رتبہ۔ اس کی حیثیت سب کچھ پہلے سے منفرد تھی۔ سب کچھ بدل چکا تھا، شاید اس کا اندر نہیں۔ اس لیے وہ اسے دیکھ کر بے چین ہو گیا تھا۔

کیا ماضی سے واقعی فرار ممکن نہیں.....؟ کیا حال ہمیشہ ماضی کی طرف دھکیلتا ہے؟ اور مستقبل دونوں سے حقیقت کا متقاضی رہتا ہے، ہوا یہ نشان بن کر؟

وہ رفتہ رفتہ چاروں طرف سے آزمائشوں کے زلزلے میں آ رہی تھی۔ جن تمام چیزوں کو وہ قصہ پارینہ سمجھ کر بھلا چکی تھی، اب اور مستحکم پوزیشن میں نہیں حقیقت بن کر اس سے سوال کر رہی تھیں۔ حیدر ہمیشہ اس کے حافظے میں شجر سایہ دار کی طرح موجود رہا تھا۔ جس کے سائے میں سستانے کے لیے وہ چند لمحوں کے لیے رکتی تھی۔ جب کبھی بہت گھبرا جاتی تو آنکھیں بند کر کے اسے یاد کرتی اور وہ اسے تسلیاں دیتا۔ دلا سے دچک۔ وہ ہمیشہ اس کے وجود کے

اندھاس کی سانسوں میں موجود رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ جب بھی تھا جب وہ پیئر..... کے ساتھ ہوتی تھی اور جب بھی جب ملک منصور کی قربت میسر ہوتی۔ مجبوریاں اور مصلحتیں انسان کی ذات کو دور تولے جاسکتی ہیں مگر یادوں پر کسی کا بس نہیں اور وہی ایک یاد تھی جو اسے مہلک رکھتی تھی۔

کالج میں انگریز اسٹوڈنٹ ہے جسے اس لیے وہ پیئر پھیلائے ان کی چینگ کر رہی تھی جب رشیدہ کارڈ لیس فون پکڑے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

”میڈم جی، آپ کا فون آیا ہے۔“ رشیدہ نے اسے فون دیتے ہوئے کہا۔

”میرا فون.....“ وہ قدرے حیران ہو کر بولی کیونکہ اسے کبھی بھی سہ پہر کے وقت فون نہیں آیا تھا۔ ولیم جب بھی فون کرتا تو رات کو در سے کرتا تھا اس نے لرزے ہاتھوں سے فون پکڑا اور بیلو کا توجہ تک مٹی۔

”میں حیدر بول رہا ہوں..... مجھے جانتی ہو کہ سب کچھ بھلا دیا ہے۔“ وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

”میں کسی کو نہیں جانتی..... سوری.....“ اس نے کہہ کر فون بند کر دیا پھر بیلز ہونے لگیں۔

”کب تک ماضی سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرو گی..... میں تمہارا کل تھا اور اب آج بن کر تم سے سوال کر رہا ہوں.....“ وہ قدرے تلخ لہجے میں بولا۔

”سوال کرنے کا حق میں نے کسی کو نہیں دیا.....“ اس نے بھی تگنی سے جواب دیا۔

”کب تک حقائق سے نظریں چراؤ گی..... مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ بولو کہاں ملو گی.....؟“ حیدر دھوک لہجے میں بولا۔

”کہیں نہیں..... مجھے نہ آپ سے کچھ کہنا ہے اور نہ ملنا ہے۔“

”کوئی بحث نہیں..... میں تمہارا انتظار کروں گا..... اور اگر تم نہ آئیں تو تمہارے ہاسٹل آ کر تمہارے کمرے میں تم سے بات کروں گا۔“

حیدر نے منجھے ہوئے سیاست داں کی طرح اسے انکسپلائیٹ کرنے کی کوشش کی تھی اور فانیو اشار ہوٹل کا ایڈریس بتا کر فون بند کر دیا۔

حیدر کتنا پوزیو ہو رہا تھا اس کا مطلب ہے وہ بھی کسی قدر بدل گیا ہے۔ وہ اس سے خوف زدہ نہیں تھی۔ پوری دنیا میں صرف وہی شخص تو

تھا جس سے ہات کرتے ہوئے اسے کبھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ زندگی میں اسے جتنے بھی مردوں سے پالا پڑا تھا، وہ ان سب سے مختلف تھا۔ ایسا

مرد جس پر اندھا اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ ایسا مرد جس کی ذات سے دوسروں کو صرف سکون مل سکتا ہے..... ایسا مرد جس کی صرف پذیرائی کی جاسکتی ہے

اور ایسے شخص سے بھرپور محبت بھی کی جاسکتی ہے۔ صرف ایک وہی شخص تھا جس کی وابستگی اور تعلق اسے ہمیشہ مسحور رکھتا تھا اور نہ ملک منصور اور پیئر ہمیشہ

کانتوں کی طرح اسے چپے رہتے تھے۔ شزا اور ولیم بیک گراؤنڈ میں چلے گئے، اب صرف حیدر اس کے سامنے تھا اور حیدر سے ملنے کے لیے وہ تانا

بانا رہی تھی۔ الفاظ ترتیب دے رہی تھی۔ کیسے اور کس طرح اسے جوابات دینے ہیں، ذہن مسلسل الجھا ہوا تھا۔ وہ قدرے نزدں بھی ہو رہی تھی۔

وہ کالج سے سیدھی ہوٹل پہنچی اور ریسیپشنسٹ سے کمرے کا پوچھ کر اس کمرے کی طرف بڑھی، اس کے قدم ڈمگمار ہے تھے، وہ جوہت اور

حوصلہ بچا کر کے آئی تھی، اسے لگ رہا تھا، سب کچھ بھرپور ریت کی طرح ڈھلے جانے گا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ ناک کیا۔ پہلی ہی دسک پر

دروازہ کھل گیا۔ حیدر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے خاموشی سے اسے راستہ دیا۔ وہ بیگ اور کتابوں کا ڈھیر اٹھائے اندر داخل ہو گئی۔

”بیٹھو.....“ حیدر نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور تیل بجائی۔ ویٹر کو کولڈ ڈرنک اور کھانا لانے کو کہا۔

”جلدی سے پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو..... میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“ وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

”مجھے پہلے دیکھنے تو دو کہ شہلا کدھر ہے اور مسز پیٹر کہاں ہے اور میں کس سے بات کروں.....؟“ حیدر کے لہجے میں جھجھکی تھی اور آنکھوں

میں غصہ۔ اس نے نظریں اٹھا کر حیدر کو دیکھا۔ وہ اس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

”میں صرف مسز پیٹر ہوں۔“ وہ ہذا احتیاط لہجے میں بولی۔

”کیا تم عیسائی ہو چکی ہو؟“ حیدر نے قدرے غصے سے پوچھا۔

”کیوں؟“

”اگر تو تم عیسائی ہو چکی ہو تو پھر مجھے تم سے نہ کچھ کہنا ہے اور نہ کچھ پوچھنا ہے، تم جاسکتی ہو۔“ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے بولا۔ وہ اس کے

سوال پر بھونچکا رہ گئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے، وہ بے چینی سے صوفے پر پہلو بدلتی رہی اور سوچتی رہی۔ وہ جو کچھ سوچ کر آئی تھی۔ حیدر تو ان

میں سے کوئی بات نہیں پوچھ رہا تھا۔ وہ بھی خاموش رہا اور وہ بھی خاموشی سے پہلو بدلتی رہی۔ ویٹر کھانا لے کر آ گیا تھا اور اس نے ٹیبل پر کھانا لگا دیا تھا۔

”سرا کچھ اور.....“ ویٹر نے باادب لہجے میں پوچھا۔

”نہیں..... تم جاؤ۔“ وہ بارعب انداز میں بولا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”کھانا کھاؤ.....“ اس نے مناس کی طرف کر کے کہا۔

”مجھے بھوک نہیں۔“

”یہ ہماری مہمان نوازی کا حصہ ہے۔“

”مجھے بھوک نہیں۔“

”مجھے ہار ہار“ نہ“ سننے کی عادت نہیں رہی۔“ وہ غصے میں اس کی طرف مڑا۔ اس کی آنکھیں اب بھی سرخ ہو رہی تھیں اور ان میں نمی بھی

تھی۔ وہ ڈری گئی۔ وہ کرسی کھینچ کر بالکل اس کے سامنے بیٹھ گیا اور ہر زاویے سے اسے آہستہ کر دیا۔

”کب تک اپنے آپ سے جھوٹ بولتی رہو گی؟“ حیدر نے سکوت توڑا۔

”میں نے نہ کسی سے جھوٹ بولا اور نہ ہی اپنے آپ سے.....“

”اگر سچ کہنے کی ہمت ہے تو بتاؤ کیا تم عیسائی ہو چکی ہو؟“

”نہیں.....“ وہ اچانک بول پڑی۔

حیدر نے یہ سنتے ہی زوردار چھپڑاس کے منہ پر مارا۔ وہ اس کی قلعی توقع نہیں کر رہی تھی۔ وہ حیرت سے گال سہلانے لگی۔ اس کی آنکھوں

سے آنسو رواں ہو گئے۔

”تم نے مسلم ہو کر ایک غیر مسلم سے شادی کی..... تم اس قدر بے ضمیر ہو سکتی ہو، تم مر جاتیں مگر یہ نہ کرتیں۔ یہ تمہیں سید صاحب کی طرف سے ہے اگر وہ زندہ ہوتے تو وہ یہ تمہیں خود مارتے۔ میں نے جو کیا ان کی وجہ سے کیا۔ اگر تم کہیں کہ تم عیسائی ہو چکی ہو تو انہیں اتنا دکھ نہ ہوتا جتنا یہ جان کر۔“ حیدر کی آنکھوں میں جیسے خون اتر رہا تھا۔ ”تم نے ان کی محبت و شفقت کا تو مذاق اڑایا ہی ہے، میری محبت کی بھی تو ہین کی ہے۔ میں نے پوری دنیا میں صرف ایک شخص ہی تو چاہا تھا۔ میری پہلی اور آخری محبت تم ہی تھیں۔ میرا اگر تمہاری وجہ سے منتشر رہا۔ طاہرہ کبھی بھی مجھے معاف نہ کر سکی..... اور تم نے یہ سب..... یہ سب کر کے مجھے کس مقام پر کھڑا کیا ہے، کیا تم جانتی ہو.....؟“ اس کے لہجے میں اب شکستگی اور مایوسی تھی۔ ”میں نے اپنی بیٹی کو تمہارا نام دیا..... تمہیں زندہ رکھا اپنی یادوں میں، اپنی سوچوں میں..... میں نے دوسری شادی نہیں کی۔ پہلی شادی میری مجبوری تھی اور دوسری میں نے تمہارے لیے نہیں کی۔ کیونکہ طاہرہ میرے نام پر بیٹھی تھی مگر تم..... میں تم سے بے وفائی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں کیسی زندگی گزار رہا ہوں، کاش تم اندازہ کر سکو..... تم..... تم نے تو اپنا ضمیر ہی بیچ..... دیا، میرے ساتھ بھی بے وفائی کی۔“ وہ فصیحے میں بول رہا تھا اور وہ خاموشی سے سن رہی تھی۔ آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے برس رہے تھے۔ وہ جواباً ایسی ہی باتیں اس سے کہنا چاہتی تھی مگر..... مگر اس میں حوصلہ تھا نہ صبر۔

”یولو..... جواب دو، تم نے یہ سب کیوں کیا؟“

”کیا.....؟“ وہ ہلکی لیتے ہوئے بولی۔

”مجھ سے بے وفائی کیوں کی؟“

”میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی.....“

”تو پھر یہ سب.....؟“

”کیا شادی ہو جانے سے روح کا تعلق لوٹ جاتا ہے؟ جسموں کو قید کرنے سے روح تو قید نہیں کی جاسکتی اور آپ..... آپ تو میری روح کا حصہ ہیں.....“ وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔ حیدر ایک دم نرم پڑ گیا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا..... اور پانی کا گلاس اٹھا کر ایک ہی بار میں ختم کیا۔

”تو پھر تم نے یہ سب کیوں کیا.....؟“ اس کے لہجے میں اب قدرے نرمی تھی۔

”کیا کرتی..... کب تک ذلت برداشت کرتی۔ اذیت تو میں سہہ ہی رہی تھی مگر جب منصور دوسروں کے سامنے ذلیل کرنے پر اتر آیا تو میں سہہ نہ پائی..... حیدر! میں نے اس کے طعنے سہے..... تمہیں کھائے..... بے عزتیاں کہیں..... کبھی وہ جائز اور ناجائز کے چابک مار کر میرے بیچے اور چیزتا..... تو کبھی آپ سے تعلق کو بنیاد بنا کر الزامات کی بوچھاڑ سے میرا وجود چھٹی کر دیتا..... آخر میں بھی انسان تھی۔ اس کے ساتھ گزارا ہوا ہر لمحہ میرے لیے کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ وہ ہر وقت میری آزمائش میں رہتا۔ اس نے تو مجھے سولی پر لٹکا رکھا تھا۔ آخر کب تک کوئی اتنی ذلیل برداشت کرے۔ سید صاحب، ان کا گھرانا..... اور میرا وہاں پلنا بھی میرے وجود پر لگی گندگی اور حقارت کو نہ محسوس کا۔ آپ جاننا چاہتے ہیں کہ میں نے یہ سب

کیوں کیا۔۔۔۔۔ صرف ایک کتاب خریدنے پر منصور نے مجھے دیا غیر میں اجنبی لوگوں کے سامنے اتنا ذلیل کیا کہ میں برداشت نہ کر سکی۔ پیٹر اس بک شاپ کا مالک تھا۔ اس نے میری دلجوئی کی اور ان کمزور لہجوں میں میری حوصلہ افزائی کی۔ انسان ہونے کے ماتے اس نے میری ہمت بندھائی۔ میری یہ غلطی تھی کہ میں نے بغیر جانچے اس کے لفظوں پر یقین کیا۔ اس کے لہجے کی نرمی کو اپنے رستے دشمنوں کا سر ہم سمجھا۔ اس کی پذیرائی نے مجھے اعتماد بخشا اور۔۔۔۔۔ میں نے منصور کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر میں اس وقت پیٹر کی حقیقت بھی نہیں جانتی تھی۔ حیدر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ میں جو قدم بھی اٹھاتی ہوں۔ وہ الٹا پڑتا ہے۔ قدرت کیوں میرا ساتھ نہیں دیتی۔ کیا میں خدا کی اس دنیا میں اتنی ذلیل اور ادنیٰ مخلوق ہوں، کبھی تو کوئی مہرہ میرا بھی ساتھ دے۔ بعض لوگوں کے نصیب کیوں کالی راتوں کی کالی روشنائی سے لکھے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے کبھی بھی کوئی جگہ نہیں، کہیں بھی کوئی روشنی نہیں، کاش سید صاحب مجھے وہیں گاڑی تیلے کھل دیتے یا پھر نظر انداز کر کے چلے جاتے۔ کاش وہاں کے آوارہ کتے ہی میرے وجود کے کھڑے کھڑے کر دیتے تو آج میں یہ زندگی کا عذاب نہ سکتی۔ میں ایسی بد نصیب ہوں جسے نہ شناخت ملی، نہ محبت اور نہ ہی سکون۔ کاش ہم جیسے لوگ پیدا ہی نہ ہوں۔“ اس کے لہجے میں بلا کی غلطی تھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔

وہ کتنی ہی دیر بچکیاں لیتی رہی۔ اس نے اچانک کسی کالس اپنے کندھے پر محسوس کیا۔ اس نے سرفا کر دیکھا۔ حیدر سرخ انکارہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت مشکل سے اپنے آنسو روک رہا تھا۔ وہ بے اختیار اس کے گلے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا، نہ تسلی دے سکا نہ دلجوئی کر سکا۔ وہ بھی اسی غیر متوقع صورت حال سے متذبذب میں پڑ گیا۔ اس کے آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔ زندگی میں اس نے اپنا غم آج تک کسی کے ساتھ شیئر نہیں کیا تھا۔ اپنے دل کی بات کبھی کسی سے نہ کہی تھی۔ اپنا غم صرف اپنے تک ہی رکھا تھا اور اب جو بکھرنے پر آئی تو کرچی کرچی ہو گئی۔ ایک دم وہ پیچھے ہٹی جیسے اسے کرنٹ لگا ہوا یا پھر وہ اپنے حواسوں میں واپس آئی ہو۔ اس نے حیدر کی طرف دیکھے بغیر اپنا بیگ اور کتابیں اٹھائیں اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

حیدر نے اسے روکنا چاہا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ شاید اس کا جانا ہی بہتر تھا۔ کولڈ ڈرنکس اور کھانا وہیں کا وہیں پڑا تھا۔ وہ خود بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کا دل بھی شدت جذبات سے پھٹنے کو تھا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے جو لوگ کبھی مل نہیں سکتے، وہ زندگی کا حصہ کیوں بن جاتے ہیں نہ بھلائے جانے کے قابل۔۔۔۔۔ حیدر نے دکھ سے سوچا۔ وہ واپس آ کر بہت شرمندہ بھی تھی اور افسردہ بھی۔ وہ گلی فیل کر رہی تھی۔ اسے اپنے جذبات پر قابو کیوں نہیں رہا تھا۔ وہ کیوں ایک ہی لمحے میں بہک گئی اس کا سارا بھرم خاک میں مل گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کوس رہی تھی۔ یہ سب کیونکر ہو گیا۔ وہ تو اسے کنوئس کرنے لگی تھی۔ اپنی باتیں بتا کر اسے قائل کر لے گی مگر وہ تو کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ کچھ بھی نہ بتا سکی، بہت کچھ ادمورا ہی رہا۔ ہر دفعہ میرے ساتھ ایسا ہی کیوں ہوتا ہے۔ اس نے دکھ سے سوچا۔ تھوڑی دیر بعد رشیدہ اس کے پاس کارڈ لیس لے کر آئی۔

”میڈم جی! آپ کا فون ہے۔۔۔۔۔“ وہ فون پکڑا کر چلی گئی۔

”شہلا، میں حیدر بول رہا ہوں۔ کل تمہارے کالج میں میرا آدمی، تمہیں سوپائل دے جائے گا۔ اسے رکھ لینا۔۔۔۔۔ اور ہاں، تم لوگوں اور حقیقتوں کے بارے میں غلط اندازے کیوں لگاتی رہی ہو۔ منصور کو چھوڑنے کے بعد اگر تم واپس لوٹ آئیں حیدر تمہیں سید صاحب کی بیٹی کی حیثیت

سے سر آنکھوں پر نہ بٹھاتا تو پھر تم کوئی انتہائی قدم اٹھاتیں، تم نے یا تو حیدر کو نہیں سمجھایا پھر اپنے آپ کو..... تم سن رہی ہو؟.....“ اس نے چند لمحے توقف کیا۔

”ہاں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اور اب.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر پوچھا۔

”اب میری زندگی میں کسی بھی شے کی کوئی اہمیت نہیں۔“

”ہم چاہے جتنے بھی دعوے کریں..... جن کی اہمیت ہوتی ہے، وہ اپنا پورا حق لے لیتے ہیں۔ میں جانتا ہوں تم نے زندگی میں بہت

مشکلات کا سامنا کیا ہے۔“

”ہاں، کچھ لوگ صرف پیدایں اس لیے ہوتے ہیں اور شاید ابھی بہت کچھ باقی ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”بہت سی آزمائشیں ابھی میری منتظر ہیں۔ خدا جانتا بھی ہے کہ میں ثابت قدم نہیں ہوں۔ میں تو بہت کمزور اور شکستہ وجود ہوں پھر بھی.....

نہ جانے کیوں وہ مجھے بار بار آزماتا رہا ہے۔“

”اب کس آزمائش کی بات کر رہی ہو..... کیا تم.....؟“

”ولیم کی صورت میں.....“

”کون ولیم.....؟“

”میرا بیٹا ہے، میری میں پڑھتا ہے.....“

”اوہ آئی سی..... اے کیا ہوا ہے؟“ حیدر نے مشکور لہجے میں پوچھا۔

”شاید بہت کچھ ہونے والا ہے۔“

”کیا تم سب جانتی ہو؟“

”نہیں..... مگر میں دیکھ رہی ہوں مگر میں کچھ نہیں کر سکتی۔“

”سب کچھ دیکھنے کے باوجود.....“

”ہاں..... میں نے کہا تھا۔ میں بہت کمزور اور بے بس وجود ہوں..... بس خاموش قماشانی.....“ وہ ہونٹ چبا کر بولی۔

”اور میں کچھ..... خیر چھوڑ دو۔“ اس نے فون رکھ دیا۔ اس کا ادھورا جملہ اس کے لیے عذاب بن گیا۔ وہ جانتا چاہتی تھی وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔

اس نے فون بند کر کے رشیدہ کے حوالے کر دیا۔ وہ بہت مضطرب تھی۔ ایک طرف ولیم تھا۔ دوسری طرف حیدر تھا اور پھر ان کے درمیان شہزاد اور اس

کے اپنے بچے تھے۔ وہ عجیب سے دورا ہے پر کڑی تھی۔ ہر طرف الجھنیں تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ رفتہ رفتہ گرداب میں پھنسی جا رہی ہو۔

اگلے دن حیدر کا ملازم اسے نیا موبائل سیٹ دے گیا۔ اس کے جاتے ہی حیدر نے اسے فون کیا۔ ”آپ نے یہ سب کیوں کیا؟“ وہ آہستہ سے بولی۔

”میں اب تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔“

”یہ سب کچھ بے معنی ہے۔“

”بعض اوقات بے معنی چیزیں بھی زندگی میں اہمیت رکھتی ہیں۔ تم اس سے انکار نہیں کر سکتیں۔“

”حیدر..... خدا کے لیے مجھے مزید آزمائش میں مت ڈالیں۔“

”میں تمہیں ہر آزمائش سے نکالنا چاہتا ہوں۔ تمہارا حیدر کبھی بھی کمزور نہیں تھا۔ اس وقت میں روایات کے ہاتھوں مجبور تھا، اب نہیں۔“

شہلا تم اپنا ہر دکھ مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔ شہلا، تم مجھ پر اعتبار تو کرو۔“ ابھی وہ بات کر رہا تھا کہ ایک دم فون بند ہو گیا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ فون کٹ گیا تھا یا پھر حیدر نے خود ہی فون بند کر دیا تھا۔ اس نے فون ملایا تو لوہے جلائی کی ٹیپ سن کر وہ پریشان ہو گئی۔ ضرور کوئی ایسی بات ہوئی ہوگی جو حیدر نے یوں اچانک فون بند کر دیا تھا اور نہ تو بہت بڑا اعتماد اور کوئی فیڈنٹ شخص ہے اس طرح فون بند کرنا، اسے کچھ سمجھ نہ آیا۔

حیدر اپنے بیڈروم میں تھا، جب وہ شہلا سے بات کر رہا تھا کہ اچانک شہلا حیدر کسی کام کے سلسلے میں اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے کسی کو فون کرنا دیکھ کر وہ اس کے قارغ ہونے کی منتظر رہی۔ جب اس نے حیدر کے منہ سے یہ الفاظ سنے تو چونک گئی۔ حیرانی کے ساتھ ساتھ اسے شک بھی لگا۔ اس کا باپ اس عمر میں کس قدر ایکی ایکی باتیں کر رہا تھا اور وہ بھی اس کی کسی ہم نام سے۔ اس کے لیے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا اور وہ پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔

شہلا نے غصے سے دروازہ بند کیا اور باہر نکل گئی اور حیدر اب نام سا کھڑا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا تو جہات پیش کرے۔ زندگی کا اتنا لمبا عرصہ بے سکونی سے گزارنے کے بعد چند لمحوں کے لیے اسے شہلا کی جو قربت نصیب ہوئی تھی اس نے اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ حراست نہیں کر پا رہا تھا یا شاید کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی شکستہ روح جیسے برستی پھوار میں چند لمحوں کے لیے ترہتا اور مہلک ہو گئی تھی۔ کاش وہ وقت ٹھہر جاتا..... اور وہ دونوں یونہی.....؟

وہ ساری رات نہیں سو پایا..... وہ ہمیشہ یہی سمجھتا آ رہا تھا کہ اس نے اپنے اندر سے محبت جیسے جذبے کا وجود ہی ختم کر دیا تھا۔ طاہرہ کبھی اس کی ذات کا اور روح کا حصہ نہیں بن سکی تھی اور طاہرہ کے بعد وہ تجرد کی زندگی گزار رہا تھا۔

شہلا کو اپنے باپ پر کبھی کبھی ترس بھی آتا تھا جو ہر وقت کام اور صرف کام میں لگا رہتا تھا اور کبھی کبھی فخر بھی محسوس ہوتا مگر اب باپ کا بدلہ روپ دیکھ کر اسے شدید صدمہ ہوا۔ اس نے کبھی بھی ایسا نہیں سوچا تھا کہ اس کا باپ بھی ان تمام سیاست دانوں کی طرح یوں دیوانگی دکھائے گا..... وہ بھی کسی عورت کے لیے یوں بے چین ہو رہا تھا جو اس کی ہی ہم نام تھی۔ اسے شدید نفرت سی محسوس ہونے لگی۔ وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے شدت سے رو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک دم بہت نیچے گر گئی ہو۔ بے وقت ہو گئی ہو۔ وہ جو سراٹھا کر چلتی تھی، اپنے باپ کا نام فخر سے لیتی تھی،

اپنے نام کے ساتھ اپنے باپ کے نام کو انوٹ ایگ بگھتی تھی، اب یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے دونوں میں گہری دراڑ پڑ گئی ہو۔ وہ ہمیشہ اپنے باپ کو خاص الخاص بگھتی آئی تھی۔ وہ بھی بہت عام مرد نکلا۔ اس کا اعتماد ٹوٹ رہا تھا اور جب اعتماد ٹوٹ رہا ہوتا ہے تو دل کس طرح کھڑے کھڑے اور کرچی کرچی ہوتا ہے، وہ اندازہ کر رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے یا پھر وہ خود ہی خود کشتی کر لے۔ اب وہ باپ کا چہرہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ بار بار غصے میں مٹھیاں بھینچ رہی تھی۔ وہ نیچے کارپٹ پر بیٹھی تڑپ رہی تھی جیسے کسی بہت عزیز از جان کی مرگ پر کوئی تڑپتا ہے، ہلکتا ہے، روتا ہے مگر کچھ کر نہیں پاتا۔ ایسی ہی بے بسی وہ محسوس کر رہی تھی۔

آخر میرا باپ بھی تو انسان ہی ہے نا۔ وہ اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش کرتی..... نہیں، نہیں..... میرا باپ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ اور فلرٹ..... اُف خدایا! میں کیا کروں، کاش میں یہ دن دیکھنے کے لیے نہ ہوتی۔ جس شخص کی پارسائی کی زمانہ گواہی دے، جس کی شخصیت میں، میں نے کبھی کوئی جھول نہ دیکھا ہو۔ کبھی بھی بڑی بڑی رکاوٹیں اور آزمائشیں اسے راہِ راست سے نہ ہٹا سکی ہوں، کیا وہ فلرٹ کرے گا؟ یہ نہیں ہو سکتا لیکن وہ باپ سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بہت پیچور اور ریشٹل بھی جاتی تھی اور اب اس قدر ریشٹل ہو رہی تھی۔ اتنی پیچور۔ اسے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی وہ وہی شہلا تھی۔ وہ تو با اعتماد انداز میں باپ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی آئی تھی اور اب کیسے چل پائے گی؟ جبکہ باپ کے قدم ڈمگام گئے ہوں۔ آپ کوئی بھی برا کام کر لیتے، مجھے دکھ نہ ہوتا مگر کسی عورت کے چکر میں تو نہ پھنستے۔ اسے ہمسار رہا تھا..... اس عورت پر..... وہ کون عورت ہو سکتی ہے؟ یہ سوچ کر اسے سخت ہمسار رہا تھا، کبھی دل چاہتا کہ اسے جا کر شوٹ کر آئے، کبھی دل چاہتا باپ کو ہی شوٹ کر دے اور کبھی اپنے آپ کو اس بدنامی کے ساتھ وہ کس طرح جی پائے گی۔

اس نے کچھ سوچ کر اپنا سامان پیک کیا۔ وہ کہیں جا رہی تھی۔ کہاں جا رہی تھی، وہ خود نہیں جانتی تھی، وہ رات کو ہی گھر سے نکل گئی۔ حیدر بدحواسی میں ادھر ادھر اسے تلاش کر رہا تھا۔ وہ شدید ذہنی اذیت سے دوچار تھا۔ وہ اسے ڈھونڈنا چاہتا تھا، بغیر کسی کو بتائے اور اس کو سب کچھ بتانا چاہتا تھا۔ وہ اس قدر مشتعل ہو سکتی تھی، اس نے سوچا بھی نہیں تھا اور وہ خود بھی جذبات کے ہاتھوں اس طرح بہک سکتا تھا، اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ وہ سڑکوں پر مار مارا پھر رہا تھا۔ شہلا کا اتنا وسیع سوشل سرکل تھا کہ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کہاں ڈھونڈے..... وہ قدرے پاگل ہو رہا تھا۔

سبز پٹر (شہلا) کا دل کہہ رہا تھا کہ حیدر کسی مصیبت میں ہے۔ وہ اس کے موبائل پر بار بار فون کر رہی تھی مگر وہ بند تھا۔ حیدر یوں بات ادھوری چھوڑنے کا عادی تو نہیں تھا اور وہ بھی اس وقت۔ اسے اس کے لہجے اور لفظوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کوئی اہم فیصلہ اسے سنانے والا ہے۔ اس سے قبل کہ وہ اسے کچھ سنا تا، ایک بار پھر کوئی شے یا غیر مرئی قوت اس کے راستے میں حائل ہو گئی۔ اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ وہ کہاں جائے، اس کی تلاش میں؟ وہ ہاسٹل سے باہر سڑک پر آ گئی اور ہفتوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہر آنے والی پیچور کو گھور گھور کر دیکھتی، کئی ایک نے تو اس کے قریب آ کر زبردست بڑیک لگائے تو وہ چونک گئی۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ وہ واپس ہاسٹل آ گئی اور اپنے کمرے میں آ کر شدت سے رونے لگی۔ ہاتھوں کو باندھے وہ تعظیم سے قبلہ رخ بیٹھ گئی۔

”میں بچوں سالوں سے تمہارے آگے جھکی ہوں، نہ تجھ سے مدد مانگی ہے اور نہ تیری عبادت کی ہے..... مگر آج بھی میں اپنے لیے نہیں،

صرف اور صرف حیدر کی خیریت کے لیے جھکتی ہوں۔ اس کے لیے تیری مدد چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ اور اس کے لیے تیرے آگے سر تسلیم خم کرتی ہوں۔ میں سرکش نہیں، ہانسی نہیں۔۔۔۔۔ مگر جب تو نے مجھے چھوڑ دیا تو میں بھی تجھے بھول گئی۔۔۔۔۔ تو نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے، اس نے میرا حیرتی ہستی پر اظہارِ ختم کر دیا ہے لیکن آج۔۔۔۔۔ آج تو نے مجھے اس جگہ لاکھڑا کیا ہے کہ میں پھر تیرے آگے جھک رہی ہوں۔ جو تجھے بھلاتے ہیں، تو انھیں ایسے دورا ہے پر لاکھڑا کرتا ہے کہ وہ خود بخود تیری طرف لوٹ آتے ہیں۔ تو انسان کی اکڑ اور غرور کیسے کیسے خاک میں ملاتا ہے، آج مجھے اس کا احساس ہو رہا ہے اور سب کچھ بھولتے ہوئے میں آج صرف حیدر کے لیے تیرے آگے جھکی ہوں۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں تجھ سے کچھ بھی نہیں مانگا۔ بس حیدر کو اپنی امان میں رکھ۔ اگر حیدر کو کچھ ہو گیا تو پھر وہ دن میری زندگی کا بھی آخری دن ہوگا۔ یہ میرا تجھ سے وعدہ ہے۔" وہ قدرے جذباتی ہو کر بڑبڑا رہی تھی۔ وہ حیدر کے لیے کس قدر پیٹی تھی، اسے آج اندازہ ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی نامعلوم جذبے اور نامعلوم منزلیں انسان کو کس قدر کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ وہ اس لمحے اپنے آپ کو بالکل کھوکھلا اور خالی وجود محسوس کر رہی تھی۔ ایسا خالی وجود جس میں صرف حیدر کے نام پر ایک دل دھڑکتا تھا۔ وہ ساری رات نہ سوئی۔ ساری رات وہ اس کے موبائل پر فون کرتی رہی مگر کوئی بھی فون نہ سیو نہیں کر رہا تھا۔ حیدر کا موبائل کس طرح آف ہو سکتا ہے اور وہ بھی ساری رات۔۔۔۔۔ یقیناً وہ بہت بیمار ہے۔ وہ خود ہی اندازے لگا رہی تھی۔

اگلے دن کالج میں بھی فری ہیریڈز میں وہ بار بار فون کر رہی تھی۔ وہ کالج سے واپس آ رہی تھی جب اس کے فون پر قتل ہوئی۔ اس نے جلدی سے فون اٹھایا، حیدر بول رہا تھا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں؟" وہ قدرے بے صبری سے بولی۔

"ہاں، میں ٹھیک ہوں اور تم۔۔۔۔۔؟" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔

"آپ میری چھوڑیں اور اپنی بتائیں۔۔۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔"

"حیدر! کیا بات ہے۔۔۔۔۔ پلیز، مجھے سچ سچ بتائیں؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ تو ہے۔" وہ کرپتے ہوئے بولی۔ "آپ کو۔۔۔۔۔ آپ کو۔۔۔۔۔ شہلا کی قسم۔۔۔۔۔"

"مجھے کسی بھی شہلا کی کوئی قسم نہ دو جبکہ وہ دونوں ہی میرے پاس نہیں۔"

"سنگ۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔؟" ابھی وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ حیدر نے فون بند کر دیا۔



سہیل گرفتاری دے چکا تھا اور یہ خیر اخباروں میں بھی چھپ چکی تھی۔ ملک منصور کی راتوں کی نیند اڑی ہوئی تھی۔ ایکشن سر پر تھے۔ اب وہ چیف منسٹر کے عہدے تک پہنچنے کی تگ و دو کر رہا تھا کہ اس قلعے نے اس کے سارے پلان کا بیڑا فرق کر دیا۔

”وہ بد بخت ہے کہاں.....؟“ ملک منصور نے سرگوشی کے انداز میں سہیل سے پوچھا۔

”میرے گاؤں میں۔ میری ماں کے پاس۔ آپ بے فکر رہیں، وہ وہاں ہر طرح سے محفوظ ہے۔“ سہیل نے اسے تسلی دی۔

”میں اس کے گلے کے گلے کر دوں گا۔“ وہ طیش میں بولا۔

”اس وقت ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھائیے۔ زویا اور عابد کے پیچھے کوئی ایسا نہیں جو مقدمہ بہت اوپر تک لے جائے۔ صرف ان کے لواحقین کو

خریدنا پڑے گا۔“ سہیل نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اور وہ کم بخت عابد کا دوست۔ جس نے شفق کو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ شکر ہے اس وقت چوکیدار گیٹ پر نہیں تھا۔ اس کو میں ہر

ممکن طریقے سے خریدنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ابھی تک تو وہ رکا ہوا ہے۔ اگر اس نے زبان کھول دی تو.....؟ اس وقت میں شدید اسٹریس میں ہوں۔

میں ملک منصور، جو بڑی سے بڑی آفتوں سے نہیں گھبرا یا، اس نامرابطہ کی وجہ سے اپنے ہوش و حواس کھو رہا ہوں۔“ وہ قدرے بے بسی سے بولا۔

”ملک صاحب! آپ فکر نہیں کریں۔ جب میں اقرار جرم کر رہا ہوں تو پھر..... پھر کسے اعتراض ہے..... اور ویسے بھی یہاں پر ایمان تک

بکنے کو تیار ہوتا ہے۔ ایک شخص کی گواہی کیا سچی رکھتی ہے؟ اگر نہیں مانتا تو.....“ سہیل کے ادھر سے جملے نے اسے سب کچھ سمجھا دیا۔

”اس کو میرے بندوں نے اغوا کر لیا ہے۔ اسی لیے تو وہ تھانے تک نہیں پہنچ پایا۔“

”ملک صاحب! اس نے شفق کو کسی کو مار تے ہوئے نہیں دیکھا ہے نا۔“ شفق جب گاڑی میں بیٹھ رہی تھی تب وہ پیچھے سے آ رہا تھا۔ اس کا

بیان اتنا غصوں نہیں۔ اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا تھا اور ظاہر ہے گاڑی میں چلا رہا تھا۔ اب میں نے گرفتاری دے دی ہے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”لیکن..... پولیس بار بار یہی پوچھ رہی ہے کہ شفق کہاں ہے کیونکہ عابد کے دوستوں اور چوکیدار نے یہی بیانات دیے ہیں کہ شفق کا وہاں

بہت آنا جانا تھا۔ ظاہر ہے شفق کی غیر موجودگی خود بخود اسے مشکوک بنا رہی ہے۔“

”تو آپ اوپر بات کیوں نہیں کرتے؟“

”کر تو رہا ہوں۔ آج کل میں منسٹر شپ سے استعفیٰ دے چکا ہوں۔ میری وہ حیثیت نہیں ہے جو منسٹر ہوتے ہوئے تھی۔ اب ایکشن کے

دن ہیں اور مخالف پارٹیاں ہر ممکن طریقے سے مجھے نچا دکھانے کی کوشش کریں گی۔ ہر جھکندہ اپنا نہیں گی۔ شفق کی بھنک بھی ان کے کانوں تک پہنچی تو

پھر..... پھر سب کچھ میری اتنے سالوں کی محنت اور سب کچھ برباد ہو جائے گا۔“ ملک منصور کچھ کھوجانے کے شدید خوف سے تلملارہا تھا۔

”آپ شفق کو گھر لے آئیں۔“ سہیل نے رائے دی۔

”نہن..... نہیں۔“

”کیوں؟“

”وہ بہت خود سر اور ضدی ہے۔ اگر اس نے ابھی کوئی الٹا سیدھا بیان دے دیا تو میں نہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہوں گا اور نہ ہی دوبارہ انکیشن میں کھڑا ہوں گا۔ میرا لہجہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ میرا تودل چاہتا ہے اس کو بھی شوٹ کر دوں۔“ ملک منصور غصے سے بول رہا تھا۔

”کیا.....؟“ سہیل حیرت سے اس کی طرف بے یقینی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ اسے قطعی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص اس قدر سنگدل اور بے رحم ہو سکتا ہے۔ وہ اس کے سارے کرتوتوں سے واقف تھا۔ لہجوں میں وقار داریاں بدلنا اور موقع کی مناسبت سے گرج کی طرح رنگ بدلنا تو اس کی فطرت کا خاصہ تھا۔ مگر اولاد کے بارے میں اس کا یہ رویہ پہلی دفعہ سامنے آیا تھا۔ اس شخص کو صرف اپنا کیریئر عزیز ہے۔ نہ اولاد اور نہ ہی کوئی دوسرا شخص اس کا مطلب ہے کہ وہ سہیل کو ایک مہرے کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ اس نے کسی قدر غصے ہو کر بے لوث اس کی خدمت کی تھی۔ بتا اس کے کہے شوق کی خاطر دہرے قتل کا الزام اپنے سر لیا تھا اور اس شخص نے ایک دفعہ بھی نہ اس کا شکریہ ادا کیا نہ اس کی رہائی کے سلسلے میں کوئی امید دلائی۔ وہ تو بس اپنی ساکھ اور انکیشن کی بات کرتا رہا۔ سہیل اس کی باتیں سن کر سوچ میں پڑ گیا۔



سہیل کی ماں اور اس کی دونوں بہنیں اس کی ہر طرح سے خدمت کر رہی تھیں۔ اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرتیں مگر وہ کم مہم ہی پریشان ہر وقت کمرے میں بیٹھی رہتی۔ وہ شدید ڈپریشن میں تھی۔ عابد نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا، اسے اس کا شدید دکھ تھا اور اب اس نے جو کچھ زویا اور عابد کے ساتھ کیا تھا، وہ اس کا بھی عذاب سہہ رہی تھی۔ سونے کی کوشش کرتی تو عابد کی گندی باتیں اس کے دل و دماغ میں آگ لگا دیتیں اور کنسرٹ والی رات..... اس رات کیا کچھ ہوا تھا۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کرتی، یاد نہ آتا مگر شاید کچھ بہت ہی بھیاںک ہوا تھا۔ اس کا جسم اس کا گواہ تھا۔ اس کے بازوؤں پر سگریٹ کے جلے کے نشانات اور بہت کچھ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر ان لہجوں کو کوس رہی جب اس نے زویا کو دوست بنایا، اس پر اندھا دھند کیا، سہیل اسے کتنا سمجھاتا تھا۔ کتنا ڈانٹتا تھا مگر وہ کب سنتی تھی۔ سہیل نے اس کے لیے نہ جانے کیا کچھ کیا تھا۔ وہ اس کے خلوص کو نہ جان سکی۔ سہیل نہ جانے کن حالوں میں ہو گا۔ اس کے گھر والے بھی لاعلم تھے یا شاید اسے بتانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ کس سے پوچھے۔ چند ساعتوں کے لیے اس نے سونے کی کوشش کی مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی پھر بھی اس نے آنکھیں بند کر کے ایک کوشش کی کہ شاید بھولے بھگتے نیند کی وادیوں میں سے کوئی پری اک لمحے کے لیے اس کی طرف آ جائے۔ آج اسے شہلا بار بار یاد آ رہی تھی۔ اگر ماما پانچک ہوتے تو شاید وہ ان حالات کا شکار نہ ہوتی مگر وہ دونوں تو..... اپنی اپنی ذات کو چاہنے والے تھے۔ اولاد کو تو کوئی بھی نہیں چاہتا تھا۔ فلک کس طرح بے بسی کی حالت میں مرگئی اور میں بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں گی۔ دونوں میں سے کسی کو بھی افسوس نہ ہو گا۔ ہم کتنے بے وقعت وجود ہیں۔ جنہیں نہ محبت مل سکی نہ تحفظ۔ جیسے خزاں میں اڑتے آوارہ چتے۔ ادھر ادھر، بے ضرر، بے حقیقت، مردہ اور بے جان۔ آنسو آنکھوں سے بہہ بہہ کر چکے ہیں جذب ہوتے رہے اور اس طرح اس کی آنکھ لگ گئی، ابھی اس نے نیند کی وادی میں قدم رکھا ہی تھا کہ کسی کی سسکیوں نے اور رونے کی آواز نے اسے اٹھا دیا۔ وہ گھبرا کر اٹھی اور ہار جھانکا۔ سہیل کی ماں اور بہنیں رو رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس بھاگتی ہوئی گئی۔

”کیا ہوا..... آ..... آپ لوگ کیوں رو رہی ہیں؟“

”میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔۔۔۔۔“ اس کی ماں روتے ہوئے بولی۔

”کیا۔۔۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔۔۔؟“

”وہ کسی کو نہیں مار سکتا۔“

”مگر اس نے کس کو مارا ہے؟“ اس نے بے صبری سے پوچھا۔

”یہ دیکھو اخبار۔۔۔۔۔“ سہیل کی بہن عذرانے اخبار اس کے سامنے رکھا۔ وہ زمیندار کی حویلی میں کام کرتی تھی شاید وہیں سے لائی تھی۔ اس

نے جیسے ہی اخبار سپردِ حاکر کے پڑھنے کی کوشش کی تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ سہیل اس کی وجہ سے یہ سب برداشت کر رہا ہے۔

”وہ بے گناہ ہے۔۔۔۔۔ وہ بے گناہ ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”آپ کیسے جانتی ہیں؟“ عذرانے جلدی سے پوچھا۔

”میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔ میں ہی تو سب کچھ جانتی ہوں۔۔۔۔۔ وہ ایسا نہیں۔۔۔۔۔ وہ بے گناہ ہے۔ مجھے کسی طرح تھانے پہنچا دو۔۔۔۔۔ میں گواہی

دوں گی۔“

”نہیں، سہیل بھائی آپ کی سخت حفاظت کا کہہ کر گئے ہیں اور یہ کہ آپ باہر نہ نکلیں۔“

”یہ تب تھا جب وہ خود لاک اپ میں نہیں تھا۔ اب میرا باہر جانا مجبوری ہے۔ مجھے کسی طرح شہر پہنچا دیں۔“ تینوں ماں بیٹیوں نے ایک

دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر خاموش ہو گئیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ملک منصور مضطرب سا کمرے کا چکر لگا رہا تھا۔ گھر میں ہر طرف ستاہی ستاہی تھا۔ شزا اپنے کاموں میں مگن رہتی تھی۔ آفاق نے آج کل

فیکٹری جانا شروع کر دیا تھا اور وہ اب رات گئے تک واپس آتا۔ محرم کہاں ہوتی، کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کا موبائل بار بار بج رہا تھا وہ نمبر دیکھ کر فون رکھ

دیتا۔ تھوڑی دیر بعد پھر فون بجا۔ اب کی بار اس نے نمبر دیکھا تو فوراً ہی لوکھا۔ دوسری طرف اس کا پی اے تھا۔

”ہاں کہو۔۔۔۔۔ کیا بات ہے؟“

”سر، بس شفق تھانے پہنچ گئی ہیں اور انھوں نے اقبال جرم کرنے کی کوشش کی ہے۔“

وہ غصے میں گالیاں بکتے لگا اور موبائل اٹھا کر دروازے پر پھینکا۔ چند لمحوں کے بعد وہ دم بخود رہا اور پھر کچھ سوچ کر باہر نکل گیا۔ اس کی

آنکھوں میں خون اتر ا ہوا تھا۔ ایسی ناخوار اولاد سے تو میں بے اولاد ہی رہتا تو بہتر تھا۔ اب چیف فکٹر بننے کی ساری جگہ دووا کا رست جائے گی۔ یہ ایکشن

نہیں جو تھا اور اس میں اس نے ساری جمع پونجی لگا دینے کا سوچا تھا اور کافی کچھ لگا بھی دیا تھا۔ فیکٹری بھی رہن رکھی تھی۔ پارٹی والے نمبرے خواب

دکھانے میں کسی طرح بھی پیچھے نہیں تھے۔ ملک منصور کے چیف فکٹر بننے کی دیر ہے پھر سب کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ جلسے کامیاب جا رہے

تھے۔ ایکشن کمپن میں زبردست کامیابی کے دعوے کیے جا رہے تھے۔ اب جبکہ فصل پک کر تیار ہو چکی تھی، بس کٹنے کی ہی دیر تھی کہ شفق کا یہ قدم جیرونگلر

آندھی کے مانند ثابت ہوا..... میں قسمیں تہا کر کے رکھ دوں گا۔ وہ نہ جانے کیا کچھ سوچ رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ گاڑی تھانے میں داخل ہوئی۔

”ملک صاحب! میں آپ کو بہت دیر سے فون کر رہا تھا مگر آپ کا فون ہی نہیں مل رہا تھا۔“ انسپکٹر اسے دیکھ کر تباہ داری سے بولا۔

”ہاں..... ہاں، مجھے معلوم ہے۔ شفق کہاں ہے؟“ وہ کچھ سننے کے موڑ میں نہیں تھا۔ اس لیے بے اعتنائی سے بولا۔

”وہ کمرے میں ہے۔“

”میں اس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں جی..... ضرور.....“

”اوتے نذر..... بی بی کو ملک صاحب سے طوا اوئے۔“ انسپکٹر نے ایک سپاہی کو آ رہا دیا۔

”ابھی ہم نے ان کو لیڈی پولیس کے حوالے نہیں کیا۔ بس آپ کے حکم کے منتظر تھے۔ ابھی ان کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ وہ خود ہی تھانے میں پیش ہو گئی ہیں اور ابھی پرچہ بھی نہیں کٹا۔ اس لیے ابھی معاملہ اپنے ہاتھ میں ہے۔“ انسپکٹر کی رال چکے کو تیار تھی۔ ملک منصور نے جیب سے ہزار ہزار کے نوٹ نکالے سب انسپکٹر کے سامنے رکھے اور سپاہی کے ساتھ اندر چلا گیا۔

شفق ایک چادر میں لپیٹی بیٹھی تھی۔ باپ کو دیکھ کر اس نے سر جھکا لیا۔ ملک منصور خونخوار لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم بھی اپنی ماں کی طرح گند اخون ہی نکلی۔ تم نے مجھے جہا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر میں تمہارا ہر پلان ٹیل کر دوں گا۔ تم زندہ رہو گی تب تا.....“ اس نے رپا اور لکال کر دو تین قاز کیے۔ وہ وہیں فرش پر تر پنے لگی۔ وہ قدرے اطمینان سے باہر آیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”باقی معاملہ خود منجبال لینا۔“ اس نے انسپکٹر کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

”ملک صاحب.....؟“ جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔

”اس واقعے کی خبر نہ پولیس میں جائے اور نہ کسی اور کو یہاں کچھ نہیں ہوا ہے۔“ وہ الفاظ پر زور دے کر جیسے وارننگ دے رہا تھا۔

”مگر.....؟“

”بس کچھ نہیں.....“ وہ فرمایا۔

انسپکٹر شدید شش دہچ میں تھا۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟

اتنا اہم واقعہ..... اور سب کچھ چھپانا کیسے ممکن ہوگا؟ اس کی نوکری بھی جاسکتی تھی اور ملک منصور کی سیاسی حیثیت سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھا۔

سہیل خٹے میں ماں کے ساتھ جھگڑ رہا تھا اور وہ اس کی ختیں کر رہی تھی۔ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”آپ نے ایسا کیوں کیا..... جب میں نے آپ سے کہا تھا کہ اسے باہر نہیں جانے دینا اور آپ اسے تھانے تک لے آئیں۔ آپ کو

نہیں معلوم کہ اس کی جان کو کتنا خطرہ ہے۔“ سہیل خٹے سے بولا۔

”مجھے کیا معلوم..... مجھے اس نے کچھ بھی تو نہیں بتایا۔ کہنے لگی وہ تھانے میں تم سے ملنا چاہتی ہے..... اب بتاؤ میں کیا کرتی..... تھانے آتے ہی وہ سیدھی پولیس کے پاس چلی گئی، میرا کیا قصور ہے؟“

”اماں..... اماں، میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟“ وہ جھنجھلا کر بولا۔ ”اور اب وہ کہاں ہے؟“

”تھانے میں.....“

”اور آپ کو جیل میں کس نے آنے دیا؟“

”اسی نے جیسے سے بات کر کے مجھے ادھر بھجوا دیا ہے۔“ اسی لمحے ملک منصور جیل میں اس کے پاس آ گیا۔

”سہیل، میں نے اسے ٹھکانے لگا دیا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ سہیل کے قدموں تلے سے جیسے زمین نکل گئی۔

”وہ تھانے میں پیش ہو گئی تھی اور میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ابھی پرچہ نہیں کٹا تھا اور کسی کو بھی خبر نہیں ہوئی تھی۔ میرے پی اے نے مجھے فون پر اطلاع دی..... اور میں نے اسے ختم کر دیا۔“

”ملک صاحب..... ملک صاحب ایسا آپ نے کیا کیا..... اتنا بڑا قدم.....؟“ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

”میں نے کہا..... اس کے علاوہ میرے پاس کوئی اور راستہ نہ تھا اور اب تم اپنی بات پر قائم رہنا۔“

”کون سی بات.....؟“

”زویا اور عابد والی..... کہ یہ قتل تم نے کیے ہیں۔“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

سہیل اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ ملک منصور جا چکا تھا اور سہیل کی ماں حیرت سے دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”اماں..... میں نے کہا تھا کہ اس کو یہاں مت لانا..... اب دیکھو، اس کے سگے باپ نے ہی اس کو مار ڈالا ہے..... اماں، یہ آپ نے کیا کیا.....؟“ وہ تاسف سے بولا۔

”کیا کوئی باپ بھی اپنی اولاد کو مار سکتا ہے؟“ اس کی ماں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ دنیا ہے اماں..... اور یہاں سب کچھ ہوتا ہے۔ اب خود ہی دیکھو، کیا ہو گیا ہے؟“ وہ تھر تھر سے بولا۔

”بی بی..... ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔“ ایک پولیس والے نے اس کی ماں کو باہر نکلنے کو کہا اور وہ اس ادھوری ملاقات سے مزید پریشان ہو کر باہر نکل آئی۔

جب سے وہ کلب جانا شروع ہوئی تھی، زندگی کا ایک نیا روپ اس کے سامنے آیا تھا۔ وہ عورتوں کی چالبازیوں اور چلتروں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی تھی۔ ظاہری طور پر خوبصورت، اسماٹ، ویل ڈریسڈ اپرکلاس کی چارمٹنگ خواتین اندر ہی اندر کس کس طرح ایک دوسرے کو فریب دینے کی کوشش کرتی تھیں۔ وہ دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ سزا اس کے سامنے تھی۔ مگر ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی وہ اس سے ناواقف تھی اور شفق ایسی نہیں تھی۔ وہ اپنی ہی زندگی میں گمن رہتی۔ شفق کئی دنوں سے گھر سے غائب تھی اور کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے آفاق سے پوچھنے کی کوشش کی تو اس نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔

”آفاق، وہ تمہاری بہن ہے تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کہاں ہے۔“ سحر نے قدرے غصے سے اس سے پوچھا۔

”وہ اکثر ٹریس پر یو جی بتائے بغیر چلی جاتی ہے۔ کچھ دنوں تک واپس آ جائے گی اور جائے گی بھی کہاں؟“ وہ بے پروائی سے بولا۔

اسے اندر ہی اندر فکر تھی کیونکہ وہ شفق کو جس حالت میں دیکھ چکی تھی، اسے خوف تھا کہ وہ کوئی انتہائی قدم نہ اٹھالے مگر آفاق اور دوسرے گھر والے کچھ بھی نہیں جانتے تھے اس لیے مطمئن تھے۔ جب سے اس کے ساتھ یہ حادثہ ہوا تھا۔ آفاق اب آہستہ لہجے میں اس سے بات کرتا جیسے اس کا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے اکتا گئی تھی۔ شفق نے سب کچھ بھلانے کے لیے اسے کلب جوائن کرنے کو کہا تھا اور اس نے کافی دنوں سے کلب جوائن کر لیا تھا۔ پہلے پہلے تو خواتین نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔ فرقر انگریزی بولنے والوں میں وہ اردو بھی پنجابی لہجے میں ڈر کر بولتی۔ کبھی وہ اس کی پرسنالٹی کا مذاق اڑاتیں تو کبھی اس کے لب و لہجے کا۔ وہ ان کے درمیان مذاق بن گئی تھی۔ اسے اندر ہی اندر شرمندگی بھی ہوتی تھی۔ اس نے فوری طور پر نیوٹرل سٹا کی۔ وہ گھر آ کر اسے سحر زبھی سکھاتی۔ پڑھاتی بھی اور سوسائٹی میں مود کرنے کے طریقے بھی بتاتی۔ ڈیجین تو وہ تھی ہی..... ہر چیز کو اس نے چند دنوں میں ہی پک کر لیا۔ بس انگریزی میں کسرا تھی..... اور اس کے لیے وہ بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ وہ زیادہ تر وقت انگریزی فلمیں دیکھنے میں گزارتی۔ ساتھ ساتھ ٹیوٹر اسے سمجھاتی رہتی۔ اس نے عام بول چال کے جملے سکھا دیے تھے۔ اس کا ایکسٹ بھی آہستہ آہستہ بہتر کرنے کی کوشش کی۔ اس کے کپڑوں کے اسٹائل میں بھی فرق آچکا تھا..... اور ان چیزوں کے ساتھ ساتھ اس کے اعتماد میں بھی کافی اضافہ ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ ان خواتین کی خامیوں پر بھی اس کی نظر تھی۔ وہ ان کے درمیان بیٹھ کر ایک دوسرے کی تعریفیں اور پھر خامیاں سنتی رہتی۔ کس کو کہاں لیٹ ڈاؤن کرنا ہے اب یہ فن بھی اس کو آ گیا تھا۔ ہاتوں ہاتوں میں مٹھو اور گھٹیا جملے پھینکنے میں وہ ایسی ماہر ہو گئی تھی کہ خواتین حیران رہ جاتیں۔ جیسے جیسے وہ کونفیڈنٹ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی نظریں اور حرکتیں بھی بے باک ہو رہی تھیں۔ جب وہ منگتی تھی تو کالی سی چادر کبھی سر سے بننے نہ دیتی تھی۔ اپنی طرف ہر اٹھنے والی بے باک نظر کو ایسا نشتر چھوٹی کر دیکھنے والا بلبلال لگتا۔ وہ تو ساری آبادی میں پتھر مشہور تھی اور اب اپنی نظروں کو خود ہی اس نے بے باک کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جن خواتین میں اٹھ بیٹھ رہی تھی۔ وہ بیگمات کا مخصوص سرکل تھا۔ جن کے لیے ہر بات فن اور ایڈوینچر سے کم نہ ہوتی تھی۔ ان میں سے اکثریت تو خاوندوں کو چھوڑ چکی تھیں اور کچھ ظاہر آشوبہروں والیاں تو تھیں مگر اندر سے دل رجمانے اور نام پاس کرنے کے بہت سے شغل پال رکھے تھے۔ وہ جیسے جیسے ان کے قریب ہوئی تو ویسی ہی عادتیں اپنانے لگی۔ دو مخالف گروپوں کے درمیان وہ مثل کا ک بن گئی۔ اسے ایک دم اپنا آپ بہت اہم اور مستبر محسوس ہونے لگا۔

وہ ایک گروپ کی باتیں دوسرے کو بتاتی اور پھر جو کچھ ہوتا اسے خوب انجائے کرتی۔ اس کے لیے زندگی تو اب کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ محض ایک فن..... ایک شغل..... اس کے علاوہ اس کے لیے زندگی میں کچھ بھی باقی نہ تھا۔ وہ آفاق کو چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اب اس کے پاس کوئی اور راستہ نہ تھا۔ جس ماحول سے وہ نکل تھی اب وہاں جانا تو کیا سوچنا بھی ایک مستحکم خیز خیال لگتا تھا۔ وہ اسے روپیہ پیسہ بھی کھلا دیتا۔ وہ جو چاہتی کرتی۔ ان کا رشتہ محض نام کا رہ گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد آفاق میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ وہ اس پر ہاتھ بھی کم اٹھاتا تھا اور خود بھی اس نے فیکٹری جانا شروع کر دیا تھا۔ زندگی کی طرف اس نے تنجیدگی سے قدم بڑھایا تھا۔ اس بات کو ملک منصور نے بھی بہت خوش آئند سمجھا تھا اور سر کے لیے بھی یہ کسی اجنبی سے کم نہ تھا۔ وہ بات بھی دھیسے لہجے میں کرتا اور اس کی بہت سی نامعقول باتوں پر بھی خاموش رہتا۔

اس کا موڈ سخت آف تھا۔ نہ کچھ کھانے کوئی چاہ رہا تھا نہ پینے کو۔ باہر ٹکجا سا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ کمرے میں لائٹ آف کیے کرسی پر بیٹھی سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہی تھی۔ آج سگریٹ بھی خاصی بد مزہ لگ رہی تھی اس نے سگریٹ بری طرح توڑ مروڑ کے الٹش ٹرے میں پھینکی اور سگریٹ کیس سے نئی سگریٹ نکالی پرس میں سے ایک چھوٹی سی ڈبی نکال کر اس کے تمباکو میں چرس بھرنے لگی اور پھر گہرے گہرے کش لینے لگی۔ ہار کا تھن پھر بھی کم نہیں ہو رہا تھا۔ گوکہ ذہن اونچی اڑانیں بھرنے لگا اور اس میں نئی نئی اسکیمیں آنے لگیں۔ مسز سلیم انتہائی چھچھوری اور کینی عورت ہے۔ آج اس نے ضرور پتا بدلا ہوگا ورنہ میں کیسے ہار سکتی تھی۔ میرا تعلیم یافتہ نہ ہونا ان لوگوں کو اکثر فائدہ دے جاتا ہے۔ ورنہ میں آج باری نہیں سکتی تھی۔ مسز سلیم، مسز اکرام اور مسز زہیر پڑی گھاگ اور زہریلی عورتیں ہیں۔ شاطر، چال باز انھوں نے میرے خلاف مل کر پلاننگ کی ہوگی۔ یہ ہمیشہ مجھے پھنسانے کے چکروں میں رہتی ہیں۔ اسے ان پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ آج وہ پچاس ہزار جوئے میں ہار کر آئی تھی۔ وہ ہر طرح سے لیس ہو کر آج میدان میں اتری تھی۔ اس نے خصوصی طور پر مسز زہیر سے سارے ٹکس دیکھے تھے۔ پتے سارے اس کے پاس تھے۔ یقیناً پتے بدلے گئے ہوں گے وہ بار بار سارا منظر ذہن میں لا رہی تھی اور جیسے ایک دم کچھ ذہن میں آ گیا۔ جب اس کا سگریٹ کیس نیچے گرا تھا اور وہ اٹھانے کے لیے جھکی تھی۔ تب سر اٹھاتے ہوئے اس کی نظر مسز زہیر پر پڑی تھی اس کی آنکھوں میں خاص چمک تھی اور لہجوں پر مسکراہٹ اور اس نے مسز اکرام کو آکھ بھی ماری تھی۔ اچھا تو یہ کم تھی۔ میں بھی ان کو نہیں چھوڑوں گی۔ اس نے ریڈ ٹکری ہلاک ہیل کی اونچی ایڑی والی جوتی اتار کر دور پھینکی۔ اس کا خون غصے سے کھول رہا تھا۔ انھوں نے مجھے ہمیشہ شکست دینے کی کوشش کی ہے۔ ہر بات میں۔ اب میری باری ہے ان سے اپنی ہار کا بدلہ لینے کی اور اب یقیناً وہ پی سی میں ڈنر کے لیے گئی ہوں گی۔ وہ ان کی عادتوں اور روئین سے اچھی طرح واقف تھی۔

وہ اک نئے عزم کے ساتھ اٹھی۔ سگریٹ الٹش ٹرے میں سسلی اور آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ شو لڈر کٹ بالوں کو برش کیا۔ لپ اسٹک کا ڈبرا کوٹ کیا۔ ماؤتھ واش سے منہ صاف کرنے کے بعد ماؤتھ اسپرے کیا۔ جسم پر پریلوم کا بھرپور چھڑکاؤ کرنے کے بعد وہ گاڑی لے کر پی سی کی طرف روانہ ہوئی۔ پی سی میں کوئی خاص فنکشن تھا۔ اس لیے مرد و خواتین جوتی در جوتی جدید فیشن، ہیل میڈیسات اور ملی جلی خوشبوؤں سے معطر ہتھ مسکراتے داخل ہو رہے تھے۔ اس نے ہال میں نظر دوڑائی کوئی شٹا سا چہرہ نظر نہ آیا۔ موسم گرما کی آمد آئی تھی اس لیے مقامی کینیاں اپنی پروڈکٹس کی ایڈورٹائزنگ کے لیے ہر سال کی طرح اس دفعہ بھی بہت وسیع اور جدید خطوط پر یہ شو منعقد کروا رہی تھیں۔ تقریباً تمام بڑے ہوٹلوں میں یہی

سرگرمیاں جاری تھیں۔ فیشن اور ماڈلنگ کے نام پر ایک مخصوص انجوائے منٹ مخصوص طبقے کو لڑاہم کی جا رہی تھی۔

ہال قدرے بھرا ہوا تھا۔ رنگ برنگی روشنیاں نیم عریاں ماڈلز کے جسموں اور چہروں پر پڑتیں تو عجیب سا تاثر پیدا ہوتا۔ لوگ خوب انجوائے کر رہے تھے۔ وہ تینوں اسے ایک کونے میں بیٹھی نظر آ گئیں۔ تینوں قہقہے لگا رہی تھیں اور اچانک اس سے اگلی ٹیبل پر اس کی نظر پڑی وہ جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی۔ اس میں ایک قدم بھی اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ اتفاق ایک خوبصورت سی ماڈل اسکا ڈاکٹر کی کے ساتھ ہاتوں میں مصروف تھا اور دونوں کسی بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ ان قہقہوں کا شور اور گونج اپنے دل و دماغ میں سن رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر کی اور پھر خالی خالی قدموں سے واپس لوٹ آئی۔



ولیم کو فادر کی طرف سے ایک میل موصول ہوئی تھی اور اب وہ بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ فادر نے ہر ممکن طریقے سے دو سالوں میں اس کی برین واشنگ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب اس کے اے، لیوڈ کے ایگزٹرا میں ہونے والے تھے اور ان سے فارغ ہونے کے بعد فادر نے اس کے بارے میں کوئی اہم فیصلہ کرنا تھا۔ فادر نے خود ہی اس کا ایڈیشن لاہور میں کروا دیا تھا۔ شہلا ان تمام باتوں سے بے بہرہ تھی۔ ولیم نے کئی دنوں سے ماں سے بالکل رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ حیدر کی وجہ سے سخت پریشان تھی۔ نہ وہ اسے مل رہا تھا نہ کوئی اس سے بات ہو رہی تھی۔ وہ حقیقت معلوم کرنا چاہتی تھی مگر سب کچھ اس کی ریٹج سے باہر تھا۔ رشید نے اسے اطلاع دی کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یقیناً حیدر ہی ہوگا مگر اس وقت اس نے گھڑی دیکھی رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ پریشان سی منتشر سوچوں کے ساتھ جب وزیٹرز روم میں داخل ہوئی تو چمک گئی۔ ولیم سامنے بیٹھا تھا۔

”ولیم تم..... اور یوں اچانک بغیر بتائے۔ خیریت تو ہے۔“ اس نے بے دلی سے اسے گلے لگایا اور سوالات پوچھنے شروع کر دیے۔
 ”ہاں..... وہ..... ماما.....“ اسے جیسے پوری بات بتانے کے لیے ماحول سازگار نہیں لگ رہا تھا۔ ”ماما..... آپ نہیں، میں آپ کو بتاتا ہوں۔“
 ”کیا، خیریت تو ہے نا؟“

”ہاں، وہ فادر نے کہا ہے کہ میرا اب لاہور میں رہنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ اس لیے اب میں لاہور شفٹ ہو رہا ہوں۔ انھوں نے میرا ایڈیشن بھی یہیں بہت اچھے کالج میں کروا دیا ہے اور میرے رہنے کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔“ ولیم آہستہ آہستہ اسے بتا رہا تھا۔ شاید اسے اس کے رد عمل سے خوف آ رہا تھا۔

”ولیم..... میں فادر سے سخت تنگ ہوں۔ انھوں نے تم میں اور مجھ میں دراڑ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور تم نے ماں کو اہمیت دینا تو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔ فادر جو بات بھی کرتے ہیں تم فوراً مان لیتے ہو۔ کیا تمہاری ماں مر چکی ہے اور تم بے آسرا ہو گئے ہو جو تمہیں ہر بات میں ان کے مشورے کی ضرورت ہے۔ ولیم تم اب کسی بھی بات میں مجھ سے مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ اب جبکہ سب کچھ ہو چکا ہے تم صرف مجھے بتانے کے لیے آئے ہو۔ ٹھیک ہے تم جو چاہو کرو۔ میں کون ہوتی ہوں تمہیں کسی بھی بات میں مشورہ دینے والی۔ تمہارے لیے اب سب کچھ فادر ہی ہیں۔“

وہ غصے سے بولتی ہوئی ہا ہر نکلتے گئی تو ولیم اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

”مما..... یوں نہیں۔ میں جانتا تھا آپ ناراض ہوں گی اور آپ کو ہونا بھی چاہیے۔ ممائیں نہ آپ کو ناراض دیکھ سکتا ہوں نہ قادر کو۔ آپ میری ماں ہیں اور میں جانتا ہوں کہ آپ نے کن ٹکلیخوں سے مجھے پالا ہے۔ ممائیں آئی رینگیں لو یو۔“ اس نے ماں کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا ”مگر ممائیں قادر میرے لیے ایک رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آئی آلو لو ہم۔ میں کیا کروں۔ میں آپ دونوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ممائیں۔ میرے لیے چھوٹن کو مشکل نہ بنائیں اس طرح میں کٹھنکٹ کا شکار ہو کر ڈسٹرب ہو جاؤں گا۔ کیا آپ چاہیں گی کہ میں ڈسٹرب ہو جاؤں۔“ وہ استغہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”نہیں، میں کبھی بھی نہیں چاہوں گی۔ میں کبھی بھی تم کو ڈسٹرب نہیں دیکھ سکتی۔“ اس کی آنکھوں میں بھی نمی سی تیرنے لگی۔ وہ ولیم کی بات سن کر شدید جذبات سے مغلوب ہو چکی تھی اور سخت غصے کے باوجود اسے نہ روک سکی۔ اس کے اندر لاوا اٹل رہا تھا۔ کبھی دل چاہتا اسی لمحے ساری حقیقت اسے بتا دے اور کبھی مسئلے کو مزید الجھنے سے بچالے..... مگر پھر وہ اس سے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ جا چکا تھا اور اسے اپنے آپ پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ ہر بار ایسا کیوں ہوتا ہے۔ وہ کب تک مصلحتوں کا شکار ہوتی رہے گی۔ کب تک..... یوں حالات کے ہاتھوں کٹھن پتلی بنی رہے گی مگر میں کیا کروں۔ کیا کہوں اور کس طرح۔ اسے ہمیشہ نتائج سے خوف آتا تھا۔ اس نے حالات کو یونہی چلتے دیا۔

ولیم ہاسٹل شفٹ ہو چکا تھا۔ جب سے قادر سے اس کا ملنا جلتا ہوا تھا اس کی سوچ بہت بدل چکی تھی۔ وہ عام لڑکا نہیں رہا تھا۔ قادر کی مملو نے اس کی بہت برین واشنگ کر دی تھی۔ وہ بہت سنجیدگی سے زندگی اور اس کی حقیقتوں کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ وہ ہر بات کے ہر پہلو کو پہلے ذہن میں رکھتا پھر کوئی قدم اٹھاتا۔ اس کے نرم و نازک ذہن کو قادر نے مذہب کے سخت قلعے میں جکڑ دیا تھا۔ وہ گناہ اور ثواب کے فلسفے میں الجھا رہا تھا۔ ہر بات کو کہنے سے پہلے سوچتا کہیں گناہ کے زمرے میں تو نہیں آتی اور ہر کام کو کرنے سے پہلے الجھن کا شکار رہتا کہ اس کا ثواب بھی ہوگا کہ نہیں۔ اس کے ہم عمر زندگی کو کیسے کیسے انجوائے کر رہے تھے۔ ہنسی مذاق کرتے لڑکے لڑکیوں کے گروپ انجوائے منٹ کے مختلف پلانز بناتے رہتے۔ فریس اریج کرتے۔ ایگزیشنز پر جاتے۔ فیشن شوز دیکھنے کے لیے پروگرامز بنتے۔ تھیز جاتے۔ شاپنگ کے لیے جاتے اور وہ یا تو اپنی اسٹڈیز کرتا یا پھر ہاسٹل پڑھتا یا پھر نیٹ پر قادر سے چیٹ کرتا۔ وہ جب بھی الجھتا قادر اسے ایک نئی سوچ دے کر اس کے ذہن کا دھارا بدل دیتے۔ قادر بہت ماہر اور فطین شخص تھے۔ جن کی زندگی کا مشن ہی نئے ٹیکنٹ کو چرچ کے مفادات کے لیے استعمال کرنا تھا۔ قادر سے ملنے سے پہلے وہ ہر ایکٹیوٹی میں آؤٹ اسٹینڈنگ سمجھا جاتا تھا۔ کسی بھی پروگرام میں اس کی شرکت ادارے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی اور اب وہ ان سب چیزوں سے الگ تھلک رہتا۔ اس کے کلاس فیلوز اور روم میٹس نے بھی اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا بلکہ اب وہ اس کی کمپنی کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ لڑکیاں اسے ”گاڈ قادر“ کہہ کر تھیز تھیں اور اس کا خوب مذاق اڑاتیں۔ وہ کالج کا سب سے ہنڈم لڑکا تھا۔ لڑکیاں اس کے پیچھے دیوانہ وار فدا ہوتیں۔ جب تک وہ مری میں تھا ہر لڑکی اس سے دوستی کی خواہاں تھی اور جب لاہور آتا تب بھی وہ سب اس کی تاک میں رہتیں مگر جیسے ہی اس کی پرسنالٹی کا یہ پہلو سامنے آتا تو سب بدک کر پیچھے ہٹ جاتیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنا لوج بھی انھیں تاریک لگنے لگتا۔ بات بڑھنے سے پہلے اس کو قہقہہ کر دینا بھرتا ہے۔ ہر بڑھتا قدم

رک جاتا۔ ماں کے ساتھ بھی اس کے تعلقات سرد مہری کا شکار تھے۔ دوستوں کے حلقے میں بھی کمی آگئی تھی۔ اب اس کی ذات کو صرف اور صرف قادر نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ وہ پورا کا پورا قادر کے کنٹرول میں تھا اور قادر اسے اپنے اشاروں پر چلا رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ خود ہی الجھ جاتا۔ جو کچھ وہ کر رہا تھا وہ سب ٹھیک تھا یا پھر.....؟ اس کے آگے اس کا ذہن کچھ نہ سوچ پاتا۔ ہر طرف الجھنیں ہی الجھنیں تھیں اور وہ کسی ٹیکٹس کی طرح اس کے سارے وجود کو جکڑے ہوئے تھیں۔ اس کا وجود تضادات کا شکار ہو رہا تھا۔ سکون کے بجائے انتشار جنم لے رہا تھا۔ جب سے اس نے یہ محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ ماں اس کو اور قادر کے تعلقات کو ناپسند کرتی ہے۔ وہ مزید ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ ماں کے خواب چکنا چور ہو رہے تھے اور اس کی اپنی سوچ ڈسٹرب.....



شہلا نائٹ کوچ سے پشاور پہنچے تبسم کے پاس گئی تھی۔ دوا سے یوں اچانک صبح سویرے دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔
 ”شہلا خیریت تو ہے نا بیٹی۔ تم اس طرح اچانک..... بغیر کسی فون اور اطلاع کے گھر میں سب ٹھیک ہے نا۔“ تبسم اسے یوں پریشان اور پشیمان دیکھ کر مضطرب ہی ہو گئیں۔

”ہاں، سب ٹھیک ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔
 ”شہلا سچ بتاؤ۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولیں۔
 ”ارے بھئی بیٹی کو ناشتا وغیرہ تو دو پھر پوچھ لینا۔“ ان کے شوہر سید مغیث الدین نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
 ”السلام علیکم اکل۔“

”وہ السلام بیٹی۔ کیسی ہو۔ حیدر بھائی کیسے ہیں؟“
 ”ٹھیک ہیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”بیگم اس کو فریٹس تو ہونے دو۔ جاؤ بیٹی آپ فریٹس ہو جاؤ پھر ناشتا کھٹے کرتے ہیں۔“
 ”جی اکل۔“ وہ بیک لے کر اندر کمرے میں چلی گئی۔

”بیگم، آپ نے آتے ہی اسے پریشان کرنا شروع کر دیا ہے۔ آپ کو اس کے چہرے پر پھیلی مایوسی اور پریشانی سے خود ہی اندازہ کر لینا چاہیے۔ وہ بہت ڈسٹرب ہے۔“ مغیث صاحب نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... اسی لیے تو میں پریشان ہو گئی ہوں۔ وہ نہ تو کبھی یوں اچانک آئی ہے اور وہ بھی کوچ سے اور نہ ہی اس طرح کبھی افسردہ دکھائی دی ہے۔“

”آپ ناشتا لگوائیں۔ بعد میں اس سے پوچھ لینا لیکن پہلے میں حیدر کو تو فون کر کے بتا دوں کہ وہ خیریت سے پہنچ گئی ہے۔ وہ بھی پریشان ہو رہا ہوگا.....“ انھوں نے جلدی سے فون ملایا۔

”حیدر بھائی، کیسے ہیں آپ..... ٹھیک تو ہیں نا؟“ وہ خوش کن لہجے میں بولے۔

”کون مغیث بھائی! ہاں ٹھیک ہوں۔“ وہ قدرے یاسیت سے بولا۔

”آپ کو اطلاع دینی تھی کہ شہلا بیٹی خیریت سے پہنچ گئی ہے۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ اپنی ہی لے میں بولے۔

”شہلا..... ادھر..... ہے۔“ حیدر کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں بھئی۔ کیوں یقین نہیں آ رہا۔ بات کرواؤں۔ ابھی ابھی وہ پہنچی ہے اس لیے واٹس روم میں ہے۔“

”اچھا اس کو کچھ نہ بتائیے گا میں خود ادھر آتا ہوں۔“

”خیریت تو ہے نا؟“ مغیث صاحب کو شک سا ہو گیا۔

”بس آپ فون کے بارے میں کچھ بھی نہ بتائیے گا۔ وہ کچھ ناراض ہے۔“ حیدر نے فون بند کر دیا۔

”خدا یا تیرا شکر ہے کہ وہ ادھر چلی گئی۔ ورنہ میں تو پاگل ہی ہو جاتا۔“

شہلا زندگی میں پہلی دفعہ اس سے روشنی تھی اور اس کا یوں رونمنا اس کے لیے سخت جان لیوا ثابت ہو رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی دنیا ختم ہو رہی ہو۔ محبتوں کا یہ لٹھی اور نازک جال انسان کو کیسے کیسے جکڑے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ نازک جذبے بھی انسان کو کس قدر بے حوصلہ اور مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ نہ جی سکتا ہے نہ سر سکتا ہے۔

”مجھبتیں..... مصلحتیں، مجبوریاں اور بے بسی۔“ انسان الجھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ہر کوئی الجھ رہا تھا اور جو جھٹنا جھٹنا الجھ رہا تھا اتنا تڑپ رہا تھا۔ جھٹنا جھٹنا تڑپ رہا تھا۔ اتنا ہی زیادہ بے بس ہو رہا تھا۔ اس نے فوراً پٹا اور کے لیے سیٹ بک کروائی تھی۔

اس نے ناشتا بہت بے دلی سے کیا۔ اب مغیث الدین معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اس کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ تبسم اپنی جگہ پریشان بیٹھی تھیں۔

”بیٹی آپ ناشتا کیوں نہیں کر رہیں..... اور حیدر بھائی کیوں نہیں آئے؟“

”وہ..... انکل ان کی میٹنگز..... وہ بہت معروف ہیں۔“ وہ بے ربط لہجے میں بولی ”پچھو..... میں بہت تھک گئی ہوں۔ آرام کرنا چاہتی ہوں۔“ شاید اس نے مغیث الدین کی نظروں میں چھپا ہوا استہمام اور مشکوک لہجے کو پہچان لیا تھا۔ اس لیے ان کے سوالوں سے بچنے کے لیے وہ آرام کا بہانہ بنا رہی تھی۔

”آؤ..... میرے ساتھ.....“ پچھو اسے گیٹ روم میں لے گئیں۔

”پچھو گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے۔ کہاں ہیں سب لوگ؟“

”رینا نے اسلام آباد میں باؤس جاب شروع کی ہے۔“ میمنم کالج ٹرپ کے ساتھ بھونٹن گیا ہے اور اطہر کی پوسٹنگ آج کل کوئٹہ میں ہے۔“

”شہلا مجھے سچ سچ بتاؤ۔ کیا بات ہے۔ تم بہت پریشان لگ رہی ہو۔ اس قدر پریشانی تو میں نے تمہارے چہرے پر کبھی نہیں دیکھی ہے۔“

”پھوپھو..... میں بہت پریشان ہوں۔ پاپا..... پاپائیں رہے۔ آئی مین..... عی ازان لو..... اور یہ میرے لیے بہت شاکنگ ہے۔“

”کیا فضول بکواس ہے۔ حیدر اور امی باتیں۔“ پھوپھو ہنستے ہوئے ایک دم سیریس ہو گئیں۔

”بچی تو میرے لیے دکھ کی بات ہے۔ وہ میرے سامنے شروع سے ایک شفاف موتی کی طرح رہے ہیں۔ ان کی زندگی مکمل کتاب کے مانند ہے مگر اب وہ اس قدر بدل گئے ہیں۔“

”تم یہ سب کیسے جان پائیں؟“

”میں نے خود ان کو فون پر باتیں کرتے ہوئے سنا ہے۔ ان کا لہجہ..... مائی گاڈ..... پھوپھو..... وہ کہہ رہے تھے۔ شہلا تم اپنا ہر دکھ مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔“

”کیا کہا..... کیا..... شہلا زعمہ ہے.....؟“ پھوپھو کو جیسے ایک دم کرنٹ لگا۔

”کیا آپ انھیں جانتی ہیں.....؟“ شہلا کے لہجے میں حیرانی کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں بے شمار سوالات بھی تھے۔

”ہاں..... وہی تو ہے۔“ پھوپھو کے لہجے میں ابرت عاش پیدا ہو گیا۔

”کون..... بتائیں نا کون.....؟ جس نے میرا سکون برباد کر دیا ہے۔“

”حیدر کی محبت.....“ وہ آہستہ سے پولیس اور اسٹھ کر باہر چلی گئیں۔

”پھوپھو..... آپ نے بات ادھوری کیوں چھوڑ دی۔ آخر آپ کیوں بتانا نہیں چاہ رہیں؟“ وہ ان کے پیچھے مکن میں آ گئی۔

”تم کیا کرو گی سن کر؟ جن باتوں کو دہرانے سے سوائے تاسف کے اور کچھ نہ حاصل ہو تو ان کا فائدہ؟“

”مگر پھوپھو..... اس عورت کو کوئی حق نہیں کہ ہماری بے سکون زندگی کو یوں تباہ کرے..... پاپا کو اس سے پہلے میں نے اتنا مضطرب کبھی نہیں دیکھا۔ ان کا بدلا ہوا لب و لہجہ..... مجھے تو وہ اپنے آپ ہی میں نہیں لگے۔“

”آخر تم اس بحث سے کیا نتیجہ نکالنا چاہتی ہو؟“ وہ قدرے درشتی سے پولیس۔

”پھوپھو! آپ ناراض ہو رہی ہیں، آپ کو اندازہ نہیں کہ میں کتنی ہرٹ ہوئی ہوں۔ جس شخص کو ہم اپنی ذات سے بڑھ کر چاہیں۔ اس کا ایج ایک دم ختم ہو جائے تو کیا ہوتا ہے..... تو کیا ہوتا ہے، شاید آپ کو نہیں معلوم.....“

”شہلا..... تم صرف اپنا ہی سوچ رہی ہو۔ اگر دو لوگ ایک دوسرے کو بہت چاہیں اور مصلحتیں، روایتیں انھیں نہ ملنے دیں۔ ایک کا ٹٹوں بھری زندگی گزارے اور ایک بیلا بالوں جیسی دیراں..... تو اس کو تم کیا کہو گی.....؟“ تبسم نے آہ بھر کر اسے دیکھا۔

”تو یوں کہیں نا قسمت نے انھیں نہیں ملا یا..... مگر پاپا کا اس سے کیا تعلق؟“

”تم جانتی ہو..... تمہارا یہ نام بھی کسی کی عطا ہے..... شہلا کو قسمت نے اس سے چھینا تھا یا پھر وہ کھو گئی تھی۔ مگر وہ تمہاری صورت میں کبھی بھی اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ہم سب خاموشی سے سب کچھ دیکھتے رہے۔ کوئی بھی کچھ نہ کہہ سکا اور نہ کر سکا۔ شاید قسمت اسی کو کہتے ہیں..... نہ بابا نہ

حیدر..... نہ شہلا اور نہ ہی کوئی اور.....“

”آپ مجھے تفصیل سے سب کچھ کیوں نہیں بتاتی ہیں.....؟“ انھوں نے ساری تفصیل اسے بتادی۔

”پھوپھو..... اس عورت نے میری ماں کو بھی پورا حق نہ لینے دیا۔ میری ماں میرے باپ کی بچی اور بھرپور محبت کو ترستی مرگئی اور اب وہ مجھ

سے میرا حق چھیننا چاہتی ہے۔“

”شہلا اتہا ہاری ایسی سوچ..... ہم جو حیدر کے کزنز ہیں، اسے سگے بھائی سے زیادہ عزیز جانتے ہیں۔ اس کے لیے ہمارا دل اتنا دکھتا ہے

اور تم کس قدر بے اعتنائی کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ قصص اس شخص نے اتنی محبت دی ہے اور تم کیسے اس کے اور شہلا کے خلاف بول رہی ہو۔“ وہ ناراضی سے بولیں۔

”پھوپھو..... محبت میں شراکت داری مجھے قبول نہیں، جب وہ عورت یہاں نہیں تھی تب بھی اس کی وجہ سے میری ماں ڈسٹرب رہی اب وہ

نہ جانے کہاں سے آگئی ہے تو اب میرا اور میرے باپ کا رشتہ کمزور کر رہی ہے۔ ایسے لوگ بس دوسروں کو اذیتیں دینے کے لیے جہنم لیتے ہیں۔“

”شہلا مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی..... تم تو پورے خاندان میں بہت مختلف اور پیار کرنے والی مشہور ہو۔ تمہارے منہ سے یہ باتیں سن کر

مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔“

”پھوپھو..... مجھے زندگی میں صرف ایک ہی رشتہ ملا ہے۔ ماں میری پیدائش کے دو سال بعد مر گئی۔ نہ بہن، نہ بھائی، نہ وادائے ناتا..... اور

آپ لوگ بھی دور دور رہتے ہیں۔ میرے پاس صرف ایک ہی رشتہ ہے جسے میں اپنا سب کچھ سمجھتی ہوں۔ وہ مجھ سے چھین جائے، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pakvirtuallibrary.com

میں اس چھیننے والے سے ہی اس کا سب کچھ چھین لوں گی.....“ وہ قدرے غصے میں بولی۔

”شہلا..... آرام سے میری بات سنو۔ جس سے تم اتنی محبت کرتی ہو، اگر اس کی خوشی ایک ذات سے وابستہ ہو اور تم وہ بھی اس سے چھیننا

چاہو تو کیا تم خود غرض نہیں کہلاؤ گی؟“

”پھوپھو! اب اس عمر میں وہ کیا کرنا چاہتے ہیں..... شادی..... کیا انھیں یہ ذی ب دے گا۔ اگر وہ شادی کریں گے تو کیا میں سوسائٹی میں

منہ دکھانے کے قابل رہوں گی۔ اگر ایسا ہوا تو پھر انھیں میرا جنازہ ہی اٹھانا پڑے گا.....“ وہ اس قدر جذباتی ہو کر بول رہی تھی اسے اندازہ ہی نہیں تھا

کہ کچن سے باہر کرل منیٹ الدین اس کی ساری باتیں بہت توجہ سے سن رہے تھے۔

”ہر محبت کو شرط نہیں بناتے بیٹا..... تم کمرے میں جا کر آرام کرو۔ حیدر ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ تم سے زیادہ ہم اسے جانتے ہیں۔ جو

مخلص اپنی جوانی تیاگ دے وہ بڑے حاکم کو کیونکر داغ دار کرے گا۔ تم اطمینان رکھو۔“ منیٹ الدین اخبار پکڑے کچن میں آئے اور اس کے سر پر ہاتھ

رکھتے ہوئے بولے۔ وہ ایک دم نادام سی ہو گئی اور خاموشی سے کمرے میں چلی گئی۔

”تبسم حیدر ابھی یہاں پہنچنے والا ہے.....“ انھوں نے بیوی سے کہا۔

”وہ کیسے..... اور آپ کو کس نے بتایا؟“ وہ حیرت سے بولیں۔

”میں نہیں جانتا تھا کہ شہلا ناراض ہو کر اسے بغیر بتائے یہاں چلی آئی ہے، میں نے تو شہلا کے پہنچنے کی اسے اطلاع دینا چاہی تو اس نے ہی بتایا کہ وہ خود اسے لینے آ رہا ہے۔ شہلا بہت جذباتی لڑکی ہے۔“ وہ قدرے انسرودہ لہجے میں بولے۔

”شدید محبت، انسان کو جذباتی بنا دیتی ہے مگر دیکھیے، ہر رشتہ اپنا حق کیسے دھونس اور رعب سے مانگتا ہے اور جو بے چارے نہیں مانگ سکتے، وہ ساری زندگی اذیتیں ہی سہجے ہیں۔ اس وقت بھی سید خاندان کے بہت سے لڑکوں نے فیروں میں شادیاں کر لی تھیں مگر حیدر نے خاموشی سے بابا کی بات مانی۔ اگر وہ ذرا بھی مشتعل ہوتا یا چوں چرا کرتا تو بابا کیا کر سکتے تھے اور وہ یہ بات خود بھی جانتا تھا۔۔۔۔۔ مگر بابا کی پرورش اور ان کی محبت کو جھٹلا کر وہ احسان فراموش بھی نہیں کہلانا چاہتا تھا۔ بس یہی قسمت ہے۔۔۔۔۔“ وہ انسرودہ ہو رہی تھیں۔

”وہ اپنا فصد کمال کر آ رام سے سو رہی تھی۔ تبسم کے میاں کرل مغیث الدین سی ایم ایچ میں سائیکاٹرسٹ تھے اور آج کل ان کی پوسٹنگ پشاور میں تھی۔ چھٹی کا دن تھا اس لیے وہ گھر پر تھے۔ بیٹ بین سبزی بنانے میں مصروف تھا اور وہ خود سو پچھر سے صفائی وغیرہ کر رہی تھیں۔ جب حیدر پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر وہ خوش بھی ہوئیں اور پریشان بھی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ ساری رات نہیں سویا تھا۔ پریشان حال چہرہ، سوجی سرخ آنکھیں، تبسم کا تودل ہی لرز گیا۔

”حیدر بھائی۔۔۔۔۔ یہ آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔۔۔۔۔“

”بس آپا۔۔۔۔۔ میں شہلا کی وجہ سے بہت پریشان رہا ہوں۔ یہ بغیر بتائے ہی آ گئی۔ کیا اس نے آپ سے کوئی بات کی؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ سب باتیں ہو چکی ہیں۔ وہ تمہارے بارے میں بہت زیادہ پوچھ رہی ہے۔۔۔۔۔ اور ہاں، شہلا تمہیں کہاں سے ملی، اتنے سالوں کے بعد۔۔۔۔۔ سنا تھا اس نے منصور سے طلاق لے کر کسی انگریز سے شادی کر لی تھی اور اب یہاں۔۔۔۔۔“ آپا نے استغہامیہ انداز میں پوچھا۔

”بس، مصائب کی چکی میں گس رہی ہے۔ وہ پہلے جیسی شہلا نہیں رہی ہے۔ نہ وہ جو رہا ہے اور نہ ہی نام۔۔۔۔۔“ وہ انسرودگی سے بولا۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“ آپا نے چونک کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ شہلا کہاں ہے؟“

”سو رہی ہے۔۔۔۔۔“ آپا نے بتایا۔

”حیدر بھائی۔۔۔۔۔ آپ انگریز بیو نہ ہونا، آرام سے بات کرنا۔ وہ اس وقت بہت جذباتی ہو رہی ہے۔“ مغیث الدین نے انہیں سمجھایا۔

”آپا، ہر دفعہ نہ جانے میں ہی کیوں آزما یا جاتا ہوں۔۔۔۔۔“ حیدر کی آنکھوں میں آنسو گھیرنے لگے۔

”ہاں۔۔۔۔۔ بعض لوگوں کو قدرت ہار بار آزما دیتی ہے۔ نہ جانے کس بھنی کے لیے انہیں تیار کر رہی ہوتی ہے۔ شاید زیادہ آزمائش انہی کے لیے ہوتی ہیں جنہیں وہ زیادہ پیار کرتا ہے۔“ آپا نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”آپا، میں جتنا اپنے ماضی سے دور بھاگنا چاہتا ہوں، وہ بھاگ بھاگ کر میرے قدموں سے لپکتا ہے۔۔۔۔۔ نہ جانے شہلا کہاں سے آ چکی۔۔۔۔۔ میں اس کی تکلیفیں اور مصیبتیں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔۔۔۔۔ بس یہی مجھ سے غلطی ہو گئی۔“ وہ پریشانی سے ہونٹ چبانے لگا۔

”اچھا..... تم فکر نہیں کرو..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ٹھکے ہوئے ہو، آرام کرو۔ مغیث آپ انھیں اطہر کے کمرے میں لے جائیں، میں ذرا کھانا وغیرہ بنا لوں۔“

”آئیے، حیدر بھائی!“ وہ خاموشی سے کسی معمول کی طرح ان کے پیچھے چلنے لگا۔

دونوں رات گئے تک سوتے رہے۔ نہ دوپہر کا کھانا کھایا اور نہ شام کو چائے پی۔ تبسم آپا نے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا دیا تھا اور ان کو اٹھا کر اب ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ حیدر فریش ہو کر ان کے پاس بیٹھا تھا۔ جب وہ کمرے سے باہر نکلی، باپ کو دیکھتے ہی اس نے نظریں جھکا لیں اور آہستہ سے سلام کر کے ٹیبل کی دوسری طرف بیٹھ گئی۔

”باقی سب باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے اطمینان سے کھانا کھائیں۔“ مغیث الدین نے ان کے چہروں پر پھیلی ناگواری دیکھ کر کہا۔ سب خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

”کریم خان، برتن اٹھا لو..... اور چائے لاونچ میں ہی لے آؤ۔“ تبسم آپا نے بیٹھ مین کو آواز دی اور سب لوگ لاونچ کی طرف چلے گئے۔ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے سے جیسے نظریں چرا رہے تھے۔

”شہلا تم حیدر بھائی کو بغیر بتائے کیوں آئیں؟“ تبسم چھو پھونکنے کا کافی دیر انتظار کے بعد کہا۔

”میں ان سے ناراض تھی۔“

”اگر ناراض تھیں تو مجھ سے کہا ہوتا..... یوں گھر چھوڑ کر آنے کی کیا تک تھی اور میں کس طرح مارا مارا لاہور کی سڑکوں پر ساری رات تھیں ڈھونڈتا رہا ہوں۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے؟“ وہ قدرے درشتی سے بولا۔

”میں بہت ڈسٹرب تھی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”کس بات سے ڈسٹرب تھیں..... کم از کم مجھ سے کوئی بات تو کی ہوتی.....“

”مجھے لگا جیسے آپ دوسری شادی کر رہے ہیں اور میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکی اس لیے ادھر چلی آئی۔“

”تمہاری ماں کو بھی ساری زندگی یہی دوسرے اور خدشات رہے۔ آپا، ان لوگوں کو نہ جانے میں کیوں اتنا بے اعتبار لگتا ہوں۔ سنو، اگر میں نے یہی کچھ کرنا ہوتا تو نہ مجھے تمہاری ماں کی اجازت کی ضرورت تھی اور نہ تمہاری۔ میں نے تو جانتے ہو جیسے سب کچھ اپنے ہاتھوں سے ختم کیا تھا اور پھر بھی تم لوگ میرے بارے میں مشکوک رہے۔ طاہرہ مرتے دم تک اپنا ذہن صاف نہ کر سکی اور اب تم میرے لیے مسائل کھڑے کرنا چاہتی ہو.....“

”پاپا..... میں آپ کے لیے کوئی مسائل کھڑے نہیں کرنا چاہتی لیکن میں یہ بھی نہیں برداشت کر سکتی کہ وہ عورت جس نے پہلے میری ماں کا بیٹا حرام کیے رکھا تھا، اب میرا بھی کرے..... ماضی میں وہ آپ کے لیے جو کوئی بھی تھی، اب اس کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کی ایک ایسی حیثیت ہے اور میری بھی معاشرے میں پہچان ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ معاشرہ آپ کی وجہ سے مجھ پر انگلیاں اٹھائے۔“ وہ قدرے غصے میں بولی۔

”آپا..... آپ اس کی باتیں سن رہی ہیں..... باپ آج اس کی نظروں میں مشکوک ہو گیا ہے۔ ایک لمحے میں تم نے میرا بیچ تباہ کر کے

رکھ دیا ہے۔ میں نے تم سے اپنی مچھوں کا کوئی صلہ تو نہیں مانگا..... تم مجھے کس کا بدلہ دے رہی ہو؟“ وہ بھی غصے میں پھنکارا۔

”پھوپھو..... آپ بھی دیکھیے، محبت بھری نظریں اور پیار کبے والی زبان آج کسی صلے اور بدلے کی باتیں کر رہی ہے۔ یہ کس کی وجہ سے ہے، یہ اس عورت کی وجہ سے ہے جس نے میری ماں کی زندگی میں بھی زہر گھولا تھا۔ مجھے سب علم ہے آپ دونوں نے کیسی زندگی گزاری ہے اور اب وہ مجھ سے میرا باپ بھی چھیننا چاہتی ہے۔ ہمارے رشتے میں دراڑ تو اس نے ڈال ہی دی ہے..... اب نہ جانے اس نے اور کیا کچھ کروانا ہے۔“ وہ غصے سے بولتی چلی گئی۔

”شہلا بیٹی! باپ سے اس لہجے میں بات نہیں کرتے.....“ مغیث انکل نے اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اور انکل، آپ بھی انھیں بتائیں کہ ایسی باتیں کر کے وہ میرا بھرم..... میرا اعتماد، میرا سب کچھ چھین رہے ہیں۔ اس وقت میں ریزہ ریزہ ہو رہی ہوں..... کاش، یہ اندازہ کر سکتیں۔“ وہ رونے لگی۔

”حیدر بھائی، آپ بھی لہجے کو نرم رکھیں۔ غصے سے مسائل حل تو نہیں ہوتے.....“ مغیث الدین نے انھیں بھی سمجھایا۔

”آپا، آپ اس سے پوچھیں، یہ میرے بارے میں کیونکر مٹھلک رہا ہے؟“ حیدر نے تبسم آپا کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”تو آپ نے اس سے فون پر کیا کہا تھا؟“

”اُف خدایا..... تو کیا میں اسے شادی کے لیے کہہ رہا تھا..... تم کس قدر نا سمجھ ہو..... آپا، آپ اندازہ نہیں کر سکتیں کہ وہ کس قدر غم زدہ زندگی گزار رہی ہے۔ ہاسٹل میں چدرہ بیس سال سے وہ خواہ ہو رہی ہے۔ بیٹا، اس کا کہیں ہے، وہ خود کہیں ہے۔ میں تو صرف یہ چاہ رہا تھا کہ اتنی بڑی حویلی خالی ہے، ادھر آ جائے۔ نوکر چاکر ہیں اور پھر ماضی میں اس تعلق کے علاوہ ایک اور تعلق بھی تو تھا۔ وہ تاپا لبا کی بیٹی بھی تو تھی۔ اس مائے سے بھی اس کا پورا حق ہے کہ وہ وہاں رہے۔ اس نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں اور خود ہی فیصلہ کر لیا۔ آپا، جہاں اتنے مزارعے ہماری زمینوں سے رزق کھاتے ہیں، ٹیکسٹ میں ملازمین اور ان کے بچے اتنے فوائد اٹھا رہے ہیں، اگر وہ اور اس کا بیٹا ہمارے پاس رہ جائے گا تو کوئی قیامت تو نہیں آ جائے گی اور ویسے بھی یہ سید صاحب کی وصیت تھی۔“ حیدر اب دمجھے لہجے میں بولا۔

”ہاں، اس میں کوئی قباحت نہیں۔“ آپا نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں..... وہ آئیں اور رہیں لیکن پاپا، میں اپنا کچھ بھی ان سے شیئر کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ آپ کو بھی نہیں۔“ وہ غصے میں بولتی ہوئی اندر چلی گئی۔

”بھروسہ ہات..... تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ حیدر غصے میں بولا۔

”حیدر..... اسے یہ خدشہ ہے کہ اس کے آنے کی وجہ سے تمہاری توجہ اس کی طرف ہو جائے گی اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ تمہاری شیئرنگ کسی صورت میں نہیں چاہ رہی۔ نہ تمہاری محبت، نہ تمہاری توجہ..... اور نہ ہی کچھ اور..... اگر اس نے ذرا سا بھی کچھ ایسا دیکھ لیا تو اس کی شخصیت بگڑ جائے گی اس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ شہلا جس حال میں ہے، اسے رہنے دو۔ جہاں اس نے زندگی کے اچھے سال گزار لیے ہیں، اب بھی

گزار لینے دو۔ تمہاری ہمدردی اور توجہ شاید اسے تو کچھ سکون دے دے مگر تمہاری بیٹی کا سکون برباد ہو جائے گا۔" مفیث بھائی نے اسے سمجھایا تو وہ خاموشی سے ان کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ آپا نے حیدر کی طرف دیکھا۔ اس لمحے انھیں وہ بے حد مجبور، بے بس اور لاچار باپ لگ رہا تھا۔ آپا بھی مصلحتاً خاموش رہیں۔

اگلے دن ان کی واپسی تھی۔ آپا اور مفیث الدین نے دونوں کو علیحدہ علیحدہ بھی سمجھایا اور ایک دوسرے کے سامنے بھی۔ دونوں خاموشی سے سنتے رہے۔ ایک نے دوسرے سے کچھ نہ کہا۔ سارا راستہ خاموشی سے کٹا۔ نہ جانے کیا ہوا تھا کہ ایک دم دونوں میں جیسے صدیوں کا فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ وہ قدم بڑھاتے ہوئے جھجک رہی تھی اور وہ اس کی طرف شکر مگر حیران کن لگا ہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ایک دو دفعہ موہاٹل پر بتل بجی۔ حیدر نے نمبر دیکھا اور فون آف کر کے رکھ دیا۔ اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ فون کس کا ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔



شفق خون میں لت پت اسپتال لائی گئی تھی۔ اس کی حالت بہت نازک تھی ملک منصور کے قاتل کے بعد وہ گر کر تر پنے لگی۔ سارا عملہ وہاں اکٹھا ہو گیا۔ کوئی بھی یوں اسے ایڑیاں رگڑ کر مارتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تھانے دار کی جان پر بنی تھی۔ اس نے فوراً ایسوی لینس منگوا کر اسپتال بھجوا دیا۔ تھانے میں یوں بے باکی سے قتل اور اس پر چشم پوشی اس کے لیے ہزار ہا مسائل کھڑے کر سکتی تھی۔ ڈاکٹر ہر ممکن طریقے سے اسے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ رات بھر آپریشن کے بعد گولیاں اس کے پیٹ سے نکالی گئیں۔ ساتھ ہی انھیں اس کا آپریشن بھی کرنا پڑا۔ پوری کوشش کی جا رہی تھی کہ یہ خبر اخبار میں نہ لگے۔ صحافیوں کو ذرا سی بھی ہلک پڑ جاتی تو ملک منصور نے جو طوفان برپا کرنا تھا، اس کا سامنا کرنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔ اس کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ کئی دن گزر گئے تھے۔ وہ ہسپتال وارڈوں کی طرح پڑی تھی۔ اس کے گھر اطلاع دینا گویا ملک منصور کو مزید مشتعل کرنا تھا۔ اس کی جان کو اب بھی اس سے خطرہ تھا۔ جو شخص خود اسے بے دردی سے قتل کر کے پھینک گیا ہو، دوبارہ اس کے زندہ ہونے کا سن کر غصے سے پاگل ہونا یقینی تھا۔ مگر اس کے پاس بھی کسی کا ہونا بہت ضروری تھا۔ کچھ دنوں بعد اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو نرس نے کسی کو بلانے کے لیے اس سے ایڈریس مانگا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کون ہوگا جو اس وقت اس کے پاس آئے گا۔ شزا سے اس کے تعلقات ایسے نہ تھے کہ وہ اس مشکل وقت میں اس کا ساتھ دیتی۔ ملک منصور کو تو بلانے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی اور آفاق۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ سحر۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے سحر آ جائے۔ اس نے بہت سوچنے کے بعد سحر کو بلانے کو کہا اور اس کا موہاٹل نمبر لکھ کر دیا۔

آفاق رات بھر گھر نہیں آیا تھا اور وہ سخت غصے میں رات بھر نہیں سوئی تھی۔

وہ کہاں تھا اور کس کے ساتھ تھا، وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ اس سے بھرپور جھگڑے کے موڑ میں تھی۔ ایک طرف لیڈیز سے ہارنے کا حق تھا تو دوسری طرف آفاق کی بے وفائی جو شاید اس کے خون میں شامل تھی۔ وہ ہار ہار اپنے آپ کو سمجھاتی۔ ایک دن تو ایسا ہونا تھا۔ وہ کب تک اس کے بنجر وجود کو برداشت کر سکتا تھا لیکن نہ جانے اندر ہی اندر کسی شے کے ٹوٹنے کا اسے شدید صدمہ ہوا تھا۔ شاید ایسے میاں بیوی میں جو نام نہاد رشتہ ہوتا ہے، اس کے ٹوٹنے کا دکھ تھا یا پھر اپنی ذات کی لٹی تھی۔ دوسری عورت جب پہلی کی جگہ لیتی ہے تو پہلی اپنے آپ کو کس قدر کمتر اور بے وقعت سمجھتی

ہے۔ شاید یہ سوچ کر اسے اس بے قدری کا دکھ تھا مگر کچھ ایسی چیز تھی جو اندر ہی اندر اسے چیر رہی تھی۔ وہ لاکھا پتے آپ کو تسلیاں دیتی۔ اپنے آپ کو قائل کرنے کی کوشش کرتی مگر آفاق اور اس لڑکی کا قہقہہ لگا تا چہرہ اس کے سامنے گھوم جاتا۔ آفاق کی خوشی دیدنی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلی مسرت نے اسے ایک لمحے کے لیے چمکا دیا تھا۔ اس نے شادی سے اب تک ایسی خوشی کبھی بھی آفاق کے چہرے پر نہ دیکھی تھی۔ اس کا مطلب ہے وہ اس لڑکی کو دل سے پسند کرتا ہے۔ اس کی صحبت اس کے لیے خوشی کا باعث ہے، اسے اپنا آپ سزا مند زدہ اور بدبودار لگا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے قیمتی پرلیو، ہاڈی اسپرے، اس نے اٹھا اٹھا کر زمین پر مارنے شروع کر دیے۔ وہ اپنے اندر کے غم دھیسے کا اظہار اسی طرح کرتی تھی۔ جب کسی پر بس نہ چل رہا ہو تو بے جان چیزیں انسان کے زیرِ عتاب آ کر اپنے وجود کی اہمیت کو خود بھی منوالیتی ہیں۔ اس نے آفاق کو سہاگل پر کاٹیکٹ کرنے کی کئی بار کوشش کی مگر وہ آف تھا۔ اس کا مطلب تھا آج وہ اس لڑکی کے ساتھ تھا۔ صبح ہو چکی تھی مگر وہ نہیں آیا تھا۔ اس نے سہاگل اٹھا کر دور پھینکا۔

”اسی لمحے اس پر قتل ہونے لگی۔ اس نے اٹھا کر نمبر دیکھا مگر سمجھ نہ آیا۔ اس نے ہیلو کہا۔ فون اسپتال سے تھا۔ نرس نے اسے شفق کے بارے میں بتایا اور وہ آنے کو کہہ رہی تھی۔

اگلے لمحے وہ اسپتال جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ شفق کو کسی نے گولیاں ماری تھیں۔ شاید ان لوگوں نے، جن کے ساتھ وہ اٹھتی بیٹھتی تھی اور اس رات..... وہ جلدی سے اسپتال پہنچی۔ شفق بستر پر بالکل لاوارثوں کی طرح پڑی تھی۔

”شفق، تمہیں یہ کیا ہوا..... اور کس نے کیا؟“ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

”پاپا نے.....“ شفق بمشکل بولی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree

”کیا..... مگر کیوں؟“ وہ انتہائی حیران ہو رہی تھی۔

”سحر، میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پاپا اس حد تک ظالم ہو جائیں گے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔

”مگر انہوں نے یہ سب کیوں کیا؟“

”کیونکہ میں نے سہیل کو بچانے کے لیے سچ بولنا چاہا۔ سحر، عابد اور زویا کو میں نے قتل کیا ہے مگر پاپا نے سہیل کو مجبور کیا ہے کہ وہ الزام اپنے سر لے لے کیونکہ میں ان کے ایکشنز کے لیے بہت بڑا خطرہ بن چکی ہوں۔ ان کو بس اپنا عہدہ اور شان و شوکت عزیز ہے۔ نہ ان کو اولاد سے محبت ہے اور نہ ہی کسی اور سے۔ وہ کسی سے بھی غلط نہیں۔ بچپن میں، میں انھیں بہت عزیز تھی مگر اب ہم سب ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ ہم کیسے حقیر لوگ ہیں۔ ہمیں کوئی بھی نہیں چاہتا۔ نہ ہمارے حصے میں محبت آئی، نہ شفقت، نہ غلوں، نہ ہمدردی اور نہ ہی پیار۔ یہ دودن جو میں نے اسپتال میں گزارے ہیں، میں نے اپنے آپ سے بڑھ کر اس وارڈ میں کسی کو اٹکا ہے آسرا اور لاوارث نہیں سمجھا۔ کوئی ایک بھی تو میرے پاس نہیں آیا.....“ وہ چھت کو دیکھ رہی تھی اور آنسو اس کے ہاتھوں میں جذب ہو رہے تھے۔

”معلوم نہیں..... اس گھر پر کس کی محبت ہے یا کسی کی بددعا ہے۔ کوئی بھی تو کسی کا نہیں..... نہ اولاد ماں باپ کی، نہ شوہر بیوی کا، نہ بھائی، بہن کا، سب کیسی منتشر اور آوارہ زندگیاں گزار رہے ہیں۔“ سحر دکھ سے بولی۔

”میں تمہاری مشکور ہوں کہ تم آگئیں، اگر تم بھی نہ آتیں تو.....“

”تم کیسی باتیں کر رہی ہو..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میں تمہارے پاس ہی رہوں گی۔“

”سحر، میں ٹھیک ہونے کے بعد کہاں جاؤں گی..... پاپا تو مجھے گھر میں گھسنے دیں گے اور نہ ہی زعمہ چھوڑیں گے۔“ وہ سخت مگر مندی سے بولی۔

”تم فکر نہ کرو، کوئی نہ کوئی راستہ تو نکل ہی آئے گا۔“ اس نے اسے دلا سادہ مگر خود اس کا دل کس قدر افسردہ تھا، یہ وہی جانتی تھی۔ وہ باتیں

شوق سے کر رہی تھی مگر ذہن میں آفاق تھا اور وہ لڑکی؟ سحر بن تو شوق کر رہی تھی مگر قہقہان کے سن رہی تھی۔ اس کا ذہن دونوں صورتوں سے دوچار تھا۔

”محبت بہت بے معنی شے ہے..... اور بہت بے وقعت.....“ بار بار یہی جملہ اس کے دل کے کہاں خانوں سے اٹھتا اور اس کے دل و

دماغ میں گونجنے لگتا۔ وہ سردی آدھ کر شوق کو دیکھتی رہی جواب میڈیٹو کھا کر سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ شوق کی باتیں اس کے ذہن میں گونج رہی

تھیں۔ واقعی، شوق اسپتال کے بعد کہاں جائے گی۔ ملک منصور کیسا باپ تھا، اپنے مستقبل کے لیے اسنے اولاد کو بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کیا تھا۔

کیا اب وہ اسے کسی قسم کا تحفظ دے سکے گا، کبھی نہیں بلکہ اس سے کوئی بھی امید وابستہ کرنا حماقت ہوگی اور خود اس کا باپ، اس نے کیسے جلدی جلدی

میں اس کے بدلے میں ٹوٹ کھرے کیے تھے۔ اولاد، رشتے، ناتے، محبت سب کچھ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اس نے بھی دوبارہ مڑ کر انھیں نہیں دیکھا تھا،

جنھیں تھیوں سے محبت، اولاد سے بڑھ کر تھی۔ رشتوں کو کیا ہونا چاہیے؟ اور اب جیسے جیسے وہ ماؤرن سوسائٹی کی ایک سرگرم رکن بن رہی تھی، مزید

تعلیق حقیقتیں کھل کر سامنے آ رہی تھیں۔ ہم سب کس طرف جا رہے ہیں؟ کس کو کس کی تلاش ہے۔ سب دوڑ رہے ہیں، بھاگ رہے ہیں۔ مگر کوئی کسی

کے لیے ٹھہر نہیں رہا..... مگر بکھر رہے ہیں، معاشرہ ٹوٹ رہا ہے اور انسان منتشر ہو رہا ہے۔ ہر کوئی اپنے آپ کو دوسرے سے برتر ثابت کرنے کی جنگ

و دو میں آخری حد تک دور نکل گیا ہے۔ وہ بھی سوچ رہی تھی، کوئی ایسا ٹھکانا..... مگر دور دور تک کہیں بھی کوئی منزل نظر نہیں آ رہی تھی۔ سب کچھ اب

قسمت پر تھا، وہ جہاں اسے لے جائے۔

آٹھ دس دن میں وہ کافی حد تک بہتر ہو چکی تھی۔ انیس ایچ او بار بار چکر لگا رہا تھا۔ اس کے نزدیک ابھی وہ ایک قیمتی مہرہ تھی جسے وقت

آنے پر ملک منصور کے خلاف استعمال کیا جاسکتا تھا۔ گو کہ اس کا بیان ابھی تک قہمبند نہیں ہوا تھا اور سحر نے ہی کسی طرح اسے بتایا تھا کہ سہیل کو عمر قید کی

سزا ہوئی ہے۔ ملک منصور نے چوٹی کا وکیل کر رکھا تھا اور یہ سب اسی کا کمال تھا۔ شوق کون کر بہت دکھ ہوا۔

”میں اس کے خلاف احتجاج کروں گی۔“ وہ غصے سے بولی۔

”شوق، بے وقوفی مت کرو۔ تم بستر پر ہو۔ اسپتال میں ہو، کیا تم نہیں جانتیں کہ تمہارے باپ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ بہتر

ہے کہ تم یہ بھی سوچ لو کہ وہ آئندہ تمہارے ساتھ کیا کر سکتا ہے؟ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا لیکن پہلے یہ تو سوچو کہ جانا کہاں ہے اور اس تھانے دار سے بھی

جان چھڑاؤ۔“

”سحر کسی طرح اس شخص کا پتا کر داؤ۔ یہ میرے نانا کے بیٹے ہیں۔ انکل حیدر یہ بھی منشر تھے۔ ان کا کامیٹ نمبر کہیں سے لو..... ہو سکتا ہے

یہ میری کچھ مدد کر سکیں۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ صرف یہی ایک شخص ہے جو میری مدد کر سکتا ہے۔ وہ ہم سے بہت محبت کرتے تھے۔ اب تو

عرصہ ہوا ہے ان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ معلوم نہیں اب کیا سلوک کریں مگر تم ان سے رابطہ ضرور کرنا۔" وہ بہت سوچنے کے بعد بولی۔
 "کہیں یہ شہلا حیدر کے والد تو نہیں.....؟" سحر نے ذہن پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔
 "گگ..... گگ..... کون شہلا؟" وہ ہڑبکا گئی۔

"مس شہلا حیدر!..... بڑی ایکٹو، گریس فل سوشل ورکر ہے..... ہر جگہ باپ کے ساتھ وہی جاتی ہے اور ہماری کلب کی میٹنگز میں اکثر آتی ہے۔ سوسائٹی میں اس کا بڑا نام ہے۔ تمہیں کبھی ملو اس کی۔"

"شاید..... وہی ہو۔" اس نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔ اس نام پر جیسے اس کی سوچیں اٹھل پھل ہو گئی تھیں۔ بہت سی یادیں اس کے ذہن کو جھنجھوڑنے لگی تھیں۔ وہ جس نام سے الریج تھی۔ شاید وہی اس شخص کی بیٹی کا نام تھا۔ اسے ماں اور حیدر کے تعلق کا اندازہ تو تھا کیونکہ ملک منصور اکثر غصے میں انہیں جب ماں کے طعنے دیا کرتا تھا تو حیدر کی ذات کو بھی اس میں لپیٹ لیتا تھا۔ وہ یہ نام سن کر مضطرب ہو گئی۔ کوئی شے اندر ہی اندر جگ کرنے لگی۔

"میں کفرم کر کے ان سے رابطہ کروں گی بلکہ نمبر لے آؤں گی، تم خود ہی بات کر لینا....." سحر اٹھتے ہوئے بولی۔
 "تم کہاں جا رہی ہو؟"

"میں ذرا گھر جا رہی ہوں۔ آفاق کی بھی..... خیر چھوڑو، تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"نہیں..... کچھ نہیں چاہیے۔"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
 www.pdfbooksfree.pk

"میں ایک دو گھنٹے تک آ جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

شام ہو رہی تھی، جب وہ گھر پہنچی، آفاق کی گاڑی پورچ میں کھڑی تھی۔ یہ وقت آفاق کے آنے کا تو نہیں تھا وہ کیسے اس وقت آ گیا تھا۔ وہ قدرے حیرانی میں اپنے بیڈروم میں داخل ہوئی۔ آفاق اوندر سے منہ سوراہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے حد تھکاوٹ کے آثار تھے۔ وہ خاموشی سے باہر آ گئی اور خانساں کو شفق کے لیے سوپ بنانے کو کہا اور خود چائے کا کپ لے کر بیٹھ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آفاق سے کس طرح بات کرے۔ اسی لمحے شزا اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ اس کو دیکھ کر اس نے منہ پھیر لیا۔ شزا کی ناپسندیدگی کا یہی اظہار ہوتا تھا۔ وہ تو پہلے دن سے اس کو سخت ناپسند کرتی تھی اور ہمیشہ اسے دیکھ کر ایسا منہ بناتی تھی جیسے کوئی گندی سی سڑاندزدہ چیز کو دیکھ کر منہ بناتا ہے۔ سحر کو ہمیشہ اس کا رویہ برا لگتا تھا مگر وہ کچھ کہتی نہیں تھی۔ وہ کچن میں گئی اور واپس آ کر اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"تم آفاق پر ذرا کنٹرول رکھو۔ آج کل وہ بہت اوور بور ہوا ہے۔" شزا منہ دوسری طرف کر کے روکھے انداز میں بولی۔

وہ اس کی بات سن کر اُن سنی کرتے ہوئے چائے پینے میں مصروف رہی۔

"میں تم سے کہہ رہی ہوں....." وہ قدرے جھنجھلا کر بولی۔

”اس گھر میں کیا کوئی کسی کو کنٹرول کر سکتا ہے؟“ اس کے اس جملے پر شزا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم پوچھو گی نہیں کہ وہ آج کل کیا کرتا پھر رہا ہے؟“

”یہ اس گھر کی روایت ہی نہیں کہ کوئی دوسرے سے کچھ پوچھے.....“

”تم ہر بات کا الٹا جواب کیوں دیتی ہو؟“ شزا اسے غصے سے گھورتے ہوئے بولی۔

”آپ بے معنی اور فضول باتیں جو کر رہی ہیں.....“

”شٹ اپ..... میں بے معنی باتیں یعنی کہ بکواس کر رہی ہوں اور تم بھکارن غلظت بن بیٹھی ہو؟“

”کیوں بھکاریوں کے دماغ نہیں ہوتے یا پھر ان کے دل و دماغ بھی آپ جیسے شوخیوں میں ڈال دیے جاتے ہیں.....“ اس نے بھی

برابر کی چوٹ کی۔

”تم بہت بد تمیز ہو..... مان سنیں..... بات سمجھ نہیں رہی..... اور الٹا بکواس کیے جا رہی ہو۔“ شزا غصے میں آپے سے باہر ہو رہی تھی۔

”میں سب جانتی ہوں آفاق کیا کر رہا ہے۔ کس کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں؟ کیا آپ اپنے شوہر کو آج تک ان کاموں سے

منع کر سکی ہیں، جو میں کروں؟ آفاق بھی وہی کرے گا جو ملک منصور کرتا آیا ہے..... نہ آپ کچھ کر سکیں اور نہ میں اسے روک سکوں گی۔ ہم دونوں ایک

سی ہیں..... نہ آپ کا حسن اور خوبصورتی انھیں کسی کام سے روک سکا اور نہ میری محبت..... اس لیے یہ گنگووی فضول ہے۔“ وہ کہتی ہوئی اٹھ کر اپنے

کمرے میں چلی گئی اور شزا اپنی جگہ پر تھملا نے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو اس کے برابر گنویا تھا اور دونوں اب ایک ہی جگہ کھڑی تھیں۔ اس کا حسن کتنا

ارزاں تھا، ملک منصور اس سے کتر لڑکیوں کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا۔ ان کے لیے اس کو نظر انداز کرتا تھا۔ واقعی اس کی بات میں سچائی تھی۔ وہ غصے میں

بیٹھی ناخن چبا رہی تھی۔ اس کے اندر جیسے آتش فشاں کھول رہا تھا۔ وہ پاؤں بٹختی گاڑی کی چابی لے کر باہر نکل گئی۔

مخرفون پر مسز عبید سے مس شہلا حیدر کا فون نمبر لے رہی تھی، جب آفاق کی آنکھ کھل گئی۔

”تم آہستہ بکواس نہیں کر سکتیں..... دیکھ نہیں رہیں، میں سو رہا ہوں۔“ اس نے چلاتے ہوئے ہنگیہ اس کی طرف پھینکا۔ اس نے ہنگیہ پکڑ کر

پاس رکھ لیا اور مس شہلا حیدر کا نمبر لکھنے لگی۔ فون بند کرنے کے بعد اس نے ہنگیہ زور سے اس کی طرف پھینکا۔

”یہ سونے کا وقت نہیں..... جو سونے کا وقت ہوتا ہے، تم آوارہ لڑکیوں کے ساتھ رات بھر گھومنے پھرنے میں صرف کرتے ہو۔“ وہ غصے

سے چلائی۔

”تم سے مطلب..... جب تم کسی قابل نہیں رہیں تو پھر میں جو چاہے کروں.....“

”کیا..... کیا..... کیا کہا تم نے..... میں کسی قابل نہیں رہی۔ یوں کہو تم نے مجھے کسی قابل نہیں چھوڑا.....“ وہ آفاق کا گریبان جھنجھوڑتے

ہوئے بولی۔

”تمہاری یہ جرات ا“ اس نے گریبان چھڑاتے ہوئے دو تین تھپڑا سے لگائے۔

”تمہارے ان تھپڑوں کا مجھ پر اب کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لیے بہتر ہے کہ زبان سے بات کرو۔“ اس نے اسے دھکا دیتے ہوئے پیڈ پر گرایا اور خود بھی صوفے پر بیٹھ گئی۔

”تم دفع ہو جاؤ کمرے سے.....!“ آفاق فحسے سے بولا۔

”وہ تو میں ہو ہی جاؤں گی..... مگر وہ کون ہے جس کے ساتھ تم بہت خوش تھے۔ تمہارے قہقہے اور تمہاری خوشی ابھی تک مجھے یاد ہے۔“

”تم سے مطلب..... اودھو کوئی بھی ہے۔“

”مجھے نہیں..... تمہاری ماں شزا کو ہے..... وہ آج مجھ سے شکایت کر رہی تھی۔“

”ان کو کیا تکلیف ہے؟“

”انہی سے پوچھو۔“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں..... اور نہ ہی میں کسی کو جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر مہارخ ان کی سیکرٹری کی بہن ہے تو میں کیا کروں؟

اس میں ان کا کیا جانا ہے۔ روکنا ہے تو مادرخ کو روکیں..... انھوں نے تو اسے پاپا کی نگرانی کے لیے رکھوایا تھا۔ اب ٹیکسٹری میں، میں چلا گیا تو مادرخ سمیت ان سب کو خطرہ پڑ گیا ہے۔ ٹھیک ہے، میں کل ہی مادرخ کو نکال دیتا ہوں۔“

”مجھے نہیں پتا..... تم لوگوں کے گندے میمز کا..... ہر وقت ایک دوسرے کو کٹر ثابت کرتے رہتے ہو۔“

”تم اپنے کام سے کام رکھا کرو..... نہ کسی کی بات میں ڈٹو اور نہ ہی کسی کو یوں جھگ کرنے کی ضرورت ہے۔“ وہ نکلنے سے بولا۔

”کیا تمہیں بھی.....؟“

”ہاں..... مجھے بھی.....“

”آفاق، تمہیں معلوم ہے تاکہ تم میرے لیے.....“ وہ ایک دم محبت بھرے لہجے میں بولی۔

”سب بکواس ہے..... یہاں کسی کو کسی سے کوئی محبت و جت نہیں..... سب ٹائم پاس کرنے کا ذریعہ..... سب کا کوئی نہ کوئی مفاد ہے۔ خود

فرض ہیں سب..... مطلب پرست..... ہوس کے مارے ہوئے لالچی انسان۔“ وہ فحسے میں بے قابو ہو رہا تھا۔

”لیکن آفاق، مجھے تو تم سے بہت محبت ہے۔“

”ہونہہ..... محبت..... چھوڑو اس فضول بکواس کو اور جاؤ، میرے لیے چائے لے کر آؤ۔“ ایک دم اس کا موڈ بدل چکا تھا۔

”اچھا.....“ وہ اپنا چہرہ اور ہال درست کرتی ہوئی باہر آ گئی اور چائے خانہ ماں سے بنا کر اس کے لیے لے کر آئی۔ وہ بستر پر بیٹھا ساگر

پنی رہا تھا۔

”آفاق..... ایک بات کہوں؟“

”ہاں.....“

”تم نے مجھے بہت دکھ دیے ہیں مگر..... مگر ایک بات نہ کرنا۔“ وہ پیار سے بولی۔
”کیا.....؟“

”دوسری..... شادی نہ کرنا..... بے شک تم لڑکیوں کے ساتھ گھومو پھر دو مگر میں کسی کو نہ لانا۔“
”فحش اس سے کیا فرق پڑتا ہے.....؟“

”پڑتا ہے..... سبکی تو فرق پڑتا ہے..... بس تم وعدہ کرو.....“
”کیوں..... کیوں، میں وعدہ کروں اور اگر تم ہی دوسری شادی کر لیتی ہو.....“
”وہاٹ نان سنس..... ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“ اس نے غصے سے جواب دیا۔

”تم عورتیں بہت ناقابل اعتبار ہوتی ہو۔“
”تم مرد بھی کسی سے کم نہیں ہوتے۔“

”مرد تو ایک کو چاہ کرنا ہے تم تو خاندانوں اور نسلوں کو برباد کرتی ہو۔“
”اس ایک کے بھی بہت سے رشتے ہوتے ہیں اور ہر عورت کو بہکانے والے بھی تو تم مرد ہی ہوتے ہو۔“
”تم بہت بحث کرنے لگی ہو۔“

”سب کچھ میں نے یہاں آ کر سیکھا ہے..... چالاکیاں..... حکاریاں اور عیاریاں.....“
”اور جہاں سے تم آئی ہو وہاں تو تم بڑی پاک صاف فحش نا ا میں سب جانتا ہوں، ایک ایک کے چار چار چھ.....“ وہ خطرے سے مکرابٹ کے ساتھ بولا۔

”یکو اس نہیں چلے گی آفاق! تم جانتے ہو، میں یہ سب نہیں سن سکتی۔“
”اور میں بھی نہیں سن سکتا۔“ اس نے گرم گرم چائے کا کپ اس کی طرف پھینکا۔ کپ اس کے ہاتھ سے ٹکرا کر گھٹنے سے ٹکراتا ہوا پاؤں پر گرا۔ گرم چائے سے اس کا پاؤں اور گھٹنا بھی جل گیا۔
”تم بہت ظالم ہو.....“ وہ غصے میں بولی۔

”وہ تو ہم ہیں.....“ ڈورینگ نیکل سے برش اٹھا کر اس نے بالوں کو ٹھیک کیا اور پر لیوم لگاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اب مارکنائی کے بعد وہ آرام سے باہر نکل جایا کرتا تھا۔ اس سے قبل وہ ہمیشہ اس کی مرہم پٹی کیا کرتا تھا۔ اس کو مار کر خود ہی خوف زدہ ہو جایا کرتا تھا مگر اب وہ ان تمام باتوں اور احساسات سے عاری ہو رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ بے پردا ہوتا جا رہا تھا، اس کے اندر کی سفاکی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ بڑی سے بڑی بات کی پروا کیے بغیر وہ آرام سے باہر نکل جاتا تھا۔

”شفق اس کی بستر تھی۔ رات گہری ہو رہی تھی مگر وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے لیے سوپ اور پھل وغیرہ لے کر آئی۔“

”ہاں..... بس آفاق سے جھکڑا ہو گیا تھا۔“

”تم لوگ اتنا جھکڑتے کیوں ہو؟“

”مجھے کیا معلوم..... اس کے اندر نہ جانے کون سا درد ہے۔ کیا زہر ہے کہ بس وہ ہر وقت محاذی کھولے رکھتا ہے۔ شفق! ویسے تم لوگ بہت

عجیب لوگ ہو..... میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ اسے میری اس کمزوری کا علم ہے، اس لیے وہ ہر وقت..... اچھا چھوڑ دیتا..... یہ سوپ پی لو۔“

”اسے چھوڑ دیتا..... یہ بتاؤ تم نمبر لائی ہو؟“

”ہاں، یہ لو بات کرو۔“ اس نے موبائل پر نمبر ملا تے ہوئے کہا۔

”ہیلو..... جی حیدر صاحب سے بات کرنی ہے۔“ اس نے لرزرتے ہاتھوں سے موبائل کو پکڑتے ہوئے کہا۔

”میں شفق بول رہی ہوں..... بہت ضروری کام ہے۔“ تھینک یو..... اس نے موبائل فون بند کر دیا۔

”کیوں..... کیا ہوا؟“ سحر نے حیرت سے پوچھا۔

”شہلا حیدر تھی..... بہت غصے میں بول رہی تھی پھر کہنے لگی کہ وہ اس وقت میٹنگ میں ہیں، ایک گھنٹا ظہر کر ان کے موبائل پر کر لیں۔ ان

کا موبائل نمبر اس نے دے دیا ہے۔ لیکن سحر، تم تو اس کی بہت تعریفیں کر رہی تھیں۔“

”ہاں..... شفق، معلوم نہیں وہ کیوں ایسے بولی ہے ورنہ وہ تو بہت ہنس مشہور ہے میں خود اس سے ملی ہوں۔ ہو سکتا ہے اس وقت وہ بھی

بڑی ہو.....“

”ہاں، ہو سکتا ہے.....“ وہ آہستہ سے بولی، اسے امید تو پتی نظر آئی۔ اگر حیدر اگل بھی اس کی طرح بولے تو وہ پھر کہاں جائے گی۔ ہر

طرف اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

”سحر..... آفاق نے میرے بارے میں پوچھا؟“ شفق نے بڑی امید نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں..... کیا اس گھر میں کوئی دوسرے کے بارے میں پوچھتا ہے؟ سب اپنی اپنی زندگیوں میں کھوئے رہتے ہیں اور شاید اپنے آپ

سے بھی محبت نہیں کرتے۔ شفق مجھے تو کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ سب بہت کھوکھلے لوگ ہیں۔ بس کبھی کبھی کھوکھلی بول کی طرح کھٹکتے ہیں پھر چپ ہو

جاتے ہیں۔ میں تو تنگ آ گئی ہوں۔ ہم سب لوگ کیسی زندگی جی رہے ہیں۔ نہ کسی کو کسی کے دکھ درد کی پروا ہے اور نہ کسی کی خوشی کی۔ اپنی اپنی زندگی

ہے جیسے چاہو جیو اور مر جاؤ۔ مجھے تو یوں لگتا ہے اگر اس گھر میں کوئی مر جائے تو یہاں رونے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔“ وہ بے حد افسردگی سے بولی۔

”تم ٹھیک کہتی ہو..... مگر تو ماں باپ سے بنتے ہیں۔ جب دلوں ہی اولاد کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑیں تو ان پر نہ قدرت رحم کرتی

ہے نہ دوسرے انسان مہربانی۔ یوں جیسے کسی درخت کے آوارہ پتے ادھر ادھر تنہا پھرتے رہتے ہیں اور پھر کہاں گم ہو جاتے ہیں، کون جانتا ہے.....“

شفق اداسی سے بولی۔

”شفق، تم لوگوں کی ماں نے بچوں کو کیوں چھوڑا؟“

”معلوم نہیں۔“ وہ سحر کی بات کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے جو گلے کے ساتھ ساتھ خاموش بھی ہو گئی۔

”آفاق کسی نہ کسی طرح اپنی ماں کا ذکر کر ہی لیتا ہے۔ مجھے لگتا ہے اسے ماں سے بہت محبت تھی۔ شاید یہ سارا درد، یہ زہر اس کے اندر انہی

کی وجہ سے ہے۔“

”کیا اس نے تم سے کبھی کچھ کہا.....؟“

”اکثر بے وقائی، بے احتیاری عورت سے منسوب کرتا ہے اور ایسی باتیں کرتا ہوا کہیں کھوسا جاتا ہے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں جو

بے چینی اور بے بسی ہوتی ہے، وہ میں تمہیں نہیں بتا سکتی۔“ وہ آدھ بھر کر بولی۔

”ہاں..... ہماری ماں بہت اچھی تھی اور ہم سے بہت محبت بھی کرتی تھی پھر نہ جانے کیا ہوا..... اس نے ہمیں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور ہم

بکھر گئے۔ تب سے ہم منتشر ہی تو ہیں..... ہم پل بڑھ کر جوان تو ہو گئے مگر اندر سے ہم خالی، سوکھے ہوئے، غمراہ انسان ہیں۔“

”ملک منصور جیسے شخص کو چھوڑا ہی جاسکتا ہے.....“ وہ آہستہ سے بولی۔

”لیکن شزا آئی بھی تو ہیں نا..... وہ بھی تو سب کچھ برداشت کر رہی ہیں؟“ ماما بھی کر سکتی تھیں۔“ اس کے لہجے میں بلا کا تاسف تھا۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ تو وہی جانتی ہوں گی مگر ہم عورتیں کیسے کیسے ان مردوں کے ہاتھوں ذلیل ہو رہی ہیں۔ چلو دفع کرو، اس بکو اس

کو۔ ہاں تم بات کرو، اس شخص سے۔“ اس نے موبائل پر نمبر ملا کر اسے تھما دیا۔

”ہیلو، حیدر صاحب سے بات کرنی ہے.....“ شفق قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”جی ہول رہا ہوں.....“ وہ بھاری رعب دار آواز میں بولے۔

”انکل، میں شفق بات کر رہی ہوں۔“

”کون شفق.....؟“

”ملک منصور کی بیٹی.....!“

”اوہ..... تم.....“ جیسے وہ بری طرح چونک سے گئے ہو۔

”انکل، مجھے آپ سے بہت ضروری کام ہے۔ میں اسپتال سے بات کر رہی ہوں۔ آپ کل اسپتال آ سکتے ہیں۔“ اس نے پُر امید لہجے

میں پوچھا۔

”ٹھیک ہے..... میں کل کسی وقت چکر لگاؤں گا۔“ وہ قدرے سوچتے ہوئے بولے۔

”ٹھیک برا انکل!“ اس نے اسپتال کا ایڈریس دہرایا کر خوشی خوشی فون بند کر دیا۔

”کیا کہہ رہے تھے؟“ سحر نے بے چینی سے پوچھا۔

”وہ کل آئیں گے۔۔۔۔۔ سحر، وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ وہ ضرور ہماری مدد کریں گے۔“

”خدا کرے۔۔۔۔۔ درنہاب ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں میں قصصیں چھپا سکوں؟“ سحر فکر مندی سے بولی۔
 شفیق مطمئن تھی اور بڑی امید بھی۔

اگلے دن سہ پہر کو حیدر آیا، شفیق اس وقت سو رہی تھی۔ اور سحر واک مین لگائے کچھ سن رہی تھی۔ اس نے کمرے کا دروازہ تاک کیا اور شفیق کے بارے میں پوچھا۔

”آپ آ جائیں۔۔۔۔۔ آپ کا انتظار کرتے کرتے وہ سوئی ہے۔ آپ تشریف رکھیں۔“ اس نے حیدر کو کرسی دیتے ہوئے کہا۔ حیدر نے قدرے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر بیڈ پر سوئی شفیق کو وہ ہو، ہواں جیسی لگ رہی تھی۔

وہ کافی حد تک شہلا سے مشابہہ تھی۔ سحر نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔

”شفیق اٹھو! کچھ کون آیا ہے؟“

”کون۔۔۔۔۔؟“ اس نے حیدر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”حیدر۔۔۔۔۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”اوہ آئی ایم سوری انگل! میری آنکھ لگ گئی تھی۔“

”کیسی ہیں آپ۔۔۔۔۔؟ اور یہ سب کیا ہے؟“ حیدر نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”انگل، میں نے بہت مجبوری میں زحمت دی ہے۔ اس وقت پوری دنیا میں صرف آپ، ہی میرے لیے امید کی کرن ہیں۔۔۔۔۔ مجھے آپ

کی مدد کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔؟“

”کیسی مدد۔۔۔۔۔؟“ حیدر نے چونک کر پوچھا۔

”انگل، مجھے سر چھپانے کے لیے ٹھکانا چاہیے۔ میرے پاس اس وقت کوئی ایسی جگہ نہیں جس کے سائے تلے میں چند دنوں کے لیے

پناہ لے سکوں۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ آپ کا گھر اور آپ کے والد تو۔۔۔۔۔؟“

”انگل پلیز۔۔۔۔۔ ان کے کان میں تو اس کی بھک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔“

”کیوں؟“ حیدر نے حیرت سے پوچھا۔ شفیق نے ساری بات اسے بتا دی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ آپ ہماری گاؤں والی حویلی میں ٹھہر سکتی ہیں۔ میں کل ڈرائیور بھیج دوں گا اور تھانے میں بھی بات کر لوں گا، آپ بے فکر

رہیں۔“

”انکل، بہت شکریہ..... اس وقت میں ہانکل بے آسرا ہوں۔ آپ کا خیال آیا تو امید ہی بندھی۔ سوچتی تھی نہ جانے آپ بھی.....“ اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ مسئلے اور اس کے حل کے اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔“ حیدر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور خاموشی سے نکل گیا۔

”وہاٹ آ گریں فل مین.....“ سحراک ادا سے بولی۔

”ہاں، حیدر انکل بہت ناگس ہیں۔“

”ہاں، اور تمہارے گھر کے مردوں سے بہت مختلف بھی..... پہلی دفعہ کوئی بندے کا ہتھ لگا ہے۔“ سحراچے مخصوص پرانے اسٹائل میں بولی۔

”شفق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھپکائیں۔ اسے قطعی سمجھ نہ آیا کہ وہ کس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

”میں تم سے ملنے وہاں آیا کروں گی..... اور تمہارے ان انکل سے بھی۔“

”کیا مطلب.....؟“

”بھئی اچھے لگے ہیں.....“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”پلیز، کسی کو کچھ مت بتانا.....“

”ٹھیک ہے، نہیں بتاؤں گی، مجھ پر بھروسہ رکھو۔ البتہ تمہارے باپ کی سی آئی ڈی بہت اکیٹو ہے۔ ان کی ڈس واری میں نہیں لیتی۔“ وہ

قہقہہ لگا کر بولی۔

”شکر ہے کوئی لٹھکانا تو ملا۔“ شفق نے سکھ کا سانس لیا۔

”خوش قسمت ہو کہ کوئی آسرا تو ملا۔ میری طرف دیکھو، کہیں جانا بھی چاہوں تو نہ کوئی منزل ہے، نہ راستہ۔ میرے تو راستوں کے آثار ہی

مٹ گئے ہیں۔“

”تم کل میرے کچھ کپڑے اور ضروری سامان بیگ میں ڈال کر لے آنا..... اور سنو، بہت بہت شکریہ تم نے میری بہت مدد کی۔“ شفق

نے اس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا کر کہا۔

”شکر ہے، کسی کے کام تو آئی..... ورنہ..... خیر، چھوڑو..... میں تم سے ملنے آتی رہوں گی اور کل میں تمہارا سامان لے آؤں گی۔“

”ٹھیک ہے.....“ وہ مطمئن ہو کر لیٹ گئی۔

پوری رات آفاق پھر گھر نہیں آیا..... اسے معلوم تھا، وہ کہاں ہوگا؟ اس لیے وہ خاموشی سے لیٹ گئی۔ جو شخص خود اپنی کارستانیوں کا اقرار

کر لے تو اس سے مزید کچھ اگلوانا حماقت ہے۔ اور ایسے متذکرہ گھوڑے کو روکنا مزید حماقت جب کہ وہ سر پٹ بھاگ رہا ہو۔ دوا بھی طرح جاتی تھی

کہ اس کی طبیعت میں ظہر آؤ نہیں۔ چند دنوں کے بعد وہ خود لوٹ آئے گا۔ نہ شزا گھر پر تھی نہ ملک منصور۔ خاناماں اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا اور

چوکیدار باہر پہرہ دے رہا تھا۔ کئی دنوں سے وہ کلب بھی نہیں جاسکی تھی۔ اس نے مسز زہیر کا نمبر ملا یا۔ مسز زہیر لگائی بجھائی کرنے میں شاطر کھلاڑی بھی جاتی تھی۔ ہر اندر کی بات کی خبر سب سے پہلے انہیں ہوتی تھی۔ مگر یہ سیاست سے لے کر ملکی سیاست تک تمام جوڑ توڑ کے علاوہ سب میروں کی چالیں ان کی نظر میں ہوتی تھیں۔ پچاس ہزار کے ڈبے کا دکھ تو اپنی جگہ پر تھا۔ مگر مسز زہیر سے بگاڑنا گویا سوسائٹی میں اپنے آپ کو ذلیل کرنے کے مترادف تھا۔ اس وقت اس کی فون کال کا مقصد کچھ اور تھا۔

”مسز زہیر سنا بیٹے، کلب ہمارے بغیر کیسا جا رہا ہے؟“ وہ اک ادا سے بولی۔

”بھئی کلب کی رونقیں تو آپ جیسے لوگوں سے ہیں۔ پارٹم نے آنا کیا بند کیا ہے، ہر طرف اداسی چھا گئی ہے۔ آپ جیسے روح رواں ہوں تو محفلوں کو چار چاند لگتے ہیں اور یہ چاند اتنے دنوں سے کلب میں جلوہ افروز نہیں ہوا اس لیے تاریکی تاریکی ہے۔“ مسز زہیر اپنے مخصوص چالوں اسٹائل میں بولیں۔

”جی، میں تو خود آپ کے کمٹس اور قہقہوں کو ترس گئی ہوں۔ بس جلد ہی حاضر ہوں گی۔ بس مصروفیت ہی ایسی تھی۔ ہاں، یہ تو بتائیے شہلا حیدر آج کل کلب آ رہی ہے کہ نہیں.... مجھے اس سے کچھ کام تھا۔“

”نہیں، کافی دنوں سے نہیں آ رہی.... شاید کچھ ڈسٹرب ہے؟“

”ڈسٹرب.... کس لیے.... اور کیونکر؟“ وہ اپنی جگہ پر اچھل پڑی۔

”کیوں.... تم کیوں چوٹیں؟“

”بھئی، ایسی اشراک پر سنائی کے بارے میں سن کر.... ویسے آپ کو کیا خبر ملی؟“

”یہی بات تو معلوم نہیں ہو سکی مگر لگتا ہے آج کل اس کی باپ سے کچھ ٹھنی ہے ورنہ پہلے تو ہر جگہ اکٹھے جاتے تھے۔ جاتے تو خیر اب بھی ہیں مگر کچھ تناؤ سا ہے۔“

”باپ کے ساتھ.... شوہر کے ساتھ ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔“ وہ قہجہ لگا کر بولی۔

”بھئی اس کی باپ کے ساتھ زبردست انچ منٹ ہے۔“

”کیوں، اس کے باپ میں کیا خاص بات ہے؟“ وہ اپنے اصل موضوع کی طرف آ رہی تھی۔

”اس کے باپ میں ہی تو بات ہے....“ مسز زہیر نے زبردست بے ہودہ سا قہجہ لگایا اور اس قہجے کے انداز میں ہی ساری بات چھی ہوئی تھی۔

”خیریت تو ہے مسز زہیر.... مجھے تو آپ بڑی امپریس لگ رہی ہیں؟“

”ہائے ہائے، ہم تو بس ان کے متاثرین میں سے ہی رہ گئے ہیں۔ کوشش تو بہت کی مگر وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتے.... تم نے ان کو دیکھا

ہے جانو، کیا فی شک پر سنائی ہے.... اور اوپر سے مقررہ بھی۔ کلب کی بہت خواتین نے لڑائی ماری ہے مگر سب ناکام ہی ہوئیں۔ مس شہلا حیدر اسی

بات پر تو اکڑتی ہے۔ ویسے ابھی تک باپ سے ناراضگی کی سمجھ نہیں آ رہی۔ خیر ہم بھی آرام سے کہاں بیٹھنے والے ہیں۔ بس اندر کی خبر پہنچی سمجھو۔۔۔۔۔

بڑے لوگ چھوڑے ہوئے ہیں ان کے پیچھے یقین مانو، سیاست دانوں کی صف میں کمزور و منفرد شخص ہر ایک کو بس ٹرپاتا ہی ہے۔۔۔۔۔“ مسز زہرا کی جیسے دال ٹپک رہی تھی۔

”بس بس مسز ذہرہ ازہرہ صاحب نے سن لیا تو آپ کی شامت آ جائے گی۔“

”ارے، وہ اس قابل تو ہوں پہلے.....“ مسز بیر نے پھر قہقہہ لگایا۔

”کیا مطلب...؟“

”ارے اب اتنا بھی مت بنو..... بے وقوف..... اور چھ قسم کے شوہر بس بیوی بچوں کو پا لیں، یہی بڑا کام ہے۔ رومانس تو کہیں اور چلتا ہے۔ یار، جس حیدر سے کہیں ملو اس کی بھرد کیجنا..... اب میں چلتی ہوں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ میرا بیٹا ملارہا ہے..... اوکے بائے بکلب میں ملیں گے۔“

اس نے بھی مسکراتے ہوئے فون رکھ دیا۔ اس کا دل نہ جانے کیوں حیدر سے ملنے کو چاہ رہا تھا۔ اسے اپنی اس احمقانہ سوچ پر ہنسی بھی آرہی تھی مگر وہ اس سے اتنی متاثر ہوئی تھی کہ سوچ خود بخود اس کی طرف چلی جاتی۔ اس کا ٹھہرا ٹھہرا ہوا لہجہ، باتوں میں سمجیدگی اور شائستگی..... نظروں میں حیا اور شرافت۔ وہ کسی اعلیٰ خاندان سے معلوم ہوتا تھا۔

رات کے چھلے پہر آفاق مگر لوہا، وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ آتے ہی جوتے اتارے بغیر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ بھی آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ اس کے تصور میں کبھی حیدر تھا، کبھی ملک منصور اور کبھی آفاق۔ وہ ان تینوں کا موازنہ کر رہی تھی۔ یہ دونوں اسے بہت حقیر اور سٹیٹی مرد عموماً ہوا ہے تھے۔ ملک منصور سے وہ شدید نفرت کرتی تھی اور آفاق سے شدید محبت مگر شاید حیدر کی وہ عزت کرنے لگی تھی۔ خود بخود اس کے لیے دل سے اچھے اور محترم جذبات نکل رہے تھے۔ واقعی، وہ شخص اس قابل ہے کہ اس کی بہت تعریف اور دل سے عزت کی جائے۔ میں ضرور اس سے کبھی ملوں گی۔ شفق خوش قسمت ہے کہ وہ ایسے شخص کے زیر سایہ رہنے جا رہی ہے۔

صبح وہ شفق کا سامان پیک کر کے کمرے میں لوٹی تو آقا کا ق اوہ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”کیوں..... تم ہوش میں آ گئے؟“

”اچھا، کون نہیں کرو، صبح صبح..... شوق کہاں ہے، بہت دنوں سے نظر نہیں آئی؟“

”واہ..... کیا کہنے بہن کی یاد آئی مگنی۔ تف ہے تم جیسے بھائی پر اور تمہارے باپ پر بھی۔ تمہاری بہن اتنے دنوں سے مگر نہیں آئی اور تم ایسے پوچھ رہے ہو جیسے تمہاری بلی کئی دنوں سے نظر نہیں آ رہی۔ حد ہے تم لوگوں کی بے حسی کی.....“ وہ بے حد زبان دراز اور منہ پھٹ ہو گئی تھی۔

”افوہ..... کیا بکواس شروع کر دی تم نے..... جاؤ دفع ہو جاؤ کمرے سے۔“ اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھا پلاسٹک کا گلدان اس کی طرف پھینکا۔ جسے اس نے فوراً کچھ کر لیا اور جوا ہا زور سے اس کی طرف پھینکا جو اس کے بازو پر لگا۔ وہ کراہ اٹھا۔ اس سے قبل کہ وہ بستر سے اٹھ کر اس کو تھپتھپا

رسید کرتا، وہ ہا ہر جا چکی تھی۔ ”جابل..... بھکارن.....“ وہ بڑبڑاتا رہا۔

شفق اور وہ دونوں سامان پیک کے خطر تھیں شام کو حیدر کا ڈرائیور اسے لینے آ گیا۔ ”حیدر صاحب نے مجھے بھیجا ہے..... آپ میرے ساتھ چلیں۔“ ڈرائیور نظریں جھکائے بہت احترام سے بولا۔

”ہاں، میں بھی انتظار کر رہی تھی..... چلو.....“ وہ دوپٹا گلے میں ڈالتے ہوئے بولی۔

”بی بی، اس طرح..... میرا مطلب ہے آپ گاؤں میں بغیر چادر کے پارے کے نہیں جاسکتیں۔ شہلا بی بی بھی گاؤں جانے کے لیے چادر اوڑھتی ہیں۔ یہ اس علاقے کی روایت ہے۔“ شفق اور سر حیرانی سے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے..... سہریک میں سے مجھے کوئی بڑا دوپٹا نکال کر دو۔“

سحر نے ایک کاتن کے سوٹ کے ساتھ بڑا سا بلیک کلر کا دوپٹا نکال کر دیا جسے اس نے اچھی طرح اوڑھا اور سحر سے مل کر چل دی۔

”یہ میرا سو بائل تم رکھو۔“ سحر نے اس کے پیک میں اپنا سو بائل رکھ دیا۔

”تھینک یو سحر..... میں تم سے رابطہ رکھوں گی۔“

”میں تمہیں خود فون کیا کروں گی..... اپنا خیال رکھنا۔“ وہ اس کے گلے ملتے ہوئے بولی۔



آرمس پروست

آرمس پروست، ام ہے عمران میرن کے نئے ماؤں کا جسے آپ کے لیے مظہر عظیم جیسے کہنے مشق مصنف نے تحریر کیا ہے۔ اس بار بار اور ملک مصر کی سیکرٹ سروس کے سربراہ نے پاکیستا سیکرٹ سروس سے درخواست کی کہ وہ اُن کے ملک سے چوری ہو جانے والے قیمتی تاریخی نوادرات کو بازمیاب کرانے کے لیے اُن کی مدد کرے لیکن ایکس فون نے سیکرٹ سروس کے لیے یہ کیس لینے سے انکار کر دیا۔ کیوں؟ مصر کے عجائب گھر سے چوری ہونے والی قدیم تختیاں جن کے حصول کے لیے عمران اورنا تھیر کا ایک ٹورنیز بنگ لڑتی پڑی۔ وہ تختیاں ایسا کون سا راز اپنے اندر چھپائے ہوئے تھیں کہ مجرم ایجنٹ اُن کے لیے عمران کے خون کے پیاسے ہو گئے؟ آرمس پروست، ایک شیطان صفت پروست جس کے مشیر بے کی کھونٹ لگانے کے لیے لوگ صدیوں سے سرگرداں تھے لیکن وہ مشیرہ دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رہا۔ اور جب عمران کو آرمس پروست کے مشیرے کوڑیں کرنے کا سب ملاتو کیسے کیسے حالات پیش آئے عمران اورنا تھیر کو اُن کی کاروں پر راکٹ فائر کر کے اڑا دیا گیا۔ عمران اورنا تھیر کس طرح اس راکٹ جسے سے بچ پائے؟ آخر کیوں جوزف کو اپنی کلائی کاٹ کر اپنا خون عمران کے حق میں نچا مارتا؟ کیا عمران اورنا تھیر کوئی زندگی مل سکی؟ کیا عمران آرمس پروست کا مشیرہ لڑیں کر سکا۔ یہ سب جاننے کے لئے پڑھیں ماؤں ”آرمس پروست“

”آرمس پروست“ کتاب گھر پروستیا ہے جسے جاسوسی ماؤں سیشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

”سز پٹر.....!“

”آپ وہی..... اس اسٹ میں.....“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”مائی گاڈ..... اوکے..... ٹھیک ہے، میں کل شام کو آپ کی طرف آؤں گی۔“ اس نے ایک دم اپنا لہجہ ٹارٹل کرتے ہوئے کہا۔

اسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اس سے کیوں ملنا چاہتی ہے مگر اس کے لہجے میں تجسس اور روکھا پن کسی اچھی بات کی طرف اشارہ نہیں کر رہا تھا۔ وہ بہت مضطرب رہی مگر دوبارہ فون نہ کیا کیونکہ شاید حیدر کا موبائل اس کے پاس تھا۔ وہ کالج سے جلد واپس آ چکی تھی اور اس وقت سے ہی اس کی آء کی منتظر تھی۔ شام کو ایک دم ہاسٹل میں افراتفری سی پھیل گئی۔ وارڈن اور نوکرانیوں کی دوڑیں ادھر سے ادھر لگ رہی تھیں۔ اس کے کالوں میں بھی بھٹک پڑی تھی، وہ جانتی تھی کہ اس کے پیچھے کیا بات تھی۔ چانک مس حیدر اس کے کمرے میں آ گئیں۔

”آپ لوگ سب جائیں مجھے ان سے تنہائی میں کچھ بات کرنی ہے۔“ مس حیدر نے وارڈن اور دوسری ورکرز کو کہا۔

”آپ کوئی شخصہ وغیرہ..... میرا مطلب ہے ادھر ہی بچھادوں۔“ مس افضال نے کہا۔

”نہیں، کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بس آپ لوگ جائیے.....“ اس کا لہجہ تھکسانہ تھا اور مزاج اکھڑا ہوا۔

”آپ بیٹھیں پلیز.....“

”میں، آپ کے صرف چند منٹ لوں گی مگر یہ دروازہ اچھی طرح بند کر دیں تاکہ ہماری گفتگو کوئی تیسرا بندہ نہ سن سکے۔“ وہ بولڈ انداز میں بولی۔

”جی فرمائیے۔“ اس نے دروازہ بند کرنے کے بعد کہا۔

”میں آپ کے اور پاپا کے بارے میں سب کچھ جان چکی ہوں۔ میں آپ سے صرف یہی کہنا چاہوں گی کہ اگر آپ کی خواہشات پوری نہیں ہو سکیں تو اس کا بدلہ آپ کس کس سے لیں گی..... کتنے لوگوں کے سکون اور ان کی زندگیاں ڈسٹرب کریں گی۔“ وہ غصے سے بولی۔

”کیا مطلب.....؟“ وہ چونکی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ڈھیروں پانی اس کے اوپر گرا دیا ہو۔

”آپ نے میری ماں کو بے سکون زندگی دی اور اب مجھے..... میرے پاس بہت محبت کرنے والا آئیڈیل ہاپ تھا اور میرا آئیڈیل آپ نے مجھ سے چھین لیا ہے۔ میرے تخیل کو کرجی کرجی کر دیا ہے۔ میری سوچیں منتشر ہو گئی ہیں۔ جس ہاپ کے بغیر میں سانس بھی نہیں لیتی تھی، اب اس کی موجودگی میں مجھے گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے کیونکہ آپ انہیں ان کی حیثیت سے گرا رہی ہیں۔“ وہ انتہائی کاٹ دار لہجے میں بولی۔

”میں..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... آپ..... اگر آپ کو خوشیاں نہیں ملیں تو دوسروں کو کیوں تباہ کرنے پر تلے ہیں۔ آپ نے تو مجھ سے میرا سارا کچھ چھیننے کی کوشش کی ہے۔ آپ کیا سمجھتی ہیں، میں خاموشی سے یہ ”محبت ڈراما“ دیکھتی رہوں گی۔ میں جتنی کڑو نہیں۔ میں آپ کو وارننگ دے رہی ہوں کہ آئندہ نہ تو پاپا کو فون کریں اور نہ ہی ان سے ملنے کی کوشش کریں..... ورنہ..... اس کا انجام.....؟ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اور وہ ہمیشہ کی طرح حیرت سے

ساکت کھڑی رہ گئی۔ اسے کوئی توجہ بہ پیش نہ کر سکی۔ اس کی غلط باتوں کو رد نہ کر سکی۔ وہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر ایک کی بھی تردید نہ کر سکی۔ وہ جہاں کھڑی تھی۔ وہیں بیٹھ گئی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے شدت سے رواں ہوئے۔ مس حیدر کیسے اس کی تذلیل کر کے گئی تھی۔ چند منٹوں میں اسے اتنا بے عزت کیا تھا کہ اپنا آپ اسے نہ ہر گھٹنے لگا۔

کب تک..... باخدا کب تک یہ تذلیل میرا مقدر رہے گی..... اب تو بچے بھی اٹھ کر مجھے ذلیل کرنا شروع ہو گئے ہیں۔ شاید کچھ لوگ دنیا میں صرف اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ دوسرے انہیں قدم قدم پر ٹھوکریں لگائیں، انہیں ذلیل کریں، انہیں رسوا اور بے عزت کریں..... اور وہ خاموشی سے سب کچھ سہتے رہیں۔ وہ تو اپنے دفاع میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ بس ہمیشہ کی طرح سختی رہی، سوچتی رہی اور روتی رہی۔ کاش زندگی میں کوئی ایک لمحہ تو ایسا آئے جب وہ اپنا موقف کھل کر بیان کر سکے۔ کسی کے دعوے کو جھٹلا سکے۔ دوسروں کی جھوٹی باتوں اور الزامات کو رد کر سکے مگر قدرت کبھی بھی اسے ایسا موقع نہیں دیتی۔ ساری رات وہ روتی رہی۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوچ گئی تھیں۔

اس نے اگلے دن کالج سے چھٹی بھی کر لی تھی۔ مس افضل اور دوسرے لوگ بھی پریشان تھے کہ مس حیدر اسے کیا کہہ کر گئی تھیں کہ اس کے بعد تو وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے آنسو بے اختیار نوٹی مالا کے موتیوں کی طرح گرتے رہے۔ سینے کے اندر سے ہوک سی اٹھتی، آہیں اور سسکیاں ہر سانس کا لازم و ملزوم حصہ بن گئیں۔ آنکھیں لمحوں میں غم ہو جاتیں۔ وہ بہت بھلانے کی کوشش کرتی مگر مس حیدر کے الفاظ گویا اس کے دماغ کے خلیوں کے ساتھ چپک گئے تھے۔ مننے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ مس افضل خود اس کے کمرے میں آئیں۔ وہ بھی اس کی حالت دیکھ کر افسردہ ہو گئیں۔

”مسز پائیئر، یہ آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔ آپ جیسی خاتون، یوں کسی بات پر حوصلہ کھو دے گی، میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں نہیں جانتی مس حیدر نے آپ سے کیا کہا ہے اور نہ میں یہ جاننے میں کوشاں ہوں لیکن آپ کو یہ حالت ہم سے دیکھی نہیں جاتی۔ پلیز، اپنے آپ کو نارمل کیجئے، ہاسٹل میں بہت چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ سب لوگ یہ جاننے کے لیے تجسس ہو رہے ہیں کہ آخر مس حیدر آپ سے کیا کہہ کر گئی ہیں اور آپ کیوں پریشان ہیں۔ آپ کی تخلص ساتھی ہونے کے ناتے آپ کو مشورہ دیتی ہوں کہ پلیز، اپنے آپ کو سنبھال لیں۔ حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے۔ چند دنوں بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ مس افضل نے اسے بہت دلاسا دینے کی کوشش کی۔

”میں مس افضل..... میرے حالات کبھی نہیں بدلیں گے..... میں نے بڑے بولڈ اسٹپس لے کر بھی دیکھے مگر..... میں کیا کروں، بعض لوگوں کے ہر اٹھتے قدم الٹے ہی کیوں پڑتے ہیں۔ کتنے نصیب والے لوگ ہوتے ہیں جن پر پروردگار اتنا مہربان ہوتا ہے کہ ان کے اٹنے کاموں کو بھی وہ اپنے کرم سے سیدھا کر دیتا ہے۔ میں تو مختصر ہی رہی۔ ساری زندگی اسی تک دو دو میں گزر گئی شاید میری زندگی میں بھی کوئی ایسا لمحہ آئے جب میری بھی سنی جائے مگر کچھ لوگ صرف تمنا ہی کر سکتے ہیں۔ اپنی ناقص آرزوؤں کے ساتھ ہی دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ میں اب دعا کرتی ہوں کہ خدا مجھے جلد اٹھالے۔ میرے ارد گرد کہیں بھی امید کی کرن نہیں۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ سائے بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں اور میں خزاں رسیدہ چنے کی طرح اب پھڑ پھڑا رہی ہوں۔ جب انسان خود ہی اپنی نظر میں گر جائے تو پھر اسے لوگوں کی کیا پروا۔ ہاسٹل کے لوگ جو مرضی کہیں، حالات میرے بس ہیں تو نہیں۔ رسوائیاں اگر میرا مقدر ہیں تو میں انہیں روک تو نہیں سکتی۔“

”خدا کے لیے یوں مایوسی کی باتیں مت کریں۔ آپ کیوں اس قدر بددل ہو رہی ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں خود مس حیدر سے بات کروں کہ وہ آپ سے کیوں ناراض ہیں۔“

”خدا کے لیے یہ غضب نہ کیجئے۔۔۔۔۔ جو بات بھی ہوئی ہے، میرے اور ان کے درمیان ہوئی ہے، اسے ختم سمجھیں۔۔۔۔۔ اس بات کو ڈھرانے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں، میں اب مزید کچھ برداشت نہیں کر سکتی۔“

”پھر آپ یوں مایوس ہونا بھی چھوڑ دیں اور۔۔۔۔۔ اور ولیم بھی تو ہے، اس کی خوشیاں بھی تو آپ کو دیکھنی ہیں۔“

”نہیں مس افضل۔۔۔۔۔ پہلے مجھے اس کی امید تھی، اب وہ بھی نہیں رہی۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟ خدا نہ کرے، آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟“

”میں نے کہا تھا بعض لوگ صرف دکھنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ پھر یا تو بیمار ہو کر بستر کے ساتھ لگ جاتے ہیں یا پھر مر جاتے ہیں۔ میں بھی ایسے لوگوں میں سے ایک ہوں۔ میں تو خدا سے کہتی ہوں کہ میں نہ تو سرکش تھی نہ باغی۔۔۔۔۔ میں نے تو کبھی تجھ سے شکوہ بھی نہ کیا پھر کیوں تو نے مجھے اس قدر آزمایا ہے کہ میں اب تھک گئی ہوں۔“

”مسز پیٹر۔۔۔۔۔ آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ اللہ اپنے پیاروں کو ہی آزماتا ہے۔“

جس کو دنیا میں انسانوں سے پیار نہ مل سکا، اس کو خدا پیار کرے گا۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں مس افضل۔۔۔۔۔ یہ محض ڈھکوسلے ہیں۔ خوش فہمیاں ہیں، اپنے آپ کو جھوٹی تسلیاں ہیں اور کچھ نہیں۔۔۔۔۔ اس کے لہجے میں بلا کی شکستگی تھی۔

”اس وقت میں آپ سے کوئی بحث نہیں کروں گی۔۔۔۔۔ اس وقت آپ بہت مایوسی کا شکار ہیں۔ ان دنوں آپ میرے روم میں کیوں شفٹ نہیں ہو جاتیں۔۔۔۔۔ کم از کم ہم دونوں باتیں تو کر سکیں گے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔ جب تمہاری اور رسوائی مقدر ہو چکی ہو تو پھر فرار کیسا۔۔۔۔۔؟“

”آپ دل مت چھوڑیں، پلیز۔۔۔۔۔ خدا سے اچھی امید رکھیں۔“

”مس افضل! آپ بھی تو کب سے بڑا امید ہیں۔۔۔۔۔ کیا ہوا؟“

مس افضل کی آنکھوں میں ایک دم آنسو نمودار ہوئے اور پھر ان کے لیے روکنا محال ہو گیا۔ وہ خاموشی سے چلی گئیں۔ اس نے بھی آنکھوں کو پتیلیوں سے رگڑا اور ہاتھوں کی لکیروں میں کہیں گم ہو گئی۔

.....

کالج میں اینول ڈے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہر طرف لڑکے لڑکیوں کی ٹولیاں پٹنٹی پروگرامز ترتیب دے رہی تھیں۔ ڈسکر کا آغاز ہو چکا تھا اور سر دواؤں کی شدت میں بھی اضافہ ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ لان میں، کینے ٹیریا میں، غرض ہر جگہ اسٹوڈنٹس معروف نظر آ رہے تھے۔ کلاسز نہ لینے کا اچھا بہانہ بھی انھیں ملا ہوا تھا۔ ڈسکشن، قہقہے اور اکیٹنگ۔ سب کچھ عروج پر تھا مگر وہ اپنے کمرے میں نیٹ کے سامنے بیٹھا رہتا۔ اسے قادری

میل موصول ہوئی تھی کہ فارن ڈیلی گیٹیشنز پینچیس ورکشاپس کے لیے آرہے ہیں اور اس کی شرکت ان میں بہت ضروری ہے۔ فادر نے اس کا نام بھی لکھوا دیا تھا۔ اینول ڈے کے بعد اس کے ایگزاحز بھی تھے مگر فادر کو اس کی اسٹڈیز کی نسبت اس کی مذہبی سرگرمیوں میں زیادہ دلچسپی تھی۔ اگر کوئی کلاس ہوتی تو وہ اٹینڈ کرتا ورنہ واپس آ جاتا۔ ان کی کلاس کرسس کے حوالے سے ایک اسٹ تیار کر رہی تھی۔ اس میں ایک پادری کے رول کے لیے سب نے ولیم کا نام تجویز کیا مگر ولیم کو اس بات پر آمادہ کون کرے، وہ تو کسی سے فالتو بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے تو بس اپنی سرگرمیاں اور اسٹڈیز عزیز تھی۔ سب لوگ بھی پروگرام بتا رہے تھے کہ کون اس کو آمادہ کرے، اسی لمحے ٹرسٹ ایئر کی آئے نور آتی ہوئی دکھائی دی۔ جب سے آئے نور نے کالج میں داخلہ لیا تھا، ہر کوئی اس کی ذہانت اور خوبصورتی کا زبردست مداح ہو گیا تھا۔ اس کا سنس آل بیومر بھی سب بہت انجوائے کرتے۔ لڑکوں کو چٹانا اور بدتمیزوں کو چٹانا اس کو خوب آتا تھا۔

”کیوں نہ آئے نور کی خدمات لی جائیں.....“ رملہ نے کہا۔

”مگر وہ ہماری کلاس فیلو نہیں.....“ اویس بولا۔

”تو کیا ہوا.....؟ ولیم کو کون سی خبر ہوتی ہے کہ کون کلاس میں آیا ہے اور کون نہیں..... اپنے مطلب کے لیے سب جائز ہے.....“ انجمن نے رائے دی۔

”چلو..... کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟“ ڈاکر نے بھی اپنی رائے دینی ضروری سمجھی۔

”انجمن جاؤ ذرا اس کو بلا کر لاؤ۔“ رملہ نے اسے کہا۔

”ٹھیک ہے..... تم لوگ بھی تو آؤ نا.....“ اس نے اویس اور ڈاکر کو کہا۔

آئے نور اگلے ہی لمحے ان کے درمیان بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی۔ ”یار! کیوں مجھ سے کوئی گناہ کروانے پر تلے ہو..... اگر وہ اپنی عبادت میں بڑی ہے تو ہمیں کیا تکلیف ہے؟“

”مگر وہ اس کالج کا اسٹوڈنٹ بھی تو ہے؟..... اس پر یہ فرض ہے کہ وہ ہماری یعنی کہ اپنی کلاس فیلوز کی مدد بھی کرے، کیا اس کی کوئی ذمہ داری نہیں.....؟“ رملہ نے منہ بٹ کر کہا۔

”ہاں، یہ تو ہے..... چلو تم مجھے اس کے کرے تک پہنچا دو..... میں کوشش کرتی ہوں..... باقی تمہاری قسمت۔ نتائج کی ذمہ دار میں نہیں ہوں گی۔“ وہ جھپٹتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟“ انجمن نے کہا۔ سب لوگ اسے اس کا کراؤ دکھا کر ہار کونے میں اس کا انتظار کرنے لگے۔

”ایکسکیو زی!..... عے آئی کم ان.....“ ولیم کے دروازہ کھولنے پر اس نے فوراً کہا۔

”نہیں..... بٹ آئی.....“

”اوکے..... اوکے آئی ایم یور نیو کلاس فیلو..... آئے نور۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں، بہت بری بات ہے۔“ وہ جلدی جلدی بولی۔

”مگر آپ یہاں کیسے.....؟“ ولیم اس غیر طراری لڑکی کی اچانک آمد پر حیران ہو رہا تھا۔

”آپ کا کمر بہت بورنگ رہا ہے۔ آئی مین..... کوئی ہیرو، ہیروئن نظر نہیں آ رہی..... بروڈ لی، جیمز ہاٹ اور جیکسن کے بغیر تو کسی لڑکے کا کمر اچھا نہیں لگتا ہے آپ.....؟“

”آپ مطلب کی بات کیجئے اور آپ کو کسی بھی بات پر تنقید کا کوئی حق نہیں۔“

”اوہ..... آئی ایم سوری.....“ وہ قہقہے ہو کر بولی۔

”آپ کیا لیتا پسند کریں گی..... کافی یا..... پھر؟“ وہ اسے شرمندہ دیکھ کر بولا۔

”نو، تھنک..... اچھے ٹکلی..... کالج میں اینول ڈے ہو رہا ہے۔ ایک رول ہے جو آپ کو بی سوٹ کرے گا۔ ہم سب کی خواہش ہے کہ وہ رول آپ کریں.....“

”سوری..... میں بہت بڑی ہوں اور ان کاموں میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”بائی داوے..... آپ کو کن کاموں میں دلچسپی ہے.....؟“

”گاڈ کے.....“ وہ اس کی طرف بنور دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

”گڈ..... ویری گڈ..... لیکن گاڈ تو بہت سوشل ہے۔“ وہ ابرو اچکائے ہوئے بولی۔

”وہاٹ ڈو یو مین.....؟“

”اٹس کیئر..... وہ صرف عبادت میں جمنا کی اور خاموشی چاہتا ہے۔ مکمل طور پر وہ بہت سوشل ہے۔ اس لیے تو اس نے کنٹرین، آئی لینڈ اور سوسائٹی بنائی ہیں پھر سوسائٹی میں رہنے کے طریقے اور اصول بھی تو اسی نے بنائے ہیں۔ وہ لوگوں کا لوگوں سے ملنا پسند کرتا ہے اسی لیے تو کہتا ہے کہ جب ایک دوسرے سے ملو تو محبت سے ملو۔ ایک دوسرے کو تحفے دو..... ایک دوسرے سے اچھی اچھی باتیں کرو۔ ایک دوسرے کی مدد کرو۔“

”آپ.....؟“ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

”ہاں، ہاں..... کہیے، آپ رک کیوں گئے۔ کیا خدا ایسا نہیں کہتا؟“

”مگر ہمارے ریلیجن.....“

”کیا ہے آپ کے ریلیجن میں..... کہ دنیا سے صلہ ہو جاؤ..... ٹھیک ہے، آپ کے اپنے مورل کوڈز ہیں..... مگر ہمارے کوڈز میں تو یہی

ہے کہ آپ اس کالج کے اسٹوڈنٹ ہیں اور آپ کو ہماری مدد کرنی ہے۔“

”سوری..... میں بہت مصروف ہوں۔“

”وی ڈونٹ کیئر..... آپ کو ہر صورت میں رول کرنا ہے۔“

”میں نے کہا.....“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”اور میں نے بھی کہا نا..... کہ میں اس کمرے سے تب جاؤں گی جب آپ رول کرنے کی ہائی بھریں گے۔“

”ٹھیک ہے..... آپ بیٹھیے، میں جارہا ہوں۔“ اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

”ایک منٹ..... ایک منٹ سنا ہے آپ لوگ بہت مہمان نواز ہوتے ہیں یہ کیسی مہمان نوازی ہے..... مہمان نامہ ہے اور میزبان جا رہا ہے۔“

”جب مہمان اور دور دور ہوا.....“ وہ درشتی سے بولا۔

”تو اسے برداشت کرنا چاہیے.....“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

”افوہ..... آپ کیوں مجھے ڈسٹرب کر رہی ہیں.....؟“

”اس لیے کہ ہم آپ کی وجہ سے ڈسٹرب ہیں۔“

”میں نے ایسا کیا، کیا ہے؟“

”یہی تو مسئلہ ہے کہ آپ کچھ کر نہیں رہے۔“

”بھئی، میں انٹر سٹو نہیں.....“

”لیکن ہم کیا کریں..... ہم تو آپ ہی میں انٹر سٹو ہیں۔“ وہ اک ادا سے آنکھیں منکا کر شرارت سے بولی تو اس نے نظریں جھکا لیں۔

اس کی سفید رنگت سرخ پڑنے لگی۔ اس کے کانوں کی لونبیں سرخ ہونے لگیں۔

”آپ پلیز.....؟“

”آپ بھی پلیز.....“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”اوکے..... میں سوچوں گا۔“ وہ اس سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے کل تک سوچ لیجئے گا ورنہ میں کل پھر آؤں گی.....“

”آپ..... میرا مطلب ہے میں خود آ جاؤں گا۔“

”ویش گڈ.....“ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکلی تو اس نے شکر ادا کیا۔

”لگتا ہے..... تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی ہو۔“

”جی ہاں..... اس نے سوچنے کی ہائی تو بھری ہے۔ ویسے سمجھو کہ کام ہو گیا ہے۔ قسم سے مجھے تو اس غریب پر ترس آ رہا تھا۔ ایسا کیوٹ

سالز کا ہے اور تم لوگ اس کو تنگ کرنے پر تلے ہو۔ کیوں تھیت رہے ہو اسے.....“ آئے نور ذرا غلطی سے بولی۔

”یار اتم بھی کمال کرتی ہو، ہماری عزت کا مسئلہ ہے۔ ہمارا اسٹ اس کے بغیر ادھورا ہے اور ہم نے اس کو شریف سارول ہی دینا ہے۔

ویسے آپ ان کی بہت طرف داری کر رہی ہیں، خیر تو ہے نا.....؟“ رملہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہاں، میں نے اس کو بہت تنگ کیا..... وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اب میں چلتی ہوں۔ کل ملوں گی۔“ وہ دستاویز اٹھا کر چلی گئی اور سب لوگ

پھر پلاننگ کرنے لگے۔

وہ اس اچانک اتحاد پر ایک دم گھبرا گیا تھا۔ اس نے تو اپنی زندگی صرف کمرے تک محدود کر رکھی تھی ورنہ اس سے قبل وہ مری میں ہر فنکشن میں بہت دلچسپی سے شرکت کرتا تھا کوئی بھی فنکشن اس کے بغیر ادھورا سمجھا جاتا مگر جب سے فادر نے اس کو گاڈ سے انٹرویو کر لیا تھا، وہ بہت سویر ہو گیا تھا۔ وہ گناہ اور ثواب کی ڈوری سے بندھ گیا تھا ہر قدم ڈرڈر کر اٹھاتا۔ اب نور کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ”گاڈ از سوشل۔“

”ہاؤ از اسٹ پاسبل.....؟“ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے فادر سے کانٹیکٹ کیا۔ وہ آن لائن تھے۔ اس نے ان سے یہ سوال پوچھا۔

”فادر اٹل می.....! گاڈ از سوشل؟“ اس نے لکھا۔

”وہاٹ نان سنس.....! گاڈ، اس طرح کی باتیں پسند نہیں کرتا۔“ فادر نے اسے جھڑکا۔

”فادر..... آپ مجھے بتائیں..... کیا یہ سچ ہے؟“ وہ بھی مصرع تھا۔

”گاڈ انسان نہیں..... جو وہ سوشل ہو۔“

”تو پھر وہ کیا ہے..... کیا وہ واقعی سوشل نہیں.....؟“

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو..... آج تم کس سے ملے ہو؟“

”فادر! آپ مجھے میرے سوال کا جواب دیں..... اگر خدا سوشل نہیں تو پھر وہ کیوں ایک دوسرے کو ملنے کو کہتا ہے۔ ایک دوسرے کی مدد

اور ایک دوسرے سے محبت کرنے کو کہتا ہے؟ اگر وہ ان سوشل ہو تو وہ علیحدہ رہنے کا کہے گا، کیا فادر یہ سچ نہیں.....؟“

”نہیں..... سی از سوشل۔ سنو، تم مجھے کل ہی ملو۔“ فیسے میں فادر آف لائن ہو گئے۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ کیسا تضاد پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ بہت سے تضادات موجود ہیں۔ وہ لڑکی تو بہت نان سیریس ہی لگی تھی اور اس کی نان سیریس بات میں کسی سچائی تھی کہ فادر بھی ہلا خرقہ حقیقت مان گئے تھے۔ اس کا ہنسا، مسکراتا چہرہ بار بار اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اس کا ہاتھیں کرنے کا کاغذینٹ اور بولڈ اسٹائل، اس کی ٹیسی..... اور اس کا ترکی بہ ترکی جواب دینا اور اس کی آنکھوں میں شرارت۔ وہ سو نہیں پا رہا تھا۔ اس نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی بات پر سوچے گا مگر وہ تو..... بات کے بجائے اس کے ہارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی ذہن سے نہیں ہٹ رہی تھی..... وہ آنکھیں بند کرتا تو وہ کھٹ سے اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی اور وہ آنکھیں کھول دیتا۔

گاڈ..... مائی ڈیر کرائسٹ..... سیو می..... ”وہ حریف کوئی دعا نہ کر پاتا..... اس کا مسکراتا سرخ و سفید..... گول سا چہرہ..... بڑی بڑی سیاہ شرارت سے بھرپور مسکراتی آنکھیں..... گہرے سیاہ ابرو..... وہ کوئی ایول اسپرٹ تو نہیں بلکہ جنت کی حور مطوم ہوتی تھی۔ اچانک وہ کہاں سے آ گئی تھی۔ اس نے تو اسے کلاس میں نہیں دیکھا تھا مگر وہ خود بھی تو کلاس فیلو کے ہارے میں بہت کم جانتا تھا۔

”نور..... شہزادہ ولیم ابھی تک نہیں پہنچا.....“ رملہ نے اسے دیکھ کر کہا۔

”یار ابھی تو ہی بجے ہیں۔۔۔۔۔۔ پر نہیں لوگ اتنی صبح کہاں اٹھتے ہیں انہیں تو اٹھانا پڑتا ہے اور پر نہیں ہے نا وہ ادھر ہی جا رہی ہے۔۔۔۔۔۔ اس نے وعدہ تو کیا تھا۔۔۔۔۔۔ کیا خیال ہے ہمیں انتظار کر لینا چاہیے۔۔۔۔۔۔“

”نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔ تم جاؤ اسے بلا کر لاؤ۔۔۔۔۔۔ اور اگر وہ آگیا تو میری طرف سے ٹریٹ ہوگی۔۔۔۔۔۔“ انہیں نے اسے لالچ دیا۔

”یہ بتاؤ ٹریٹ کہاں دوگی۔۔۔۔۔۔؟“

”اپنا ٹی بار ہے نا۔۔۔۔۔۔“ انہیں ہنس کر بولی۔

”نہیں جناب۔۔۔۔۔۔ میکڈونلڈ کی بات کرو۔۔۔۔۔۔ کے ایف سی کی بات کرو۔۔۔۔۔۔ یا پھر۔۔۔۔۔۔“

”بس بس۔۔۔۔۔۔ بس ہم اسٹوڈنٹ ہیں ہمیں رعایت دی جائے۔۔۔۔۔۔“

”بیداریت صرف حکومت دیتی ہے۔ اسٹوڈنٹس، اسٹوڈنٹس کو نہیں دیتے اور سنو پر بس بھی ہمارے ساتھ چلے گا۔۔۔۔۔۔“ نور آنکھیں مٹکا کر بولی۔

”واقعی۔۔۔۔۔۔“ سب نے حیرت سے کہا۔

سب لوگ خنجر رہے مگر وہ نہ آیا۔ بہت انتظار کے بعد نور کو اس کے کمرے میں بھیجا گیا مگر اسے سخت مایوسی ہوئی جب اس کا کمر والا کڈ دیکھا۔ اس نے ارد گرد اسٹوڈنٹس سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ تو صبح سویرے ہی کہیں چلا گیا تھا۔ نور کو سخت غصت کا سامنا تھا اسے پکا یقین تھا کہ وہ اگلے دن ضرور ان کے درمیان ہوگا مگر وہ تو بغیر بتائے ہی کہیں چلا گیا تھا۔۔۔۔۔۔ اس کا مطلب ہے اس نے اس کی انسلٹ کی تھی۔ اس کی بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ آج تک کسی نے بھی اس کی بات کو نہیں جھٹلایا تھا اور۔۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔۔ سب لوگ آئے نور کا مذاق اڑا رہے تھے مگر ظاہری طور پر شرمندہ ہوتا گویا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

”یار ہو سکتا ہے وہ بیمار پڑ گیا ہو۔۔۔۔۔۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔ آخر وہ بھی تو انسان ہے۔ اس کو گھر سے بھی کال آ سکتی ہے۔ ہزار مسائل ہوتے ہیں۔ تم لوگ تو بس یونہی دل چھوڑ دیتے ہو۔۔۔۔۔۔ کل وہ آ جائے گا۔ فکر کیوں کرتے ہو۔“ اس نے سب کو تسلی دی۔

”نور اس نے قسمیں بنایا ہے۔۔۔۔۔۔ اور ویسے بھی اس نے آنے کا وعدہ تو نہیں کیا تھا۔ اس نے سوچنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کا ذہن نہ مانتا ہو۔“ رملہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

”بھئی وہ کل آ جائے گا۔۔۔۔۔۔ کہا نا۔۔۔۔۔۔“ وہ مکمل اعتماد کے ساتھ بولی۔

”ٹھیک ہے کل تک انتظار کر لیتے ہیں۔ اگر کل تک نہ آیا تو ہم اپنا اسکٹ مینج کر لیں گے۔۔۔۔۔۔“ اولیس نے مشورہ دیا۔

”ویسے تم لوگوں کو کس نے مشورہ دیا تھا کہ ایسا اسکٹ لکھو اور پھر ہیر دیگی اسے ہی رکھو۔۔۔۔۔۔ تم لوگ بھی حد کرتے ہو۔۔۔۔۔۔“ نور ذرا منہ بنا کر بولی۔

”یار قسمیں کیا معلوم باقی لوگ ایسے ذہیر دست اسکلٹس کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور ہماری کلاس میں کوئی اس کا ٹل تو ہے ہی نہیں کہ کچھ بھی

ڈھنگ کا کر سکے۔ شوخیاں مستیاں ان سے کر دالو۔ کوئی کریڈٹ کام ان سے نہیں ہو سکتا۔ یہ تو میرے انکل نے اسکٹ لکھ دیا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا

کہ کیا یہ رول کوئی کر سکے گا۔ میں نے جلدی سے ولیم کا نام لے دیا۔ انھوں نے اسکٹ تو لکھ دیا مگر ولیم اب مان نہیں رہا۔ اتنی جلدی نیا اسکٹ لکھوانا

بھی تو مشکل کام ہے۔“ رملہ نے پوری تھیلیاں بتائیں۔

”اچھا کل تک انتظار کرلو..... میں اس سے بات کروں گی..... آئی ہوپ کل وہ آ جائے گا۔“ نور نے پھر انہیں امید دلائی۔ مگر سب لوگ بددلی کا شکار ہو چکے تھے۔

ولیم تذبذب کا شکار ہو چکا تھا۔ اس نے قادر سے دے دے بے الفاظ میں رول کرنے کی اجازت مانگی تو وہ غصے میں آ گئے۔

”ولیم تم اپنے فرائض بھول رہے ہو..... مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ تم اس قدر اچھوڑ ہو۔ میں تمہیں اپنے ارادوں میں مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے جب تمہیں کہا ہے کہ تم نے ورکشاپ میں شرکت کرنی ہے تو اس کے علاوہ اور کوئی سوچ تمہارے ذہن میں نہیں ہونی چاہیے۔“

”..... مگر قادر وہ میرے کلاس فیلوز ہیں اور.....“

”ولیم..... کلاس میں بہت سے لڑکے لڑکیاں ہوتے ہیں یہ رول ان میں سے کوئی بھی کر لے گا مگر تمہاری جگہ ورکشاپ میں شرکت کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اٹھ راستیڈ.....“ قادر ذرا تلخی سے بولے۔

اسے قادر کا رویہ بالکل اچھا نہیں لگا۔ قادر نے آہستہ آہستہ اس کی سوشل لائف ختم کر دی تھی۔ ہر وقت مذہبی سوچوں نے اس کے ذہن کو جس راہ پر گامزن کرنا شروع کیا تھا وہ وہاں کھینچنے کھینچنے تک سا گیا تھا..... اتنے سوالات ذہن میں اٹھتے..... اتنی ہی سوچیں ابھرتیں کہ وہ کبھی کبھی خود ہی جھنجھلا جاتا۔ آہستہ آہستہ مذہب اس کے لیے ایک ایسی آزمائشی میزمرہ بننا جا رہا تھا جس کے ہر زینے پر قدم رکھتے ہوئے وہ کئی بار کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا۔ وہ پکا ارادہ کر کے آیا تھا کہ اس نے کوئی رول نہیں کرنا اور ان لوگوں کو صاف نہ کہنی ہے۔ شام ہو رہی تھی جب وہ لوٹا..... قادر نے خصوصی طور پر اس کے لیے کالج انتظامیہ سے کچھ خاص مراعات لے رکھی تھیں۔ وہ جب چاہے آئے جائے..... اسے کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا اور ویسے بھی وہ اچھے ذہین اور بے ضرر طلباء میں شمار ہوتا تھا۔ اساتذہ بھی اس سے بہت خوش تھے۔ وہ ہر ایک کی گڈ بک میں تھا۔ آئے نور کو دیکھ کر وہ ایک دم چٹکا..... وہ ہاسٹل کے باہر بے چینی سے چکر لگا رہی تھی۔ اس وقت وہاں اس کی موجودگی اسے قطعی غیر متوقع لگی۔ وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا اندر داخل ہونے لگا..... تو وہ اس کے پیچھے آ گئی۔

”کیا آپ جانتے ہیں کہ میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں؟“

”آپ کو کس نے انتظار کرنے کو کہا ہے..... آپ نے کیوں تکلیف کی.....؟“

”جس شخص کو اس کا وعدہ یا دہندہ ہے اسے یاد دلانے کے لیے کبھی کبھی انتظار بھی کرنا پڑتا ہے۔“

”میں نے آپ سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا..... کیا میں نے ایسا کچھ کہا تھا.....؟“

”آپ نے کہنے کا نہیں غالبا سوچنے کے بارے میں کہا تھا اور سوچنے کے بعد ہمیشہ کچھ کہا جاتا ہے۔ آپ نے تو کچھ بھی کہا مناسب نہیں

سمجھا اور صبح سے غائب ہیں..... مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔“

”دیکھیں مس.....“

”آئے نور.....“

”جی.....جی..... میں بہت مصروف ہوں۔ میں ابھی بھی قادر کے پاس سے آ رہا ہوں مجھے بہت ضروری ورکشاپس میں شرکت کرنی ہے میں ان فضول کاموں میں شرکت نہیں کر سکتا۔ آپ میرے پرائمر کو کیوں نہیں سمجھتیں.....“ وہ اکتا کر بولا۔

”کیا آپ میرے پرائمر کو سمجھتے ہیں.....؟“

”میں سمجھنا بھی نہیں چاہتا۔ مجھے آپ سے کوئی مطلب نہیں..... میری اپنی حدود ہیں اور آپ کی اپنی..... آئی ایم سوری.....“ اس نے جان چھڑانے کے لیے قدم آگے بڑھائے۔

”آپ کیا سمجھتے ہیں اتنے بہت سے لوگوں کو ہرٹ کر کے آپ گاڈ کو خوش کر لیں گے۔ گاڈ آپ سے کبھی بھی خوش نہیں ہوگا..... جو لوگ اپنے جیسے لوگوں سے وعدے پورے نہیں کر سکتے وہ خدا سے کیا وعدہ پورا کریں گے۔“ وہ قدرے غصے سے بولی۔

”آپ میرے پیچھے کیوں پڑی ہیں جبکہ..... میں.....“ مایوسی کے سائے اس کے چہرے پر لہرانے لگے وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بے بسی سے بولا۔

نور ایک لمحے کو غصے سے اس نے اس کے چہرے پر یاسیت اور آنکھوں میں بے بسی کی لہر دیکھی تھی۔

”میں آپ کے کمرے میں کچھ دیر کے لیے آنا چاہتی ہوں۔ آپ سے پیشہ کر بات کرنا چاہتی ہوں.....“ اس نے اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے بنا کچھ کہے اس کے آگے چلنے لگا..... وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اسے اندر جانے کے لیے راستہ دیا۔ وہ کمرے میں رکھی ایک لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے تھیل سے گلاس اٹھا یا سنرل واٹر سے اسے بھرا اور اس کے آگے کر دیا۔

”تھینک یو.....“ اس نے خاموشی سے گلاس لے لیا۔ دونوں کافی دیر خاموش رہے۔

”بیدول کوئی اور بھی تو کر سکتا ہے..... سب لوگ میرے لیے ہی کیوں کوشش ہیں۔“ ہلا آخراں نے خود ہی سکوت توڑا۔

”آپ مجھے بہت بے ضرر شخص اور سچے انسان لگتے ہیں۔ میں حقیقت بتائے دیتی ہوں۔ میں آپ کی کلاس فیلو نہیں ہوں مگر کالج فیلو ضرور ہوں۔ آپ کی کلاس نے مجھے خصوصی طور پر آپ کے پاس بھیجا ہے اور بیدول آپ کے لیے ہی نکھوایا گیا ہے۔ کلاس میں کوئی بھی اس رول کو ٹھیک طرح سے پرفارم نہیں کر پائے گا۔ میں نے اسٹوڈنٹس پڑھا مگر اس کی ڈیمانڈ ہی آپ ہیں۔ میری ان کے ساتھ شرط بھی لگی ہے کہ آپ بیدول ضرور کریں گے..... اگر آپ نے بیدول نہ کیا تو میری بہت انسلف ہوگی..... اور پھر ہو سکتا ہے..... میں دوبارہ کالج نہ آؤں.....“ وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

”رینلی..... یو آر سو ہٹٹی.....“

”جی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اوہ..... آئی سی.....“ وہ قدرے مسکرایا۔ ”ٹھیک ہے کل میں آ جاؤں گا.....“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”تھینک یو..... آئی ایم رینلی گریٹ فل ٹو یو.....“ اس کی آواز میں خوشی کی کھٹک تھی۔

”اُس مائی پلیز۔۔۔۔۔“ وہ بھی مسکرا کر بولا۔

اگلی صبح وہ ہاسٹل سے باہر نکل رہا تھا۔ جب وہ اس کی طرف مسکراتی ہوئی آئی۔ ”آپ کے کلاس فیلوز آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔۔۔۔۔“

”کہاں ہیں سب۔۔۔۔۔؟“

”سب لوگ لائبریری میں بیٹھے ہیں۔“

”ٹھیک ہے تو ادھر ہی چلتے ہیں۔۔۔۔۔“ وہ پرسکون لہجے میں اعتماد سے بولا۔ جیسے ہی سب نے دونوں کو آتے دیکھا تو حیرت سے ایک

دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر نور کو ہنسنے لگا ہوں سے داد دی۔

”لو بھئی۔۔۔۔۔ میرا وعدہ تو پورا ہو گیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔۔۔۔۔“ نور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہم سب لوگ بھی ہال میں ہی چلتے ہیں۔۔۔۔۔ یہاں پر قیامت بھی نہیں ہو سکتی۔“ رملہ اٹھتے ہوئے بولی اور اس کے ساتھ سب لوگ ہی اٹھ گئے۔

”تم بھی ہماری ریہرسل دیکھنے آنا۔۔۔۔۔“ افشین نے کہا۔

”سوچوں گی۔۔۔۔۔“ وہ ذرا اسٹائل سے منہ بنا کر بولی تو ایک دم اس کی نظر ولیم کی طرف اٹھی۔ وہ ہنسنے لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھ کر

مسکرا دیا وہ چونک سی گئی اور جلدی سے افشین کی طرف دیکھنے لگی۔

”تمہیں اپنی ٹریٹ یاد ہے نا۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ ٹی بار میں۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ کہیں اور۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے اینول ڈے کے بعد۔۔۔۔۔ اور تمہیں بھی۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ مجھے بھی یاد ہے۔۔۔۔۔“ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔

ولیم اپنا رول پڑھنے لگا۔ اس کا رول ایک سلجھے ہوئے، حساس پرنس کا تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پادری بن جاتا ہے اور لڑکی غربت کے

باتوں تک آ کر نرن بن جاتی ہے۔۔۔۔۔ دونوں اپنی زندگی کا مشن نوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا چاہتے ہیں۔ اسٹ میں زیادہ زور، جذبات، کیفیات اور

ڈائیلوگوں پر تھا۔

”ٹھیک ہے مجھے سمجھا گئی ہے مگر نرن کا رول کون کرے گا؟“ ولیم نے اسکرپٹ پڑھتے ہوئے کہا۔

”حوریہ ہماری کلاس فیلو ہے۔۔۔۔۔ وہ نرن کا رول کرے گی۔۔۔۔۔ وہ ابھی آنے والی ہے۔“ رملہ نے اسے بتایا۔

”تو رکیوں نہیں۔۔۔۔۔“ ولیم کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”بھئی وہ ہماری کلاس فیلو نہیں۔۔۔۔۔“ افشین نے جلدی سے جواب دیا۔

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے بھی اس کے لیے کلاس فیلو بننا کون سا مشکل کام ہے۔۔۔۔۔“ ولیم مسکرا کر بولا۔

”ہاں..... مگر.....؟“ رملہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔

”میرے خیال میں یہ رول ان سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا کیونکہ اس میں زور، کیفیات اور جذبات پر ہے اور میں نے یہ مشاہدہ کیا ہے وہ اس میں کافی تیز ہیں۔“ وہ قدرے عجیبگی سے بولا۔

”ٹھیک ہے اسے بھی دیکھ لیں گے مگر پہلے خود یہ کو.....“ رملہ نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد خود یہ آئی خوبصورت سی نازک سی دہلی پتلی سفید یونیفارم میں۔ چاسر کی پرائز لیس کی طرح حسین و نازک نازنین..... وہ نٹن کے رول کے لیے ہر لحاظ سے فٹ لگتی تھی۔ اس کا ایکسٹری بہت اچھا تھا۔ مگر ڈائلاگ ڈلیوری اچھی نہیں تھی۔ جذبات الفاظ کے ساتھ میچ نہیں کر رہے تھے وہ ڈائلاگ گزیوں بول رہی تھی جیسے رٹے رٹائے جملے..... اور اس بات کو سب لوگ بہت محسوس کر رہے تھے۔ ولیم اور رملہ نے اس کے ساتھ بہت کوشش کی۔ ہر ڈائلاگ دلوں نے ادا کر کے بتایا مگر اس کی پک شارپ نہیں تھی۔

”میرا خیال ہے نور کو دیکھتے ہیں۔“ رملہ خود ہی بولی اور اسے بہت منت سماجت کر کے آمادہ کیا۔ واقعی اس کی ڈائلاگ ڈلیوری بہت اچھی تھی۔ ریہرسل شروع ہو چکی تھی اور سب لوگ بہت ڈوب کر کردار ادا کر رہے تھے۔ رملہ اور ڈاکر..... افشین اور اولیس..... دو کھلو کے کردار ادا کر رہے تھے اس کے علاوہ کچھ چھوٹے موٹے کردار تھے جو کلاس کے دوسرے لوگ کر رہے تھے۔

ریہرسل کرتے ہوئے سب لوگ بہت انجوائے کرتے۔ معمولی معمولی باتوں پر ہنسیوں کا دور چل پڑتا..... تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آرام کرنے بیٹھ جاتے..... پھر کیفے ٹیریا چل دیتے۔ بہت دنوں کے بعد ولیم اپنے آپ کو فریش محسوس کر رہا تھا۔ اس کا رول پرنس سے پادری کا تھا۔ سب لوگ اسے پرنس کہہ کر بلاتے..... اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت دنوں بعد وہ کھلی فضا میں..... سانس لے رہا ہو..... اتنے دنوں میٹ کے آگے بیٹھ بیٹھ کر اور بائیکل کے مختلف ورژنز پڑھ پڑھ کر اس کا ذہن تھک سا گیا تھا۔

”نور..... میں یہ رول صرف تمہارے لیے کر رہا ہوں۔“ کیفے ٹیریا میں بھاپ اڑاتی چائے کا سپ لیتے ہوئے اس نے اسے آہستہ سے کہا۔

”کیوں.....؟“ اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”تمہاری پرنس کے لیے..... اور گاڈ کو خوش کرنے کے لیے..... ورنہ میں قادر کے ساتھ کھڑا تھا اور وہ مجھ سے ناراض بھی ہیں۔ وہ کل سے میٹ پر مجھ سے بات بھی نہیں کر رہے..... لیکن میں انہیں متالوں گا۔ درکشائیں تو اگلے مہینے ہیں۔ معلوم نہیں قادر مجھے کیوں یہ رول نہیں کرنے دے رہے تھے..... لیکن جب میں نے تمہاری آنکھوں میں مایوسی دیکھی تو مجھے دکھ سا ہوا اور مجھے لگا کہ واقعی گاڈ مجھ سے ناراض ہو جائے گا..... اگر..... اگر تم ناراض ہو گئیں تو.....“ وہ مسکرا کر بولا۔

”تم اپنے فیصلوں میں بہت جلد باز لگتے ہو.....؟“

”ہاں..... شاید..... میں ایسا ہی ہوں..... اور اکثر میں اچانک کوئی اہم فیصلہ کرتا ہوں تو اس میں کامیاب بھی ہوتا ہوں.....“

”جیسا کہ رول کرنے کا.....؟“

”ہاں..... ممکن ہے..... اس میں بھی.....“

”پرنس تم میں اتنی الونفس کیوں ہے..... تم حقیقت میں بھی تو پادری نہیں بننا چاہتے.....؟“ نور کے سوال نے اسے چونکا دیا۔

”ہاں..... تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے..... قادر بھی چاہتے ہیں.....“

”اور تم.....؟“ نور حیرت سے اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

”شاید..... میں بھی.....“

”اس میں ”شاید“ کیوں ہے..... اس میں تمہارا اپنا ارادہ اور عزم ظاہر نہیں۔“

”پلیز اس پر بات مت کرو.....“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”جو مسئلے ڈسٹرب کریں ان کو پہلے ڈسکس کرنا چاہیے.....“

”اور جو زیادہ ڈسٹرب کریں ان کو حالات پر چھوڑ دینا چاہیے.....“

”ٹھیک ہے..... میں اس پر آئندہ بات نہیں کروں گی..... مگر میں اتنا جان گئی ہوں کہ یہ تمہارے دل کی آواز نہیں..... اور جب دل کچھ

کہے اور دماغ کچھ تو پھر زبردست تضاد جنم لیتا ہے..... تم حشر ہو جاؤ گے اور بکھر جاؤ گے..... اس لیے سوچ کچھ کر فیصلہ کرنا.....“ آئے نور نے اسے ہمدردی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”ٹھیک ہو.....“ وہ آہستہ سے بولا۔

وہ کالج سے ہاسٹل واپس آیا ہی تھا کہ قادراً گئے..... انھیں یوں اچانک دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا..... وہ کچھ خفا خفا سے لگ رہے تھے۔

”قادراً آپ.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ولیم تم نے میرے سمجھانے کے باوجود اسٹ میں حصہ لیا..... تمہیں ورکشاپ کے لیے ہوم ورک کرنا ہے۔ اور تم ان فضول، لغو کاموں

میں مصروف ہو گئے ہو۔ اس آل ریش.....“ وہ سخت غصے میں بولے۔

”قادراً ورکشاپ اگلے مہینے ہے اور یہ تو صرف کچھ دنوں کی بات ہے۔ میں دونوں کام آسانی سے کر سکتا ہوں۔ اسی لیے میں نے یہ رول

کرنا قبول کیا ہے.....؟“

”مائی سن..... تم پادری بن رہے ہو۔“ وہ سخت لہجے میں بولے۔

”آئی ایم سوری قادراً.....“

”اوکے..... مگر آئندہ خیال رکھنا۔“

”رائٹ قادراً.....“ وہ آہستہ سے بولا۔

قادر بنا کچھ کہے چلے گئے۔ قادر کا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ جب قادر پہلے ملتے تھے تو بہت محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے اس کے کندھے چھپتے تھے۔ اسے گلے لگاتے تھے اور اب قادر جب سے اس سے ناراض ہوئے تھے سیدھی طرح بات بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کے لہجے میں بھی تلخی ہوتی تھی اور آنکھوں میں غصہ۔ لنگھوں میں ترشی تھی اور حرکات و سکنات میں بھی وہ دھمکی سی محسوس کرتا وہ قادر سے یہ توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کا دل ٹوٹنے لگا تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ حساس واقع ہوا تھا۔ وہ لہجوں سے اندرونی احساسات و جذبات محسوس کرنے کا عادی تھا۔ مگر اس کے درمیان بہت کم شدید غصے کا اظہار ہوتا۔ وہ ہمیشہ ماسے بہت سوٹ ٹون میں بات کرتا۔ وہ سوچ میں اپنی عمر سے زیادہ پختہ اور پختہ تھا۔ وہ تو قاطب کے احساسات کو سمجھ کر بات کرنے کا عادی تھا۔ صرف قادر کی وجہ سے اس میں اور مماثل سرد جنگ چھڑ گئی تھی۔ مگر شدید تلخی کا تاہلہ کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ قادر کی طرف بھی ان کی محبت اور شفقت کی وجہ سے کھینچا چلا گیا تھا۔

قادر کی پریشانی کا یہ رخ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ یہی سوال اس کے ذہن میں بار بار ابھرتا کہ قادر اسے کیوں اتنا محدود رکھنا چاہتے ہیں کیوں اسے ہر کام سے روکنا چاہتے ہیں۔ وہ پائلٹ بننے کا خواب لے کر جوان ہوا تھا اور اس نے اپنے ذہن سے بہت مشکل سے اپنا یہ آئیڈیل کھرچا تھا۔ ورنہ جب تک مری میں رہا اس کے پاس ہر شکل اور سائز کے جہاز اور ان کے پسنرز ہوتے تھے کبھی وہ کاسٹر پائلٹ بننے کے خواب دیکھتا تو کبھی کمرشل۔ کبھی اپنے آپ کو آری یو نیٹارم میں دیکھتا تو کبھی پی آئی اے۔ اتنے سارے خواب۔ جو بچپن سے لے کر اب تک اس کے ساتھ لہو بہ لہو جوان ہوئے تھے اور ان سارے خوابوں کے ساتھ اس کے جذبات بھی اسی طرح پروان چڑھے تھے وہ سب قادر کے کہنے پر اسے اپنے دماغ کے ایک ایک خلیے سے خود کو چنے پڑے تھے اور یہ کس قدر مشکل تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کو بہت منایا تھا۔ بار بار سمجھایا تھا۔ اپنی زندگی سے خواہشات کے دائرے اور خوشیوں کو محدود کر دیا تھا مگر قادر اس کے احساسات کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ اسکت میں رول کرنے سے کسی کا بھی کوئی نقصان نہیں تھا۔ اس نے ہر زاویے سے اس بات پر سوچا تھا مگر قادر کی ناراضی سمجھ سے باہر تھی۔

جیسے جیسے دن قریب آ رہے تھے۔ تیاریاں عروج پر تھیں۔ پورے کالج کو ڈیکورٹ کیا جا رہا تھا۔ بہت سی کلاسز کے طلباء نے مختلف اسکلز اور پروگرامز ترتیب دیے تھے۔ کچھ حراجیہ کچھ سنجیدہ۔ اساتذہ بھی ان کی بھرپور رہنمائی کر رہے تھے۔ ملبوسات بخوائے جا رہے تھے۔ ایک ہنگامہ سا رہا تھا۔ پروگرام کی کامیابی کی ٹینشن بھی تھی اور تفریح کا زبردست موقع بھی تھا۔ اس اسکت کی وجہ سے سب لوگ ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے تھے کہ ایک دوسرے کے احساسات کو بھی سمجھنا شروع ہو گئے تھے۔ ولیم کو کہ سمجھدار اور موقع شناس تھا مگر اچانک فیصلے کرنے کا عادی تھا۔ شاید یہ عادت اس نے اپنی ماسے ورٹے میں پائی تھی۔ نور ہر بات کو بہت سوچ سوچ کر فیصلہ کرنے کی قائل تھی لیکن کسی حد تک وہ ضدی بھی واقع ہوئی تھی۔ رملہ تھوڑی سی خود پسند تھی اور دشمن تو سیدھی سادی ہر بات ماننے والی لڑکی تھی۔ اولیس اور ڈاکٹر میں بہت دوستی تھی۔ ڈاکٹر کی اپنی کوئی رائے نہ تھی جو اولیس کہتا وہی ڈاکٹر پر کرنا لازم ہوتا۔ اولیس کی ہر بات میں ہاں میں ہاں ملانا تو ڈاکٹر پر فرض تھا۔ سب لوگ ڈاکٹر کو چھیڑتے تو وہ مسکرا کر اولیس کی طرف دیکھتا۔ اس کا اولیس کی طرف مسکرا کر دیکھنے کا اسٹائل سب لوگ بہت انجوائے کرتے۔

فلکشن والے دن سب لوگوں نے اپنے اپنے گھر سے کسی نہ کسی کو انوائسٹ کیا تھا دیسے بھی اینول ڈے تھا۔ پرنس کا آنا تو لازمی سمجھا جاتا

ہے مگر ولیم کے گھر سے کوئی نہیں آیا۔ اس نے ماما کو انوائٹ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ پچھلی دفعہ جب وہ ماما سے مل کر آیا تھا تو ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اور اب مصروفیت کی وجہ سے نہ تو انھیں ملے جاسکا اور نہ ہی فون کر سکا اس کا پروگرام تھا کہ فنکشن کیا گلے دن وہ ماما سے ملنے جائے گا۔ شہر کی انتظامیہ کے بڑے بڑے لوگ مدعو تھے۔ حیدر اور شہلا بھی مدعو تھے مگر شہلا نہ جاسکی اور صرف حیدر کو ہی جانا پڑا۔ ملک منصور بھی مدعو تھا۔ وہ شہزاد کے ساتھ گیا چونکہ ایکشنز قریب تھے اس لیے عوامی رابطہ مہم کے سلسلے میں ایسے پروگرامز میں شرکت سیاستدانوں کے لیے ہمیشہ فائدہ مند رہتی ہے۔ اسی بات کے پیش نظر وہ اسٹوڈنٹس کے اس فنکشن میں گیا مگر اس سے قبل اس کی جگہ شہزاد ہی شرکت کرتی تھی۔ حیدر اور منصور نے ایک دوسرے کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

ولیم اور آئے نور کی ایکٹنگ اور ان کے اسکٹ Broken Hearts کو سب لوگوں نے بے حد پسند کیا خصوصی طور پر ولیم کی ایکٹنگ اور اس کے ایکسپنس کو بہت سراہا گیا۔ ہر ایک کی زبان پر پرنس ولیم کا نام تھا۔ پڑھائی کے علاوہ ایکٹنگ میں بھی اسے سرٹیفکیٹس اور میڈلز دیے گئے۔ سب لوگ بہت خوش تھے اور فنکشن کے بعد سب لوگ افشین کے گروا سے پارٹی کا وعدہ یا د دلانے کے لیے جمع ہو گئے۔

”بھئی چینیوں کے بعد پروگرام رکھ لو.....“ افشین نے جان چھڑانا چاہی۔

”نہیں..... پارٹی آج ہی چاہیے اور وہ بھی کے ایف سی میں.....“

”تھوڑی سی رعایت دے دو.....“ افشین منمنائی۔

”ہم کچھ نہیں مننا چاہتے.....“ آئے نور بولی۔

”لیکن ولیم اور آئے نور پر بھی تو پارٹی بنتی ہے..... ان لوگوں کو تو خصوصی انعامات ملے ہیں۔“ رملہ نے ٹانگ لگایا۔

”ہاں..... ہاں..... یہ تو ہم بھول ہی گئے۔“ اوئیس بولا تو ڈاکر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

”ہماری کوئی کمیٹی نہیں تھی..... ویسے بھی میرے راتے آج کے بعد آپ لوگوں سے جدا ہیں..... میں تو بس کرسی میں آ گیا اور رول کر

دیا اور نہ..... میں تو..... خیر..... پھر سہی“ اس نے آئے نور کی طرف مسکراتے ہوئے ذرا معنی الفاظ میں کہا۔

”اوہو..... یہ کوئی رومانس تو نہیں شروع ہو گیا.....؟“ افشین نے سادگی سے کہا تو دونوں گڑبڑا گئے۔

”واٹ مان سینس..... اب میں تمہاری کلاس میں کبھی نہیں آؤں گی پہلے ہی میرے کلاس فیلوز مجھ سے ناراض ہیں۔ میں بھی کرسی میں آ

گئی..... ورنہ.....“ آئے نور مصنوعی فکلی سے بولی۔

”ہائی داوے..... دونوں ایک دوسرے کی کرسی میں آئے ہیں تو پھر ٹریٹ کیسی.....؟“ اوئیس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیوں..... کیوں..... اتنا کام کیا ہے۔ میں نے تمہارے لیے۔ ٹریٹ کا وعدہ ہوا تھا کہ نہیں یاد رکھو آئندہ بھی تم لوگوں کو مجھ سے کام پڑ

سکتا ہے۔“ آئے نور نے گویا دھکی دی۔

”او کے بھئی..... قہقہہ بھر دیری..... میرے پاس جتنے پیسے ہیں ان میں جو کچھ انجوائے کر سکتے ہو کر لو.....“

”چلو سب لوگ لٹالو..... سوائے میرے.....“ آئے نور نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اور میرے علاوہ بھی..... کیونکہ میرے پاس تھوڑے سے پیسے ہیں اور یہ اس ماہ کا خرچ ہے میں ماما کو مزید پیسوں کے لیے تنگ نہیں کر سکتا..... اور ویسے بھی یہ وعدہ میری موجودگی میں نہیں ہوا تھا۔ میں تو تم لوگوں کا گیسٹ ہوں.....“ ولیم نے صاف گوئی سے کہا۔

”ٹھیک ہے بھی..... کل کا پروگرام رکھ لو آج تو بہت تھک گئے ہیں۔ کل چلیں گے.....“ رملہ نے رائے دی۔

”اوکے..... کل سب تیار رہنا اور چھٹی کوئی نہ کرے.....“ آئے لور نے گویا وارننگ دی سب مسکراتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

ولیم ہاسٹل لوٹا تو اس کے لیے فون کال تھی.....

”ولیم..... آپ کے لیے کئی دفعہ فون آچکا ہے مگر آپ فٹنشن میں بڑی تھے۔ اس لیے کوئی کال نہیں ہو سکا۔“ آپریٹر نے اسے بتایا۔

”کس کا فون ہے.....؟“ ولیم نے قدرے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

”ورکنگ ویمن ہاسٹ سے مس افضل بات کر رہی ہیں.....“

”اوکے.....“ اس نے فون پکڑتے ہوئے کہا۔

”ہیلاؤ آئی خیریت تو ہے نا؟“

”ہیٹا آپ کی ماما بہت پیار ہیں اور اسپتال میں ہیں.....“ وہ اسے ایڈریس بتانے لگیں۔

”میں ابھی آتا ہوں.....“ اس نے فون رکھتے ہوئے کہا اور وارڈن کو بتا کر چلا گیا۔

اسپتال میں مس افضل کے علاوہ ایک دواور خواتین تھیں۔ ”آئی، ماما کو کیا ہوا ہے؟“ اس نے پریشانی میں مس افضل سے پوچھا۔

”ہیٹا بہت دنوں سے وہ شدید ڈپریشن کا شکار تھیں اور پھر بخار ہونا شروع ہو گیا اور آج تو حد ہی ہو گئی۔ چلتے چلتے اچانک گر پڑیں۔ بی بی اس قدر بائی ہو گیا کہ ناک سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ شاید برین ہمرج.....“

”اوہ نو.....“ وہ مایوسی سے بولا اور رونا شروع ہو گیا۔

”حوصلہ رکھو ہیٹا.....“ مس افضل نے اسے پیار سے سمجھایا۔

”مجھے لگتا ہے کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے..... بھولی دفعہ میں آیا تھا تو ماما مجھ سے ناراض تھیں شاید یہ ڈپریشن اسی وجہ سے ہے.....“ وہ بہت گھٹی محسوس کر رہا تھا۔

”نہیں ہیٹا..... تم یونہی غل مت کرو..... ایسی کوئی بات نہیں.....“ مس افضل حقیقت جانتی تھیں اس لیے اسے سمجھا رہی تھیں۔

”آئی لو آئی..... یہ میری وجہ سے ہی ہوا ہے..... آئی لومما..... اینڈ شی لوزی مور دین می..... وہ یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتیں..... اسی لیے یہ سب ہوا ہے..... آپ نہیں جانتی نا.....“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”ہیٹا..... آپ اتنا محسوس نہ کرو..... سب ٹھیک ہو جائے گا.....“ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکیں۔ وہ اسے حقیقت بتانا چاہتی تھیں مگر کچھ نہ بتا سکیں۔ کہاں سے شروع کرتی اور کیا بتاتی..... انھیں تو خود بھی صحیح طرح معلوم نہ تھا کہ مس شہلا حیدر نے کیونکر ان کی انسلٹ کی تھی۔

”جینا آپ کے پاس کچھ پیسے ہیں.....“ مس افضل نے رازداری سے پوچھا۔

”کس..... کس لیے..... آئی.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ڈاکٹر کچھ آپریشن کی بات کر رہے تھے ابھی بلیئر تو نہیں..... مگر ممکن ہے.....“

”میرے پاس تو صرف پاکٹ منی ہوتی ہے..... ماما کے پاس ہی..... معلوم نہیں ان کے پاس بھی کچھ ہے کہ نہیں.....“ ولیم افسردگی سے بولا۔

”اچھا تم پریشان نہ ہو..... میں کچھ کرتی ہوں.....“ انھوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

وہ ساری رات ماں کے پاس بیٹھا رہا۔ ان کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ لیکن ڈاکٹر مطمئن نہیں تھے اور انھوں نے کچھ ٹیسٹ کروانے کو کہا تھا۔ وہ بھی لگرمند ہو گیا..... وہ اب ہاسٹل شفٹ ہو چکی تھی۔ مس افضل ان کی بہت دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ وہ بھی ہاسٹل پہنچا تو سب لوگ اسے ناراض ملے مگر جب اس کی ماما کا سنا تو سب خاموش ہو گئے۔ پھر کسی نے بھی ٹریٹ کی بات نہ کی وہ اندر ہی اندر بہت پریشان تھا اور بہت چپ چاپ بھی۔ آئے نور اس کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

”ولیم تم اس قدر پریشان کیوں ہو..... کیا تم اپنی پریشانی مجھ سے شیئر نہیں کرو گے.....“ آئے نور نے اس سے ہاسٹل جا کر پوچھا۔

”نہیں.....“ وہ ساٹ لہجے میں بولا۔

”کیوں.....؟“

”اس کا کوئی فائدہ نہیں.....“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”ولیم ہم بہت سے کام بغیر قاعدے کے بھی تو کرتے ہیں.....“

”مثلاً.....“

”مثلاً..... مثلاً..... میں جانتی ہوں تمہارے اور میرے راتے جدا ہیں۔ مجھے سب کچھ اچھی طرح معلوم ہے مگر میں بے بس ہوں۔

میرے دل میں تمہارے لیے ایسا جذبہ بیدار ہو چکا ہے جو میرے لیے بہت قیمتی اور شاید تمہارے لیے بہت ارزاں ہو..... میں جانتی ہوں یہ سب بے فائدہ ہے مگر میں ان خوبصورت یادوں کو..... ان لہجوں کو اپنا خوبصورت ماضی بنانا چاہتی ہوں ایسا ماضی کہ جب مستقبل میں کبھی تھک جاؤں تو اس کی کھڑکی کھول کر تازہ ہوا کے جھونکوں سے تازہ دم ہو سکوں.....“ آئے نور کی آنکھوں میں دکھ بھی تھا، شگفتگی بھی اور ایک چمک بھی۔“

”آئے نور..... تم بھی..... کیا تم بھی ایسا محسوس کرنے لگی ہو..... میں تو سمجھا تھا کہ یہ سب میرا دہم ہے..... کیا ہم دونوں..... اوہ گاڈ.....“

ولیم کے لہجے میں ہلاکی حیرت تھی۔

”ولیم میں اپنے آپ کو بہت سمجھاتی ہوں کہ تم اور میں..... لیکن میں کیا کروں کہ میری حالت اس پھلکی کی سی ہے جو جانتی ہے کہ خشکی پر موت اس کا مقدر ہے مگر خشکی پر جانے کی اس کی تڑپ شدید تر ہوتی جا رہی ہے ولیم وہ خشکی کا جزیرہ تم ہو..... میں جانتی ہوں تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں..... تمہاری منزل سے تو میں پہلے دن سے آگاہ ہوں..... لیکن میں بہت بے بس ہوں..... معلوم نہیں تمہارا اور میرا تعلق کیسا ہے اور کیا ہوگا.....“

چاہے ہمارا انجام کچھ بھی ہو مگر میرا ہر قدم تمہارے ساتھ اٹھے گا۔۔۔۔۔ تم اپنے ہر دکہ سکھ میں مجھے اپنا شریک پاؤ گے۔۔۔ کیا اب بھی نہیں بتاؤ گے کہ قسمیں کیا پریشانی ہے؟“ آئے نور کی آنکھوں میں نمی سی حیر نے لگی جس سے اس کے اندر کا خلوص جھانک رہا تھا۔

”نور تم نے مجھے اور پریشان کر دیا ہے۔۔۔۔۔“ وہ ایک ہنسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”میں تمہاری ہر پریشانی شیر کرنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ آدرا کر تو دیکھو۔۔۔۔۔“

”مما بہت بیمار ہیں اور ڈاکٹروں نے ان کے کچھ ٹیسٹ کروانے کو کہا ہے۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔“ ولیم رک سا گیا۔

”مگر کیا۔۔۔۔۔؟“

”نور میں یہ صرف قسمیں بتا رہا ہوں۔ پلیز اسے راز میں رکھنا۔۔۔۔۔“

”ولیم۔۔۔۔۔ مجھے آئندہ یہ الفاظ مت کہنا۔۔۔۔۔ یہ میری تو جین ہوگی۔“

”اوکے۔۔۔۔۔ ہمارے پاس اتنے۔۔۔۔۔ آئی مین اتنے ریورسز نہیں کہ۔۔۔۔۔“

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔۔۔۔۔ میرے ایک ملنے والے انکل ادھر ہی جا ب کرتے ہیں۔ تم بس فکر مت کرو۔۔۔۔۔ مجھے بتا دینا۔ میں

خود آئی کو لے کر چلوں گی اور دیکھو میرے سامنے کبھی ہمت نہ ہارنا۔۔۔۔۔ مجھے بولڈ اور ڈرلڑ کے اچھے لگتے ہیں۔۔۔۔۔ زندگی میں کچھ بھی مشکل نہیں سوائے

ان راستوں کے جہاں ہمیں محسوس ہو کہ خدا ہمارے ساتھ نہیں۔۔۔۔۔ تم مجھے بس انکار کرو یا میں قسمیں بھی چک کر لوں گی اور آئی کو بھی۔۔۔۔۔“ وہ اسے

حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔

”تھینک یو۔۔۔۔۔“ وہ زلمی مسکراہٹ سے بولا۔ اس لمحے اس کا دل کرچی کرچی ہود ہا تھا۔ اس نے سارا بچپن محرومیوں میں گزارا تھا ماما سے

کبھی بے جا ضد نہیں کی تھی وہ جانتا تھا کہ ماما کے پاس کبھی بھی اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ وہ اپنی ضد منا سکتا۔ اس نے تو ضد ہی کرنا چھوڑ دی تھی اور

اب ماما کے علاج کے لیے بھی وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ابھی وہ اس قابل ہی نہیں ہوا تھا۔ ایک لمحے کو قادر اس کے ذہن میں آئے مگر دل نہیں مانتا تھا۔

قادر کے روپے نے اسے قدرے بخیر کر دیا تھا۔

ورکشاپ میں صرف ایک دن باقی تھا اور قادر اسے صبح سویرے ملنے ہاسٹل آئے۔ وہ سخت غصے میں تھے۔

”ولیم تم اس قدر ریئر لیس ہو گئے ہو۔۔۔۔۔ قسمیں ذرا بھی خیال نہیں کہ قسمیں ورکشاپ میں شرکت کرنی ہے اور تم نے مجھ سے کوئی کوئی ٹیکٹ

نہیں کیا۔“

”آئی ایم سوری قادر۔۔۔۔۔ میری مما بہت بیمار تھیں اور مجھے ان کے کچھ خاص ٹیسٹ کروانے ہیں۔“

”وہاٹ ڈو یو مین۔۔۔۔۔ تم ورکشاپ میں شرکت نہیں کرو گے۔۔۔۔۔“

”نہیں قادر۔۔۔۔۔“ اس نے اچانک اپنا فیصلہ انھیں سنایا۔

”وہاٹ نان سنس۔۔۔۔۔ تم جانتے ہو تمہارا فیجو چ کیا ہے۔۔۔۔۔؟“

”تو قادر..... میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میری ماں بہت بیمار ہے اور انہیں اس وقت میری ضرورت ہے.....“

”ڈونٹ بی سلی..... کیا تم جاننے ہو تمہارا کتنا بڑا نقصان ہوگا.....؟“

”تو قادر..... لیکن اگر ممّا کو کچھ ہو گیا تو اس سے بڑا نقصان اور میرے لیے کیا ہوگا.....؟“

ولیم تم اس قدر بدل گئے ہو..... کیا اس لیے میں تمہیں لاہور لایا تھا؟“

”معلوم نہیں میں بدلا ہوں کہ نہیں مگر آپ کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے۔ قادر اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا

کرتے.....؟“ اس نے استغلامیہ لگا ہوں سے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”میں..... میں درکشاپ میں شرکت کرتا.....“ وہ قدرے گھبراہٹ میں جھنجھلا کر بولے۔

”سوری قادر مجھ میں نہ تو اتنا اسٹیمنا ہے اور نہ اتنی سوجھ بوجھ۔“

”ولیم..... یو.....“ قادر کو اس کی بات پر سخت غصہ آیا اور وہ غصے سے مٹھیاں پھینچنے چلے گئے۔

وہ مطمئن تھا اس نے جو بھی فیصلہ کیا تھا ٹھیک کیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لورائی گئی اور اس نے اسے ساری بات بتائی۔

”تم نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے..... ظاہر ہے آئی کو اس وقت صرف اور صرف تمہاری ضرورت ہے یہ بتاؤ ٹیسٹ کب کروانے ہیں۔ میں نے

بات کر لی ہے۔ انکل نے بہت تسلی دی ہے فکر کی کوئی بات نہیں، میں کب آؤں.....؟“

”کل چلیں گے..... مگر ابھی تم کہاں جا رہی ہو.....؟“

”کہیں نہیں..... یونی..... مارکیٹ جا رہی تھی تو تمہاری طرف آگئی۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو، کیا کہیں جانا ہے.....؟“

”ہاں..... میں اس وقت شدید اسٹریس میں ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے باہر جانا چاہتا ہوں..... تمہارے ساتھ.....“

”ٹھیک ہے..... چلو.....“

وہ آہستہ آہستہ رائیو کرتی ہوئی نمبر کے پاس سے گزر رہی تھی۔ شدید ٹھنڈ اور دھند نے ارد گرد کو اور بھی خوبصورت بنا رکھا تھا نمبر کے بچ پانی

سے بھاپ سی اڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی..... دونوں خاموش تھے۔

”ولیم کیا تم قادر کی وجہ سے پریشان ہو.....؟“ ہالا خراس نے پوچھا۔ وہ میٹ کے ساتھ سرٹکائے مسلسل باہر دیکھ رہا تھا اور کچھ سوچ رہا تھا۔

”ولیم میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں.....؟“

”کیا.....؟“ اس نے چہ نکتے ہوئے پوچھا۔

”تم اس قدر پریشان کیوں ہو.....؟“

”نور میں نے ساری زندگی پریشانیاں ہی تو دیکھی ہیں مگر کبھی ان کو اپنے اوپر طاری نہیں کیا مگر اب مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے میں

جکڑا جا رہا ہوں..... میرا دل دو مانع اور روح سخت اذیت میں ہیں..... سمجھ نہیں آ رہا مجھ سے کہاں کہاں غلطیاں ہوئی ہیں۔“

”تم کیوں ایسا محسوس کر رہے ہو.....؟“

”معلوم نہیں..... مگر دل پر ایک بوجھ سا ہے۔ تمہیں معلوم ہے ماما میری وجہ سے بیمار ہوئی ہیں، قادر بھی مجھ سے ناراض ہیں اور تم.....“

”تم.....“

”ولیم میں تو تم سے ناراض نہیں.....“ اس نے گاڑی کو ایک دم بریک لگاتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں..... مگر میں تمہارے بارے میں بھی سوچ سوچ کر پریشان ہوتا ہوں۔“

”تم کیوں میرے بارے میں سوچتے ہو..... جبکہ میں جانتی ہوں کہ تمہارے اور میرے راستے کبھی بھی مل نہیں پائیں گے مگر اس سڑک

اور نہر کی طرح ہم دونوں ساتھ ساتھ چلیں گے..... میری جانب سے اپنا ذہن پر سکون کر لو..... مجھے تو تم سے کوئی شکوہ نہیں۔ مجھے تو صرف اور صرف تم سے بے غرض محبت ہے..... اور ضروری نہیں کہ ہر محبت اپنا حق بھی وصول کرے.....“ وہ سڑکوں لہجے میں بولی۔

”مگر میں تو لمحہ بہ لمحہ خطر ڈھور رہا ہوں۔ تم نے تو اپنے آپ کو سمجھا لیا ہے مگر میں..... کس طرح.....؟“

”ولیم..... میری ایک بات یاد رکھنا مجھے وضاحتیں دینے والے لوگ سخت ناپسند ہیں۔ اپنے آپ کو مضبوط بناؤ۔ تم جو بات کہو ٹھوس لہجے

میں کہو تمہارے لہجے میں مایوسی مجھے طعنے دلاتی ہے۔ میں نے زندگی سے ہارنا نہیں سیکھا مگر میں نے حقیقت سے بھی آنکھیں نہیں چرائیں۔ میں جانتی ہوں میرا اور تمہارا تعلق چاند اور چکور جیسا ہے، جو کبھی نہیں مل سکتے مگر کیا چکور چاند کی محبت میں اس کی طرف پرواز کرنا چھوڑ دیتا ہے..... جبکہ وہ جانتا

ہے کہ وہ کبھی بھی اس کو نہیں پاسکے گا..... وہ ہار نہیں مانتا مگر موت قبول کر لیتا ہے..... میں تمہاری طرف بڑھی ہوں..... جانتی ہوں کہ تم میرا عقیدہ نہیں۔

مگر..... مگر ایک امید میرے اندر ہے اور وہ مجھے ہارنے نہیں دیتی..... میرے سامنے اپنے بکھرے کی باتیں کبھی بھی نہ کرنا ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی.....“ اس نے گاڑی کو ایک دم ریس دی۔

ولیم اس کی باتوں سے گڑبڑا گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ نور یوں بکڑ جائے گی۔ ”آئی ایم سوری.....“

”تو سوری..... ایسے الفاظ تمہارے پاس بہت زیادہ ہیں ان کو یوں میرے سامنے کثرت سے استعمال مت کیا کرو..... مجھے ڈھیٹ قسم

کے سخت جان لوگ پسند ہیں۔“

وہ مسکرا کر بولی۔

”مجھے لسٹ بنا کر بتا دو کہ تمہیں کس کس قسم کے لوگ پسند ہیں میں دیباہی بننے کی کوشش کروں گا.....“ وہ بھی مسکرا کر بولا۔

”گڈ..... زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا کرو..... اگر پریشانی ہے تو اس کو بولڈ لی فیس کرو..... یوں منہ لٹکائے بھٹوں بننے

سے فائدہ..... ہاں کھٹول ہاتھ میں ہو تو خیرات مل سکتی ہے ورنہ دل ہی کڑھتا رہے گا اور اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔“ وہ کھٹکھٹا کر ہنس دی۔ ”اب

بولو..... کچھ کھاؤ گے.....“

”ہاں..... کافی پیوں گا..... مگر آج صحت میں کروں گا۔“

”او کے..... ایز بوش..... میرے پاس کون سے ڈالرز ہیں..... خوشی سے کیجئے.....“ اس نے ایک اوسط درجے کے ریسٹوران کے سامنے گاڑی پارک کی اور دونوں کافی پیئے اندر چلے گئے۔

تم کتنی بڑی نعمت ہو..... وہ کافی کے سپ لیتے ہوئے سوچ رہا تھا اور نہ چند لمحے پہلے وہ کتنا ڈسٹرب تھا اور اب بہت حد تک اپنے آپ کو نارمل محسوس کر رہا تھا۔

”ولیم جس دن تم چرچ جوائن کرو گے..... وہ ہماری ملاقات کا آخری دن ہوگا..... میں نے یہ سوچ لیا ہے مسٹر..... خیر چھوڑو.....“

”بات پوری کرو.....“ وہ ایک دم ٹھنکا۔

”اس بات سے تمہارا کوئی کنسرن نہیں..... جس کا تم سے کنسرن تھا وہ میں نے مکمل کر دی ہے۔“

”نور تم بہت مختلف لڑکی ہو اور بہت مختلف باتیں کرتی ہو۔ تم مجھے اکثر چوکا دیتی ہو.....“

”اس لیے کہ مجھے چوکنا اور چوکنا اچھا لگتا ہے.....“

”تم ایسی کیوں ہو.....؟“

”کیسی.....؟“ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”اب بخومت.....“

”ٹھیک ہے..... تو تم بٹاؤ مت.....“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”نور.....“ وہ غصے میں جھنجھلائے لگا۔

”ہاں..... پرنس.....“ دونوں مسکرا دیے۔

”اب بولو..... کہاں چلو گے.....؟“

”مجھے ماما کے پاس ڈراپ کر دو۔“

”رائٹ سر.....“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

اسے ورلک ویمین ہاسٹل ڈراپ کرنے کے بعد وہ کل دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی اور وہ اس کے بارے میں سوچتا رہ گیا مگر اب

اس سوچ میں مایوسی نہیں تھی۔ بہت تھی اور حوصلہ تھا۔



شہلا کا باپ کے ساتھ تھوڑا ابھی تک برقرار تھا۔ وہ ہمہ انداز میں باپ کے رویے، اس کی حرکات و سکنات، ان کی فون پر باتوں کو مشکوک انداز میں دیکھنے کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ شک کا بیج آہستہ آہستہ نشوونما پاتا جا رہا تھا گوکہ حیدر نے مسز پیٹر کے ساتھ ہر طرح کا رابطہ منقطع کر دیا تھا مگر وہ شہلا کو مطمئن نہیں کر پایا تھا۔ دونوں کے درمیان ایک خلیج تھی جو بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ حیدر بھی بس ضرورت کے تحت اس سے بات چیت کرتا

اور وہ بھی اسے زیادہ سے زیادہ نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی۔ انہی دنوں شہلا کے خیال سے اس کی خالہ کے بیٹے اسد علی شاہ کا رشتہ آگیا۔ اسد ایم بی اے کرنے کے بعد مزید پڑھائی کے لیے کینیڈا گیا تھا اور اب پڑھائی مکمل کرنے کے بعد وہ واپس آ رہا تھا۔ اس لیے اس کی ماں اس کے آتے ہی اس کی شادی کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ لوگ سب حویلی آرہے تھے۔ حیدر نے بھی شہلا کے ساتھ وہاں جانے کا پروگرام بنایا۔

”پاپا یا آپ کو اچانک میری شادی کا خیال کیسے آگیا.....؟“ وہ حیدر سے اسد علی شاہ کے بارے میں سن کر چکھے انداز میں بولی۔

”اس لیے کہ رشتہ انھوں نے اب مانگا ہے..... اگر وہ پہلے مانگتے تو میں پہلے ہاں کر دیتا۔“

”اس کا مطلب ہے آپ اپنے طور پر فیصلہ کر چکے ہیں اور اگر میں انکار کروں تو.....؟“ اس کی نظروں میں معنی خیز استفہام تھا۔

”تمہیں انکار کرنے کا پورا حق ہے.....“ وہ مطمئن لہجے میں بولا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ دونوں گاؤں پہنچے تو لوگ ان کے استقبال کے لیے

کھڑے تھے۔ بوڑھے اور جوان آگے بڑھ کر حیدر سے ہاتھ ملارہے تھے اور انھیں چوم رہے تھے۔ بوڑھی عورتیں شہلا کے سر پر پیار بھیر رہی تھیں۔ حویلی میں ایک دم شور مچا رہا تھا۔ شفق اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ جب سے وہ حویلی آئی تھی وہ بہت مطمئن اور خوش تھی۔ یہاں ہر طرح کا آرام اور تحفظ تھا۔ وہ بہت بے سکون تھی۔ اس کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا وہ کمرے سے باہر نکلی تو نوکروں کی ادھر ادھر دوڑی لگی تھی۔ اس نے حیرانی سے ایک نوکرانی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ حیدر شاہ اور شہلا بی بی آئے ہیں۔ وہ ان سے اسی وقت ملنا چاہتی تھی مگر بشری آپا نے اسے منع کر دیا جو

پوری حویلی کی مگران اور حویلی کے سب سے پرانے خادم رحیم بابا کی بیٹی تھی۔ بشری آپا اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ حویلی کے ساتھ مسلک ایک

چھوٹے سے گھر میں رہتی مگر سارا دن وہ حویلی کے کاموں میں گزارتی تھی ہر روز کوئی نہ کوئی شہر سے حویلی آیا ہی رہتا۔ اس نے نوکر چاکر اناج اور

جانوروں کی دیکھ بھال کے علاوہ ہر نئے مسئلے سے حیدر کو آگاہی بشری آپا کی ہی ذمہ داری تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کی نرم دل خاتون تھی شفق کے ساتھ بھی وہ

بہت محبت سے پیش آتیں۔ سب لوگ انھیں آپا ہی کہہ کر بلاتے تھے۔ بشری آپا کے کہنے پر وہ رک گئی۔

”مگر آپا میں ان سے ملنے کب جاؤں گی.....؟“ وہ قدرے بے صبری سے بولی۔

”وہ آرام کر لیں۔ کھانا دانا کھالیں اس کے بعد.....“

”ٹھیک ہے..... پھر آپ مجھے ان سے ضرور ملوائیے گا.....“

”اچھا بابا..... تم اور اس کیوں ہو رہی ہو..... وہ ادھر ہی ہیں۔ تم سے مل کر ہی جائیں گے۔“

”آپا ان کے آنے پر ہر دلع بوجھ کر روٹی اور گہما گہما بھی ہو جاتی ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... اور نہیں تو کیا۔ وہ گاؤں کی بڑی سرکار ہیں۔ ان کے آنے سے تو گاؤں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے.....“

”اور شہلا بی بی..... وہ کیسی ہیں.....؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”بہت سوتی..... بہت اچھی..... جیسا باپ ویسی بیٹی..... اللہ ان دونوں کو لمبی حیات دے دوںوں ہی بہت اچھے ہیں۔ غریب غربا کے تو مائی

”یہ لوگ یونہی اچانک گاؤں آتے ہیں.....“ اس نے پھر سوال کیا۔

”ہاں..... اور نہیں تو کیا، ان کا اپنا گھر بار ہے جب دل چاہتا ہے آ جاتے ہیں۔ ان کو بھلا کسی سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اچھا اب میں باورچی خانے میں جا کر انتظام وغیرہ دیکھوں۔“ وہ چادر سر پر اوڑھتے ہوئے یوٹیس۔

رات گئے تک وہ دستک رہی مگر کوئی بھی اسے بلانے نہ آیا اور نہ شہلا اس طرف آئی۔ اگلے دن صبح سویرے وہ پھر بشریٰ آ پا کے پاس کچن میں چلی گئی۔

”آپ آپ نے تو کہا تھا کہ میں رات کو ان سے مل سکتی ہوں مگر آپ نے مجھے بلا یا نہیں.....“

”ہاں..... کہا تو تھا مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ لوگ کس ارادے سے آئے ہیں.....؟“

”کیا مطلب..... کس ارادے سے؟“

”ارے بھئی..... شہلا بی بی کے رشتے کے سلسلے میں۔ ان کے خیال سے آج لوگ ادھر اکٹھے ہو رہے ہیں اور آج بھی سب بہت معروف ہیں۔“

”کیا شہلا بی بی کی شادی ہو رہی ہے.....؟“

”معلوم نہیں..... ابھی تو رشتے کے لیے آرہے ہیں۔ آگے کیا ہوتا ہے خدای بہتر جانتا ہے۔“

”کیا شہلا بی بی خوش ہیں.....؟“

”ہاں..... کچھا کھڑی اکھڑی سی لگ رہی ہیں۔ اس سے پہلے تو کبھی بھی وہ ایسی نہیں لگیں۔ معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے.....“

”رشتہ پسند نہیں ہوگا.....“

”اؤںہوں..... ایسی بات بھول کر بھی نہ کرنا۔ اس خاندان میں ایسی باتیں نہیں ہوتیں۔ ایسی آزاد باتیں وہ شہر میں ہی چھوڑ آتے ہیں۔ اگر

پسند نہ ہوتا تو وہ گاؤں نہ آتے، بات کچھ اور ہے۔ مجھے تو وہ کچھ حیدر سائیں سے ناراض لگی ہے۔ اللہ بہتر کرے.....“ وہ کچن میں ادھر سے ادھر مسلسل چکر لگا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ہاتھ بھی کر رہی تھیں۔

”تم جا کر آرام کرو..... جیسے ہی وہ مجھے فارغ نظر آئے میں تمہیں بلاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے آپا.....“ وہ بے دلی سے اٹھ کر چلی گئی۔

وہ پہر تک اور مہمان آ گئے۔ شہلا کی خالہ، خالو اور ان کے عزیز واقارب سب اکٹھے ہو کر حیدر سے شہلا کا ہاتھ مانگنے آئے تھے۔ حیدر نے

پھر شہلا سے پوچھا۔

”ٹھیک ہے یا چھپے آپ مناسب سمجھیں اور ویسے بھی اب ہمارے حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ میرا شادی کر لینا ہی بہتر ہے۔“

”یہ محض تمہارا دہم اور اپنی سوچ ہے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں اور نہ ہی میں کسی بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں اگر تمہیں یہ رشتہ منظور

ہے تو میں ہاں کر دیتا ہوں۔ میں زبردستی کا قائل نہیں۔ سوچ لو..... پھر مجھے جواب دے دیتا۔“ حیدر کمرے سے نکلے ہوئے بولا۔
 ”شاہجی..... شوق بی بی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔“ اسی لمحے بشری آپا کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں تو شہلا نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔

”ہاں بلا لہو اسے اور اسے یہاں کوئی مسئلہ تو نہیں.....؟“ حیدر نے پوچھا تو شہلا کی آنکھیں حیرت سے پھلنے لگیں۔
 ”نہیں..... شادجی..... آپ اس سے خود پوچھ لیں۔“ بشری آپا کہتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ شہلا استغہامیہ نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھنے لگی مگر کچھ نہ بولی اور نہ ہی انھوں نے کچھ بتانا مناسب سمجھا۔ تھوڑی دیر بعد شوق کمرے میں داخل ہوئی۔ خوبصورت، دراز قد، ہارک سی لڑکی، شہلا نے چونک کر اسے دیکھا۔
 ”السلام علیکم اکل.....“

”علیکم السلام بیٹا کیسی ہیں آپ..... سب ٹھیک تو ہے نا..... کوئی تکلیف تو نہیں آپ کو یہاں؟“ حیدر نے جلدی جلدی سارے سوال ایک دم پوچھ ڈالے۔

”نہیں اکل..... میں بہت آرام سے ہوں بس آپ سے کچھ کہنا تھا.....“
 ”ہاں کہو..... کیا کوئی خاص بات ہے.....؟“
 ”اکل..... وہ..... میں.....“ وہ شہلا کی موجودگی میں ہچکچا رہی تھی۔
 ”اچھا..... اس وقت میں جلدی میں ہوں آپ مجھے موبائل پر رنگ کر کے بتا دیتا آپ کے پاس اپنا موبائل تو ہے نا.....“
 ”جی اکل.....“

”ٹھیک ہے بیٹا..... اللہ حافظ۔“ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ شہلا کے ساتھ خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔
 شہلا کا موڈ سخت آف تھا۔ رشتے کی نوعیت تو کچھ کچھ سمجھ میں آگئی تھی مگر پاپا نے کبھی بھی چھوٹے سے چھوٹا کام اس سے ڈسکس کیے بغیر نہیں کیا تھا۔ ایک لڑکی نہ جانے کب سے حویلی میں رہ رہی تھی اور اسے خبر تک نہ تھی۔ اس کا مطلب ہے پاپا اب آہستہ آہستہ خود ہی اسے اپنے سے دور کر رہے تھے۔ ان کے دل میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں..... اس نے شوہروں کو بھائیوں کو اور بیٹوں کو بدلتے تو سنا تھا مگر باپ کو بدلتے خود دیکھ لیا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے ساتھ صرف اس عورت کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ وہ سارا راستہ گاڑی میں خاموش بیٹھی رہی۔ نہ حیدر نے اس سے کوئی بات کی اور نہ ہی اس نے..... مگر دیکھتے ہی اس نے اپنا فیصلہ شادیا کہہ دیا کہ وہ شادی کے لیے راضی ہے اور جلد از جلد شادی کرنا چاہتی ہے۔
 حیدر کے لیے یہ اچھی بات نہ تھی وہ جانتا تھا کہ وہ غصے میں یہ سب کر رہی ہے مگر وہ اسد علی شاہ کی طرف سے مطمئن تھا اس لیے غصے کی کوئی پروا نہ تھی اور اس کی خالہ زبیدہ کو فون کر کے مبارکباد دے دی۔

اسد علی شاہ ایک ہفتے تک پاکستان پہنچ رہا تھا اور اس کے آنے کے دو دن بعد شادی کی تاریخ رکھی گئی۔ شادی گاؤں میں ہی ہونا طے پائی۔

حیدر نے تبسم اور فاطمہ آ پاکو بھی فون کر کے اطلاع دے دی اور انھیں جلد آنے کو کہہ دیا تاکہ شادی کی تیاری میں وہ شہلا کی مدد کر سکیں کیونکہ اس کی ماں تو موجود نہیں تھی اور سارے کام حیدر کے ذمے ہی تھے۔ شہلا بھی جیسی جیسی اور بہت اداس تھی۔ اس نے اپنی ساری سرگرمیاں ختم کر دیں تھیں صرف ضروری کام کے سلسلے میں باہر نکلتی۔ حیدر نے اسے شاپنگ کے لیے کہا مگر وہ پھر بھی نہ مانی۔ بہت دنوں کے بعد اس کا موڈ اچانک ٹھیک ہوا تھا اور دونوں زیورات کی خریداری کے سلسلے میں باہر گئے۔ حیدر نے اسے فری پینڈو دے رکھا تھا کہ جو جو اسے پسند ہو وہ خرید لے اور اس نے اپنی پسند کے بہت سے زیورات پیک کروائے۔ حیدر حناٹ کرنے لگا تو موبائل بج اٹھا..... اس نے نمبر دیکھا اور ایکسکیوڈ کرنا ہوا باہر نکل گیا۔ شہلا نے حیرت سے مشکوک انداز میں باپ کی طرف دیکھا۔ اس کا موڈ پھر آف ہو گیا۔

”ہاں بولو شوق پینا کیا بات ہے.....“

”انگل..... میں نے آپ سے سہیل کے بارے میں ڈسکس کرنا ہے۔ پاپا نے خواہ مخواہ اسے پھنسا دیا ہے اور وہ اپنی ماں اور بہنوں کا اکلوتا سہارا ہے۔ انگل وہ بے قصور ہے۔ پاپا نے اپنی پوزیشن بچانے کے لیے اسے مہرے کے طور پر استعمال کیا ہے اور مجھے یقین ہے اس کے گھر والوں کی بھی خبر نہیں لی ہوگی۔ انگل پلیز آپ سہیل کے لیے کچھ کریں..... اور اس کے گھر والوں کے لیے بھی.....“

”ٹھیک ہے تم مجھے ان کا ایڈریس بتا دو اور سہیل سے میں خود جیل میں ملنے جاؤں گا۔“

”شکریہ انگل..... آپ بہت اچھے ہیں۔“

”او کے پینا خدا حافظ.....“ وہ موبائل آف کر کے اندر آیا تو شہلا نے سارے زیورات واپس رکھوا دیے تھے اور سخت غصے میں بیٹھی تھی۔

”پاپا چلیں..... مجھے یہ زیورات پسند نہیں۔“

”کیوں کیا ہوا..... تم نے سارے زیورات خود پسند کیے تھے اور میں ابھی حناٹ ہی کرنے والا ہوں ابھی آپ نے ہماری بیٹی کو کیوں ناراض کر دیا۔“ وہ سیٹر مین سے مخاطب ہو کر بولا۔

”سر ہم تو خود حیران ہیں۔ میڈم ہیکنگ کے بعد انھیں واپس کر رہی ہیں۔ ہم نہیں جانتے وہ کیوں ناراض ہوئی ہیں۔“

”آپ انھیں دوبارہ پیک کروا کے گاڑی میں رکھوا دیں اور بل مجھے دے دیں۔“

”مجھے کچھ نہیں چاہیے.....“ وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔ حیدر نے خاموشی سے حناٹ کی اور باہر آ گیا۔

”شہلا یہ کیا حرکت ہے..... تم کیوں ایسا کر رہی ہو.....؟“ حیدر غصے سے بولا۔

”میں نہیں جانتی پاپا..... لیکن جب بھی اس عورت کا فون آتا ہے میرا دل جھٹکے لگتا ہے اور خون کھولنے لگتا ہے.....“ وہ صاف گوئی سے بولی۔

”کس عورت کا.....؟“ حیدر نے حیرت سے پوچھا۔

”وہی مسز پیٹر کا.....“

”کیا مطلب..... کیا تم اس سے ملی ہو؟“ حیدر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور حیران رہ گیا۔

”ہاں..... میں اس سے ملی تھی.....“

”تم نے اس سے کوئی.....“ جواباً وہ خاموش رہی.....

”شہلا مجھے تم سے ایسی باتوں کی قطعی امید نہیں تھی۔ تم عورتیں کیسی مخلوق ہو۔ بغیر حقیقت جانے ایک دوسرے سے حسد کرنے لگتی ہو اور بعض اوقات اس رقابت میں ایک دوسرے کا کتنا بڑا نقصان کر دیتی ہو، میں اپنے آپ پر فخر کرتا رہا کہ میں نے اپنی بیٹی کی ایسی تربیت کی ہے کہ وہ جہاں بھی جائے گی میرا سر فخر سے بلند کرتی جائے گی اور شہلا تم اس قدر..... مائی گاڑ مجھے یقین نہیں ہو رہا..... اور..... اور..... تم جانتی ہو اس وقت کس کا فون تھا۔ شفیق کا گاؤں سے فون تھا۔ دو بچاری اپنا ایک مسئلہ سکس کر رہی تھی۔ لوو بکھو..... دیکھو یہ نمبر.....“ اس نے شفیق کا نمبر اسے دکھاتے ہوئے موبائل اس کی گود میں پھینکا اور گاڑی ڈرائیو کرنے لگا..... اسے سخت دکھ ہو رہا تھا۔ ایسا دکھ زندگی میں کبھی بھی اس نے محسوس نہیں کیا تھا جو وہ اب کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں ایک دو دفعہ اس نے بری طرح اور ٹیک کرنے کی کوشش کی۔ شہلا پشیمان اور شرمندہ سی اپنی جگہ بیٹھی تھی۔

”آئی ایم سوری پاپا.....“ اس نے گاڑی سے نکلنے ہوئے کہا۔ حیدر جواباً خاموش رہا اور اس کے بعد اس نے شہلا سے کوئی بات نہ کی۔ اسے شہلا کی اس حرکت پر سخت افسوس تھا کہ وہ نفرت اور حسد میں اس حد تک دور نکل گئی تھی کہ اس نے باپ کے احساسات کی بھی پروا نہیں کی اور اس نے قدم قدم پر بیٹی کے احساسات کی پروا کی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی برسوں کی محنت اکارت گئی ہو۔ شہلا حیدر اس کی سوچ سے کتنی مختلف نکلی تھی۔ وہ ایسی نہ بن سکی تھی جیسا اس نے ملنا چاہا تھا۔ انسان کے اندر کیا کچھ ہوتا ہے اور کیا کیا پکڑا رہتا ہے دوسرا انسان کتنا لاعلم رہتا ہے وہ تو اس کی بیٹی تھی اور اس کی بظاہر تربیت کر کے وہ سمجھا تھا کہ وہ اس کو اپنی سوچ کے قالب میں ڈھال چکا ہے مگر وہ تو بہت مختلف نکلی تھی۔

شہلا اپنے کمرے میں بند تھی اور حیدر اپنی سوچ میں غم تھا۔ دونوں کے درمیان گہری خاموشی اور سرد مہری کی وسیع فلیج حاکم تھی۔ قاطعاً آپا اور عجم آپا دونوں آپسکی تھیں اور شادی کی تیاریوں میں گرم جوشی سے حصہ لے رہی تھیں۔ زیورات اور ملبوسات کے علاوہ بقیہ چیز کی ساری تیاری ان کے لئے تھی۔ دونوں صبح سے شام تک بازار کے چکر لگاتی رہتیں۔

حیدر کو شہلا کی حرکت پر افسوس کے ساتھ ساتھ دکھ بھی تھا۔ اس نے تو مڑ کر شہلا کی خبر بھی لی تھی۔ اس سے کوئی کمیٹ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے شہلا کی خفگی کے پیش نظر اور مغیث بھائی کے سمجھانے پر دوبارہ اس سے سارے رابطے منقطع کر دیے تھے اور اب شہلا کی زبان اس سے ملاقات کی خبر ہوئی تو وہ جانتا چاہتا تھا کہ شہلا نے اس سے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی تھی نہ جانے کیوں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ شہلا نے ضرور کوئی نہ کوئی بات اس سے کہی ہوگی کیونکہ شہلا کے تئیں اور اس کے ہات کرنے کے انداز سے ہی اس نے اندازہ لگا لیا تھا اور اب وہ اس سے جلد از جلد رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اسے موبائل پر فون کیا مگر فون آف تھا۔ اس نے ہاسٹل فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ باہر گئی ہے شام کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت خراب ہے وہ فون نہیں سن سکتی۔ اسے یہ سن کر قدرے تشویش ہوئی۔ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا مگر ہاسٹل میں نہیں..... کہیں باہر..... اور اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ جیسے جیسے اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اگلے دن صبح سویرے ہاسٹل پہنچ گیا۔ انچارج ابھی نہیں آئی تھی۔ اس انفصال سے ہی ملاقات ہو گئی۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں پوچھتا رہا۔ اس انفصال جانتی تھیں کہ وہ سر پرانڈوزٹ کا عادی تھا

شاید اسی لیے صبح سویرے بچھ گیا ہے۔

”مسز افضال..... میں آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھنا چاہتا ہوں؟“

”جی فرمائیے.....“

”کچھ روز پہلے شہلا حیدر ہاسٹل وزٹ کے لیے آئی تھیں تو انھوں نے کس چیز پر زیادہ زور دیا۔ آئی مین کس چیز کی ڈیو پلمنٹ کے بارے میں..... کیونکہ میرے ساتھ ان کی تفصیلات نہیں ہو سکی اور ویسے بھی ایک ہفتے بعد ان کی شادی ہے اور شادی کی مصروفیت میں ایسے معاملات تو زیر بحث نہیں لائے جاتے میں ادھر سے گزر رہا تھا تو سوچا کہ آپ لوگوں کی خیریت بھی دریافت کر لوں۔ مجھے ان کے وزٹ کا تو علم تھا مگر تفصیلات ڈسکس نہیں ہو سکیں۔“ وہ قدرے رک رک کر بولا۔

”مس شہلا اچانک ہی مسز پٹیل سے ملنے آئی تھی اور بس ان سے ملنے کے بعد چلی گئیں۔“ مس افضال نے نارمل لہجے میں بتایا۔

”مسز پٹیل سے..... مگر کیوں..... کیا کوئی خاص بات تھی؟“

”معلوم نہیں..... ان کے کمرے میں ہی ان سے کچھ بات ہوئی اور..... اس کے بعد.....“

”اس کے بعد کیا ہوا؟“ وہ پوچھتی سے بولا۔

”اس کے بعد مسز پٹیل بہت پریشان تھیں اور پھر پتھر پڑ گئیں۔ ان کو برین ہیمریج ہو گیا.....“

”کیا.....؟“ حیدر کو سخت غصہ آ رہا تھا مگر اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔

”اور اب تو پتھر پڑی..... ڈاکٹر ان کے بارے میں پریشان ہیں۔ برین ہیمریج کا بہانہ بنا ہے۔“

”اب کیا ہوا ہے.....؟“

”ڈاکٹر ز نے ٹیسٹ کروانے کو کہا..... اور ان کی رپورٹس بھی اچھی نہیں آئیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”ان کو برین ٹیومر ہے..... اور ستم ظریفی دیکھیے پتھری کے پاس اتنے ریورسز بھی نہیں کہ وہ علاج کروا سکیں۔ بیٹا تو ابھی خود تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ ہم لوگ اپنے طور پر کوشش تو کر رہے ہیں مگر آپ کو تو معلوم ہے کہ اس علاج میں بہت پیسہ چاہیے..... اچھا ہوا آپ آگئے اور میری آپ سے بات ہوگئی۔ سراسر ممکن ہو سکے تو انسانیت کے ناتے ہی ان کی مدد کر دیجئے.....“ مس افضال نے ہمدردی سے کہا تو حیدر کے لیے مزید وہاں رکنا حال ہو گیا۔

”ٹھیک ہے میں پھر آؤں گا.....“ وہ دروازے کی طرف منہ کر کے جلدی سے باہر نکل آیا۔ گاڑی میں آ کر اس نے رومال اپنی آنکھوں پر رکھا۔ جیسے ہی رومال نے آنکھوں کو چھوا نہ جانے کہاں سے آنسو بغیر کسی رکاوٹ کے رومال میں جذب ہوتے رہے۔ مس افضال کے الفاظ مسلسل اس کے کانوں میں گونج رہے تھے..... ”انسانیت کے ناتے ان کی مدد کر دیجئے۔“ اسے اس پر اس کی قسمت پر شدید دکھ ہو رہا تھا۔ اس نے تو مس

افصال سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ اس وقت وہ کہاں تھی وہ اس کے بارے میں اس قدر ہٹی ہو چکا تھا کہ اس کا سامنا کرنے سے بھی گھبرار ہا تھا۔ وہ کافی دیر یونہی بے مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا۔ وہ کسی سے سب کچھ سکس کرنا چاہتا تھا۔ شہلا کو ڈانٹنا چاہتا تھا مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شہلا پہلے ہی ناراض تھی اور..... اس کا سامنا کرنے کی اس میں ابھی ہمت نہ تھی وہ اپنے حوصلے کو سنبھال کر چاہتا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ اندر ہی اندر شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ مگر پہنچا تو اطلاع ملی کہ اسد علی شاہ پاکستان پہنچ گیا ہے اور اسی شام ان لوگوں نے حیدر اور اس کی دونوں بہنوں کو کھانے پر انوائس کیا تھا ایک دفعہ پھر اس سے ملنے کا موقع ضائع ہو گیا۔

”حیدر تم مجھے کچھ پریشان لگ رہے ہو۔“ تبسم آ پانے راستے میں اس سے پوچھا۔

”نہیں..... ٹھیک ہوں آپ..... ایسی کوئی بات نہیں۔“

”بیٹی سے جدائی کا دکھ ہوگا۔“ قاسم آ پاسکرا کر بولیں۔

”شہلا بھی مجھے ناراض ناراض لگ رہی ہے، حیدر بھائی کیا ابھی تک وہ.....؟“

”معلوم نہیں..... شاید.....“ حیدر آہستہ سے بولا۔

”اس کا کیا حال ہے.....؟“ تبسم آ پانے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”معلوم نہیں.....“

”کیوں تم اس سے ملے نہیں.....؟“

”نہیں.....“

”کون..... اور آپ لوگ کس کی باتیں کر رہے ہیں؟“ قاسم آ پابے صبری سے بولیں۔ دونوں جواباً خاموش رہے۔ تبسم آ پانے حیدر کی

طرف دیکھا اور حیدر نے آپا کی طرف..... مگر کوئی بھی کچھ نہ بولا۔

”آپ شہلا کی بات تو نہیں کر رہے.....“ قاسم آ پاجلد ہی بھانپ گئیں۔

”ہاں“ حیدر نے جواب دیا۔

”کیا وہ پاکستان میں ہے.....؟“

”ہاں.....“

”کیسی ہے وہ..... کچھ مجھے بہت یاد آتی ہے بہت اچھا وقت اس کے ساتھ گزارا ہے۔ بڑی پیاری سی بہن تھی ہماری..... آپا کسی روز اس

سے ملنے نہ چلیں۔“ قاسم آ پا کی طبیعت میں ابھی تک جلد بازی اور بے پروائی سی تھی۔ دونوں پھر خاموش رہے۔

”ویسے حیدر تم بھی ابھی تک اسے نہیں بھلا پائے.....“ قاسم آ پانے مسکراتے ہوئے مذاقاً کہا تو دونوں نے قدرے غصے سے ان کی

طرف دیکھا۔

”فاطمہ..... تم کس قدر غیر سنجیدہ باتیں کر رہی ہو۔ تم ابھی تک نہیں بدلیں۔ وہ بیٹی کی شادی کر دیا ہے اور تم کیا قصے لے کر چنڈ گئی ہو۔“ تبسم آپا نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”آپا تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ تو بیو کن پنجر ہے۔ انسان کے اندر کے احساسات اور جذبات تو نہیں بدلتے نا۔۔۔۔۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“

”لیکن بعض اوقات وقت اجازت نہیں دیتا کہ ایسی باتوں کو لمس کیا جائے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس بات کا ذکر نہ ہی کیا جائے اور سنو شہلا کے سامنے بالکل ہی ذکر نہ کرنا۔“ تبسم آپا نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

حیدر خاموشی سے ستارہ ہاؤس اس کا دل چاہ رہا تھا کہ تبسم آپا سے سب کچھ فرسکس کرے۔ تبسم آپا کے ساتھ شروع سے اس کی بہت اٹلر اسٹینڈنگ تھی۔ وہ اسے تائی اماں کی طرح ہی ٹریٹ کرتی فاطمہ آپا اور تبسم آپا میں دس سال کا فرق تھا اور حیدر ان دونوں سے چھوٹا تھا جب اس کے والدین حادثے کا شکار ہو گئے۔ حیدر صرف چھ ماہ کا تھا جب تائی اماں نے اس کی ذمہ داری سنبھالی۔ تائی اماں اس وقت کافی بوڑھی ہو چکی تھیں اور تبسم آپا کا دلچ جاتی تھیں۔ تب سے حیدر ان کے ساتھ بہت اٹیچڈ تھا۔ شہلا اور حیدر کو تبسم آپا نے بہت محبت سے پالا تھا۔ دونوں کی عمروں میں صرف چند ماہ کا فرق تھا۔ آپا ایک طرف حیدر کے منہ میں فیڈ روٹیں ایک طرف شہلا کے..... اور ان دونوں کے درمیان بکلیہ رکھ دیتیں مگر دونوں تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے سے قہقہہ گھٹا ہوئے ہوتے۔ ایک دوسرے کے فیڈ رز چھیٹے۔ آپا ہر رات دونوں کو اپنے پاس لٹا کر کہانیاں سناتیں۔ ان کے جھگڑے ختماتیں۔ فاطمہ آپا ان دونوں سے بڑی تھیں اس لیے اکثر انھیں ڈانٹتی رہتیں، وہ بھی بہت پیار کرتیں مگر ان کے پیار کا انداز مختلف تھا وہ پہلے مارتیں، ڈانٹتیں پھر مانتیں اور پیار کرتیں۔ تبسم آپا کی محبت میں صرف شہلا اور سکون تھا جبکہ فاطمہ آپا کی محبت میں مذاق اور مار کٹائی زیادہ تھی۔ جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے گئے دونوں میں لڑائی جھگڑا کم ہوتا گیا اور شدید محبت پیدا ہو گئی۔ حیدر نے جب کالج سے آنا ہوتا تو تبسم آپا کی جگہ وہ جاتی رہتی۔ اس کے کھانے پینے اور ہر ضرورت کا خیال رکھتی۔ ان کی اس محبت کو فاطمہ آپا بھرپور انداز میں انجوائے کرتیں۔ کبھی شہلا کو لپٹا کر کہہ کر پکارتیں اور اسے بچتوں..... وہ حیدر سے بھی سرعام مذاق کرنے سے باز نہ آتیں اور وہ مسکرا کر باہر نکل جاتا۔ تبسم آپا، فاطمہ آپا کو اکثر ان باتوں پر ڈانٹتیں مگر وہ بھرپور قہقہے لگاتی ہوئی باہر نکل جاتیں یہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کا ملاپ نہیں ہوگا۔

ہر کوئی ڈانٹنی طور پر تیار تھا کہ حیدر کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد شہلا ہمیشہ کے لیے اس کی ہو جائے گی مگر سید صاحب کے اچانک فیصلے نے سب کو دنگ کر دیا۔ ہر کوئی سوچ میں پڑ گیا کہ دونوں کیسے ایک دوسرے کے بغیر جی پائیں گے۔ اس واقعے کے بعد حیدر نے جو سنجیدگی کا لبادہ اوڑھا اور اپنی زندگی سے خوشیوں اور مسرتوں کو خیر ہاؤس کہا تو پھر کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ اس کے سامنے کسی بھی بات کا ذکر کیا جاتا۔ فاطمہ آپا سا بیواں بچا ہی نکلیں۔ کبھی کبھار گاؤں آتا ہوتا اور اکثر دونوں بہنوں کی ملاقات ہی نہ ہونے پاتی۔ یہ موقع ایسا تھا کہ حیدر نے دونوں کو بلا لیا اور حیدر کی محبت میں دونوں گھبراہ چھوڑ کر آ گئی تھیں۔ تبسم آپا حیدر سے اپنی اولاد جیسی محبت کرتی تھیں۔ اس کے احساسات کو سمجھتی تھیں اور ہر قدم پر اس کے احساسات اور جذبات کا خیال رکھتی تھیں۔ اندر سے تبسم آپا بھی شدید جتنی تھیں کہ شہلا سے ملاقات ہو۔ وہ اسے دیکھتا اور پیار کرنا چاہتی تھیں مگر حیدر کے سامنے کوئی

بھی ایسی بات کر کے وہ اس کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہچانا چاہتی تھیں۔ حیدر بھی ان سے اس کی باتیں کرنا چاہتا تھا اور انھیں اس سے ملوانا چاہتا تھا مگر منیٹ بھائی کے سمجھانے پر اب وہ ان کے سامنے بھی کوئی بات نہیں ڈھرائتا چاہتا تھا اور پشاور میں گھر سے رخصت کرتے وقت آپا نے بھی تو یہی کہا تھا کہ ماضی جب کہیں دفن ہو چکا ہے اسے دفن ہی رہنے دو۔ اسے کرید کر حال کو قبرستان مت بناؤ۔ اس نے جب ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس سے رابطہ نہیں کرے گا اور اسی لیے واپس آنے کے بعد اس نے شہلا کو کبھی فون نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی قسم کا رابطہ کیا تھا۔ وہ آپا کی کہی ہوئی باتوں کا بہت احترام کرتا تھا۔ ماں جیسی بہن کا وہ دل سے معتقد تھا۔ ان کا کہنا نہ بھی ٹالا تھا اور نہ ہی رد کرنے کی کوشش کی تھی۔

اسد علی شاہ سب کو بہت پسند آیا۔ وہ شہلا کے لیے بہترین بیچ تھا۔ شادی کی تاریخ تو پہلے ہی طے ہو چکی تھی۔ بس دوسری اہم باتیں ڈسکس کرنا باقی تھیں۔ شادی کی تیاریاں بھی تقریباً مکمل تھیں۔ حیدر کی مصروفیات میں پہلے سے کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا مگر وہ اس کے ذہن میں تھی۔ بار بار فون ملاتا مگر جواب نہ دارو شادی سے فارغ ہو کر وہ جلد از جلد اس کے پاس جانا چاہتا تھا مگر اس دوران ہی اس نے مس افضال کو دو لاکھ کا چیک بھجوایا اور ساتھ ہی تاکید کی کہ وہ کسی سے اس کا ذکر نہ کریں۔



آفاق کئی روز سے گھر نہیں آیا تھا۔ ملک منصور الیکشن کے سلسلے میں دن رات مصروف تھا۔ کئی بار شزا کو بھی جلسے اینڈ کرنا پڑتے۔ سرگھر میں بیٹھے بیٹھے سخت بور ہو گئی تھی۔ شام ہو رہی تھی اس نے کلب جانے کا سوچا۔ آج وہاں اچھی خاصی گیدرنگ تھی۔ وہ حیدر ان تھی کہ آج ایسی کیا خاص بات ہے کہ سب خواتین یوں جمع تھیں۔ مسز زہیر نے اسے دیکھ کر بیہودہ سا نعرہ لگایا تو سب نے ان کا ساتھ دیا اور ایک گونج دار قہقہہ فضا میں بلند ہوا۔

”بہت دنوں بعد یہ چاند اھر نکلا ہے۔۔۔۔۔ کوئی خیر خبر ہی نہ دی کہ آج کل چاند کی اس چاندنی سے کون لطف اندوز ہو رہا ہے۔“ مسز زہیر نے اسے اپنے قریب جگہ دیتے ہوئے کہا۔

”مسز زہیر چھوڑیے بھی۔۔۔۔۔ یہ تو بتائیے آج اتنی رونق کس سلسلے میں ہے۔ کیا کوئی اہم بات ہے یا پھر ملک میں کوئی آفت آگئی ہے کیونکہ ایسی گیدرنگ یا تو ملک وقوم کے ساتھ خالی خولی ہمدردی کے لیے ہوتی ہے یا پھر کسی اور اہم بات کے لیے۔۔۔۔۔“ اس نے آنکھ دبا کر کہا اور مسز زہیر کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

”یار تم بھی کمال کرتی ہو۔۔۔۔۔ میں تمہیں فون کرنے کا سوچ ہی رہی تھی تم نے بھی رابطہ نہیں کیا۔ بڑی زبردست خبریں ہیں۔ تمہیں معلوم ہے مس حیدر کی شادی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔“ مسز زہیر نے کہا۔

”واقعی۔۔۔۔۔ زبردست۔۔۔۔۔ لیکن یہ سب کب اور کیسے ہو رہا ہے۔۔۔۔۔؟“

”کیوں بھی یہ ناممکنات میں سے تو نہیں جو تم یوں چوکی ہو۔۔۔۔۔“ مسز اکمل اپنی لے میں بولیں۔ وہ ہر ایک کو تنگ کر جواب دینے کی عادی تھیں اس لیے کوئی بھی ان سے زیادہ لمبی ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔

”دراصل۔۔۔۔۔ اچانک اچھی خبر سن کر انسان چونک ہی جاتا ہے نا۔۔۔۔۔“ مسز حید نے اسے ڈھانڈھ کرنا چاہا۔

”اچھا تو کہاں ہو رہی ہے۔۔۔۔۔“

”اپنے ہی کسی کزن سے۔۔۔۔۔ سید لوگ ہیں غیر ذات میں تو جاتے نہیں ورنہ شہلا حیدر کے لیے رشتوں کی کمی تو نہیں تھی۔۔۔۔۔“ مسز عبید نے

جواب دیا۔

”ہاں تو اور مزید دست خبر کیا ہے۔۔۔۔۔؟“ اس نے سرگوشی کے انداز میں مسز عبید سے پوچھا۔

”ابھی بتاؤں گی بڑی مسالے دار خبر ہے۔ بس ان لیڈرز کو ادھر ادھر ہو لینے دو۔۔۔۔۔“ مسز عبید نے بھی سرگوشی کی۔

”واقعی کوئی ایسی خبر ہے۔۔۔۔۔“

”ہاں بھئی۔۔۔۔۔ تم بھی انجوائے کر دو گی۔“

”کہیں چپے بدلنے کی کہانی تو نہیں۔۔۔۔۔“ اس نے طعنیہ انداز میں پچھلی بات دہرائی۔

”ارے نہیں بھئی۔۔۔۔۔ اس سے بھی گرم گرم۔۔۔۔۔ ہاں تو مسز اکمل آپ کیا کہہ رہی تھیں۔۔۔۔۔ واقعی اس وقت تو ملکی سیاست کا اللہ ہی حافظ

ہے۔۔۔۔۔ کون جیتے گا کون ہارے گا کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہے۔“ مسز اکمل کو انھوں نے طعنیہ انداز میں کہا کیونکہ مسز اکمل کے شوہر دو دفعہ الیکشن

ہارنے کے بعد پھر پورے جوش و خروش سے سیاست کے میدان میں اترے تھے اور اب اپنی جیت کے بارے میں بہت بڑے اعتماد تھے۔ مسز عبید ادھر

ادھر کی باتیں لیڈرز کے ساتھ کر رہی تھیں اور وہ بار بار پہلو بدل رہی تھی کہ کب اسے وہ بات سنا لیں جس کے لیے وہ اتنا انتظار کر رہی تھی۔

”مسز عبید اب سنا بھی چکیں۔“ اس نے موقع غنیمت جان کر کہا۔

”اچھا آؤ آؤ اک کریں۔۔۔۔۔“ اور وہ لان کے ایک کونے میں اسے لے گئیں۔ ”یار بڑے حرے کی خبر ملی ہے۔۔۔۔۔“

”کیا۔۔۔۔۔؟“ بتا بھی دو اب۔“

”حیدر شاہ کی محبوبہ دریافت ہو چکی ہے۔۔۔۔۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“ اسے جیسے کرنٹ لگا۔

”ہاں بھئی۔۔۔۔۔ کوئی مسز پیٹر ہے اور ورکنگ ویمن ہاسٹل میں رہتی ہے۔۔۔۔۔ حیدر شاہ اس کا بڑا پکا عاشق نکلا۔۔۔۔۔ کچ مجھے تو رشک آتا ہے اس

عورت پر۔۔۔۔۔ بندہ بھی کیسا زبردست پھانسا۔۔۔۔۔ مجھے تو اس عورت سے ملنے کا کریز ہو رہا ہے۔۔۔۔۔“ وہ حسرت بھرے لہجے میں بولیں۔

”مسز عبید میں بھی اس سے ملنا چاہوں گی مگر آپ کو یہ ساری خبر کس نے دی۔۔۔۔۔؟“

”لو۔۔۔۔۔ میری خبریں کبھی جھوٹی نہیں ہوتیں اور شہلا کی باپ کے ساتھ ناراضی کی وجہ بھی وہی عورت ہے۔۔۔۔۔“

”واقعی۔۔۔۔۔؟“

”اور نہیں تو کیا۔۔۔۔۔ چلو کسی دن بھانے سے ورکنگ ویمن ہاسٹل چلتے ہیں۔ اس عورت سے ملنے۔۔۔۔۔ میں بس حیدر شاہ کی چوائس دیکھنا

چاہتی ہوں۔ کلب کی کئی خواتین نے بڑی کوشش کر دیکھی مگر وہ تو کس کی بات سنتا مگر اور نہیں کرتا۔۔۔۔۔ اور سناؤ تمھارے ساس سر کا کیا حال ہے۔۔۔۔۔“

آج کل تمہاری ساس اینکشن کمپن میں بہت آگے آ گئے ہیں۔ لگتا ہے تمہارے سر کے ساتھ ان کی خوب نہ رہی ہے۔۔۔۔۔ وہ قہر لگا کر بولی۔۔۔۔۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ظاہر ہے۔۔۔۔۔ ان کی ذات سے ان کو فائدہ ہی فائدہ ہے۔“

”اور ہاں تمہارا شوہر آج کل کن چکروں میں ہے۔۔۔۔۔؟“ مسز زہیر کسی کو بخشنے والی نہیں تھیں۔ ہر ایک کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیتی تھیں۔
 ”وہ۔۔۔۔۔ وہ بھی ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“ وہ گھبرا کر بولی۔

”تمہیں اسے کھینچے میں جکڑنا نہیں آیا۔ بڑے پر پرزے نکال رہا ہے۔ سنا ہے کسی مہدی کے ساتھ اس کا چکر ہے..... ہاں..... مہدی
 بھی تو اسی ہاشل میں رہتی ہے..... تم اپنی رقیب سے مل لینا میں اپنی سے.....“ اس نے پھر قہقہہ لگایا۔
 ”مسز زبیر کیا مطلب..... میں سمجھی نہیں.....“

”یار..... تم میں بھی عقل کی بڑی کمی ہے..... متاثرین حیدر میں ہم بھی تو شامل ہیں۔ بس نہ جانے کیسے..... کب..... کہاں اس شخص سے اپہر لیس سی ہوگئی ہوں مگر وہ تو..... خیر..... تم بھی اپنے شوہر کو قابو میں رکھو..... کسی دن مددِ مرغ آگئی تا تمہارے گھر..... تو بس تمہاری چھٹی..... اور تم وہاں بھی نہیں جاسکوگی جہاں سے آئی ہو.....“

مسز زبیر نے ایسا تیر مارا تھا کہ وہ تھملا اٹھی..... مسز زبیر انتہائی کینہ پرور عورت تھی جو ہر وقت قیمتی زیورات، ملبوسات اور خوشبوؤں سے لبریز ہوتی مگر اس کا اندر اتنا سیاہ اور گندہ تھا کہ وہ کسی پر بھی کچڑا چھالنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ اسی لیے وہ ہر ایک کی کٹروری جاننے کی تاک میں رہتی۔ کسی نہ کسی کی کوئی نہ کوئی بات ایسے دھنوں کے لیے ضرور اپنے پاس محفوظ رکھتی۔ سحر کے لیے وہاں رکنا محال ہو گیا تھا۔ وہ دو چار باتیں کرنے کے بعد خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل آئی۔

مسز زہرا کھڑا سے یونہی زچ کیا کرتی تھیں کسی نہ کسی بات کی طرف اشارہ کر کے مگر آج تو حد ہی کر دی تھی ہر بات صاف صاف اس کے منہ پر دے ماری تھی اور خاص طور پر آفاق کے حوالے سے اور اس کے اپنے حوالے سے اسے شدید صدمہ ہوا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مسز زہرا نے بھری محفل میں اس کے ننگے جسم پر چابک مارے ہوں۔ آئسوایک دم اس کی آنکھوں میں تیرنے لگے۔۔۔۔۔ انسان کہیں بھی چلا جائے ماضی سے فرار ممکن نہیں اور حال ہمیشہ ماضی کی طرف دھکیلتا ہے اور مستقبل دونوں سے جواب طلب کرتا ہے۔۔۔۔۔ انسان کچھ بھی ہو جائے کہیں بھی چلا جائے۔۔۔۔۔ اس کا اصل ہمیشہ منہ کھولے اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔۔۔۔۔

وہ بار بار آفاق کا نمبر ملتا رہتا تھا۔ آفاق کو تین دن ہو گئے تھے وہ گھر نہیں آیا تھا اور یقیناً کوئی ایسی دیکھی بات ہوئی ہوگی جو مسز دبیر کو خبریں پہنچی تھیں۔ اس کے ذہن میں مسز دبیر کی باتیں گونج رہی تھیں۔ اس کا ذہن ایک نام پر ایٹک گیا تھا۔ ”مہ رخ.....“ آفاق اور مسر رخ.....“

گھر بالکل سناں ہو رہا تھا۔ باہر لان میں کہیں کہیں روشنی تھی۔ چوکیدار گیٹ پر تھا۔ اچھے بڑے گھر سے اسے وحشت ہو رہی تھی۔ رات کی تاریکی میں جیسے جیسے اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے ہر شے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کہیں بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس نے ایسی تنہائی، ایسا خوف کبھی بھی

زندگی میں محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر تھک گئی تھی۔ وہ کسی سے بات کرنا چاہتی تھی مگر کوئی بھی تو ایسا نہ تھا۔۔۔۔۔ یہ کیسا گھر تھا جہاں ایک دوسرے سے بات کرنے کو ترسے۔۔۔۔۔ کوئی بھی کسی کے ساتھ وقار نہ تھا ہر کوئی مفاد کا بندہ تھا۔ کسی کو کسی سے کوئی غرض نہ تھی۔ نہ محبت نہ الفت شاید نفرت بھی نہیں۔۔۔۔۔ وہ زندگی میں پہلی دفعہ اس گھر میں کھل کر روئی۔۔۔۔۔ وحالیں مار مار کر۔۔۔۔۔ اپنی بے بسی پر۔۔۔۔۔ اپنی تنہائی پر اور شاید اپنی بے عزتی پر۔۔۔۔۔ اس نے جس سے بھرے دو تین سکرٹس لیے۔۔۔۔۔ وہ آج اپنے آپ کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ وہ بے سدھ پڑی تھی۔ نہ جانے کس وقت آفاق آیا۔۔۔۔۔ اسے کوئی ہوش نہ تھا، آفاق خود بھی تو نشے کی کیفیت میں تھا اسے کسی کی کیا پروا۔۔۔۔۔ صبح دیر سے اس کی آنکھ کھلی تو آفاق اس کے پہلو میں سو رہا تھا۔

”آفاق تم کب آئے۔۔۔۔۔؟“ اس نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

”جانتی نہیں۔۔۔۔۔“ وہ مدہوشی کے عالم میں بولا۔

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم کتنے دنوں بعد گھر آئے ہو۔۔۔۔۔؟“

”مجھے نہیں معلوم۔۔۔۔۔“

”تو تمہیں کیا معلوم ہے۔۔۔۔۔؟“

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ وہ پھر سو گیا۔

”اس کے پاس جب ہوتے ہو تو تمہیں سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔“ وہ غصے میں بولی۔

”تھک مت کرو۔۔۔۔۔ چپ کر جاؤ اور مجھے سونے دو۔“

”نہیں سونے دوں گی۔۔۔۔۔ تم نے میری نیند ہی حرام کر دی ہیں اور میں تمہیں آرام سے سونے دوں۔“

”منطقی دلفہ ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔“ آفاق نے سوئے سوئے انداز میں کہا۔

”کیا بکو اس کی تم نے۔۔۔۔۔“ اس نے آفاق کو جھنجھوڑ کر اٹھایا اور اس کا بازو مروڑا۔۔۔۔۔ غصے سے اس کا خون کھول رہا تھا۔۔۔۔۔ اس کا اصل۔۔۔۔۔

اس کا ماضی بار بار سامنے آ رہا تھا۔۔۔۔۔

”تم۔۔۔۔۔ تمہاری یہ جرات۔۔۔۔۔“ آفاق نے اٹھ کر گھولسوں سے اس کی تواضع شروع کی تو رکنے میں نہ آ رہا تھا۔

”تم آج مجھے ختم ہی کرو۔۔۔۔۔ تاکہ یہ قصہ ہی پاک ہو۔“ اس نے چاقو آفاق کی طرف پھینکا۔

”تم کیا سمجھتی ہو۔۔۔۔۔ تمہیں مار کر میں اپنے آپ کو عذاب میں ڈالوں اور سنو تمہیں بھی میں یوں آسانی سے مرنے نہیں دوں گا۔۔۔۔۔ تمہاری

بونیاں کتوں کے آگے ڈال دوں گا مگر تمہیں پھر بھی مرنے نہیں دوں گا۔“

”تم میرا قصور تو بتاؤ۔۔۔۔۔ آخر تم کیوں اتنے سفاک ہو گئے ہو؟“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”میں تم سے۔۔۔۔۔ اور تمہارے جیسی سب عورتوں سے نفرت کرتا ہوں۔ تم عورتیں صرف تباہ و برباد کرتی ہو۔۔۔۔۔“

”اور مدد۔۔۔۔۔ مدد۔۔۔۔۔“

”ہاں..... ہاں..... اس سے بھی نفرت کرتا ہوں۔“ وہ غصے سے چلا یا۔ اور اسے جیسے ایک دم سکون مل گیا ہو جیسے اس کے جلتے کلیجے پر ٹھنڈی پھواری پڑ گئی ہو۔ وہ مسکراتی ہوئی اٹھی.....

”آفاق..... تم میرے ساتھ جو مرضی کرو..... میری بونیاں بھی کتوں کے آگے ڈال دو مگر درخ سے شادی نہ کرنا..... اس کو کبھی میرے سامنے نہ لانا..... بس مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“ وہ محبت سے اس کے گلے لگ کر بولی۔

”بیچھے ہو..... میں تم سب سے تنگ آ گیا ہوں..... نہ جانے کیوں میں نے تم سے شادی کی.....“

”اور آفاق میں نے بھی..... میں بھی کیسی سزا بھگت رہی ہوں کاش تم جان سکو.....“ وہ آہستہ سے بولی۔

”تم..... تم تو یہاں عیش سے رہ رہی ہو..... کس چیز کی کمی ہے یہاں۔“

”یہاں کمی ہی کی تو ہے۔ انسانوں کی..... محبتوں کی..... اور سچے جذبیوں کی۔ تمہارے اس گھر میں چیزیں تو بہت ہیں مگر انسان نہیں

بہتے۔ یہاں کچھ بھی نہیں۔“ وہ خالی نظروں سے کمرے کا جائزہ لے کر بولی۔ وہ بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا اور وہ خاموشی سے اس کے لیے ناشتہ لینے چلی گئی۔

مما کی رپورٹس آنچکی تھیں اور ولیم بے حد پریشان تھا۔ ٹیوٹرا اچھا خاصا پھیل چکا تھا۔ آپریشن بہت ضروری تھا مگر اس کے لیے پیسے بالکل نہیں تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ممما کی زندگی خطرے میں تھی۔ اس کا پورا جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور آنکھوں میں آنسو بار بار آرہے تھے۔ آئے نور اس کی فہمائگی کو سمجھ رہی تھی اسے بھی یہ جان کر بہت دکھ ہوا تھا۔

”ولیم تم کیسے بی ہو کر رہے ہو..... اس وقت تمہاری ممما کو تمہارے حوصلے کی ضرورت ہے تمہارے آنسوؤں کی نہیں..... اور پلیز میرے سامنے اپنے آپ کو اتنا کمزور اور بے بس نہ شو کیا کرو.....“ آئے نور ذرا سخت لہجے میں بولی۔

”نور..... اتنی بڑی بات ہو جائے اور انسان کو صدمہ بھی نہ ہو..... تم کیسی لڑکی ہو.....؟“

”ہاں میں ایسی ہی ہوں۔ میں نے قسمیں کھانا کہ میں زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی عادی ہوں۔ مجھے روتے، منہ بسورتے لوگ سخت ناپسند ہیں۔“

”تو پھر میں کیا کروں.....؟“ وہ بے بسی سے بولا۔

”بہادر اور حوصلہ مند انسان ایسے لحوں میں کیا کرتے ہیں..... یہ قسمیں خود سوچنا ہے..... کہ قسمیں کیا کرتا ہے..... تم کب تک یوں دوسروں کے سہارے چلتے رہو گے۔ تم تو روٹنگ اسٹون ہو۔ کبھی ممانے لگا دی کبھی قادر نے..... تو کبھی نور نے.....“ وہ خفگی سے بولی۔

”میں تم سے آئندہ بات بھی نہیں کروں گی.....“ وہ بیک اٹھا کر چل دی۔

”پلیز نور..... ایسا مت کرنا..... ورنہ میں..... میں.....“

”میں کیا بولو.....؟“ وہ غصے میں اس کی طرف مڑی۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔“

”ہاتھ نکل کرنے کا بھی تم میں حوصلہ نہیں۔ تم کیا کرو گے۔۔۔۔۔ مجھے تم بہت مایوس کر رہے ہو۔۔۔۔۔ میں تو تمہیں بہت سمجھدار سمجھتی تھی مگر تمہارا رویہ بالکل بچکانہ ہے۔“

”نور۔۔۔۔۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔ میرے پاس صرف میری ماں ہے۔“

”اور کیا تم جانتے ہو کہ میرے پاس کوئی بھی نہیں۔۔۔۔۔“ اس کے اس انکشاف پر وہ چونک گیا۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”میں نائیکھ کلاس میں تھی جب میری ماں نے میرے ہاتھوں میں دم توڑا۔۔۔۔۔ اور جانتے ہو۔۔۔۔۔ اس کے چھ ماہ بعد ڈیڑی کی ڈیڑی ہاڈی امریکا سے آئی ان کا وہاں ایکسٹنٹ ہوا تھا ان کی ڈیڑی ہاڈی کے ساتھ خود میں قبرستان گئی تھی۔ کیا کبھی تم نے کچھ میرے منہ سے سنا۔۔۔۔۔ میرے منہ سے مایوسی اور بدولی کی باتیں۔۔۔۔۔ میں اتنی ہی عمر میں کیسے بے آسرا ہوئی اور کون کون میرا سہارا بنا۔۔۔۔۔ مجھے کیسے کیسے تجربات ہوئے۔۔۔۔۔ اور میں کیسے اتنی پھوڑ ہو گئی۔ تم کیا جانو۔۔۔۔۔ تمہیں تو رونے دھونے سے ہی فرصت نہیں۔۔۔۔۔ مجھے اپنی جو اس پر بھی افسوس ہے کہ میں نے محبت بھی ایسے شخص سے کی جو میرے لیے کبھی احوال نہیں بن سکے گا۔ میرے آسٹونش پونچھ سکے گا بلکہ مجھے خود ہی سارے کام کرنے پڑیں گے۔۔۔۔۔ دیکھو نا کیسی بیڈ لک ہے۔۔۔۔۔“ وہ ہونٹ سکڑتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

”آئی ایم رٹلی سوری۔۔۔۔۔“

”اس آل رائٹ۔۔۔۔۔ مجھے تمہاری اس سوچی اور لفظی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ میں اب بہت پریکٹیکل ہو چکی ہوں۔ میں نے خالی لفظوں پر یقین کرنا چھوڑ دیا ہے۔۔۔۔۔ میں حقیقت کی تلاش میں رہتی ہوں۔“

”تم نے مجھے کبھی بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔۔۔۔۔“ وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

”مجھے ہمدردیاں سیٹھنا سخت ناپسند ہے اور اپنے بارے میں کسی کو کچھ بتا کر میں ہمدردیاں نہیں سیٹھنا چاہتی۔۔۔۔۔ ہاں کبھی اتفاق بھی ایسا نہیں ہوا۔ بہر حال آج تو تم جان گئے ہوتا۔۔۔۔۔“

”اور تمہارے بہن بھائی۔۔۔۔۔ وہ سب کہاں ہیں؟“

”کوئی بھی نہیں۔۔۔۔۔ میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور ان کی شادی کے چند سال بعد پیدا ہوئی۔ میری پیدائش امریکا میں ہوئی اور زیادہ تر وقت میں امریکا میں گزارتی رہی ہوں۔ ڈیڑی کی ڈیڑی کے بعد میں کہیں نہیں گئی۔ اب چند دن بڑے چچا کے پاس رہتی ہوں۔ چند دن چھوٹے چچا کے پاس چند دن پھوپھو کے پاس۔ میرا تو کوئی مستقل ٹھکانا نہیں۔ ڈیڑی نے کافی پیسہ اور امریکا میں پراپرٹی میرے لیے چھوڑی ہے۔ جیب خرچ گاڑی کا خرچہ اور دوسری ضروریات کے لیے خرچہ بڑے چچا سے ملتا ہے۔ بس اور کچھ نہیں۔“

”کیا تم اپنی زندگی سے مطمئن ہو۔۔۔۔۔“

”ہاں..... اگر نہ بھی ہوں تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ اس لیے مطمئن ہونا ہی پڑتا ہے۔ بے چینی اور اضطراب صرف ڈپریشن اور پریشانیاں ہی دیتا ہے اور کچھ نہیں..... اس لیے میں کرائس میں بھی مطمئن رہتی ہوں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ وہ قدرے حیرت سے بولا۔

”میں قصص بھی ایسا ہی دیکھنا چاہتی ہوں۔ ولیم میں می، ڈیڈی کی موت کے بعد بہت ڈپریشن میں تھی یوں لگتا تھا جیسے میں سانگیو کیس بنی جا رہی تھی کہ ایک دن میں نے تنہائی میں سوچا کہ انسان تو اپنے خوابوں کے سہارے جیتا ہے اور گزر جائے وہ تو ماضی بن جاتا ہے اور ماضی تو کبھی مڑ کر واپس نہیں آتا۔ ہمیں اس شے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے جو ہمارے ہاتھ آ سکے۔ مجھے میرے خواب بہت عزیز تھے اور خوابوں کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے..... اب میں اپنے مستقبل کے لیے جدوجہد کر رہی ہوں۔ میں بے معنی کھوکھلی اور دوسروں کے سہارے زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔“

”نور..... تمہارے خواب کیا ہیں.....؟“

”میرے خواب بہت سے ہیں لیکن میری خواہش ہے کہ جب میں مروں تو میرے لیے زمین بھی روئے اور آسمان بھی..... میں انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔“

ولیم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور حریفانہ پوچھ سکا۔

”ولیم اب تم بتاؤ میری زندگی سخت گزری ہے یا تمہاری.....“

”جو جس پر گزرتی ہے وہ اسے ہی لگ جاتا ہے لیکن تمہاری بھی یقیناً بہت لمبا لائف گزری ہے۔“

”گزری نہیں..... اب بھی گزر رہی ہے مگر..... خیر تم اپنی سوچ کہ اب تم نے آنٹی کو کس طرح ڈیل کرنا ہے..... کیا انھیں سب علم ہے۔“

”نہیں..... صرف میں اور آنٹی افضال جانتے ہیں۔ لیکن ممان زیادہ تر کمرے میں رہتی ہیں۔ میرے خیال میں ان کا آپریشن جلد از جلد ہو

جانا چاہیے۔ ٹیسٹ تو ہو گئے مگر.....“

”باقی بھی سب کچھ ہو جائے گا۔ میری ماما کی جیولری میرے پاس ہی ہے۔“

”نہیں..... میں یہ نہیں لوں گا۔“

”تم مجھے لوٹا دو گے جب کسی قابل ہو جاؤ گے ورنہ میں یہی سمجھوں گی کہ میں نے اپنی ماں کی بیماری کے لیے انھیں بیچ دیا لیکن سنو اگر تم کسی

قابل ہوئے اور مجھے نہ لوٹا پائے تو میں سمجھوں گی تم نے امانت میں خیانت کی ہے۔“ وہ اس کی بات پر حیران رہ گیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”یوں کیا دیکھ رہے ہو.....؟“ نور نے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھ رہا ہوں کہ گاڈ نے کیسے کیسے عجیب لوگ بنائے ہیں.....“

”ہاں۔ بھئی عجوبے کسے اچھے نہیں لگتے..... اور مجھے کس عجوبے میں شمار کرتے ہو؟ ٹھویں میں پالوئیں میں.....“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”پہلے اور آخری میں.....“

”وہ کیوں.....؟“

”بھئی باقی سارے تو اپنی جگہ لکھ رہے ہیں نظر آ رہے ہیں اور تم بہت ان پڑکٹ سہل ہو۔ کس لمحے کیسے ری ایکٹ کرو..... کوئی

نہیں جانتا.....“

”شکر ہے تم نے اپنی رائے تو دی..... ولیم ویسے ایک بات میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں۔ آنٹی کی بیماری میں تمہیں ہر وقت ان کے پاس ہونا چاہیے اور ہاسٹل میں تم رہ نہیں سکتے۔ ہمارا گھر بند پڑا ہے میں بڑے چچا سے بات کر کے وہ کھلواتی ہوں۔ اگر وہ بان گئے تو تم لوگ ادھر شفٹ ہو جانا..... اب میں چلتی ہوں اور آنٹی کو میری طرف سے پوچھتا.....“ وہ گاگلز لگاتے ہوئے جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی اور وہ حیرت سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ وہ سنجیدگی سے اس کی باتوں پر سوچ رہا تھا کہ کس طرح ماما کو بتائے۔ اس کے لیے کتنے حوصلے کی ضرورت تھی۔ وہ تو ہمیشہ سے ماما سے ایسی باتیں سننے کا عادی تھا۔ اب ان کو کیسے، کس طرح سب بتائے..... وہ الفاظ سوچتا رہا، بہت کچا کرتا رہا، پھولیشن پر غور کرتا رہا..... کہ اسی اثنا میں آنٹی انفصال کا فون آ گیا۔ اس کی ماما کو دورہ پڑا تھا ان کی حالت بہت خراب تھی اور انہیں اسپتال لے کر جانا تھا۔

”آنٹی..... میں آ رہا ہوں بس کچھ.....“

”سنو ولیم..... بیسوں کی لگزنہ کرو..... میرے پاس کچھ پیسے ہیں بس تم آ جاؤ۔“

”فحیک ہے آنٹی.....“ اس نے فوراً فون کر کے بتایا۔

”ولیم میں آ رہی ہوں اور سنو تم نے آنٹی کو کچھ بتایا تو نہیں۔“

”نہیں، ابھی تو میں ان سے ملنے ہی نہیں گیا ابھی آنٹی انفصال کا فون آیا ہے اور میں ہاسٹل جا رہا ہوں۔“

”میں بھی پہنچ رہی ہوں.....“ اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

”نورینجی کس کا فون تھا.....“ اس کے بڑے چچا نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”انکل..... میرے کلاس فیلو کا..... اس کی ماما بہت بیمار ہیں۔ انہیں کینسر ہے اور انکل میں نے آپ سے اجازت لیتی تھی کہ میں اپنا گھر

کچھ دنوں کے لیے انہیں دینا چاہتی ہوں۔ اس کی ماما ہاسٹل میں رہتی ہیں اور وہ خود بھی۔ اس وقت ان کے پاس کوئی آسرا نہیں۔“

”کیا نام ہے اس کا.....؟“

”ولیم.....“

”ولیم.....“ انکل نے ذرا متحیرا ہوا۔ ”تم کب سے اسے جانتی ہو.....؟“

”انکل..... یہ کام میں انسانیت کے ماتے کرنے جا رہی ہوں۔ اس لیے ایسے سوالات بے معنی ہیں۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔

”مگر ہمیں ان کے بارے میں معلوم تو ہونا چاہیے.....“

”میں ان کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ لوگ کریم ہیں۔ ماما اس کی درنگ و بھین ہاسٹل میں چند روز سولہ سالوں سے رہ رہی ہیں۔ اب

کینسر کی پشخت ہیں اور وہ خود اولیول کا اسٹوڈنٹ ہے۔“

”کل کو وہ لوگ کوئی مسئلہ نہ پیدا کریں۔۔۔۔۔“

”مجبور اور بے بس لوگ خود بہت بڑے مسئلے ہوتے ہیں وہ دوسروں کے لیے کیا مسائل پیدا کریں گے۔ آپ بے فکر رہیے۔“

”نور۔۔۔۔۔ تم ابھی اتنی سمجھدار نہیں ہو۔۔۔۔۔“

”انگل تجربات انسان کو سب سمجھا دیتے ہیں۔ مجھے بھی کر لینے دیجئے۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے جو تمہاری مرضی۔۔۔۔۔“ اس کے چچا اٹھیا رڈا لیتے ہوئے بولے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ اپنی بات منوانے کی ہمیشہ سے عادی ہے

اور جو کام وہ کرنا چاہے تو پھر کوئی اسے نہیں روک سکتا۔ سارے خاندان میں وہ خود سراسر ضدی مشہور تھی۔ بہت سے لوگوں کی اس کے بارے میں مختلف آراء تھیں جن کی وہ قطعی پروا نہیں کرتی تھی۔

”تھینک یو انگل۔۔۔۔۔“ اس نے فارمیٹنگ کے طور پر کہا اور گرنڈہ جانتی تھی کہ انگل کی اس میں کوئی فائدہ نہ تھی۔ وہ اسے کسی طرح بھی نہیں روک

سکتے تھے۔ اس نے تو محض انھیں اطلاع دی تھی۔

ڈاکٹروں نے انھیں فوری آپریشن کے لیے ایڈمٹ کر لیا تھا۔ آپریشن کر کے ٹیور نکال دیا تھا اور انھوں نے اچھی طرح سے اسے ریموڈ

بھی کر دیا تھا۔ وہ مسلسل ان کے ساتھ اسپتال میں رہی۔

”ولیم اب تم لوگ میرے گھر شفٹ ہو جانا۔ میں نے بڑے چچا سے بات کر لی ہے انھوں نے اجازت دے دی ہے اور اب تمہیں آنٹی کا

بہت خیال رکھنا ہے۔ میرا گھر ہر طرح سے آرام دہ ہے تمہیں اور آنٹی کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں بھی زیادہ تر وقت ادھر ہی رہنے کی کوشش

کروں گی اور سرورنٹ کوارنٹر میں ہمارا پرانا نوکرنہ برادر اس کی فیملی رہتی ہے تم لوگوں کو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“

”تھینک یو نور۔۔۔۔۔“ مارے تفکر کے اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ وہ جمابا خاموش رہی اور اس کی طرف گہری نگاہ سے دیکھنے لگی۔

”ولیم آپریشن کی صحت کیسے کی ہے۔۔۔۔۔“

”وہ۔۔۔۔۔ آنٹی افضل نے۔“

”میں نے تم سے کچھ کہا تھا۔۔۔۔۔“

”مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی انھوں نے سب کچھ کر دیا تھا۔“

”ٹھیک ہے اگر ضرورت پڑی تو مجھے بتا دینا۔“ وہ بے سکون لہجے میں بولی۔

”نور۔۔۔۔۔ ایک بات پوچھوں۔۔۔۔۔؟“

”ہاں پوچھو۔۔۔۔۔“

”نور۔۔۔۔۔ تم اتنے بڑے بڑے اسٹاکس لیتی ہو تمہارے گارڈین کچھ نہیں کہتے۔“

”نہیں.....“ وہ آہ بھر کر بولی۔ ”کیونکہ جب وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں تھے تو انھوں نے اس کا غلط استعمال کیا اور ان کے غلط رویوں نے مجھے اپنے فیصلوں میں آزاد بنا دیا۔“

”میں سمجھا نہیں.....“

”ضروری نہیں کہ ہر بات کی سمجھا جائے..... بہت سی باتیں سمجھ میں نہ آئیں تو بہتر ہے انسان کو کچھ ڈسکورد کرنے کی جتن تو رہتی ہے؟“

”اگر تمہارے می ڈیلی ری زندہ ہوتے تو کیا تب بھی تم یہی کرتیں.....؟“

”نہیں..... تب میں بہت مختلف ہوتی۔ جب آپ کو اندازہ ہو کہ کوئی آپ کی فکر کرنے والا موجود ہے۔ آپ کو ڈی گریڈ نہیں کرے گا اور آپ کی فیلنگ کو سمجھے گا تو ظاہر ہے رویہ بھی مختلف ہوگا۔ رویہ ماحول کے مطابق پروان چڑھتے ہیں۔ میں جب چار دن ایک بچہ کی طرف آٹھ دن ایک کی طرف۔ دس دن پھوپھو کی طرف رہنے لگی تو کسی بھی گھر میں میری کوئی حیثیت نہ رہی۔ میں ایک لڑھکتا چھری رہی۔ ہر کوئی اپنی مرضی مجھ پر چلاتا۔ میں گھر کے ایک ایک فرد کی مرضی کے مطابق چلتے لگی۔ ولیم میں تھک گئی تھی۔ میرا اندر اتنا ذلیل ہو چکا تھا کہ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی میری عزت نفس ختم ہونے لگی ان دو تین سالوں میں، میں نے اتنا کچھ سہا، سمجھا اور پھر اپنے آپ کو مضبوط کیا کہ مجھے کیا کرنا ہے اب انھیں میری مرضی کے مطابق چلانا ہے۔ میرے ماں باپ میرے لیے بہت کچھ چھوڑ کر مرے ہیں۔ میری اپنی ایک حیثیت ہونی چاہیے۔ میری اپنی شخصیت اور پہچان ہونی چاہیے اور پھر میں نے یکدم اپنے آپ کو بدلا۔

اداسیاں، محرومیاں، دکھ، سب کچھ اپنے اندر کہیں دفن کر دیے۔ اب میں ایک منفرد شخصیت کی مالک ہوں۔ اب سب میری رائے کو اہمیت دیتے ہیں۔ ولیم جب آپ کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہو مگر کہنے کا حوصلہ نہ ہو تو اس کا مطلب ہے آپ ایک ناکام انسان ہیں۔ آپ کی حیثیت سوسائٹی میں زیر ہے اور آپ اپنی ذات کے ساتھ بہت نا انصافی کر رہے ہیں۔ بہت بڑا نقصان..... اور تمہاری شخصیت کا یہ پہلو مجھے بہت برا لگتا ہے۔ تم ایک اچھے انسان ہو مگر ایک دم انگ جاتے ہو۔ پھر کوئی شخص چلاتا ہے یا تم اچانک کوئی فیصلہ کر لیتے ہو جیسے میں نے بھی ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ میں اس میں بھی بہت پر عزم ہوں.....“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”کونسا.....؟“ وہ چونکا۔

”کیا تم واقعی نہیں جانتے..... اور اب میں یہ نہیں سننا چاہتی کہ تم کچھ نہیں جانتے۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

”نہیں، میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ وہ آہستہ سے مطمئن لہجے میں بولا۔

”بس میں یہی سننا چاہتی تھی.....“

”کیا تم اس سے اپنے اندر کی تسکین چاہتی ہو؟“

”نہیں..... میری محبت تمہارے رویہ نفس کی محتاج نہیں اور میں نے پہلے بھی یہ نہیں بتا دیا تھا۔“

”تو پھر.....؟“

”میں تمہارا اقرار چاہتی تھی۔“

”میں بہت پہلے اس کا اقرار کر چکا ہوں۔“

”انسان اپنی رائے بدلتا بھی تو رہتا ہے اور میں تم سے کچھ بھی توقع کر سکتی ہوں۔“

”نہیں نور۔۔۔۔۔ تم مجھے جو چاہے سمجھو۔ اچھا، برا۔۔۔۔۔ کمزور، بزدل، بیوقوف۔۔۔۔۔ کچھ بھی مگر یہ یقین رکھنا کہ اب میرے دل میں صرف اور

صرف دو لوگ رہتے ہیں۔ ایک میری ماں اور دوسری تم تم نے اپنی محبت کے لیے تو چاند اور چکوری کی مثال دے دی تھی۔ میرے پاس ایسی کوئی مثال

نہیں صرف یہی کہوں گا جیسے کرائسٹ گاڈ اور مدد میری سے محبت کرتے تھے۔ ان کے لیے بھی تو صرف دو ہستیاں تھیں میری طرح۔“

”کیا تم کرائسٹ سے بہت محبت کرتے ہو؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ بہت۔“

”اور اگر تمہیں اپنا راستہ اچانک بدلتا پڑے تو۔۔۔۔۔؟“

”ناممکن۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”ایسے سوالوں کے جوابات جذبات سے نہیں منسلک سے دیتے ہیں۔۔۔۔۔ اگر تم ایک لمحے کے لیے اس پر کچھ سوچے تو شاید مجھے تم پر حیرانی نہ

ہوتی۔۔۔۔۔ جیسی اب ہوئی ہے۔۔۔۔۔“ نور نے ہنس مکھ لہجے میں کہا۔ ولیم اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

وہ دونوں اسپتال کے لان میں کافی دیر سے چکر لگا رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ سبز پٹیراب ہوش میں تھیں ہاسٹل سے بہت سی

خواتین ان کی خیریت پوچھنے آئی تھیں اور اس لیے وہ دونوں باہر آ گئے بلکہ آ نئی افصال نے ہی دونوں کو باہر بھیج دیا تھا۔

”ولیم۔۔۔۔۔ میں نے تم میں ایک مثبت تبدیلی دیکھی ہے۔۔۔۔۔“ وہ اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا۔۔۔۔۔؟“

”تم آ نٹی کے سامنے بہت مستحکم رہتے ہو اور روئی شکل بھی نہیں بناتے۔۔۔۔۔ مجھے یہ سب اچھا لگتا ہے۔“

”شکر ہے تمہیں مجھ میں کچھ تو اچھا لگا۔۔۔۔۔“ وہ مدد می مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”کوشش کرتے جاؤ اتفاقاً ہوتا جائے گا۔۔۔۔۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”تھینک یو۔“

چند روز بعد وہ اسپتال سے نور کے گھر شفٹ ہو گئی۔ ولیم بھی ان کے ساتھ تھا۔ اتنی بڑی کوٹھی میں ہر وقت سنانا سا چھایا رہتا۔ ولیم ہر وقت

مما کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا۔ وہ بھی دن بھر وہیں ہوتی اور شام کو گھر جاتی۔ دو تین دن تو بڑے چچا نے برداشت کیا پھر خود ان لوگوں سے ملنے

چلے گئے۔ نور سبز پٹیر کو دائیں دے رہی تھی اور ولیم کہیں باہر گیا ہوا تھا۔

چچا کو یوں اچانک دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

”انکل آپ.....؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں..... اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ آپ کی مہمان ہیں۔ ان کی خیریت پوچھتا ہوں پر بھی فرض ہے۔ اسی لیے

چلا آیا۔

”تھینک یو بھائی صاحب.....“ مسز پیٹر نے جواب دیا۔ اسی لمحے کمرے میں داخل ہوا اور انھیں دیکھ کر چوٹا۔ چچا بھی حیرت سے اسے

دیکھتے رہ گئے۔ گورا چٹا، لمبا تڑکا خوبصورت نیلی آنکھوں اور تھکے نقش و بالا لڑکا انھیں ایک دم بہت مختلف سا لگا۔ ایسا مختلف چہرہ کہ بعض لوگ جنہیں دیکھ کر کہیں کم ہو جاتے ہیں۔ وہ تو تصور میں کچھ اور سوچ کر آئے تھے۔ وہ ان کی سوچ سے بہت مختلف نکلا تھا۔

”گڈ ایوننگ انکل.....“ ولیم نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”گڈ ایوننگ.....“ انکل نے قدرے محبت سے جواب دیا۔

”سر تھینک یو..... آپ اور نور ہمارے لیے بہت کچھ کر رہے ہیں۔ ماما اور میں آپ کے بہت شکر گزار ہیں۔ میں خود آپ سے ملنا چاہ رہا

تھا مگر ماما کی خرابی طبیعت کی وجہ سے میں حاضر نہیں ہو سکا.....“ وہ بہت شائستگی سے بولا۔

”کوئی بات نہیں..... بانی دادے آپ لوگ کہاں سے تعلق رکھتے ہیں۔“ نہ جانے کیوں چچا کے ذہن میں کچھ اٹک سا گیا تھا۔

”میں..... میرا مطلب ہے لاہور سے.....“ ولیم نے جلدی سے جواب دیا۔

”مگر آپ..... آپ کچھ مختلف لگے ہیں.....“ وہ کچھ تجسس ہو کر بولے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”ہاں میرے پاپا انگلینڈ سے تھے.....“

”تھے..... کیا مطلب.....؟“

”ان کی ڈیڑھ ہو چکی ہے۔ اس لیے ماما لاہور آ گئیں۔“ ولیم تفصیلات بتا رہا تھا اور مسز پیٹر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔

انھوں نے جو کچھ ولیم کو بتا رکھا تھا وہ وہی کچھ بتا رہا تھا۔

”ابنی دے ٹائس نوٹیٹ یو..... میں یہی تسلی کرنا چاہ رہا تھا۔“

”کیا انکل.....؟“ نور نے حیرت سے پوچھا۔

”ٹائس آل رائٹ ناؤ..... اب میں چلتا ہوں۔“ وہ مطمئن سے چلے گئے۔

”نور مجھے تمہارے انکل کچھ بڑا سراہے لگے ہیں۔“ دونوں انھیں گیٹ تک چھوڑنے آئے اور وہیں ہاتھیں کرنے لگے۔

”لگتے ہیں مگر ایسے ہی نہیں۔ ان کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ خواہ مخواہ جہز باڈی بننے کی کوشش کرتے ہیں۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”تم جانتے ہو وہ کیا کرتے ہیں.....؟ سراغ رساں ہیں اور نام نہاد بزنس مین بھی۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔

”واقعی.....“ ولیم نے حیرت سے پوچھا۔

”اور نہیں تو کیا، ہر بات میں میں بیخ نکالیں گے۔ ہر بات کو ٹیڑھا کر کے دیکھیں گے مگر رزلٹ ہمیشہ الٹا ہی نکلتا ہے۔ دیکھا کیسے پوز کر رہے تھے جیسے کچھ سوگھتے سوگھتے یہاں پہنچے ہوں۔ اسی لیے تو میں انہیں اچانک دیکھ کر حیران رہ گئی تھی بلکہ ڈر بھی گئی تھی کہ کچھ الٹا سیدھا مسئلہ ہی نہ کھڑا کروں۔ چچی تو ان سے سخت تنگ ہیں۔“

”اور تم.....؟“

”مجھے ان کی نفسیات اچھی طرح معلوم ہو چکی ہے اس لیے آسانی سے ہینڈل کر لیتی ہوں۔ ایک دم ایسے پوز کریں گے جیسے اچانک قیامت آگئی ہو اور اگلے ہی لمحے نارمل ہو جائیں گے۔ ویسے وہ بچہ انسان نہیں۔ ان کو دھوکا دینا دنیا کا سب سے آسان کام ہے۔ اسی لیے تو سسلی چچی ہر وقت ان کو ڈانٹتی رہتی ہیں۔“

”اچھا.....“ وہ حیرت زدہ سا تھا۔ ”لیکن خطرناک بھی بہت ہیں..... لوگوں کو رستے ہاتھوں پکڑنے کا بہت شوق ہے اس لیے اچانک چھاپے مارتے ہیں۔ اگر ہم دونوں کو اچھے موڈ میں دیکھ لیتے تو اب تک قیامت آ چکی ہوتی۔ شکر ہے تم باہر گئے ہوئے تھے مگر پھر بھی ہوشیار رہنا.....“ وہ غذا کا بتا رہی تھی کہ اچانک چچا کی گاڑی پورچ میں داخل ہوئی۔ گیٹ کھلا تھا اس لیے دونوں گیٹ کی ایک ایک سائیڈ کی طرف ہو گئے۔ نور نے مسکراتے ہوئے ولیم کی طرف دیکھا۔

”بیٹا ذرا میری بات سننا.....“ انھوں نے گاڑی سے نکلے ہوئے کہا۔

”نہیں انکل.....“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”تمہارے قادری کی ڈیجھ کب ہوئی اور تم لوگ کب لاہور آئے.....؟“

”آئی ایم سوری انکل..... مجھے صحیح سے نہیں معلوم۔ مگر شاید میری پیدائش سے پہلے۔ میں ممبئی سے چھ کرسٹماؤں کا مگر خیریت تو ہے نا.....؟“

”ہاں..... تمہارا چہرہ مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگا ہے۔“

”میرا چہرہ..... مگر کس سے.....؟“

”ہے کسی سے..... تم چھوڑ واس کو مگر مجھے اس کے بارے میں انفارمیشن چاہیے.....“

”جی ضرور.....“ اس نے کہا۔

”اوکے..... میں پھر آؤں گا.....“ وہ گاڑی ریورس کرتے ہوئے بولے۔

”مائی گاڈ..... یہ کیا مصیبت ہے..... نور تم نے ہمیں کہاں پھنسا دیا ہے۔“

”نگر نہیں کرو..... اب یہ تمہیں بہت معروف رکھیں گے..... کچھ دنوں کے بعد کہیں گے کہ تم ان کے ساتھ ان کے کام میں شامل ہو جاؤ۔“

”تمہیں معقول معاوضہ بھی ملے گا.....“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”تمہارے چچا کو میں برداشت نہیں کر سکتا۔“

”بالکل نہیں..... ایسا سوچنا بھی مت..... اب جلدی سے گیٹ بند کر رکھیں پھر نہ آ جائیں۔ میں قسمیں ایک راز بتاؤں گی تو تم ان کے شر سے محفوظ رہو گے۔“

”تو ابھی بتا دو نا.....“ وہ بے صبری سے بولا۔

”افوہ پایا بتا دوں گی.....“

”ویسے ہائی داوے..... یہ گھر میں کیا کرتے ہیں.....؟“

”گھر میں دیکھے بیٹھے رہتے ہیں۔ چچی کے سامنے ان کی ایک نہیں چلتی گھر میں ہوں تو لگتا ہے کوئی ہے ہی نہیں..... اسی لیے تو بچارے باہر ہی اپنا ایڈوچر پورا کرتے ہیں۔“

”کیا یہ تمہارے گارڈین ہیں.....؟“

”ہاں..... ان کی کوئی اولاد نہیں۔ اس لیے ڈیڑی نے بھی ڈسٹھ سے پہلے دل میں انہیں میرا گارڈین بتا دیا۔ ان جیسا بندہ پورے خاندان میں نہیں۔ مجھ پر ہر طرف سے نگاہ رکھتے ہیں اور نگاہ بھی ایسی..... کہ پوچھو مت عتاب سے زیادہ تیز نکالیں ہیں لیکن نگاہیں جتنی تیز ہیں عقل اتنی ہی کم۔ قسمیں بھی اعزاز ہو جائے گا۔“

نور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور دونوں گیٹ اچھی طرح بند کر کے اندر آ گئے۔ مسز پیٹر چچا کی غیر متوقع آمد اور سوالات سے پریشان ہو گئی تھیں۔

”آئی آپ پریشان نہ ہوں۔ انگل کی باتیں سیر نیسلی نہ لیں دراصل وہ سرائے رساں ہیں اس لیے ہر ایک سے سوالات پوچھتے رہتے ہیں۔“ نور نے ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

”ویسے ما..... پاپا میری برقعہ سے کتنے بار پہلے فوت ہوئے تھے.....؟“ ولیم نے اچانک سوال کیا تو وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”ولیم..... پاگل ہو گئے ہو کیا.....“ آنٹی کی حالت تو دیکھو اور تم کیسے سوالات کر رہے ہو۔ آنٹی آپ آرام کریں ہم ابھی آتے ہیں۔“ وہ دروازہ بند کر کے اسے ساتھ لے کر باہر آ گئی۔

”تم بھی کمال کرتے ہو، اتنے مہر آ پریشن کے بعد تو انسان کی یادداشت بھی ٹھیک نہیں رہتی اور تم انہیں ایک برا واقعہ یاد دلانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”اوہ میں تو بھول ہی گیا.....“ ولیم تاسف سے بولا۔

”اب میں چلتی ہوں اور اب آنٹی کو آرام کرنے دینا اپنی فضول باتوں سے ڈسٹرب نہ کرنا.....“ وہ ہیک اٹھاتے ہوئے بولی۔

”تم نے وہ راز نہیں بتایا.....“ ولیم نے اس بات کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہ..... ہاں..... ایسا کرومین گیٹ پر باہر سے تالا لگا دو اور پیچھے ایک سائیڈ گیٹ ہے چھوٹا سا، اسے بھی تالا لگا دو پھر دیوار پھلانگ کر

اندر چلے جانا۔“

”کمال کرتی ہو وہ ڈھلے کٹو ہیں اگر دیوار پھلانگ کر آ گئے اور ہمیں گھر کے اندر پایا تو.....“

”میں انہیں تادوں گی کہ تم جب بھی گھر سے باہر جاتے ہو تالا لگا کر جاتے ہو اور باقی ملازم گھر کے اندر ہی ہوتے ہیں اور آ نٹی بھی اور ظاہر ہے وہ تم سے سوالات کرنے آئیں گے۔ آ نٹی سے یا ملازمین سے نہیں کیونکہ ان کا مارگٹ تم ہو۔ ان سے بچ سکتے ہو تو پھر در نہ تمہارا اللہ حافظ ہے۔“ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی وہ بھی مسکرانے لگی۔



شہلا کی شادی پر دور و نزدیک سے مہمان آئے تھے۔ خوب کہا بھی اور رونق تھی۔ حویلی کی جدید آرائش کے لیے شہر سے خصوصی طور پر ٹینٹ سروں والے لوگ آئے تھے۔ حویلی سے ملحقہ وسیع رقبے پر محیط باغ میں برسات کا فنکشن ارینج کیا گیا تھا۔ تبسم اور فاطمہ آ پاس کے سارے چاؤ پارے کر رہی تھیں۔ اس کے ہر طرح سے ناز و نخرے اٹھائے جا رہے تھے۔ حویلی کے نوکر، نوکرانیاں اور ان کے خاندان بھرپور انداز میں شرکت کر رہے تھے۔ ایسی زبردست شادی شفق نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ انواع و اقسام کے کھانے تیار ہو رہے تھے۔ جس دن سے شہلا گاؤں آئی تھی شفق اندر ہی اندر شدید ذہنی پریشانی کا شکار تھی۔ شدید احساس محرومی نے اس کے دل و دماغ کو بہت متاثر کیا تھا۔ حیدر انکل نے ہر ایک سے اسے اپنے ایک دیرینہ دوست کی بیٹی کے نام سے متعارف کرایا تھا۔ تبسم آ پاس سے دیکھ کر ایک لمحے کو چونکی تھیں۔ اس کے خدو خال نین لٹش، سب کافی حد تک شہلا سے ملتا تھا اور نام بھی جانا پہچانا۔ آپا نے حیدر کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور پھر خاموشی سے شفق کی طرف دیکھنے لگیں۔

”حیدر یہ تمہارے کس دوست کی بیٹی ہے؟“ آپا نے اچانک پوچھا تو وہ بھی چونک گیا۔

”وہ آج کل امریکا میں ہے..... یہ اس کی انگوٹھی اولاد ہے اس لیے میرے پاس چھوڑ گیا۔“ حیدر انہیں تفصیلات بتا کر نئی مصیبت کھڑی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آپا مطمئن ہو گئیں کیونکہ وہ منصور اور حیدر کے تعلقات سے بہت اچھی طرح واقف تھیں اور منصور اپنی بیٹی حیدر کے پاس چھوڑے گا۔ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی شہلا سے اس حد تک مشابہت اتفاقیہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے انہوں نے اس کو مزید نہ کر دیا۔ شہلا حیدر تو ہر ایک سے کبھی کبھی ملتی تھی۔ اس سے کیا فری ہوتی۔ دونوں بینش انتظامات دیکھنے میں مصروف تھیں وہ بری طرح نظر انداز ہو رہی تھی۔ ماہوں کی رات بھی وہ اپنے کمرے میں بند رہی کسی نے اس کو بلانا ضروری نہ سمجھا۔ ہر کوئی مصروف تھا اور وہ کسی کے لیے بھی ضروری نہ تھی۔ اس نے ماں کی غیر موجودگی اور باپ کی موجودگی میں جس طرح کی بے آسرا زندگی گزاری تھی اس نے اس کو تنہائی، یاسیت اور دکھ کے علاوہ کچھ بھی تو نہیں دیا تھا اور عابد والے واقعے نے تو اس کی روح تک کو جنم جوڑ ڈالا تھا۔ اس کا انسانیت پر سے ہی اعتبار اٹھ گیا۔ اگر ماما انہیں یوں تنہا چھوڑ کر نہ جاتیں تو شاید وہ آج کی شفق سے بہت مختلف ہوتی۔

اس کے پاس تو کوئی ایسا رشتہ نہ تھا جس کی طرف وہ اعتماد سے دیکھتی۔ شہلا حیدر اسے بہت خوش قسمت معلوم ہو رہی تھی جس کے اتنے لاڈ اٹھائے جا رہے تھے اور جس کا اتنی محبت کرنے والا باپ موجود تھا۔ یہ دن اس پر بہت بھاری تھا۔ وہ ہر لمحہ اندر ہی اندر نہ جانے کتنے آنسو بھرتی رہی۔ مگر جتنی اپنے آپ کو تسلیاں دینے کی کوشش کرتی اتنی بکھرتی جا رہی تھی۔ اس کے حافظے میں کوئی ایک شخص بھی تو ایسا نہ تھا جس نے کبھی بھی زندگی میں اس

کے لیے پریشانی اٹھائی سوائے سہیل کے اور وہ بھی نہ جانے کس حالت میں ہوگا۔ اسے بھی پاپا نے جیل کی تاریک کوٹھڑی میں بند کروا دیا تھا اور اب وہ تنہا تھی۔ ہاں ساری رات ڈھول بجاتے رہے۔ عورتیں گیت گاتی رہیں مگر وہ افسردہ ہی اپنے کمرے میں گیلی لکڑیوں کی طرح سلکتی رہی۔ رات شمع کی مانند آہستہ آہستہ اپنے اختتام کو پہنچنے والی تھی جب بشری آپا کو ایک دم السوس سا ہوا۔ وہ شاید کھانا کھائے بغیر سو رہی تھی اور مایوں کی رسم میں بھی موجود نہیں تھی حیدر شاہ کو معلوم ہوگا تو وہ کتنے ناراض ہوں گے اور وہ یہ بات اب کسی سے نہیں کرنا چاہتی تھیں مگر انھیں یوں اس کا لاوارثوں کی طرح بیٹھے رہنا بہت قابل رحم لگا۔

اگلی صبح انھوں نے جھنجھوڑ کر اسے خود ناشتہ کروایا مگر کوئی بات نہ کی۔ ”تم آج برات میں کیا پہنو گی.....؟“ بشری آپا نے اس کی توجہ دوسری طرف کرنا چاہی۔

”میں..... معلوم نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اچھا سا سوٹ پہنا..... کیا تمہارے پاس اچھے کپڑے ہیں میرا مطلب ہے کوئی چمک والے؟“

”نہیں.....“

”تو تم نے مجھے بتایا ہی نہیں.....“

”کیا بتاتی.....؟“

”اچھا میں دیکھتی ہوں۔ شہلا بی بی کا کوئی سوٹ لا دوں۔“ بشری آپا اپنی ہی لے میں بولیں تو اس نے چونک کر انھیں دیکھا مگر خاموش رہی۔ اسے شدید تھک لیل محسوس ہوئی کہ اب وہ دوسروں کی اترن پہنے گی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ کبھی کبھی زندگی کیسے موز پر لا کھڑا کرتی ہے کہ انسان خود ہی چونک جاتا ہے۔ وہ خود لاکھوں کروڑوں کی مالک اب کتنی بے وقعت ہو گئی تھی۔ اس کی وارڈ روب قیمتی سے قیمتی ملبوسات سے بھری رہتی تھی۔ مگر نہ اسے کپڑوں کی پروا ہوتی تھی نہ زیورات کی اور نہ ہی زندگی کی..... اس کے لیے سب کچھ بے معنی تھا اور اب بے معنی چیزیں بھی اپنی حیثیت دکھانے لگی تھیں۔ شام کو برات سے پہلے بشری آپا شہلا حیدر کا ایک کامدار جاننی اور شائنگ چمک سوٹ لے کر آئیں۔

”شفق یہ تم پر بہت اچھا لگے گا.....“

وہ خاموش رہی اور سوٹ کو دیکھتی رہی۔

”کیا تمہیں پسند نہیں آیا.....؟“

وہ پھر بھی خاموش رہی۔

”بتاؤ نا کیا بات ہے..... کوئی دوسرا لے آؤں۔“

”نہیں آپا..... میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں شادی میں نہیں جاؤں گی۔“

”ہیں..... ہیں..... کیا کہا تم نے..... تم شہلا بی بی کی شادی میں نہیں جاؤ گی تو حیدر سائیں کیا کہیں گے۔“

”انہیں کوئی فرصت ہے۔۔۔۔۔“

”یہ مت کہو، وہ تو مایوں کی رسم میں ادھر نہیں آئے ورنہ اب تک۔۔۔۔۔ اور یہ بھی تو دیکھو کہ وہ تمہارا کتنا خیال رکھتے ہیں اور تم ان کی بیٹی کی شادی میں نہیں جاؤ گی تو وہ کیا سمجھیں گے۔“

”کچھ نہیں سمجھیں گے۔۔۔۔۔ کسی کو کسی کے نہ جانے سے نہ فرق پڑتا ہے اور نہ آنے سے میں کسی کے لیے بھی اہم نہیں۔ آ پاپس آپ جائیں میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”نہیں شفیق بیٹی یوں مت کہو۔۔۔۔۔ اچھا نہیں لگتا۔ تم میری خاطر چلو۔۔۔۔۔ یوں سمجھو اپنی ماں کی خاطر۔۔۔۔۔“ بشریٰ آپا نے محبت اور اپنائیت سے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔

شہلا حیدر سرخ اور نیوی بلیو کا مدار غرارے میں زیورات سے لدی ہوئی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ایسی حسین پری جس پر نظر نہیں ٹھہر رہی تھی۔ جسم آ پاپا اور قاطعاً اس کی بلانیں لیے نہیں تھک رہی تھیں۔ اس کا سارا انضیال جمع تھا مگر وہ خود بہت افسردہ تھی۔ وہ رخصتی سے پہلے حیدر شاہ سے ملنا چاہتی تھی۔ جسم آ پاپا حیدر شاہ کو بلا کر ایک کمرے میں لے گئیں شہلا پہلے سے وہاں بیٹھی تھی۔ حیدر نے ایک تک اسے دیکھا جیسے اس کی بلانیں لے رہا ہو اور پھر استغہا میہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے، خیر بہت تو ہے نا۔۔۔۔۔؟“

”پاپا آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ یہ میں جانتی ہوں اور یہ بھی اچھی طرح جانتی ہوں کہ جتنے آپ وسیع القلب ہیں شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ اسی لیے میں آپ سے سب باتوں کی معافی چاہتی ہوں۔“ وہ حیدر کے قدموں میں گر گئی۔

”اٹھو یہاں سے۔۔۔۔۔ میں نے ہمیشہ تمہیں اپنے دل میں جگہ دی ہے۔ کبھی بھی روایتی باپ بننے کی کوشش نہیں کی۔ شہلا مجھے اپنی زندگی میں کوئی ایسا لمحہ یاد نہیں آتا جب میں نے تم سے کوئی زیادتی کی ہو۔ میں خود بہت منفرد باپ بننے چلا تھا اور تمہیں منفرد بیٹی بنانے مگر شاید ہم سب انسان اندر سے ایک ہی ہوتے ہیں کبھی احساسات، جذبات اور انسان کی سوچ بھی بدلی ہے۔ مگر تم نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔۔۔۔۔“ حیدر نے آہ بھر کر کہا۔ ”تم نے اپنے باپ کو شک کی نگاہ سے دیکھا۔۔۔۔۔“ حیدر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”مگر خدا نے شاید ہر باپ کو اتنا وسیع القلب بنایا ہے کہ جب بھی اپنی اولاد کی طرف بدلے کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو اس کی نگاہ خود بخود جھک جاتی ہے وہ اولاد کے لیے بددعا تو کر ہی نہیں پاتا۔ وہ بڑی ہی بد نصیب اولاد ہوگی جس کے لیے کوئی باپ بددعا کرے گا۔ میرے دل میں اب بھی تمہارے لیے برے جذبات نہیں۔۔۔۔۔ تم جہاں رہو خوش رہو۔“ حیدر نرم آنکھوں سے مڑنے لگا۔

”نہیں پاپا، میں ایسے نہیں جاؤں گی جب تک آپ میرے گناہوں کا کفارہ نہ بتادیں۔۔۔۔۔“ وہ رونے لگی اور اس کا مسکرا بہہ کراس کے چہرے پر میک اپ کی تہوں پر لکیریں چھوڑنے لگا۔

”کیا تم سمجھتی ہو کہ تم نے واقعی کوئی گناہ کیا ہے۔۔۔۔۔؟“ حیدر کی نظروں میں گہرا استغہا م تھا۔

”ہاں..... شاید میرا ضمیر مجھے ہر وقت ملامت کرتا رہتا ہے۔“

”کس بات پر.....“

”اس پر کہ جو میں نے آپ سے کہا.....“

”اور اس پر نہیں جو تم نے اس عورت سے کہا.....“

”نہیں.....“

”کیا تم جانتی ہو کہ تمہارے جانے کے بعد وہ کس قدر بیمار پڑ گئی اور اسے برین ٹیمپریج ہو گیا.....“

”اوہ..... نو.....“ وہ چلائی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ”آئی ایم سوری..... آئی ایم ریلی سوری.....“ وہ اپنا زیور لوچنے لگی..... ”پاپا

کاش آج مجھے یہ سب نہ ملتا۔ میرے لیے تو اس احساس کے ساتھ جانا ہی مشکل ہو رہا تھا کہ میرا باپ مجھ سے ناراض ہے اور آپ نے مجھے یہ خبر بھی سنادی۔“

”خاموش ہو جاؤ شہلا اب رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں بھی تمہیں نہیں بتانا چاہتا تھا مگر تمہاری ہٹ دھرمی کی وجہ سے بتانا پڑا۔

شہلا جب ہم کسی دوسرے پر چلاتے ہیں یا زیادتی کرتے ہیں تو ایک لمحے کو یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ سننے والا بھی ہماری طرح کا انسان ہے۔ اس کی بھی مجبوریاں ہو سکتی ہیں۔ اس کے بھی دکھ ہو سکتے ہیں اور اس کے بھی احساسات آپ کی طرح ہی نازک ہو سکتے ہیں۔ ہم ساری اچھائیاں اپنے لیے اور ساری عداوتیں اور برائیاں دوسروں کے لیے ہی کیوں سوچتے ہیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم خوشی خوشی اپنے سسرال جاؤ۔“

”نہیں، اب نہیں..... میں آج ہی شادی سے انکار کر دوں گی۔“

”یہ کیا پاگل پن ہے۔ دکھ تو تم نے مجھے دیا ہی ہے اور اب ایسا صدمہ بھی دینا چاہتی ہو کہ ضرار حیدر جان سے بھی جائے۔ تمہارے اور میرے درمیان جو کچھ ہے اسے صرف میں، تم اور تبسم آ پا جانتے ہیں اور اس طرح کی حرکت کر کے تم لوگوں پر کیا واضح کرنا چاہتی ہو کتنی زبانوں اور کتنی نگاہوں کو میرے اور اپنے لیے ایک امتحان بنانا چاہتی ہو۔ میں تبسم آ پا کو بھیج رہا ہوں۔ جو کچھ خاموشی سے چل رہا ہے اسے چھپنے دو۔“

”پھر آپ کو مجھے معاف کرنا پڑے گا۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”جاؤ شہلا..... اگر تمہیں اس سے تسکین ملتی ہے تو یہ بھی کیا..... تم خوش رہو.....“ اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور ہار نکل گیا۔

اسد علی شاہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا دونوں کی جوڑی چاند اور سورج سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ شہلا کے ننھیالی ہار دونوں کو چوم رہے تھے مبارکبادیں دے رہے تھے مگر شہلا کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہ تھی۔ وہ خاموش سی بیٹھی تھی مگر اسد علی شاہ بہت چمک رہا تھا۔ شفق کی نظریں ان دونوں پر تھیں۔ وہ ایک کونے میں خاموش بیٹھی تھی اور نہ جانے کیا کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کے اندر شدید احساس عروسی تھی۔ ہر چیز کی کمی وہ اپنے اندر محسوس کر رہی تھی۔ خوشی کی، اعتماد کی، سکون کی، تحفظ کی، عزت کی اور رشتوں کی محبت والہت کی..... اس کے ماں باپ زندہ تھے مگر وہ اپنے آپ کو شروع سے ہی بے آسرا اور لاوارث محسوس کرتی آرہی تھی۔ کیا یہ زندگی یونہی یا سیت اور تنہائی کی نذر ہو جائے گی۔ میری زندگی میں خوشی کی کوئی رمت

کوئی کرن، کوئی خوشبو، کوئی جھونکا کبھی نہیں آئے گا۔ زعمہ انسانوں کے لیے یہ چیزیں آکسیجن کا کام کرتی ہیں اور میری آکسیجن تو رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ کاش میں بھی اس آکسیجن کی طرح جلد ختم ہو جاؤں اور پھر کچھ نہ رہے۔ نہ شفق نہ اس کی تنہائی، نہ اس کا خوف اور نہ اس کے دکھ کاش میں خاک میں خاک ہو جاؤں۔ میں نے اور آفاق نے زندگی سے کیا پایا ہے۔ ہم دلوں نے کس طرح کی زندگیاں گزاری ہیں۔ جس عمر میں چہروں پر مسکراہٹیں اور قہقہے، رعنائیاں پیدا کرتے ہیں ہم نے تنہائیاں، خوف اور سکوت چہروں پر سجایا اور نتیجہ کیا نکلا وہ دگر رفتہ بن گیا اور میں سائیکو..... وہ خود بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا رویہ نارمل انسانوں جیسا نہیں رہا تھا۔ اسے شدید ڈپریشن ہونے لگا وہ اٹھ کر اندر آ گئی۔ کسی نے نہ اس کے آنے کا نوٹس لیا نہ جانے کا۔ نہ کسی نے بیٹھنے کو کہا اور نہ اب جانے کو۔

بعض لوگ حشرات الارض کی طرح ہوتے ہیں جن کے ہونے نہ ہونے سے اہل زمین کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اپنے کمرے میں آگئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ ماں کا چھوڑ کر جانا۔ پاپا کا شزا کے ساتھ مسکراہٹیں بکھیرتا چہرہ اور اس رات ملک کی موت پر ہلک ہلک کر رونا۔ اس کا اکرم کے ساتھ سونا عابد اور زویا کا ڈانچ دینا..... یہ سب اسے شدید قہر والا کرنے لگا اس نے ایک زوردار چیخ ماری وہ فرش پر گر کر ترپنے لگی۔ وہ نہ جانے کیا کیا کہتی رہی..... کتنا چنجی رہی..... کس کس کو مدد کے لیے بلاتی رہی اسے کہاں کہاں درد ہوتا رہا..... کسی کو بھی خبر نہ ہوئی وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ باہر شادی کا بنگامہ عروج پر تھا۔ ڈھول زور زور سے پیٹے جا رہے تھے رسومات جاری تھیں۔ رخصتی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ شہلا کو بہت محبت اور پیار سے رخصت کیا گیا۔ حیدر نے خود اسے گاڑی میں بٹھایا وہ باپ کے گلے لگ کر بہت روئی۔ حیدر کی بھی آنکھیں نم تھیں مگر بری نہیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbook.com

”پاپا آپ نے مجھے.....“ اس نے آہستہ سے سرکوشی کی۔
”ہاں..... ہاں..... بس اور کچھ نہیں۔“ اس نے اس کی پیشانی کو چوما۔ اسد علی شاہ کو گلے لگایا اور محبت سے دونوں کو رخصت کر دیا۔ لوگ آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگے۔

رات کافی گہری ہو رہی تھی رفتہ رفتہ رات کی خاموشی اور سکوت نے ہر ایک شے پر اپنا قبضہ بھانا شروع کر دیا۔ تبسم آپا اور قاطرہ آپا کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی رہیں اور پھر تھکاوٹ کی وجہ سے وہ بھی سونے کے لیے چلی گئیں۔ سب لوگ جا چکے تھے مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی شہلا حیدر کھٹ سے اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی۔ بائیس تیس سال سے دونوں کا ساتھ تھا۔ بہت دکھ سکھ اکٹھے شیر کیے تھے۔ زندگی کے ہر پہلو کو ڈسکس کیا تھا۔

انسانی رویوں پر بخشش کی تھیں۔ اس نے اسے اپنی پشت پر بٹھا کر حویلی کی سیر کرائی تھی۔ اس کے لیے سائیکل اور موٹر سائیکل چلائی تھی۔ ایک دفعہ اس کے لیے رکشہ بھی کرائے پر لے کر چلایا تھا۔ اس کے لیے ہر وہ کام کیا تھا جس کی وہ تمنا کرتی اور جب وہ کھلکھلا کر قہقہے لگاتی تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ اس کی آج تک اس نے کوئی خواہش رو نہیں کی تھی۔ اس کی ایک محبت کے جواب میں دس محبتیں لوٹائی تھیں۔ اس کو زندگی میں کبھی بھی تنہا نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو اس نے اپنے لبوں سے چوما تھا۔ اتنی محبتیں، اتنی چاہتیں، اتنی عنایتیں، اتنا

اعتماد سب کچھ تو اس نے اسے دے دیا تھا اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں رکھا تھا مگر شہلا حیدر کسی ایک محبت کا حق بھی ادا نہ کر سکی اور باپ کے احساسات اور جذبات کو سمجھنے کی وجوہات ایک لمحے میں اپنے وعدے اور اقرار سے پھر گئی کہ وہ بھی اسے اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہے۔ اس کے شدید رد عمل نے حیدر کو بہت تکلیف دی تھی۔ جب خون کے رشتے یوں بدل جائیں تو دوسروں پر کیا اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ ہر رشتہ اسے ناپائیدار اور مفاد پرست لگنے لگا۔ مگر اس کی اپنی ایک مخصوص سوچ تھی کہ ہم سب انسان خطاؤں کے پتلے ہوتے ہیں اور مختلف حالات میں انسان کا غیر متوقع رد عمل اس کی ساری زندگی کی کہانی کا آئینہ دار نہیں ہو سکتا۔ ایسی مثبت سوچ اس کو انسانیت پر سے اعتبار کھونے نہیں دیتی تھی۔ شہلا حیدر فراک پہننے کی عمر سے لے کر عروسی جوڑے تک لمحہ بہ لمحہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔

کاش وہ انہی اچھے جذبات کے ساتھ رخصت ہوتی تو حیدر کا دل یوں کر ہی نہ ہوتا مگر حالات کا انسان کے بس میں ہونا اور انسان کے رد عمل کا ان کے مطابق ہونا بھی شاید انسان کے اپنے بس میں نہیں۔ وہ شہلا حیدر کو قصور وار سمجھتے ہوئے بھی اور اس کے پوزیٹو رویے کو سامنے رکھتے ہوئے بھی اسے قصور وار نہیں ٹھہراتا تھا۔ باپ اور اولاد کے درمیان رویوں کا یوں حائل ہونا قابل مذمت تو تھا مگر ان نہ چرل نہیں تھا۔ حویلی کے اس کمرے میں یادوں کا خزانہ تھا۔ جس شے کی طرف دیکھتا یادوں کے در پہچے وا ہوتے جاتے..... شہلا کے ساتھ گھنٹوں آتش دان کے پاس بیٹھ کر کالج اور یونیورسٹی کی باتیں کرنا..... محبت اور داری کی باتیں کہہ سن کر مسرور ہونا..... ایک دوسرے کو تنگ کر کے خوش ہونا..... اور پھر طاہرہ کی سنگت میں اس کمرے اور اس کی چیزوں کو شیر کرنا۔

بیز کے ساتھ جھولتی اینری چیئر پر بیٹھے بیٹھے اس کا اونگھنا اور طاہرہ کے شکوے سننا کمرے کے ایک کونے میں رکھے لکڑی کے جھولے میں شہلا حیدر کو جھولا جھلاتا..... کونے میں رکھی ٹیبل اور اس پر رکھے یسپ کی روشنی میں حیدر کا شہلا کو پڑھانا..... سب کچھ اپنی جگہ پر تھا اور ان سے منسلک یادیں بھی جوں کی توں ذہن میں موجود تھیں مگر وہ انسان نہیں رہے تھے۔ ان چیزوں کو چھونے والے..... اپنی یادیں ان پر نقش کرنے والے اور یادوں کو زندگی بخشنے والے..... کوئی بھی تو نہیں رہا تھا، سب اپنی اپنی منزل کی طرف گامزن تھے..... اور وہ خود بھی..... کسی دن ایک یاد بن جائے گا..... جیسے شہلا یاد بن گئی تھی..... طاہرہ اور شہلا حیدر بھی..... اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ تین بج چکے تھے۔ مارچ کے مہینے میں خشکی کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔ بہار کی آمد نے وجودوں پر جی خشکی کی تہوں کو کافی حد تک کرید ڈالا تھا اور اب وہ نرم، گرم، ٹھنڈے خوشگوار جھونکوں سے انھیں موسم کے حسین تغیر سے معطر کر رہے تھے۔ اس نے کھڑکیاں کھولیں اور شہلا کے جھولے کے پاس آ کر رک گیا..... اسے اپنے ہاتھوں سے جھلانے لگا جیسے وہ بچپن میں اسے جھلانے کا عادی تھا۔

یادیں ہی یادیں تھیں۔ اچھی اور تلخ..... خوبصورت اور کریمہ..... اس کے لیے وہاں رکنا محال ہو رہا تھا..... وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا..... اور برآمدے میں آہستہ آہستہ چلنے لگا..... چودھویں کا چاند پورے صحن کو اپنی ٹھنڈی ڈھلکی روشنی سے منور کر رہا تھا۔ وہ نادانستہ اپنے لیے برآمدے کا چکر لگا رہا تھا۔ برآمدے میں موجود قطار در قطار کمروں کے دروازے بند تھے مگر چلتے چلتے وہ رک گیا..... شفق کے کمرے کے سامنے..... اس کا دروازہ آدھا کھلا تھا اور آدھا بند تھا..... لائٹ آن تھی..... اسے حیرت ہوئی۔ کیونکہ اس نے بشریٰ آ پاسے کہہ رکھا تھا کہ سوتے وقت ہر ایک کا

دروازہ اچھی طرح بند ہونا چاہیے۔ مگر شاید شادی کی وجہ سے کسی کو بند کرنا یاد نہیں رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر اندر بھاگنا تو دیکھ رہا تھا۔ شوق زمین پر گری تھی اور خون اس کے ماتھے سے بہہ کر اب جم چکا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا اور جلدی سے اسے اٹھا کر بستر پر لٹایا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ جب سے اس نے سید صاحب کی جگہ جانشینی اختیار کی تھی اس نے ڈاکٹری کو خیر ہوا کہہ دیا تھا اور پولیکس میں آنے کے بعد اسے پولیکس کی فرصت تو بالکل ہی نہیں ملتی تھی۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے سے فرسٹ ایئر باکس لایا۔ اس کا خون صاف کر کے ہینڈج کی اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور حیدر کو یوں اپنے پاس بیٹھے دیکھ کر وہ چونک گئی۔

”انگل..... آپ..... کب..... یہاں آئے.....؟“

”مجھے چھوڑ دو..... مگر یہ بتاؤ کہ آپ کو کیا ہوا تھا اور کب سے ایسا ہو رہا ہے؟“

”معلوم نہیں انگل..... ایک دم بہت شدید چکر آیا اور مجھے لگا جیسے میں وہیں گر جاؤں گی۔ اس لیے میں کمرے میں آ گئی اور پھر کب میں گر گئی مجھے یاد نہیں.....“

”بیٹا مجھے لگ رہا ہے آپ کچھ پریشان ہیں۔“ حیدر نے پیار سے پوچھا تو اس کی آنکھوں سے جیسے خشے ابل پڑے..... اچھے آنسو کہہ جھینے میں نہیں آ رہے تھے۔

”آپ روکیں رہی ہیں کچھ تو بتائیں..... ہر مسئلے کا حل ہے.....“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”نہیں انگل..... ہمارے مسئلوں کا کوئی حل نہیں۔“

”مگر پھر بھی..... کچھ تو بتاؤ نا.....“ اس نے اسے دلاسا دیا اور جیب میں سے دو مال نکال کر اس کی آنکھوں کو صاف کیا تو وہ اور شدت سے رونا شروع ہو گئی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”دیکھو..... اگر آپ کچھ نہیں بتاؤ گی تو میں کیسے جان پاؤں گا کہ آپ کس بات سے پریشان ہو..... کچھ تو بتاؤ آخر ہوا کیا ہے..... رونے سے مسئلے حل تو نہیں ہوتے.....“ وہ اسے سمجھا رہا تھا اور وہ خاموشی سے سن رہی تھی۔

”انگل..... کیا میری ماما بہت بری تھیں.....؟“ اس کے اس سوال پر حیدر چونک گیا اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”آپ کیوں ایسا پوچھ رہی ہو بیٹا.....؟“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”انہوں نے ہمارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے..... انہوں نے ہمیں یوں چھوڑ دیا جیسے جانور اپنے بچوں کو ادھر ادھر پھینک کر چلے جاتے ہیں..... انگل آئی رینلی مس ہر.....“

”ہاں میں جانتا ہوں لیکن تمہارے پاپا نے بھی تو ان کے ساتھ بہت زیادتیاں کی تھیں۔“

”مگر اس میں ہمارا کیا قصور تھا..... ہم نے کیا گناہ کیا تھا۔ ان دونوں نے ہم سے ہمارا بچپن، ہماری شراعتیں، مسکرائشیں اور سب کچھ ہی تو

چھین لیا۔۔۔۔۔ شہلا ہاتھی تو بہت خوش قسمت ہیں کہ انھیں آپ جیسا باپ ملا اور ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں نہ ممانہ پاپا۔۔۔۔۔ نہ بہن اور بھائی بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہم روتے تھے تو کوئی آنسو پونچھنے والا نہ ہوتا تھا اور دکھی ہوتے تھے تو کوئی دکھ سن کر تسلی دینے والا نہ ہوتا تھا۔ میں اور آفاق پوری زندگی کل کر نہیں بنے۔۔۔۔۔ انکل جو لوگ دوسروں کی خوشیوں کو چھین لیں کیا انھیں معاف کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔ خدا کرے وہ بھی اسی طرح مشکلات سے گزریں۔۔۔۔۔ انھیں بھی اندازہ ہو کہ کھا اور غم جب خون میں گردش کرتا ہے تو کیا محسوس ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ”وہ بے ٹکان بولتی جا رہی تھی۔

”بس کرو شفیق بیٹا۔۔۔۔۔ اتنی بددعا میں مت دو۔۔۔۔۔ نامعلوم کون کتنے کرب سے پہلے ہی گزر رہا ہے۔۔۔۔۔“ حیدر آہستہ سے بولا تو وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”انکل۔۔۔۔۔ آپ ماما کو اچھی طرح جانتے تھے نا؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“

”تو پھر انھوں نے ایسا کیوں کیا۔۔۔۔۔؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں بیٹا۔۔۔۔۔؟“

”کیوں انکل، آپ تو ان سے محبت کرتے تھے نا؟“ شفیق کے منہ سے نادانستہ نکلا تو حیدر نے اس کی طرف حیران کن نگاہوں سے استفہامیہ انداز میں دیکھا۔

”آئی ایم سوری۔۔۔۔۔ لیکن پاپا جب بھی ماما کو کہتے تھے تو آپ کو بھی ضرور انوا لو کرتے تھے۔۔۔۔۔“ وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی اور حیدر بیٹا کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گیا۔

”سوری انکل۔۔۔۔۔ آپ ناراض تو نہیں ہیں۔۔۔۔۔ نہ جانے کیسے اچانک میرے منہ سے نکل گیا۔۔۔۔۔“ شفیق اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی آئی۔

”ہم بہت سی باتوں میں دوسروں کو الزام دینے کے عادی ہوتے ہیں اور۔۔۔۔۔ اور تمہارا باپ بھی ان میں سے ایک تھا۔ جو کچھ بھی تھا وہ اس کی شادی سے پہلے تھا جب ہم کزنز تھے مگر شادی کے بعد وہ منصور اور تم لوگوں سے بہت قطع تھی اس نے تو مڑ کر بھی حویلی کی طرف نہیں دیکھا۔ منصور نے اس پر اتنا تشدد کیا اور اتنی ذہنی اذیتیں دیں کہ وہ خود ہی سب کچھ چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کی طرف سے اپنا ذہن صاف کر لو۔۔۔۔۔ اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ کوئی بھی ماں اپنے بچوں کو چھوڑ کر مطمئن زندگی نہیں گزارتی۔“ حیدر نے شہلا کا دفاع کرنے کی پوری کوشش کی۔

”لیکن۔۔۔۔۔؟“

”لیکن کچھ نہیں۔۔۔۔۔ اب جاؤ اور آرام کرو۔۔۔۔۔“ حیدر کہہ کر خاموشی سے آگے بڑھ گیا اور وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔



ملک منصور کی ایکشن کمپن بہت کامیاب جا رہی تھی اور شزا اس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ اسے اپنی کامیابی یعنی نظر آ رہی تھی۔ دونوں ایک جیسے سے تھکے ہارے رات کے تین بجے لوٹے تھے۔۔۔۔۔ ایکشن نے اچانک دونوں کا پھر سے ملاپ کر دیا تھا اور نہ ملک منصور تو کئی کئی دن گھر نہ آتا تھا، کہاں ہوتا تھا۔۔۔۔۔ کس کے ساتھ ہوتا تھا اس نے سوالات کرنے کے سارے حقوق شزا سے چھین لیے تھے۔ اگر شزا ابھی رعب سے ہات کرنے کی کوشش کرتی تو اگلے ہی لمحے اسے اپنی حیثیت کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا۔ اس نے ہر طرح سے صرف شامل اور سمیر کے لیے اس سے کپڑا مانز کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا کیونکہ وہ آفاق اور شفق کو دیکھ کر وہل جاتی اور ملک منصور کو اس کے حالات پر چھوڑ دیتی۔

”منصور اس ایکشن میں آپ کے چیتے کے کتنے پرسنٹ چائسز ہیں۔۔۔۔۔؟“

”تھیں کیا لگتا ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ قاتحانہ مسکراہٹ سے بولا۔

”حالات تو اچھے ہی لگ رہے ہیں۔۔۔۔۔“

”اور یہ سمجھو کہ ہم اپنے ہاتھ ہی میں ہے۔۔۔۔۔ اس دفعہ میں نے سارے مہرے بڑی ہوشمندی سے استعمال کیے ہیں۔۔۔۔۔ تم دیکھنا انشاء اللہ جیت ہماری ہوگی۔۔۔۔۔ چیف منسٹر کے عہدے تک پہنچنے کے لیے میں نے اس دفعہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ میں سمجھی نہیں۔۔۔۔۔“

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ میں یونہی کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔“ وہ بات کو پلٹتے میں ماہر تھا اور شزا سمیت وہ کسی بھی صورت پر مکمل اعتبار نہیں کرتا تھا۔ وہ اعتماد ضرور دیتا تھا مگر خود اعتبار نہیں کرتا تھا۔ وہ سیاست کا شاطر اور مٹھا ہوا کھلاڑی سمجھا جاتا تھا۔ خوبصورتی سے لے کر ذہانت اور مکارانہ چالوں تک وہ ہر چیز پر مکمل عبور رکھتا تھا۔ دراز قد، خوبصورت نقوش، سفید رنگت، سفید اور کھنکھن سے جھانکتے ہوئے کالے بال، تھری پوسٹ سوٹ میں پائپ پیٹے ہوئے وہ بہت سلیمی ہوئی گروڈ پر سنائی لگتا اور اس کا ٹھہرا ٹھہرا لب و لہجہ اور سوچ کر بات کرنے کا انداز اسے پیدا انٹی سیاستدان ظاہر کرتا۔

سب جانتے تھے کہ اس چمکدار پرسنائی کے پیچھے کتنا بھیا تک ذہن اور مکار سوچ ہے۔ وہ اپنی ہر خوبی کو کیش کرانے کا عادی تھا اور کس طرح کس کو کیسے انکسپلائٹ کرنا ہے اس فن سے بھی بخوبی آشنا تھا۔ اسی لیے آج تک اس نے جتنے انکسپٹو میں حصہ لیا تھا کبھی نہیں ہارا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے گاؤں کی سیٹ سے جیتا تھا اس نے گاؤں والوں کو اپنی مٹھی میں لے رکھا تھا کہ اس کے مقابلے میں آنے والا پہلے ہی اس کے حق میں بیٹھ جاتا ہر ایکشن کے بعد اسے وزارت میں حصہ ملنا ضروری سمجھا جاتا تھا اور اب ایک ہی جست میں وہ چیف منسٹر کا عہدہ لے کر اپنا دیرینہ خواب پورا کرنا چاہ رہا تھا اور اپنے ان خوابوں میں اس نے شزا کو بھی شریک کر رکھا تھا کیونکہ این جی او چلانے کی وجہ سے شزا کی سماجی حیثیت بھی کافی مستحکم تھی اور وہ اس کی حیثیت سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی جب کہ وہ شزا کی۔۔۔۔۔ مگر دونوں اندر ہی اندر ایک دوسرے کے ساتھ جس حد تک قلعے تھے دونوں خوب جانتے تھے۔ شزا اس کا جواب سن کر خاموش ہو گئی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اپنے رازوں میں کسی دوسرے کو شریک کرنا اس کے مزاج کے خلاف تھا۔

”منصور۔۔۔۔۔ آپ سے ایک بات پوچھنا تھی۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟“ اس نے لینڈ کر وڈر ٹرن کرتے ہوئے پوچھا۔

”منصور..... شفق بہت دنوں سے نظر نہیں آ رہی۔ کہیں باہر چلی گئی ہے؟“ شزا شاید زندگی میں پہلی بار قدرے تشویش سے بولی۔ منصور نے مڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا مبادا کہیں وہ سب کچھ جانتے ہوئے اسے ڈانچ تو نہیں دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سچ کی لہر دیکھ کر وہ قدرے اطمینان سے بولا۔

”ہاں..... وہ کچھ روز کے لیے انگلینڈ گئی ہے۔“

”اچھا..... خیریت تو ہے..... بغیر بتائے.....“

”کیا وہ پہلے بتا کر جاتی تھی اور ویسے بھی وہ اپنے فیصلوں میں آزاد ہے۔“

”لیکن منصور گھر میں ایک فرد رہتا ہو تو اس کے آنے اور جانے کا دوسروں کو اندازہ ہونی چاہتا ہے..... اسے گئے ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں۔“

”آجائے گی..... تم کیوں اتنا انٹرسٹ شو کر رہی ہو..... وہ لوگ تو تمہیں دیکھنا بھی نہیں چاہتے.....“ منصور کا ہمیشہ سے یہی مہرہ کامیاب

رہا تھا۔ وہ شزا کو ہمیشہ بچوں کے خلاف باتیں بتاتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب تک شفق، آفاق اور شزا ایک دوسرے سے متفرق رہیں گے۔ گھر میں اس کے خلاف کوئی محاذ نہیں کھل سکے گا۔ اس نے بچوں کے ساتھ شزا اور شہلا کے ساتھ جتنی زیادتیاں کی تھیں وہ ان سب سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ کسی بھی صورت میں ان کا اتحاد اس کے لیے مسائل پیدا کر سکتا تھا اس لیے شروع دن سے اس نے شزا کو ان سے متفرق رکھنے کی کوشش کی تھی اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا تھا بچپن سے ہی شفق اور آفاق کو سوتیلی ماں سے بچنے کے مشورے دیتا تھا۔ اس شخص نے گھر اور باہر ایسی مکارانہ چالوں کی بساط بچھا رکھی تھی کہ وہ آئندہ کی طرح اپنی طرف اٹھنے والی ہر شے کو اپنے فتنے میں جکڑ لیتی..... وہ ان سب کی طرف سے بہت مطمئن تھا..... اسے گھر کا سکون نہیں چاہیے تھا۔ اس کا سکون تو ہمیشہ گھر سے باہر ہوتا اور ملک کا سکون بھی اس کے لیے نقصان دہ تھا اس لیے وہ سیاسی جوڑ توڑ اور سازشوں میں برابر کا شریک رہتا..... منصور کا جواب سن کر وہ خاموش ہو گئی اور پھر مزید کچھ پوچھنے کی اس میں ہمت نہ رہی۔

”شزا..... سمیرا اور شائل سے بہت دنوں سے بات نہیں ہوئی..... کیا کر رہے ہیں آج کل؟“ اس نے شزا کا موڈ آف دیکھ کر اس سے پوچھا۔

”منصور شائل آپ کو بہت مس کرتی ہے۔ اب وہ لاہور آنا چاہ رہی ہے۔ مری میں اس کا دل نہیں لگ رہا ہے۔“

”نہیں..... نہیں..... یہاں کیا رکھا ہے..... اگر اس کا دل ادھر نہیں لگ رہا تو میں اس کو انگلینڈ، امریکا جہاں بھی وہ جانا چاہتی ہے ادھر بھیج

دیتا ہوں۔“

”نہیں منصور، وہ آپ کو مس کرتی ہے۔ مجھے مس کرتی ہے۔ وہ ہم دونوں سے متفرق ہو رہی ہے۔ آپ بھی تو

سوچیں کب اس سے ملنے گئے تھے اور اکڑوا ہاں جا کر بھی آپ اس سے مل کر نہیں آتے۔“ شزا نے بلا واسطہ اس پر چوٹ کی۔ منصور نے پہلو بدلا اور گلا کھینکھارتے ہوئے بولا۔

”لیکن یہاں آ کر وہ ادھر اسٹریپ ہو جائے گی۔“

”کیوں.....؟“

”بھئی میں اپنے کاموں میں مصروف رہتا ہوں اور تم بھی تو ہر وقت مصروف رہتی ہو پھر وہی مسئلہ ہوگا۔ اسے سمجھاؤ کہ یہاں آنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ اسے کنوئیں کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”منصور میں بچوں کو کیسے سمجھاؤں۔۔۔ کیا کوئی بھی ماں باپ بچوں کو گھر آنے سے روک سکتے ہیں۔“ شزا اچھٹلا کر بولی۔ ملک منصور اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ ”منصور وہ بڑی ہورہی ہے اور سمجھدار بھی بہت ہے۔ یہ نہ ہو کہ وہ ہم دونوں کو ناپسند کرنے لگے اور پھر خود ہی نکھر جائے جیسے شفیق اور آفاق۔“

”اگر وہ ہمیں ناپسند کرنے لگے گی تو ہم اسے روک تو نہیں سکتے اور شفیق اور آفاق کو کیا ہوا ہے، ٹھیک ٹھاک تو ہیں۔“

”منصور کیا وہ ٹھیک ہیں۔۔۔؟“ شزا نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں تو کیا ہوا ہے انھیں سب کچھ تو نارمل ہے۔۔۔“

منصور آپ کو سب معلوم ہے کہ آفاق کیا کچھ کرتا رہتا ہے اور شفیق کس قدر ضدی اور خود سر ہے وہ بعض اوقات اس قدر جھوٹی ہو جاتی ہے کہ مجھے تو اس سے خوف آنے لگتا ہے۔

”کم آن شزا۔۔۔ یہ ہم سب امیروں کی اولادوں کے ساتھ مسئلہ ہے بلکہ اب تو اسٹیشن سہیل بن چکا ہے تھوڑی سی اینار ملٹی، مختلف اور منفرد ہونے کا شوق۔۔۔ ان کے دکھاوے اور ان کے اسٹائلز، جب تک یہ سب کچھ نہ ہو وہ کیسے منفرد لگیں گے۔۔۔“ وہ لائٹ موڈ میں بولا۔

”لیکن منصور۔۔۔ میں اپنی مثال اور میر میں یہ سب کچھ ڈیوٹپ نہیں ہونے دوں گی۔“ وہ قطعیت سے بولی۔

”ویری گڈ۔۔۔ تم تو آج مجھے چمٹکاری ہو۔۔۔“ وہ ہنستے ہوئے بے پروائی سے بولا۔

”کیوں۔۔۔؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”اپنی بورڈ واسوج سے۔۔۔ آج کل تو فشنرز کی بیویاں خود ایسے شوق پالتی ہیں کہ تھوڑی سی اینار ملٹی خود بخود ڈیوٹپ ہو جائے۔ پھر سائیکوجسٹ کے پاس سیٹھن کے لیے جائیں۔۔۔ اس پارٹ آف آرمیڈاڈرن سوسائٹی۔۔۔“ منصور ہنستے ہوئے بولا۔

وہ اس کی باتیں سن کر خاموش ہو گئی۔ اس شخص سے جیتنا آسان نہیں تھا۔ وہ سوسائٹی کے ہر پہلو سے بخوبی واقف تھا۔ مردوں کی شاطرائہ چالوں اور عورتوں کی چلتی باز یوں اور بناوٹی رویوں سے۔۔۔ وہ ہر چیز کو لاکھ لینے کا عادی تھا۔ واقعی یہ شخص بہت کٹکسی ہے۔ وہ جتنا اس کو ناپسند کرتی تھی اتنی معترف بھی ہوتی جاتی تھی۔

”یار تم آنے والے دنوں کے بارے میں سوچو جب تم وائف آف چیف فشنر ہوا کرو گی ہر فنکشن میں تم ہی تم ہو گی۔“ منصور کے لہجے میں آنے والے دنوں کی امید اور لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

”ہاں۔۔۔ تب تک نہ جانے تم؟“

”ہاں۔۔۔ یہ بھی خوب کہی۔۔۔ میں جانتا ہوں تمہارا اگلا جملہ کیا ہوگا۔۔۔ بھی تمہاری ٹون، تمہارے ایکسٹ اور تمہارے ویکیٹے کے انداز

سے مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو اور تمہارا کیا مطلب ہے۔۔۔۔۔ آخر تمہارے ساتھ زندگی گزاری ہے۔" اس نے شزا کو خوش کرنے کے لیے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا تو وہ مسکرا دی۔۔۔۔۔ ملک منصور اندر ہی اندر مسکرا رہا تھا اور اب وہ سرور کی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"منصور آپ نے سرکود دیکھا ہے اس میں کتنا چیخ آ گیا ہے۔" وہ ایک دم بولی۔

"کون۔۔۔۔۔ وہ بھکارن۔۔۔۔۔ ابھی تک نہیں ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"منصور آپ ایسے کہہ رہے ہیں۔ جیسے آپ کو معلوم ہی نہیں۔"

"قسم لے لو ڈار لنگ۔۔۔۔۔ میں نے کبھی اس فقیر کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ میرے پاس ایسے کیڑے مکوڑوں کو دیکھنے کی فرصت نہیں

اور ویسے بھی میں فی الحال اسے چھیڑ کر کوئی نیا ایڈیشن اٹھانا چاہتا۔ چیف منسٹر بن جاؤں تو سب سے پہلے اپنے گھر کو اس گندے صاف کروں گا اور تم خواہ مخواہ ٹیک مٹ ہوا کرو۔۔۔۔۔" منصور نے گاڑی گیٹ کے اندر لاتے ہوئے کہا۔

"میں تو اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔"

"گنڈ۔۔۔۔۔"

"میں یونی ڈسکس کر رہی تھی کہ اب تو وہ بہت بدل گئی ہے کلب میں اس کا بڑا نام ہے۔۔۔۔۔ گمہانگ میں تو بہت ایکسپرت ہو چکی ہے۔"

"اوپنہ۔۔۔۔۔ کیا ٹنڈی اور کیا ٹنڈی کا شور ہے۔" وہ تسخرانہ قہر لگا کر بولا تو وہ بھی ہنس دی۔

گھر میں گہرا سکوت تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی شہر غموشاں میں داخل ہو گئے ہوں۔ تمام گھروں کی لائٹس آف تھیں صرف پورچ اور لاؤنج

کی آن تھی گھر میں اتنا سا ہلکا سا کرشنر لگتا تھا جیسے لہجے میں اس سے بولی۔ "منصور اگر شکاں اور میر گھر آ جائیں تو گھر میں رونق تو ہو ہی جائے گی۔"

"شرزا پھر وہی بات۔۔۔۔۔ ان کو گھر سے دور ہی رکھو تو بہتر ہے۔ میں جب چیف منسٹر بن جاؤں گا تو خود ہی بلا لوں گا۔" اس نے اسے جھوٹی

تسلی دینے کی کوشش کی مگر وہ ملک منصور کے ارادوں اور نیتوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ شخص محض بہانے گھڑنے کا عادی تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے بیڈروم میں چلی گئی اور جاتے ہی سو گئی مگر وہ نہ جانے کب تک فون پر لکیشن اور اس پر مبنی صورت حال اپنے پی اے سے ڈسکس کرتا رہا۔

سمیل جیل میں نہایت اذیت کی حالت میں تھا۔ سزا کے بعد ملک منصور نے سزا کر بھی اس کی خبر نہیں لی تھی کہ وہ کن حالوں میں تھا۔ وہ اپنی

حالت سے ہی اندازہ لگا رہا تھا کہ اس نے یقیناً اس کے گھر والوں کی بھی خبر نہیں لی ہوگی اور اس کا کسی طرح ان سے رابطہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اتنا

کمزور ہو چکا تھا کہ چند دنوں میں ہی اس کی ہڈیاں نکل آئی تھیں اچانک ایک دن اس کی ماں ملنے آئی تو اس کی حالت دیکھ کر ہلکا سا شروع ہو گئی۔ اس کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ اسے چپ کرانے کے لیے بہت تسلیاں دے رہا تھا مگر وہ روئے جا رہی تھی۔

"سہیل بیٹا۔۔۔۔۔ خدا کے لیے تم سچ کیوں نہیں کہتے۔ مجھے اس لڑکی نے سب کچھ سچ بتا دیا تھا مگر بھی تم نے انعام اپنے سر لے لیا اور دیکھو

وہ کیسے احسان فراموش لوگ ہیں۔ جس کے لیے تم نے یہ سب کیا اس نے ایک دفعہ بھی مڑ کر ہماری خبر نہیں لی۔"

"اماں کس لے۔۔۔۔۔ آپ شفق کی بات کر رہی ہیں۔ وہ تو شاید۔"

”نہیں..... تمہارے مالک نے..... وہ تو میں جانتی ہوں کہ اس کے باپ نے اسے گولیاں مار دی تھیں۔ ان بڑے لوگوں کو خدا ہی جانے۔ مگر بیٹا میرا تو سہارا تو ہے۔ ہماری حالت سے بھی تو اچھی طرح واقف ہے اب تو نوبت قاتلوں تک آ گئی ہے۔ پرتو گلزنہ کر..... بس کسی طرح باہر آنے کی سوچ۔“

”ہاں اماں، اب کچھ تو سوچنا پڑے گا۔ وہ شخص واقعی اس قابل نہیں تھا کہ اس کے ساتھ ٹھک حلالی کی جاتی۔ میں نے اپنی زندگی اس کی خاطر داؤ پر لگا دی ہے اور وہ کس قدر بے حس نکلا..... مگر آپ گلزنہ کریں۔ اس ایڈریس پر جا کر آصف نام کے لڑکے کو میرے بارے میں بتائیں اور کہیں کہ میں اسے جیل میں ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے ماں کو ایڈریس اچھی طرح یاد کرایا اور آصف کے اخبار کا دفتر وغیرہ اسے سمجھا دیا۔ آصف اس کے گاؤں کا ہی لڑکا تھا اور اس کا بہت اچھا دوست تھا وہ ایک اخبار میں صحافی کے طور پر نوکری کرتا تھا۔ ملک منصور کی پریس کانفرنسوں میں اکثر اس کی ملاقات سہیل سے ہوتی تھی اور سہیل کے ساتھ رفتہ رفتہ اس کی دوستی گہری ہوتی گئی۔ اس اندھیرے میں صرف آصف ہی اسے امید کی کرن نظر آئی۔ اماں نہ جانے کیسے اس تک پہنچی کہ اگلے دن آصف اس کے پاس تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر اسے قدرے تشویش ہوئی۔

”یار مگر تم نے قتل کیوں کیا.....؟“

”بس..... پوچھو مت۔ مگر اس وقت میں نے جس کام کے لیے تمہیں بلوایا ہے وہ دوسرا ہے.....“

”کیا مطلب.....؟“

”ملک منصور کی الیکشن میں پوزیشن کیسی جا رہی ہے..... اور ان کے چیف منسٹر بننے کے کتنے پرسنٹ چانسز ہیں۔“

”بہت اسٹرونک پوزیشن ہے بلکہ تمام حلقوں میں بھی کہا جا رہا ہے کہ چیف منسٹر کی سیٹ صرف ملک منصور کے لیے رہی ہو ہے۔“

”آصف تم میری بات سنو.....“ اس نے آصف کے کان میں کچھ سرگوشی کی آصف کے چہرے پر مختلف رنگ آ جا رہے تھے۔

”یار دیکھو مراد دینا.....“

”دیکھو تمہاری جاب تو رسک ہی لینا ہے اور یہ کام جو تم کرنے جا رہے ہو۔ کم اہم تو نہیں.....“ سہیل نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا۔

”میں کل تم سے ملنے آؤں گا.....“

”ٹھیک ہے..... میں انتظار کروں گا.....“ سہیل نے اطمینان سے کہا۔

”لیکن اگر مجھے گاؤں جانا پڑ گیا تو پھر زیادہ وقت لگ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے مگر پہلے ان لوگوں سے معاملہ طے کرنا پھر کوئی قدم اٹھانا۔“ سہیل نے اسے گائیڈ کیا۔

”ہاں..... ظاہر ہے ان کی سپورٹ کے بغیر تو ایسے رسکی کام نہیں کیے جاسکتے ہو عا کرنا.....“ آصف نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

ملک منصور باقاعدگی سے سارے چھانے والوں کو منتقلی سمجھاتا تھا۔ اسی لیے انکی زبان میں بندھنیں ورنہ شفق کا معاملہ کب کا پریس میں جا چکا ہوتا۔

ایس باجی اونے سارا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ ایسے وہ شفق والے معاملے سے بے فکر تھا۔ وہ بس الیکشن کا شہر تھا اور اسکے بعد وہ ہر لکر سے آزاد ہوگا۔

جوں جوں انکیشن کے دن قریب آ رہے تھے اس کی راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں وہ ہر جگہ میں ہونے والی تمام سرگرمیوں کی پل پل کی خبر رکھتا۔ ہر طرف اس کے کارندے بھیل چکے تھے اور اسے صورت حال سے آگاہ کرتے رہتے۔ اس کے تینوں موہاٹز ہر وقت مصروف رہتے۔ انکیشن میں دو دن باقی رہ گئے تھے وہ تمام اخباروں میں شائع ہونے والے سرڈیز سے صبح سویرے لطف اندوز ہوتا تھا اخبارناشتے کی بھیل پر اس کے سامنے تھا اور وہ پوری طاقت سے جیج رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پورے گھر میں زلزلہ آ گیا ہو..... بحر اور شزا بھی اپنے کمرؤں میں سے بھاگتی ہوئی باہر آ گئیں۔ آفاق بھی دوڑتا ہوا باہر آ گیا..... یوں لگ رہا تھا جیسے ملک منصور پاگل ہو گیا ہو وہ موہاٹز اٹھا اٹھا کر زمین پر پھینک رہا تھا اور گالیاں بٹکا جا رہا تھا۔

”منصور..... ہوش کرو..... آخر کیا ہوا ہے؟“ شزا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”پانی لاؤ..... جلدی سے پانی لاؤ.....“ شزا چلائی بحر بھاگ کر پانی کا گلاس لے آئی۔ شزا نے اسے پانی پلانا چاہا تو اس نے گلاس اٹھا کر زمین پر دے مارا۔

”آخر بتاؤ تو سہی کیا ہوا ہے.....؟“ شزا نے اسے صوفے پر بٹھایا اور اس کے کندھے دبائے لگی۔ ملک منصور نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کیں اور پھر جیسے بے سکون ہو گیا۔ شزا نے اپنے کمرے میں سے کچھ گولیاں لا کر اسے زیر دستی کھلا دیں..... اور اسے وہیں صوفے پر لٹا دیا، آفاق اور سردور کھڑے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی آگے نہ بڑھا..... چہ مراخبار بھیل کے نیچے گر پڑا تھا۔ آفاق نے آگے بڑھ کر اخبار اٹھایا اور دیکھ کر حیران رہ گیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”آفاق اس میں کیا لکھا ہے.....؟“ بحر نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں بس گیم ختم.....“ اس نے اخبار اس کے آگے پھینکا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

بحر نے بھی اخبار حیرت زدہ نظروں سے دیکھا اور وہیں رکھ کر آفاق کے پیچھے کمرے میں چلی گئی۔

ملک منصور اب ادگہ رہا تھا شزا نے بھی اخبار اٹھا یا تو چونک گئی۔ سارا کچھ ختم ہو گیا تھا..... اور اسکی پھوٹیشن میں ملک منصور کا ہارٹ فل نہ ہونا بہت بڑی بات تھی۔ شزا کو بھی سب کچھ ختم ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ ملک منصور کے الفاظ اسے یاد آ رہے تھے اس دلچسپی میں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے..... اتنی بڑی کامیابی کے قریب پہنچے پہنچے وہ اچانک محسوس کے بل گر گیا تھا اور اب وہ بارہالہنا بہت بہت کی بات ہوگی۔

”آفاق اب کیا ہوگا.....؟“ بحر حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

”ہوگا کیا..... انکوائری ہوگی اور شاید انکیشن سے ہی انھیں اس کو ایفائی کر دیا جائے..... ایف آئی آر کٹنے کے بعد ہو سکتا ہے وہ کسی وقت

بھی اریسٹ ہو جائیں۔“

”لیکن یہ سب اچانک کیسے ہوا.....؟“

”حلقہ کی سازش ہے..... کسی نے بڑی گہری گیم کھیلی ہے.....؟“

”مگر کس نے.....؟“

”ظاہر ہے اپوزیشن نے..... وہ لوگ تو گھات میں گئے ہوئے تھے۔“

”لیکن دو سال بعد اس ایٹو کا الٹنا..... اور وہ بھی عین اس وقت جب انکسٹن سر پر ہیں۔ واقعی کسی کی سازش ہی لگتی ہے۔“ سحر بولی۔

”سیاست سے بڑھ کر مندی بچ کوئی نہیں، کون کس وقت کلین بولڈ ہو جائے کے خبر ہے.....؟“ آفاق نے تشویش سے کہا۔

”آفاق قسمیں دکھ رہا ہے.....“ سحر نے اس کا انسر دہ چہرہ دیکھ کر کہا۔

”نہیں..... جو وہ دوسروں کے ساتھ کرتے آئے ہیں۔ ایسا تو ایک دن ان کے ساتھ بھی ہونا ہی تھا۔“

کچھ دیر بعد باہر گاڑی کی آواز آئی تو آفاق تقریباً بھاگتا ہوا کمرے سے باہر نکلا وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شزا اور ملک منصور دونوں کہیں جا

رہے تھے۔

”کون ہے باہر.....؟“ سحر نے حیرت سے پوچھا۔

”پاپا اور شزا آئی..... کہیں جا رہے ہیں.....؟“

”واقعی.....؟“ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں..... وہ واقعی بہت مضبوط اعصاب کے مالک ہیں اگر میں ان کی جگہ دیتا تو بے ہوش ہو چکا ہوتا.....“ آفاق قدرے حیرت سے بولا۔

”سیاست اعصاب کو مضبوط بنا دیتی ہے۔“ سحر بولی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”اور سیاستدانوں کو دھیت.....“ آفاق سر دلچھے میں بولا۔

ملک منصور کو اس کڑے وقت میں پارٹی نے انکسٹن سے علیحدہ کر دیا تھا اور اب وہ روپوش تھا۔ اس کا اس وقت کہیں چلے جانا ہی بہتر تھا۔ شہر

میں اس کا رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

آصف بھی کہیں روپوش تھا اور سنبھل اس کا شدت سے مختصر تھا البتہ کچھ پولیس والوں کی زبانی اسے باہر کے حالات کا علم ہوا تھا اس لیے وہ

مطمئن تھا۔ آصف کا اس وقت روپوش ہونا ہی بہتر تھا۔ انکسٹن کے بعد کی صورت حال کا کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔

شزا اخبار کھولے حیرت سے اسٹوری پڑھ رہی تھی۔ ملک منصور نے دو سال پہلے اپنی..... سیکرٹری کو قتل کیا تھا۔ اس کی ساری تصویریں اور

کہانی اخبارات میں شائع ہو چکی تھی۔ اس اسکیڈل کے منظر عام پر آتے ہی ملک منصور کی مقبولیت کا گراف جس چیز سے نیچے گرا وہ سب کے لیے

حیران کن بات تھی۔

”ملک صاحب یہ تصویریں کس کے پاس تھیں.....“ شزا بار بار ملک منصور سے پوچھ رہی تھی..... جب اسے اس کے ایک دیرینہ دوست

کے پاس علاقہ غیر میں راتوں رات چھوڑنے جا رہی تھی۔

”مجھے اچھی طرح یاد نہیں لیکن وہ رپورٹر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اسے تو میں نے خود ٹھکانے لگا دیا تھا لیکن جس نے بھی میرے ساتھ یہ ٹیم

کھلی ہے میں اسے جہنم رسید نہ کروں تو ملک منصور میرا نام نہیں۔“ اس کا خون بدلے کی آگ سے کھول رہا تھا۔ ”شزا تم اس صفائی کا نام جاننے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔“

”اس اسکیٹل کا اس وقت مظہر عام پر آنا کوئی گہری سازش معلوم ہوتی ہے۔“

”جو کوئی بھی ہے ملک منصور اسے چھوڑنے والا نہیں۔ ایسے واقعات تو آئے دن ہوتے رہتے ہیں مگر اس وقت اس کا جو استعمال کیا گیا ہے یہ کسی شاطر ذہن کی کارستانی ہے۔ میرا خواب تو پورا ہونے سے رہا لیکن میں اس وقت تک جھن سے نہیں بیٹھوں گا جب تک اس شخص سے بدلہ نہ لے لوں۔۔۔۔۔ میری ساری محنت اکارت گئی اور سب کچھ بھی۔۔۔۔۔ شزا تم ہمت نہ ہارنا۔۔۔۔۔ ہمیں اپنے بچوں کے لیے اپنا کھوپا ہوا کارواہیں لینا ہے۔“

”شزا حیرت سے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے اس شخص کو دیکھ رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی کن باتوں پر یقین کرے۔ اب والی یا پہلے والی باتوں پر۔

انکیشن میں ملک منصور کی پارٹی واضح اکثریت سے کامیاب ہوئی تھی اور چیف منسٹر شپ بھی انہی کے حصے آئی تھی۔ ملک منصور نے یہ خبر سنی تو دل مسوس کر رہ گیا۔ ہاتھ آئی چیز جب اچانک پھسل کر دریا میں گر جائے تو سوائے ہاتھ ملنے کے باقی کیا رہ جاتا ہے۔ یہی حال ملک منصور کا تھا۔ وہ مسلسل اب اپنی پارٹی سے رابطہ کیے ہوئے تھا اور حالات پر اس کی گہری نظر تھی۔

آصف پر دو دفعہ کا تھانہ حملہ ہو چکا تھا۔ اپوزیشن کے جن لوگوں نے اسے مہرے کے طور پر استعمال کیا تھا اور اسے ہر طرح کے تحفظ کی ضمانت دی تھی اب پیچھے ہٹ گئے تھے۔ ملک منصور کی پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد انھیں شدید سیکورٹی رسک لاحق تھا۔ ان کے خلاف بھی مقدمے بن سکتے تھے۔ کئی فائلیں کھل سکتی تھیں۔ اس لیے انھوں نے آصف کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور اب وہ بھی پناہ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ شیروں کی کچھار میں ہاتھ ڈال کر وہ بچھتا رہا تھا۔ شزا بھی اس کو ٹریس آؤٹ کرنے کی کوشش میں تھی۔ سیکول بھی مزید پریشانی اور الجھنوں کا شکار ہو چکا تھا۔ پولیس اب اس پر پہلے سے زیادہ تشدد کرتی کیونکہ وہ ہر روز جیل میں کوئی نہ کوئی نیا مسئلہ کھڑا کر دیتا تھا۔ اس کے بال سر سے صاف کر دیے گئے تھے اور اس کی رنگت جل کر سیاہ ہو چکی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے مزید گہرے ہو چکے تھے۔۔۔۔۔ ہر لمحہ اسے ملک منصور کا خطرہ لاحق رہتا۔ اب اس شخص سے اسے کوئی بھی نہیں بچا سکتا تھا۔ ہر دن خطرے سے بڑھتا اور ہر آہٹ خوف سے۔



شمال مری سے ڈرائیور کے ساتھ اکیلی آگئی تھی۔ ڈرائیور اسے کچھ ضروری سامان دینے گیا تھا مگر وہ خود ہی اس کے ساتھ آگئی تھی۔ شزا کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔۔۔۔۔ شمال اتنی خود مر اور خود مختار ہو سکتی تھی اسے قطعی اندازہ نہ تھا۔ اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ اچانک یہاں کیسے آ گئیں اور اسکول والوں نے تمہیں کیسے آنے دیا۔۔۔۔۔؟“

”م۔۔۔۔۔ مہما۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔“

”میڈم۔۔۔۔۔ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ تھے ڈرائیور شوکت نے سرگوشی کے انداز میں کہا تو وہ چونک گئی۔

”شائل تم کمرے میں جاؤ..... میں ابھی آتی ہوں۔“ شائل پوچھل قدموں سے اٹھ کر چلی گئی۔

”ہاں کیا بات ہے.....؟“

”میڈم..... شائل بی بی بہت پریشان ہیں اور..... اور..... انھوں نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی مگر بچ گئیں اسکول والے، میڈم اس دن سے آپ کو اور ملک صاحب کو فون کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر فون ملا ہی نہیں۔ میں جب سامان دینے گیا تو ان کی مس نے مجھے میڈم صاحب سے ملوایا۔ شائل بی بی نے انھیں گھر آنے کے لیے بہت تنگ کر رکھا تھا اور وہ گھر والوں کی اجازت کے بغیر آنے نہیں دیتے۔ میں آپ کو فون کرنے آ رہا تھا کہ مجھے سڑک پر آفاق صاحب مل گئے تو میں نے انھیں اسکول چلنے کو کہا پہلے تو مائے نہیں مگر پھر مان گئے اور اسکول والوں نے ان کے کاغذ دیکھ کر شائل بی بی کو آنے دیا۔ میڈم صاحب بول رہی تھیں کہ وہ ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں رہیں۔ ہر وقت پریشان رہتی ہیں۔ ان کا علاج کروائیں پھر اسکول بھیجیں۔“

”اور سیر.....؟“ شز نے اس کے بارے میں پوچھا۔

”وہ ٹھیک ہیں..... انھیں کوئی مسئلہ نہیں۔“

”اچھا تم جاؤ.....“ شز آہستہ سے بولی۔ شائل اور خودکشی..... اسے قطعی یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ لڑکی اس قدر شدید فرسٹریشن کا شکار ہو سکتی ہے اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اندر کمرے میں گئی تو وہ بستر پر لیٹی تھی۔ اس کا بڑا مردہ چہرہ اس کے اندر کی داستان سنار ہا تھا۔ اسے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا مگر اس نے اپنے غصے کو کنٹرول کیا۔

”کیا بات ہے شائل..... تم کیوں اپ بیٹ ہو.....؟“ وہ شائل کو اپنے ساتھ لگا کر بولی تو وہ رونا شروع ہو گئی۔

”یو لو نا ڈر..... کیا بات ہے.....؟“

”کچھ نہیں.....“ وہ بس روئے جا رہی تھی۔

”کچھ تو بتاؤ..... اور تم نے خودکشی کی کوشش کیوں کی.....؟“ وہ دھیمے مگر شکایتی لہجے میں بولی۔

”میں زندگی سے بیزار ہو گئی ہوں.....“

”مگر کوئی وجہ بھی تو ہو.....“

”میں سرداؤ نہیں کرنا چاہتی.....“

”پھر وہی بات.....؟“

”ابھی تم آرام کرو..... میں تمہارے لیے کھانا لگاتی ہوں۔“ وہ اسے بستر میں لٹا کر باہر چلی گئی۔

شائل شدید ڈپریشن کا شکار تھی اور شز اس کی یہ حالت دیکھ کر سخت رنج ہو رہا تھا۔ ملک منصور تمہاری زندگی کا حاصل کیا ہے.....؟ تمہاری ساری اولاد ہی ڈپریشن کی ماری ہے نہ جانے تمہارے جیہڑ میں کیا ہے کہ ہر کوئی ڈسٹرب ہے..... اب سیر..... یا خدا یا اس کو اپنی امان میں رکھنا..... وہ

نہیں پر کھانا لگا رہی تھی اور ساتھ ساتھ سوچ رہی تھی۔ ملک منصور کو کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کی اولاد کیا سوچ رہی ہے اور کیا کر رہی ہے اس کے نزدیک تو سب کچھ ماڈرن سوسائٹی کے لیڈنر ہیں۔ ان کا مخصوص اسٹائل ہے۔۔۔ اور سٹائل کا خود کشی کرنا۔۔۔ مائی گاڈ۔۔۔ اس ٹوچ۔۔۔ اس کا مطلب ہے وہ ہائپر ہو چکی ہے اور اب مزید کچھ غلط ہوا تو وہ شاید۔۔۔ نہیں۔۔۔ مجھے اسے بچانا ہے ہر قیمت پر۔۔۔ میں اسے یوں بکھرتا نہیں دیکھ سکتی۔۔۔ میں اس کی ماں ہوں اور ایک ماں کیسے برداشت کر سکتی ہے کہ اس کی اولاد اس کے سامنے یوں بکھرتی چلی جائے۔ کھانا لگا کر وہ اسے بلانے لگی تو وہ اونگھ رہی تھی۔

”بیٹا اٹھو کھانا کھا لو۔۔۔“

”میرا دل نہیں چاہ رہا۔۔۔“

”پلیز تھوڑا سا۔۔۔ آؤ میرے ساتھ۔“ وہ اسے زبردستی باہر لے کر آئی اور خود اپنے ہاتھوں سے کھلاتی رہی۔ اسی لمحے سحر باہر سے آئی تو شزا اور سٹائل کو دیکھ کر چونک گئی۔ محبت کا یہ انداز اسے بہت الو کھانا لگا اور وہ بھی اس گھر میں۔ کیا یہاں بھی محبت کا وجود ہے۔۔۔ اس نے حیرت سے سٹائل کی طرف دیکھا۔۔۔ سٹائل بھی اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”مما یہ کون ہے۔۔۔؟“

”آقا کی بیوی۔۔۔“

”انھوں نے کب شادی کی اور وہ مری میں ان کے ساتھ۔۔۔“ سحر نے کمرے میں جاتے ہوئے اس کی بات سن کر معنی خیز مسکراہٹ سے شزا کی طرف دیکھا اور اندر چلی گئی۔ شزا اس کی اس مسکراہٹ کا مطلب سمجھتی تھی مگر خاموشی سے اسے کھانا کھلانے لگی۔

”سٹائل تم نے بتایا نہیں کہ تم اپنی بیٹ کیوں ہو۔۔۔؟“

”معلوم نہیں۔۔۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”ہر فرسٹریشن کا کوئی ریزن بھی ہوتا ہے اور ضرور اس کا بھی ہوگا۔“

”مجھے خود سمجھ نہیں آ رہا۔ میں ہاسٹل لائف سے بھگ آ گئی ہوں۔ وہاں اتنی تنہائی اور اداسی ہے کہ میرا دل گھبراتا ہے۔ مماس میں کس سے آپ لوگوں کی باتیں کروں۔ سیر میری باتیں سننا نہیں چاہتا اور میں آپ کو اور پاپا کو بہت مس کرتی ہوں مگر آپ لوگ ہمیں ہانکل مس نہیں کرتے۔ پانچ ماہ ہو گئے ہیں پاپا ایک دفعہ بھی ملنے نہیں آئے اور اب بھی وہ نظر نہیں آ رہے۔ مماس کیا آپ لوگ واقعی ہم سے پیار نہیں کرتے؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو حیر رہے تھے۔

”یہ تم سے کس نے کہا اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تم لوگوں سے پیار نہ کریں۔“

”مگر پاپا۔۔۔“

”وہ بہت مصروف ہیں۔۔۔ تم انہی طرح جانتی ہو۔۔۔“

”اور ان کی وہ تصویر اخبار میں۔۔۔“

”اودھائی گاڑ.....“ شزا بڑبڑائی۔ ”وہ سب جھوٹ ہے۔“

”مگر میں نہیں سمجھتی کہ وہ سب جھوٹ ہے.....“ وہ پورے دثوق سے بولی۔

”کیوں..... جب میں کہہ رہی ہوں کہ تمہارے پاپا ایسے نہیں اور یہ جالفتین کی سازش ہے..... پھر تم کیسے اتنے یقین سے کہہ سکتی ہو.....“

”اس لیے کہ ایک دفعہ پاپا مجھے اسکول ملنے آئے تھے تو گاڑی میں، میں نے اس لڑکی کو دیکھا تھا.....“ وہ آہستہ سے بولی۔ اس کے لہجے

میں بلا کا درد تھا۔

”ہاں..... تو وہ ان کی سیکرٹری تھی۔ اس لیے ان کے ساتھ ہر جگہ جاتی تھی۔“ شزا کا دل کرچی کرچی ہو رہا تھا مگر وہ کسی صورت میں ملک

منصور کا بیچ اس کی نظروں میں گرتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

”مما..... میں آپ جیسی باتیں نہیں کر سکتی لیکن مجھے یہ سب کچھ بہت ہرٹ کرتا ہے۔ دوسرے بچوں کے ماں باپ آتے ہیں تو اتنے اتنے

دن وہ انھیں مس کرتے رہتے ہیں۔ ان کی اچھی اچھی باتیں سناتے ہیں۔ ممّا آپ لوگ تو کبھی اکٹھے ہی نہیں آئے اور پھر آپ کی کوئی اچھی اچھی

باتیں ہمارے پاس ہیں ہی نہیں..... ممّا اب میں واپس نہیں جاؤں گی..... میںیں لاہور میں کسی کالج میں ایڈمیشن لے لوں گی۔“

”ٹھیک ہے ابھی تو تم ادھر ہی ہو..... مگر کچھ دنوں کے بعد تمہیں ادھر ہی جانا ہے.....“

”نہیں ممّا..... اب میں کبھی واپس نہیں جاؤں گی۔“ وہ پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئی اور شزا وہیں ٹھیل پر سر پر ہاتھ رکھے سوچ میں گم ہو گئی

یہ سب کیا ہو رہا ہے..... باہر سے کتنا خوبصورت اور اندر سے کتنا بھیاں کتنے ناپائیدار رشتے اور کتنی کھوکھلی زندگی..... کوئی ایک رشتہ بھی تو مضبوط

نہیں..... ہر رشتے کی بنیاد شکست اور عمارت میں دراڑیں ہیں..... تف ہے اس ماڈرن سوسائٹی پر..... ملک منصور..... تمہاری اس سوکا لڈ سوسائٹی کے

اشائز پر..... اسے فطرت ہی ہونے لگی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے بچوں کے ساتھ کہیں دو کمروں کا فلیٹ لے کر رہ لے.....

سب کچھ ختم کر دے..... ساری سرگرمیاں اور کچھ بھی نہ رہے..... مگر یہ محض ایک سوچ تھی۔ وہ جس لائف اسٹائل کی عادی ہو چکی تھی۔ اس میں اینڈ ونچر

کے طور پر تو کچھ دن کہیں گزارے جاسکتے تھے مگر ہمیشہ نہیں..... عجیب سی آزمائش سامنے کھڑی تھی۔ شائل کی صورت میں..... اور ابھی بمیر پاتی تھا.....

نہ جانے وہ کیا کرے گا؟ شزا کو ابھی شدید پڑ پڑیشن ہو رہا تھا۔ ملک منصور تم نے ہم سب کو یہ کیا مرض دے دیا ہے.....؟ وہ سوچ سوچ کر تھک گئی تھی۔

”کس کو فون کر رہی ہو.....؟“ شزا نے حیرت سے پوچھا۔

”ولیم کو.....“

”کون ولیم.....؟“

”میرا کلاس فیلو.....“

”مگر وہ تو مری میں ہے۔“

شزا کو کچھ کچھ سمجھانے لگا۔ وہ اس کی بے تابی دیکھ رہی تھی اور اس کے ہنسنے سے اندازہ لگا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”چائیس کیا مصیبت ہے..... نمبر ہی نہیں بل رہا..... ماماں ڈرائیور کے ساتھ اس کے کالج جا رہی ہوں۔“ وہ فون بند کرتے ہوئے بولی۔
 ”ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ تم ابھی ادھر ہی ہو اور نمبر مل ہی جائے گا۔“
 ”نہیں، میں اسے جلد ملنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔۔“

”مگر کیوں.....؟“ شہزاد نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں اتنی بے چینی دیکھ کر پوچھا۔
 ”بس..... یونہی..... آپ نہیں سمجھیں گی۔“ وہ بنا کچھ کہے باہر نکل گئی۔ ڈرائیور باہر کھڑا تھا اس نے اسے ایڈریس بتایا اور اس کے کالج پہنچ گئی۔ مگر اسے سخت مایوسی ہوئی جب معلوم ہوا کہ وہ کئی روز سے کالج نہیں آ یا اور ہاسٹل بھی نہیں آتا۔
 ”وہ کہاں جا سکتا ہے.....؟“ وہ شدید الجھن کا شکار ہو رہی تھی۔
 ”آپ اپنا نام اور فون نمبر لکھ کر دے دیں۔ جیسے ہی وہ آئے گا۔ میں بتا دوں گا وہ آپ کو کال کر لے گا۔“ ولیم کے روم میٹ ڈیٹان نے اس کو پریشان دیکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے.....“ اس نے ایک کاغذ پر اسے اپنا فون نمبر لکھ کر دے دیا۔

ولیم سے نہ ملنے کا اسے شدید قلق تھا۔ جب سے ولیم نے کالج چھوڑا تھا اور لاہور شفٹ ہوا تھا وہ شدید افسردہ رہنے لگی تھی اسے وہاں رہتے ہوئے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس حد تک اس میں انوار ہو چکی تھی۔ صرف ایک دن تو تھا جس سے وہ اپنی اور گھر کی ساری باتیں کرتی تھی اور وہ اسے ہر وقت کنسول کرتا رہتا تھا۔ مگر اس کے آنے کے بعد وہ شدید تنہائی کا شکار ہو گئی تھی۔ کوئی ایک بھی تو وہاں نہیں رہا تھا جس سے وہ اپنا دکھ سکھ کہتی..... اپنی باتیں شیئر کرتی..... اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے زندگی رک سی گئی ہو..... کوئی بہت عزیز از جان ساتھی چھن گیا ہو..... وہ اکثر نیٹ پر اس سے رابطے میں رہتی ولیم نے ہی اسے اپنے کالج کا ایڈریس اور فون نمبر سب کچھ میل کیا تھا مگر اب دو تین ماہ سے نیٹ پر بھی رابطہ نہیں رہا تھا۔ ان سب ٹیکنرز نے اس کے ذہن کو شدید مآؤف کر دیا تھا۔ اس نے اپنی کتابیں اس کے نام اور مس یو سے بھر دی تھیں۔ اگر اتفاق سے وہ کاپی کسی کلاس فیلو کے ہاتھ لگتی اور وہ اس کا مذاق اڑاتی تو اس کا اچھا خاصا جھگڑا ہو جاتا۔

وہ روز بروز چڑچڑی اور بد مزاج ہوتی جا رہی تھی۔ ابھی وہ سترہ سال کی ہوئی تھی اور ذہن بھی اتنا پیچور نہیں ہوا تھا کہ اپنے آپ کو سمجھاتی..... وہ اپنی سوچوں کے دھارے میں بہتی گئی۔ ہر وقت تخیل میں ڈوب رہا اور ولیم سے باتیں کرنا اسے اچھا لگنے لگا۔ ولیم اس کی ذات کا محور بن گیا۔ اس کا چڑھائی سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ صبح آنکھ کھلتے ہی پہلا خیال اور پہلی سوچ ولیم کے بارے میں ہوتی اور آنکھیں بند کرتی تو وہ خوابوں میں ہوتا۔ ولیم کی سوچ نے اس کے دل و دماغ کو اپنے قلمبے میں اس طرح جکڑ لیا تھا کہ اب فرار ممکن نظر آتا تھا۔

جس دن اس نے پاپا کی تصویر لاہور میں دیکھی تو اسے شدید شاک لگا تھا۔ باپ کی پر سنالٹی کا یہ پہلو پہلی دفعہ اس کے سامنے کھل کر آیا تھا وہ سخت اذیت میں تھی۔ میرا بھی کلاس فور میں تھا۔ اسے ان باتوں کی سمجھ ہی نہیں تھی اور وہ اس کے ساتھ ایسی باتیں کر کے اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کسی کے ساتھ سب کچھ شیئر کرنا چاہتی تھی۔ اندر ہی اندر کوئی چیز اطمینان چاہ رہی تھی۔ کوئی ایک تو کہہ دے کہ میں اس کا

باپ ایسا نہیں۔ یہ سب کچھ محض کہانی ہے۔ ایسے میں اسے ولیم کی یاد ستانے لگی۔۔۔ مگر اس تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ وہ ڈپریشن میں ہاسٹل آئی تو اس کی روم میٹس عزرا اور ندا اس کے پاپا کے بارے میں ہی باتیں کر رہی تھی۔ وہ اب بچی تو نہیں تھی کہ ان ہاتوں اور ان کے لیے کونہ سمجھتی وہ ان کی باتیں سن کر بھڑک گئی اور تینوں میں جھگڑا ہو گیا۔ وہ شدید غصے میں تھی جب اس نے حیز چاقو سے اپنے بازو کی لس کاٹ دی۔ ہر طرف کھرام مچ گیا اسے جلدی سے اسپتال لے جایا گیا مشکل سے اس کی جان بچی تھی۔ وہ روز بروز چڑچڑی ہوئی جا رہی تھی۔ بات کو سمجھتا اور اعصاب پر کنٹرول رکھنا اس کے بس سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ جب اسے اپنی خواہشات پوری ہوتی نظر نہ آتیں تو وہ انتہائی قدم اٹھانے سے بھی دریغ نہ کرتی۔ اس کی کیسی پرسنالٹی ڈیولپ ہو رہی تھی۔ شزا کے لیے یہ لکھ کر یہ تھا۔

وہ گھبرا کر بھی انتہائی بے چین تھی۔ بار بار فون ملاتی۔ نمبر نہ ملتا تو جھنجھلا جاتی۔

”شمال یہ لڑکا کون ہے۔۔۔؟“ شزا نے اس کی بے معنی بھانپتے ہوئے پوچھا۔

”مری میں آپ کو ملوایا تو تھا۔۔۔“

”کون۔۔۔ وہ کون۔۔۔“

”ہاں۔۔۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”تم اس میں اتنی انٹرسٹ کیوں ہو۔۔۔ تم جانتی ہو کہ ہم میں اور ان لوگوں میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔۔۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔۔۔ صرف یہ جانتی ہوں کہ وہ بہت اچھا ہے اور میں اسے بہت مس کرتی ہوں اتنا کہ شاید آپ لوگوں کو بھی نہیں۔“

”شمال۔۔۔ تم کیوں اس قدر جذباتی ہو کر سوچتی ہو۔۔۔“

”مم۔۔۔ میرے بس میں کچھ نہیں۔ میں ایک کمزور شخصیت ہوں۔۔۔“

”تم کیوں اس قدر کمزور ہو۔۔۔ اور اپنے آپ کو کمزور کیوں سمجھتی ہو۔۔۔؟“

”مجھے آپ لوگوں نے کمزور بنا دیا ہے اور اب مجھے ہر وقت کسی ایسے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے جو مجھے ہر اسٹیپ پر گائیڈ کرے۔۔۔“

مجھ میں تو صحیح اور غلط کا سنس بھی نہیں رہا۔۔۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”تو کیا وہ لڑکا تمہیں مضبوط بناتا ہے۔۔۔“ شزا نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”نہیں۔۔۔ وہ میری برا بھلائی اور بری بات سنتا ہے۔۔۔“

”وہ تمہیں صرف دوست سمجھتا ہے اور تم دوسری سائڈ پر جا رہی ہو۔۔۔ کیا تم سمجھتی ہو یہ سب؟“

”ہاں۔۔۔ میں اسے یہی بتانا چاہتی ہوں۔۔۔“

”کیا۔۔۔؟“ شزا کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔ وہ شمال کے منہ سے پہلے دفعہ ایسی بے باک باتیں سن کر حیران ہو رہی تھی اور مزید

جاننا چاہتی تھی کہ اس کے ارادے کیا ہیں۔

”میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”شٹ اپ شاکل..... اپنی حد نہیں بھولو۔“

”میں کچھ نہیں جانتی، کچھ بھی نہیں۔“ وہ رو پڑی۔

”تہہارا ہاپ تم دونوں کو مار دے گا۔“

”آئی ڈونٹ کیئر..... اورا گریہا ہو بھی جائے تو ہم دونوں ساتھ مریں گے۔“

”تم خواہ مخواہ پاگل ہو رہی ہو..... یہ گھر نہیں پاگل خانہ لگتا ہے.....“ وہ غصے سے بولی۔

”میں کچھ نہیں جانتی..... مجھے بس دلیم چاہیے.....“

”شاکل بکواس نہیں کرو..... میں تمہیں آرام سے سمجھا رہی ہوں اور سنو میں تمہیں خود مری چھوڑنے جا رہی ہوں۔“

”نہیں ماما..... آپ ایسا نہیں کریں گی اورا گریہا کیا تو میری ڈیڈ باڈی آپ کے ساتھ جائے گی.....“ وہ گویا دمکی دپتے ہوئے بولی۔

”شاکل اشاپ دس نان سنس.....“ وہ غصے سے چلائی۔

”چلائیں مت.....“ وہ بھی غصے سے پھنکارتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کا چہرہ لال۔ بھسوکا ہو رہا تھا اور آنکھیں غصے سے باہر اٹنے کو

تھیں۔ شزا کو اس کے تہہر اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ وہ اس کی وجہ سے اس قدر پریشان ہو رہی تھی کہ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ ایک نئی مصیبت ان کی منتظر تھی۔ نہ جانے وہ کیسے گردشِ لیام میں جکڑے جا رہے تھے کہ ہر طرف سے پریشانیوں اور الجھنیوں انہیں اپنی گرفت میں لے رہی تھیں۔

شام ہو رہی تھی۔ شاکل ٹی وی کی حیز آواز کر کے اکیلی بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ اسے گھر آنے کا جتنا کریز تھا اب وہ کریز رفتہ رفتہ کم ہو رہا تھا۔ گھر میں تو بائٹل سے بھی زیادہ تنہائی اور وحشت تھی۔ اگرچہ شزا اپنی طرف سے اسے زیادہ سے زیادہ وقتی مگر اس کے اپنے بے شمار کام اور مصروفیات تھیں اور پھر ملک منصور کو وہ اس مسئلے سے نکالنے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔ ایک طرف صحافی کوئریس آؤٹ کرنا تھا۔ اخبارات کے دفاتر سے رابطے جاری تھے تو دوسری طرف پارٹی ورکرز اور ملک منصور کے قریبی لوگوں کو اس کی مدد کے لیے اکسانا تھا۔ کوشش کے باوجود کافی وقت باہر لگ جاتا۔ سحر اپنے کاسوں میں مصروف رہتی اور جس دن سے وہ گھر آئی تھی۔ آفاق گھر نہیں آیا تھا۔

شاکل فون پاس رکھے ہر وقت منتظر لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہتی..... کسی وقت، کسی لمحے شاید اس کا فون آ جائے..... دل ہر وقت اس کی یاد میں کھوپا رہتا۔ وہ ابھی بھی اسے اتنا مس کر رہی تھی کہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ خود اس کو سارے لاہور میں جا کر جگہ جگہ تلاش کرے مگر اسے نہ تو ذرا نیچوگ آتی تھی اور نہ ہی راستوں کا زیادہ علم تھا۔ اچانک فون کی بیل زور زور سے بجنے لگی..... وہ چونک گئی اور جلدی سے ٹی وی کی آواز کم کی۔

”ہیلو..... شاکل سے بات کرنی ہے.....“

”کون.....؟ ولیم..... تم.....“ وہ جیسے الجھ پڑی۔

”ہاں..... شاکل تم کب آئیں؟“

”ولیم..... میں تمہیں بے حد یاد کر رہی ہوں۔“

”تھیک ہے.....“ وہ مسکرا کر بولا۔

”میں تم سے ملنا چاہتی ہوں..... بس تم جلدی سے آ جاؤ.....“

”نہیں شامل، یہ ممکن نہیں۔ میں ماما کے پاس ہوں اور ان کی طبیعت بہت خراب ہے آج میں ہاسٹل اپنی کچھ کتابیں لینے گیا تو ڈیٹان نے

تمہارے بارے میں بتایا۔ اس لیے فون کر رہا ہوں۔ پھر کسی وقت آؤں گا۔“

”ولیم..... کیوں آپ سیٹ ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ولیم آئی مس ہو سوچ۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر اس میں آپ سیٹ ہونے والی کیا بات ہے؟“

”ولیم..... پلیز تم سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”کیا.....؟“

”اچھا تم مجھے اپنا ایڈریس دو میں خود آتی ہوں.....“

”ٹھیک ہے..... لیکن اس وقت نہ آنا..... شام ہو رہی ہے کل آ جانا۔“

”نہیں، میں ابھی آؤں گی..... تم مجھے اپنا ایڈریس دو.....“ وہ ایڈریس لکھنے لگی۔ ایڈریس لکھ کر اس نے ڈرائیور کو سرورسٹ کوادر سے بلایا

اور خود اس کے ساتھ چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد شہزادی آئی تو اسے یہ جان کر سخت تشویش ہونے لگی۔

ولیم ماما کے پاس ہی تھا اور آئے نور گھر واپس جا چکی تھی۔ ولیم نے گیٹ کے باہر لگا تالا کھول دیا تھا۔ وہ اب اس کا منتظر تھا۔ اس کی گاڑی

گیٹ کے باہر بارن بجار ہی تھی۔ ولیم باہر آیا..... اور گیٹ کھولا تا کہ اس کا ڈرائیور گاڑی اندر لے آئے۔

”شامل کیسی ہو؟“ ولیم مسکرا کر بولا۔

”میں ٹھیک نہیں ہوں۔“

”کیوں.....؟“ وہ اس کا غیر متوقع جواب سن کر حیران رہ گیا اور اسے ڈرائیوگر روم میں لے آیا۔

”کیا یہ تمہارا گھر ہے.....؟“

”نہیں..... ایک دوست کا..... ماما بتا رہی ہیں اس لیے اس دوران ہم یہاں رہ رہے ہیں۔ ہاسٹل میں ماما کو انٹینڈ کرنا میرے لیے مشکل

تھا..... لیکن تم کب آئیں..... آج کل تو چھٹیاں نہیں ہیں۔“

”ہاں..... میں نے بتایا کہ میں بہت آپ سیٹ تھی.....“

”مگر کیوں.....؟“

”کیونکہ تم وہاں نہیں.....“

”تم آن ٹائل..... ڈونٹ بی سلی۔ تم ایک بھگدار لڑکی ہو۔“

”میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔“

”وہاٹ نان سنس.....“ وہ غصے میں صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اور اگر تم مجھے نہ ملے تو..... تو میں اپنے آپ کو تم کر لوں گی۔“

”شیکل..... یہ تم کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ تم جانتی ہو کہ میں چرچ جوائن کرنے والا ہوں اور ہمارے اور تمہارے درمیان تو ویسے بھی

بہت فرق ہے۔ اپنے آپ کو نارمل رکھو.....“

”میں کچھ نہیں جانتی..... تم میری بات سمجھو۔“

”ادھر بیٹھو.....“ اس نے اسے اپنے سامنے بٹھایا۔ ”اب صحیح بات بتاؤ کہ کیا مسئلہ ہے.....؟“

”ولیم..... میں بہت اکیلا محسوس کرتی ہوں۔ نہ میں وہاں کسی سے بات کر سکتی ہوں اور نہ یہاں..... ماما پاپا کے بارے میں تم اچھی طرح

جانتے ہو۔ ان کو ہماری کوئی پردا نہیں۔ میری لائف میں نہ کوئی امید رہی ہے اور نہ ہی کوئی اچھی بات..... تم ہر وقت مجھے یاد آتے ہو۔ میں کیا کروں،

دنیا میں صرف تم ہی ہو..... جو مجھے اچھے لگتے ہو۔“

”لیکن شیکل جو اچھا لگے..... ضروری تو نہیں کہ اس سے محبت بھی ہو جائے اور میں تو تمہیں ابھی سے بتا رہا ہوں کہ میں چرچ جوائن

کرنے والا ہوں۔ میں تو صرف ماما کی وجہ سے رک گیا کیونکہ وہ بہت بیمار ہیں۔“

”تو پھر میں کیا کروں؟“

”اپنی اسٹڈیز کی طرف دھیان دو..... اور اپنے لیے کوئی اچھی مصروفیت ڈھونڈو..... اور ویسے بھی ہم لوگ ابھی اس ایجنے میں ہیں کہ ہمیں

ایسی باتیں سوٹ نہیں کرتی۔ تم کچھ دن یہاں ریلیکس کرو..... اور پھر واپس چلی جاؤ۔ یہی بہتر ہے.....“ ولیم اسے سمجھا رہا تھا اور وہ خاموشی سے اس کی

باتیں سن رہی تھی۔

”ٹھیک ہے میں واپس چلی جاؤں گی۔ تم بھی یہی کہتے ہو اور ماما بھی..... کسی کو بھی میرا یہاں رہنا پسند نہیں.....“ وہ افسردگی سے بولی۔

”نہیں شیکل، ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم ایسی باتوں میں اپنا وقت ضائع کرو۔ اپنی اسٹڈیز مکمل کرو۔ پھر تو تمہیں لاہور ہی

آنا ہے.....“ ولیم بہت نرم لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا۔

”اب میں چلتی ہوں.....“ وہ بے دلی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”ماما سے نہیں ملو گی.....“

”نہیں..... آج نہیں..... پھر کسی.....“ وہ اب مزید وہاں رکتا نہیں چاہ رہی تھی۔

ولیم کو اس کے خیالات اور حالات جان کر سخت پریشانی ہوئی۔ وہ شروع سے ہی یہ محسوس کرتا چلا آ رہا تھا کہ شائل کے گھر والوں کو واقعی ان بچوں کی قطعی کوئی پروا نہیں۔ ان کے ماں باپ کا رویہ یہ بچوں کے بارے میں بالکل نارمل نہیں تھا۔ جب تک وہ مری میں تھا ہر وقت شائل کو سمجھاتا رہتا تھا اور واقعی اب وہ منتشر ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ نور سے اس کی باتیں ڈسکس کرے۔ وہ تو خود اپنی ہر بات نور سے ڈسکس کرنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ جس طرح وہ زندگی کا تصور نور کے بغیر نہیں کر سکتا تھا شاید اسی طرح شائل بھی اپنے لیے اسے اتنا ہی اہم سمجھ رہی تھی۔ یہ کیسی جین تھی۔ وہ چونک سا گیا مگر شائل بہت جذباتی تھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔



شہلا اسدا اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔ اسدا سے اسے جو محبت ملی تھی وہ کبھی اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ قدرت اس پر یوں فراخ دلی سے نظر کرم کرے گی۔ خالد اور ان کے سب گھروالے بھی اسے بہت پیار کرتے۔ وہ لوگ شادی کے فوراً بعد ڈیفنس شفٹ ہو چکے تھے حیدر نے ایک کاشن مل شہلا کو چیز میں دی تھی اور اسدا اپنا پرنس اسٹبلش کرنے کے چکروں میں تھا۔ وہ لوگ خود بھی بہت امیر تھے۔ خاندانی جاگیر دار روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ ہر طرح سے خوش تھی اور اپنا نیا گھر ڈیکوریٹ کرنے میں مصروف تھی۔ لیکن جب فارغ بنی تھی تو ایک دم حیدر نظروں کے سامنے آ جاتا اور اس ہو جاتی۔ حیدر خود اسے بہت کم فون کرتا۔ حیدر کی اس بے وفائی سے وہ شرمندگی محسوس کرتی۔

شہلا کی شادی سے فارغ ہونے کے بعد حیدر نے مس افضال کو خیریت پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔

”سر قہنگ پودیری جی، آپ نے جو پیسے بھیجے تھے وہ مل گئے تھے بلکہ سبز پیٹر کا آپریشن بھی ہو چکا ہے۔ میں نے آپ سے ایک دو بار کونٹیکٹ کرنے کی کوشش کی کہ شکریہ ادا کر دوں مگر رابطہ ہی نہیں ہو سکا۔“ مس افضال بہت مشکورانہ لہجے میں بول رہی تھیں۔

”شکریہ کی بات نہیں..... آپ اس بات کو چھوڑیں اور یہ بتائیں کہ اب ان کی طبیعت کیسی ہے.....؟“

”کیونکہ قرانی کا ایک کورس ہو چکا ہے اور آپ تو جانتے ہیں یہ کیسی جان لیوا بیماری ہے۔ اس بیماری سے لڑنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔

یہ تو پچھارہ مریض ہی جانے۔ سبز پیٹر بیماری بہت پیچیدگی والی ہے۔“

”مس افضال میں ان سے ملنا چاہتا ہوں.....“

”سر آپ.....؟“ مس افضال نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... اس میں کیا حرج ہے۔ سبز پیٹر ایسے ہیومن بینک.....“

”ہاں..... حرج تو کوئی نہیں مگر وہ یہاں نہیں رہتیں۔“

”تو پھر..... وہ کہاں چلی گئیں.....؟“

”اپنے کسی عزیز کے پاس.....“ مس افضال بتانا مناسب نہیں سمجھ رہی تھیں۔

”کس عزیز کے پاس.....؟“

”مظلوم نہیں۔۔۔۔۔“

”مس افضل کیا واقعی آپ نہیں جانتیں یا پھر مجھے نہیں بتانا چاہتیں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں سرائیکی کوئی بات نہیں۔ میں بھلا کیوں چھپاتا چاہوں گی۔ واصل میں اس سوچ میں پڑ گئی ہوں کہ واقعی آپ کا وہاں جانا

بہتر ہے یا نہیں کیونکہ میں نے انھیں آپ کی ہیلپ کا بالکل نہیں بتایا۔“

”اور بتائیے بھی مت۔۔۔۔۔ مجھے خود بھی یہ سب کچھ پسند نہیں۔ آپ پلیز مجھے ایڈریس بتادیجئے اور ان کے پاس کون ہوتا ہے۔۔۔۔۔؟“

”ان کا بیٹا ولیم۔۔۔۔۔ اور دو ولیم کی کلاس فیلو کے گھر میں رہ رہی ہیں۔“

”اوہ آئی سی۔۔۔۔۔ آپ ایڈریس لکھوائیے۔“ مس افضل انھیں ایڈریس لکھوانے لگیں۔ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ اس کا آپریشن بھی ہو

چکا تھا۔ ورنہ وہ خود۔۔۔۔۔

وہ مس افضل کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچا مگر کونٹھی کے باہر تالا لگا ہوا تھا وہ سخت مایوس ہوا۔ ہو سکتا ہے وہ اسپتال گئی ہو۔ ادھر ادھر سے پوچھنا بھی مناسب نہ لگا۔ وہ اسی شام دوبارہ گیا پھر تالا لگا ہوا تھا۔ اسے سخت تشویش ہو رہی تھی۔ اس نے مس افضل کو فون کرنے کا سوچا مگر یہی سوچ کر کہ وہ اس کے بارے میں مفکوک ہو جائے گی اس نے ارادہ ترک کر دیا۔ وہ مسلسل دو تین دن جاتا رہا مگر ہر بار تالا دیکھ کر واپس آ جاتا۔ اسے سخت پریشانی ہو رہی تھی۔ مختلف دوسرے اور واسے اسے پریشان کر رہے تھے۔ خدا نخواستہ اس کی طبیعت زیادہ ہی خراب نہ ہو وہ اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا حال پوچھنا چاہتا تھا۔ اس مشکل وقت میں اس کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا مگر نہ جانے اس کی سوچ کھنکھن کر رہی تھی۔ اس نے جگ آ کر مس افضل سے رابطہ کیا مگر مظلوم ہوا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے گاؤں اپنی بہن کے پاس گئی ہیں۔ ان کی بہن کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ مس افضل ہی اس تک پہنچنے کا واحد ذریعہ تھی اور اب ان تک بھی رسائی ممکن نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ عجیب جمہلا ہٹ کا شکار تھا۔ وہ صبح شام اسی سڑک سے گزرتا۔ جیسے اس کے گھر جانے والا وہی راستہ ہو۔ کچھ دیر گاڑی روک کر گیٹ کو دیکھتا اور چل دیتا۔

عجیب سی پکوشن ہو رہی تھی اور بعض اوقات اسے اپناری ایمیشن خود ہی عجیب سا لگتا۔ وہ ابھی بھی اس کے ساتھ کس قدر اٹیچڈ تھا۔ وہ اپنے آپ سے ہار ہا سوال کرتا کیا واقعی پہلی محبت کو بھلا نا ممکن نہیں ہوتا۔۔۔۔۔؟ نہ جانے کیوں شہلا کو سوچ کر ہی اس کی آنکھوں میں نمی سی حیرنے لگتی۔ تا تمام حسرتوں اور آرزوؤں کے لیے دل میں ہوک سی اٹھی۔۔۔۔۔ شہلا کاش تم میری زندگی میں نہ آئی ہوتیں۔۔۔۔۔ کاش ہم تم نہ ہوتے۔۔۔۔۔ کاش تم مجھے دوبارہ نہ ملتیں۔

کاش اب تم مجھے ایک دفعہ مل جاؤ اور ہم دونوں صرف ایک دفعہ زندگی میں مل کر رہیں۔۔۔۔۔ کاش اسی طرح دل کا یو جھ ہلکا ہو جائے۔ کاش ہم دونوں اپنا اپنا غم کہہ کر اپنی رگوں کو ایک دوسرے کی گرفت سے آزاد کر دیں۔۔۔۔۔ کاش عمروں کے اس سوز پر ہمیں کچھ طمانیت مل سکے۔۔۔۔۔ وہ ورشت کے نیچے گاڑی میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا جب اچانک ولیم نے تالا کھولا۔۔۔۔۔ وہ اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔۔۔۔۔ یہ کیا سمعہ تھا۔ ولیم تالا کھولنے کے بعد گیٹ کھول کر باہر جیسے کسی کا شکر تھا اور پھر ایک لڑکی گاڑی میں آئی ولیم دوبارہ گیٹ بند کرنے لگا تو اس نے بھی جلدی سے اپنی گاڑی اس

کے پیچھے لگا دی۔ بعض اوقات قدرت کیسے دلوں کی آواز سن لیتی ہے شاید وہی لمحہ قبولیت کا ہوتا ہے۔ ولیم حیرانی سے اسے اور اس کی بیوی ویٹی آئی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی ایک تک ولیم کو دیکھا اور اسے پہلی نظر میں پہچان لیا۔ اس کے چہرے اور پر سنائی میں دو ٹکوں اور دو تہذیبوں کے نمایاں ٹچ نے ولیم کا خود بخود تعارف کرا دیا تھا۔

”آپ..... آپ کون ہیں اور.....؟“ ولیم سر اسیگل کے عالم میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”میں..... میں تمہاری ماما کا کزن ہوں۔ ضرار حیدر.....“

”لیکن میری ماما..... کا تو کوئی نہیں۔“ ولیم کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ آئے نور بھی برآمدے میں رک کر دونوں کی گفتگو سن رہی تھی اور ادھیڑ عمر کے اس سوہرے بندے کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔

”آپ اپنی ماما کو جا کر بتائیں کہ حیدر انکل آئے ہیں۔“ حیدر نے بڑا اعتماد ہو کر اسے کہا تو ولیم اندر چلا گیا۔ آئے نور مسلسل اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ولیم باہر آیا۔

”آپ اندر آ جائیں.....“ ولیم اور نور دونوں اسے ماما کے کمرے تک لے کر گئے۔ ولیم اور نور کچھ بھی نہیں بول رہے تھے۔ دونوں حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

شہلا بستر پر لیٹی بڑیوں کا ڈھانچہ لگ رہی تھی۔ اس کے سر کے سارے بال اتار چکے تھے۔ آنکھوں کی پلکیں اور ابرو تک جھڑکی تھیں کالے سیاہ ہونٹ اور سیاہ چلی ہوئی رنگت اس کی اندر کی اذیتوں کی کہانی بیان کر رہی تھی۔ اس نے سر پر ٹھل کا سفید دوپٹا لے رکھا تھا۔ حیدر تو اسے پہچان ہی نہ سکا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”آ..... آپ یہاں کیسے.....؟“ شہلا نے حیدر کو یوں افسردہ دیکھ کر پوچھا۔

”مس افضل نے بتایا تھا ہر روز آتا تھا مگر گیٹ کے باہر تالا دیکھ کر چلا جاتا تھا۔“ حیدر نے وضاحت کی۔

”اوہ..... آئی ایم سوری..... میں نے تالا کسی اور وجہ سے لگایا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ آپ.....؟“ ولیم معذرت کرنے لگا اور نور کی طرف دیکھا۔

”پلیز اسے بٹا دیں..... اسے دیکھ کر آنے والوں کو بہت کوفت ہوتی ہے۔“ حیدر نے اپنی جھنجھلاہٹ ظاہر کی۔

”ہاں..... میں آج ہی اسے اتار دیتا ہوں.....“ ولیم نے جواب دیا۔

”ماما..... ہم لوگ انکل کے لیے کچھ لائیں؟“ ولیم نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کو کہا۔

”یہ ولیم ہے..... میرا بیٹا..... آپ اس سے مل تو چکے ہیں اور یہ آئے نور ہے۔ بہت اچھی بیٹی ہے۔ ولیم کی کلاس فیلو ہے۔ ہم اس کے گھر

میں رہ رہے ہیں یہ سب اسی کی مہربانی ہے۔ درنہ آج ہم کہاں در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہوتے۔“ وہ تاسف سے بولی۔

”آئی پلیز ایسی باتیں تو نہ کریں۔“ نور جلدی سے بولی۔

”اور یہ حیدر ہیں..... میرے کزن۔“ شہلا ولیم سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ولیم کی نظروں میں ان گنت سوالات اور بے حد حیرانی

تھی۔ وہ تو اب تک یہی جانتا تھا کہ اس کی ماں کا کوئی نہیں یہ اچانک رشتے دار کہاں سے پیدا ہو گیا اس کا مطلب ہے ممانے اسے بچ نہیں بتایا تھا اور اس کے لیے سب سے شاکک حیدر کا دوسری کیونٹی سے ہونا تھا۔ اس نے نور کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بھی وہی کچھ تھا جو اس وقت وہ خود سوچ رہا تھا۔

”مما..... ہم آتے ہیں۔“ اس کے لیے وہاں رکنا مشکل ہو رہا تھا۔

”ولیم یہ سب کیا ہے..... مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا.....“ نور نے باہر نکلتے ہی حیرت سے پوچھا۔

”اور مجھے بھی.....“ وہ بھی حیرانی سے بولا۔

”سنو یہ کوئی عام شخص بھی معلوم نہیں ہوتے..... میں نے اس شخص کو کسی اخبار میں بھی دیکھا ہے اور ویسے بھی ان کا بات کرنے کا اسٹائل اور پر سنائی..... مجھے پورا یقین ہے یہ کوئی عام شخص نہیں ہیں.....“ نور قدرے تشویش سے بولی۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ ممانے مجھ سے کیا کیا چھپایا ہے.....؟“

”افوہ..... ایک تو تم فوراً بدگمان ہو جایا کرو..... انسان کو پہلے اچھی طرح سارے پہلوؤں کے بارے میں یقین کرنا چاہیے پھر کوئی رائے قائم کرنی چاہیے.....“ نور نے اسے سمجھایا۔

”نور میں پہلے ہی کچھ کم ڈسٹرب ہوں..... اور اوپر سے یہ سب؟“

”کیوں..... تم کیوں ڈسٹرب ہو.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ اس نے ٹھانسی والی ساری بات اسے بتا دی۔

”تم تو مجھے اس وقت میٹھوچ لگ رہے ہو.....“ وہ مسکرا کر بولی۔

”لداق نہیں..... میں سیریس ہوں۔“

”اچھا بابا تم کیا چاہتے ہو.....“

”میں یہی چاہتا ہوں کہ وہ ڈسٹرب نہ رہے۔ وہ بہت پریشانی میں یہاں سے لگی ہے اور وہ کچھ اس کی سوچ کس قدر محتاط ہے۔ وہ کتنا غلط سوچ رہی ہے.....“

”اس میں غلط کیا ہے۔ سوچ تو سوچ ہوتی ہے۔ کیسی بھی ہو سکتی ہے۔ ہاں..... وہ احمق ہے اس لیے کہ اس نے ساری بات تمہیں بتا دی.....“ نور کے لہجے میں شرارت تھی۔

”پلیز بی سیریکس..... میں اس کے خیالات جان کر پریشان ہو گیا ہوں۔“

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے جب تم نے اسے کہہ دیا ہے کہ تم جرج جوئن کر رہے ہو تو وہ خود ہی سمجھ جائے گی.....“

”لیکن وہ مجھے بہت زیادہ پریشان لگی ہے اور وہ کچھ حد تک جنونی ہو چکی ہے۔“

”وہ تو ہر انسان ہوتا ہے، کوئی تھوڑا کوئی زیادہ۔“

”تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو؟“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”آخر تم کیا سمجھانا چاہتے ہو یہ کہ وہ تم سے محبت کرنے لگی اور اب تمہیں بھی کچھ ایسا سوچنا پڑے گا ٹھیک ہے اگر تم ایسا سوچتے ہو تو جو تم کرنا چاہتے ہو کر لو، مجھے کوئی اعتراض نہیں..... میں ہمیشہ سے تمام آرزوؤں کے ساتھ بچنے کی عادی ہوں۔ میں نے جہاں اتنا کچھ کھویا ہے، سہا ہے یہ بھی سہہ لوں گی۔“

”کم آن نور.....“

”تو پھر کیا چاہتے ہو تم.....؟“ وہ خفگی سے بولی۔

”مجھے نہیں معلوم.....“ وہ اکتا کر بولا۔

”ولیم..... ابھی تک تمہارا زندگی کی طرف رویہ ناگہجی کا شکار ہے۔ تم ہر بات، ہر سوچ کو واضح انداز میں کیوں نہیں سوچتے اور جو تم کہتے ہو اس کے بارے میں تمہارے اندر تضاد کیوں ہے۔ تمہاری اب تک کسی بھی بات کے بارے میں ایک رائے ہو جانی چاہیے..... جب تم ایسی باتیں کرتے ہو تو مجھے لگتا ہے کہ میری اتنی محنت ضائع ہو گئی ہے۔ میں تمہیں بار بار کہتی ہوں کہ میں تمہیں اپنے ہر ارادے، ہر سوچ اور ہر بات میں پاز یو اور اسٹرونگ دیکھنا چاہتی ہوں۔ تمہارا یوں جھنجھلانا، پریشان ہونا اور ہر بات پر وضاحتیں چاہنا مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگتا۔“ وہ گلاس میں کوک ڈالتے ہوئے بولی۔ ولیم اس کی باتیں دھیان سے سن رہا تھا۔ وہ ہر روز ایسی لمبائیں سننے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔

”ٹھہرو..... میں یہ اندر دے کر آتی ہوں۔“ وہ گلاس فرے میں رکھ کر اندر چلی گئی..... اور دروازے پر دستک دی۔

”کم ان.....“ مسز پیٹر نے کہا۔ اس نے گلاس ٹیبل پر حیدر کے سامنے رکھا اور ایک ٹک دوڑوں کو دیکھا۔ مسز پیٹر اپنی آنکھیں صاف کر رہی تھیں اور حیدر کی آنکھوں میں بھی نمی تیر رہی تھی۔ کسی نے کچھ بھی نہ کہا وہ گلاس رکھ کر باہر آ گئی اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

حیدر بیٹی کے رویے کی اس سے معافی مانگ رہا تھا اور وہ خاموشی سے سب کچھ سن رہی تھی۔

”شہلا تم سب کچھ کہہ کیوں نہیں دیتیں.....“ حیدر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”کیا کہوں..... میرے پاس تو کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں..... نہ لفظ رہے ہیں اور نہ ہی اتنی یادداشت..... معلوم نہیں کس لمحے میں اگل

منزل کی طرف روانہ ہو جاؤں۔ ہو سکتا ہے یہی لمحہ آخری ہو.....“

”تم مایوسی کی باتیں چھوڑ دو، تمہیں ٹھیک ہونا ہے..... ہر صورت میں اور ہر قیمت پر.....“ حیدر بڑا اعتماد سے بولے۔

”نہیں، حیدر اب یہ ممکن نہیں.....“

”میں ایسی باتیں تم سے سننا نہیں چاہتا۔“

”مگر حقیقت تو تم بھی جانتے ہو.....“

”حقیقت کچھ بھی ہو..... میں خدا کی خدائی پر بھی یقین رکھتا ہوں۔“

”ہاں اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں رہ جاتا۔ ہم بے بس انسان یہ نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔۔۔۔۔“ وہ پھر بے اعتمادی سے بولی۔
 ”تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو۔۔۔۔۔ آج سب کہہ دو۔۔۔۔۔“

”کس کے بارے میں کیا کہوں۔۔۔۔۔ زندگی کے اتنے سال اپنے آپ سے سب کچھ تو کہتی اور سنتی رہی ہوں۔“
 ”قصص شہلا سے جو شکوہ ہے وہی کہہ دو۔ اگر مجھ سے ناراض ہو تو کہہ دو کچھ تو کہو کہ تمہارے دل کا بوجھ کم ہو۔“

”حیدر مجھے کسی سے بھی کوئی شکوہ نہیں۔ شہلا تو میری بیٹی جیسی ہے اور تم سے کیا کہوں۔ پوری دنیا میں صرف ایک تم ہی تو ہو جس سے میں کبھی بھی ناراض نہیں ہوئی۔ حیدر زندگی بڑا ہی گورکھ دھندا ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ کاش میں پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی۔ کاش تم میری زندگی میں نہ آئے ہوتے۔ کاش ہم تم ہی نہ ہوتے۔“ وہ اپنی ہی لے میں کہہ رہی تھی اور حیدر حیران کن لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو کچھ وہ چند ثانیے پہلے سوچ رہا تھا اب وہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔ کوئی اتنا بھی دل کے قریب ہو سکتا ہے۔ جو دل کی باتوں کو بنا کہے سن لے۔ حیدر نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ کاش ہم تم نہ ہوتے۔“ نادانستہ حیدر کے منہ سے نکلا اور اس کے اندر کا کرب اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ ”کاش میں قصص کبھی اس حالت میں بھی نہ دیکھتا۔ تم سوچ نہیں سکتی کہ اس وقت میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔“
 ”گناہوں کی سزا کسی نہ کسی صورت میں تو ملنی ہوتی ہے۔“ شہلا آہستہ سے بولی۔
 ”کون سے گناہ؟“ حیدر چوٹا۔

”حیدر۔۔۔۔۔ میں نہیں جانتی کہ کس وقت مجھے موت آ جائے مگر اب سوچتی ہوں کہ شاید مجھ سے بہت زیادہ گناہ سرزد ہو گئے ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے کچھ ایسے فعلے کیے جنہوں نے شاید کتنے ہی لوگوں کو براہ کردیا ہے۔“
 ”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”معلوم نہیں۔۔۔۔۔ میری شفیق، آفاق اور فلک کن حالات میں ہوں۔ حیدر قصص کچھ نہ کچھ خبر تو ہوگی۔ میرے بچے کیسے ہیں۔ معلوم نہیں منصور اور شہزادے ان کا خیال بھی رکھا کہ نہیں۔ منصور تو بچوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ شہزادے کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ حیدر مجھے جتنوں بہت یاد آتے ہیں۔ نہ جانے مجھے کیوں یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ میرے بچوں کے ساتھ زیادتی ہو گئی ہے اور ولیم۔۔۔۔۔ ولیم چرچ جو ان کے سونے کا سوچ رہا ہے۔ حیدر اس کو تو میں نے کوئی بھی مذہب دے دیا۔ میں نے تو صرف ایک اچھا انسان بنانا چاہا اور وہ صرف اور صرف اپنے نام سے ہی سب کچھ اخذ کر رہا ہے اور میں نے کتنی قاش غلطی کی۔ پیڑ جو اس کا وجود نہیں چاہتا تھا۔ جس نے اسے ایک نظر بھی نہیں دیکھا۔ میں نے خود اس سے اصرار کر کے کہا کہ وہ اس کا نام رکھے۔

حیدر میں نے کتنی بڑی غلطیاں کی ہیں میں خود ائندہ سے کیا ہوں اور دنیا کی نظر میں کیا بن گئی ہوں۔ میں نے زندگی میں جن چیزوں کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ اب مجھ سے سوال کر رہی ہیں۔ حیدر میں نے جو قدم بھی اٹھایا، غلط اٹھایا۔ میں نے زندگی میں جس جس سے جو بھی کچھ کہنا چاہا کبھی نہ کہہ سکی۔ بس سوچتی ہی رہی اور میں سب لوگوں سے پیچھے رہ گئی۔ میں اپنی شناخت ڈھونڈنے چلی تھی اور اپنا جو دکھو بیٹھی۔ کیا تم نے مجھ جیسے

لوگ بھی دیکھے ہوں گے۔ کتنے در ماندہ بے خانماں، پستیوں کے مسافر، ذلتوں کے مارے ہوئے دھکارے ہوئے۔“
”خدا کے لیے اس طرح سوچنا چھوڑ دو۔“ حیدر تپتی لہجے میں بولا۔

”حیدر تم ہی بتاؤ کیا سوچوں، موت مجھے سامنے نظر آ رہی ہے۔ معلوم نہیں اگلا دن بھی دیکھنا نصیب ہوتا ہے کہ نہیں۔ میں ولیم کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ اس کے ساتھ بہت زیادتی ہو رہی ہے اور میں اسے بلا کر کچھ کہہ بھی نہیں سکتی اور جب میں مروں گی تو میں کہاں دفن ہوں گی؟ میں نے تو کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا مگر حیدر..... تم..... تم گواہ رہنا کہ میں..... میں مسلمان ہی ہوں۔ میں تم لوگوں میں سے ہی ہوں۔“ اسی لیے نور کمرے میں داخل ہونے لگی تھی تو اس نے یہ الفاظ سن لیے وہ کہتے میں آ گئی۔ وہ جہاں کھڑی تھی وہیں سے لوٹ گئی۔ سبز پٹیر ہاتھ باندھے سسکیاں لے رہی تھیں۔ نور پھر لوٹی اور دروازہ تھوڑا سا کھول کر ان کی باتیں سننے لگی اس کے ذہن میں شدید کشمکش جاری تھی۔

”حیدر میں کبھی چرچ نہیں گئی اور نہ کبھی میں نے مذہب بدلا۔ میں تو بس حالات کے دھارے پر بہنے والا وہ پتا ہوں جو لہروں کے سنگ بہتا ہی چلا گیا۔ خزاں رسیدہ مر مہایا ہوا ہے۔ ہوا جس طرف لے اڑی، اڑتی گئی۔ پٹیر اور میں نے مذہب کی بنیاد پر نہیں ہلکے دوا انسان ہونے کے ناتے شادی کی۔“

”شہلا تم نے یہ کیا کیا اتنی بڑی بڑی غلطیاں اور تم کیا جانو کہ کون کون کیسے کیسے فیما زہ بھگت رہا ہے؟“ حیدر کے منہ سے ٹانستہ نکلا تو وہ چونک گئی۔

”کون..... میرے بچے.....؟“ اچانک اس کے منہ سے نکلا۔
”نہیں.....“ وہ بات کو بدلتا چاہتا تھا۔
www.pdfbooksfree.pk

”تو پھر کون؟“

”تم خود..... ولیم اور میں؟“ وہ بے ربط انداز میں بولا۔

”میرے بچے تو ٹھیک ہیں نا!“

”ہاں.....“ وہ آہ بھر کر بولا۔

”اب تو جو ان ہو چکے ہوں گے۔“

”ہاں۔“

”ٹھیک کیسی ہے؟“ وہ ذرا امید لہجے میں بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

”تمہارے لہجے میں کچھ ہے، حیدر کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں، میں تمہاری باتیں سن کر پریشان ہو گیا ہوں۔ اب میں چلتا ہوں، کل آؤں گا۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے..... سنو.....“ حیدر رکا..... ”حیدر میں جسمانی اذیت میں تو ہوں ہی مگر ذہنی کشش نے مجھے دُہرے غذاب میں جتنا کر دیا ہے۔ پلیز کچھ سوچو۔ ولیم کو اس پھوٹیشن سے نکال دو۔ حیدر تم ہی میری آخری امید ہو۔“ اس کی آنکھوں میں بے انتہا بے بسی اور دکھ تھا۔ حیدر کے لیے حریف وہیں رکنا مشکل ہو گیا وہ واپس لوٹ آیا۔

نور کے لیے یہ انکشافات بہت انوکھے تھے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ظاہر ا کچھ نظر آنے والے انسان اندر سے کتنے مختلف ہو سکتے ہیں۔ اس نے ولیم کو کچھ نہ بتایا۔ وہ یکن میں اس کا شکر تھا۔ وہ تو انہیں چائے کا پوچھنے لگی تھی اور جب لوٹی تو گویا اپنے حواسوں میں ہی نہیں تھی۔

”ولیم..... میں گھر جا رہی ہوں۔“ وہ اچانک بولی۔

”ہیں..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم تو ان سے چائے کا پوچھنے لگی تھی اور ایک دم اپنا ارادہ بدل لیا۔ کھانے پینے کے معاملے میں بھی تم اتنا چٹکا سکتی ہو۔ میں نے سوچا نہیں تھا۔“

”وہ چلے گئے ہیں مگر میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”یہ طبیعت کو اچانک کیا ہوا؟ ابھی چند لمحے قبل تو تم مجھے نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی اور اب..... نور میں تمہیں واقعی نہیں سمجھ سکتا۔“ وہ بول رہا تھا اور وہ سن رہی تھی۔

”میں جا رہی ہوں۔“ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔ حیدر جا چکا تھا اور اب وہ اپنی گاڑی ریورس کر رہی تھی۔ ولیم اس کے پاس کھڑا تھا مگر اس نے نظر اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا اور قدرے تیز رفتاری سے گاڑی باہر نکالی۔ ایک دم اسے زبردست جھٹکا لگا۔ وہ رکی اور پھر اتنی ہی تیزی سے گاڑی چلاتی ہوئی چلی گئی۔ ولیم اسے یوں دیکھ کر فکر مند ہو گیا۔



خدا اور محبت

خدا اور محبت بہت ہی خوبصورت اور روحانی ناول ہے جو مصنف ہاشم ندیم کی اپنی محبت کی سچی داستان پر مبنی ہے۔ یہ مصنف ہاشم ندیم کا پہلا ناول ہے اور اس کی کہانی کوئٹہ اور لندن شہر کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ یہ ناول ایک پرائیوٹ چینل پر ڈرامائی شکل میں بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ اس ناول کو چینل اور انٹرنیشنل دونوں سطح پر بہت سراہا گیا ہے اور بہت جلد علم و عرفان پبلیکیشنز والے اس ناول کا انگریزی ایڈیشن لندن سے شائع کرنے والے ہیں۔

یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ نئے ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

شزاہ شہل میں اچانک رونما ہونے والی تہذیبی دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنا سامان پیک کرنے میں مصروف تھی۔ اس نے واپس مری جانے کا پروگرام شزا کو بتایا تھا۔

”تم ولیم سے ملنے گئی تھی، کیا وہ ملا؟“ شہزاد نے اس سے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

شزا کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ مزید اس سے کیا پوچھے لیکن اتنا اندازہ تو اسے ہو رہا تھا کہ یقیناً ولیم نے اسے کچھ ایسا کہا ہوگا اسی لیے وہ واپس جا رہی ہے ورنہ وہ تو واپس مری جانے کے نام سے ہی مشتعل ہو جاتی تھی۔ شزا خود اسے چھوڑنے جا رہی تھی۔ وہ سارا راستہ خاموش باہر دیکھتی رہی۔ دونوں نے راستے میں ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی۔ شزا کوئی سوال کرتی تو وہ ہوں، ہاں میں جواب دے دیتی۔ اسے اتنا گہرا سکوت مگر آنکھوں میں شدید اداسی، بے بسی اور دیرانی کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔ شزا اندر ہی اندر خوفزدہ تھی۔ وہ اسے بہت کچھ سمجھانا چاہتی تھی۔ اس کی طرف دیکھتی، لب کھولنے کی کوشش کرتی اور پھر خاموش ہو جاتی۔ اسے فضا مناسب نہیں لگ رہی تھی کہ وہ اس سے کچھ بھی کہتی۔ سارا سفر خاموشی میں کٹتا۔ وہ میسر سے بھی ملی۔ میسر بہت خوشی خوشی ملا اور وہ اسے چھوڑ کر واپس آ گئی۔ رخصت ہوتے وقت شائل کو اس نے اپنے ساتھ لگایا مگر وہ اس سے کچھ نہ کہہ سکی۔ شائل کا رویا بھی بھی بہت سرد تھا۔ نہ وہ اسے دوبارہ آنے کا کہہ سکی اور نہ ہی شائل نے گھر آنے کی خواہش ظاہر کی۔

وانہی کا سفر بہت بے چینی میں کٹا۔ وہ شمال کے احساسات کو محسوس کر سکتی تھی۔ اس کی بے تابیوں اور بے چینیوں کا اعجازہ کر سکتی تھی مگر وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک عام ٹل کا اس طبقے کی ماں کی طرح ہر وقت اس کی دلجوئی نہیں کر سکتی تھی۔ سائے کی طرح ہر جگہ اس کے ساتھ ساتھ نہیں پھر سکتی تھی۔ اس کی حرکات پر نظر نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس کو اپنے ساتھ لٹا کر اس کے دکھ سکھ شیر نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اسے نئے نئے لوگوں سے ملنے سے روک بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے لیے وہ بہت کچھ نہیں کر سکتی تھی اور جو تھوڑا بہت کر سکتی تھی اس کے کرنے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بے بس اور مجبور ماں تصور کر رہی تھی۔

ملک منصور اتم ہر عورت کو کیوں اتنا بے بس کر دیتے ہو۔ شہلا، میں، شفق اور اب شام۔۔۔۔۔ نہ تم بیوی کو عزت اور مقام دے سکے نہ بیٹی کو محبت اور شفقت۔ اسے شہلا یاد آئے گی۔ ملک منصور! تمہیں چھوڑا ہی جاسکتا ہے۔ شہلا نے شاید ٹھیک فیصلہ کیا تھا لیکن اس کے بچے برباد ہو گئے اور میں نے بچوں کے خوف سے تمہیں چھوڑا نہیں مگر میرے بچے پھر بھی بکھر گئے۔ حاصل کی تمنا میں حاصل تو کچھ بھی نہ ہوا۔ ایک شخص نے اتنے لوگوں کو برباد کر دیا اور پھر بھی کس قدر بے فکر اور آزاد ہے۔ وہ جتنا اس کے بارے میں سوچتی تھی اتنی ہی شدید نفرت ہوتی جاتی تھی مگر وہ کچھ کرنے سکتی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ملک منصور کو چھوڑ کر سوسائٹی میں اس کی حیثیت ایک تنگے جیسی نہیں رہے گی اور تنگے کی طرح بے وقعت ہونا گوارا اس کے لیے موت تھی۔ وہ اپنی ذات کے غماز میں جلتا تھی اور اس کے مفادات ملک منصور سے وابستہ تھے۔ اس نے اپنے کیریئر کا آغاز ایک گلیسرس گرل سے کیا تھا اور ایک گلیسرس گرل کے لیے کمائی کی زندگی کسی موت سے کم نہ تھی۔ وہ اپنی حدود و سوچ رہی تھی۔ وہ کس حد تک ملک منصور سے کپڑا و مائز کر سکتی تھی اور جس حد تک وہ کرتی آتی تھی اس کے علاوہ مزید کس حد تک جاسکتی تھی۔ اسے اپنی راہیں مسدود نظر آ رہی تھیں۔ سب کچھ بیکار تھا۔ اس کا موبائل بج رہا تھا۔

آصف فریس آؤٹ ہو گیا تھا۔ وہ فیصل آباد میں اپنے ایک دوست کے ہاں پناہ لیے ہوئے تھا۔ اخبار کے ایڈیٹر نے اسے مزید معلومات دے کر فون بند کر دیا۔ اب ہر سوچ ختم ہو چکی تھی۔ صرف ایک سوچ باقی تھی کہ آصف کو پکڑنا ہے۔ ملک منصور سے وفاداری اسی صورت میں بھائی جا سکتی تھی۔ اسے اس کی ساکھ ہر صورت میں برقرار رکھنی تھی۔ اس کا کھوپا ہوا وٹار واپس لانا تھا۔ یہی اس کی زندگی کا حاصل تھا اور یہی اس کی خواہش تھی۔ وہ آصف کو پکڑنے کے لیے پلاننگ کرنے لگی۔



حیدر آزاد امیدوار کی حیثیت سے گاؤں کی سیٹ جیت چکا تھا اور اب پھر کوئی نہ کوئی وزارت اس کے حصے میں آنا تھی۔ سوسائٹی میں اس کی نیک نامی اور اچھی شہرت کے تمام لوگ مداح تھے۔ مخالفین کو بھی اس کی ذات پر کچڑا چھالنے کا موقع کم ہی ملتا۔ وہ ہر حلقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اس لیے ہر حکومت میں اسے کوئی نہ کوئی عہدہ ضرور ملتا تھا۔ ملک منصور سے اس کے لاکھ اختلاف سہی مگر اس نے کبھی بھی اسے لیٹ ڈاؤن کرنے کی کوشش نہ کی جبکہ ملک منصور نے کئی دفعہ اس کی پوزیشن مگرانے کی کوشش کی مگر قسمت ہر بار اس کا ساتھ دیتی۔ وہ ایک دن کے لیے گاؤں گیا تھا۔ کپاس کی فصلوں کو ایک خاص قسم کا کیڑا بہت تیزی سے تباہ کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں وہ کچھ زری ماہرین کو اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ شوق کلی دلوں سے اس کی منتظر تھی۔ اس نے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اکثر جواب نہ ملتا۔ وہ سخت پریشان تھی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل سہیل کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ وہ اس کے گھر کی کسپری سے بھی اچھی طرح آگاہ تھی۔ وہ غریب لوگ تھے اور سہیل ہی ان کا واحد سہارا تھا اور اب وہ جیل میں بند تھا تو وہ لوگ کس طرح گزر بسر کر رہے ہوں گے۔ شاید حیدر بھول چکا تھا اسی لیے تو سہیل کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ حیدر کی غیر متوقع اور اچانک آمد نے اسے خوش کر دیا۔ وہ جلدی سے بشری آپا کے پاس گئی اور حیدر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

”ٹھیک ہے، ابھی تو وہ مصروف ہیں، بعد میں مل لینا۔“

”اچھا تو میں ادھر ہی بیٹھ جاتی ہوں یہیں براہِ آدمے میں۔“ وہ اس کے کمرے کے باہر ہی بیٹھ گئی۔

”ایسا بھی کیا ضروری کام ہے کہ تم اتنی بے چین ہو رہی ہو، اپنے کمرے میں جاؤ۔“

”بس ہے نا“ وہ مسکرا کر بولی۔

”ٹھیک ہے بابا! میں ان کو کہہ دیتی ہوں مگر وہ ان لوگوں کو تو فارغ کر دیں جو شہر سے ساتھ آئے ہیں۔ پہلے ان کی روٹی پانی کا بندوبست تو

کر لوں۔“ بشری آپا حسبِ عادت اپنی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے بولیں۔

شام کو حیدر ٹکفے والا تھا جب بشری آپا سے بلانے آئیں۔ وہ خوشی خوشی ملنے چلی گئی۔

”کہو بیٹا کیسی ہو آپ؟“ حیدر نے شفقت سے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں اٹکل!“

”خیریت تو ہے نا، آپ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔“

”اودھاں! واقعی میں بھول گیا۔ مجھے اس کا ایڈریس بھی دے دو۔ میں جاتے ہی سکیل سے طوں گا۔ ویسے تم کیا چاہتی ہو۔“ حیدر نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے کر پوچھا۔

”انگل! وہ بے گناہ ہے۔ پاپا نے اپنی پوزیشن بچانے کے لیے میرا گناہ اس کے سر تھوپ دیا اور اس کی وجہ سے اس کی فیملی مشکل میں ہے۔ میں چاہتی ہوں وہ رہا ہو جائے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے، کورٹ اسے سزا دے چکی ہے۔“

”انگل ایسا سب کچھ ممکن ہے۔“ وہ بے پردائی سے بولی۔

”فرض کرو اگر قاتل دوا بارہ کھلتی ہیں تو تم بھی اس میں انوالو کر لی جاؤ گی اور ہو سکتا ہے تمہیں سزا ہو جائے۔“

”انگل! مجھے اس کی پروا نہیں لیکن اب ہر وقت گناہ کے احساس سے میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ میں نے گناہ کیا ہے تو سزا بھی مجھے ملنی چاہیے، کسی بے گناہ کو نہیں۔“

”اور اگر تمہارے پاپا.....“

”اب مجھے ان کی بھی کوئی پروا نہیں۔ وہ تو ویسے بھی آج کل مفرور ہیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”سحر نے فون پر بتایا تھا اور میں نے اخبار میں بھی پڑھا تھا۔“

”او آئی سی! میں کل ہی اسے جا کر جیل میں ملتا ہوں۔“

”تھینک یو انگل!“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”ویسے اب آپ ٹھیک ہونا، کوئی مسئلہ تو نہیں؟“

”نہیں انگل! میں یہاں بہت خوش ہوں۔ یوں لگتا ہے پہلی دفعہ گھر کی فضا میں سانس لے رہی ہوں۔ سب لوگ بہت اچھے ہیں اور میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔“

”اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ اس نے اس کے سر پر پیادہ پایا اور باہر چلا گیا۔



ملک منصور علاقہ غیر میں اپنے ایک دیرینہ دوست گل انداز خان کے پاس بالکل محفوظ تھا۔ اسے وہاں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ تھا بلکہ گل انداز خان کی میزبانی سے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ فون پر اپنی پارٹی سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ اس کی پارٹی بدستور اقتدار آ چکی تھی اور اس کے لیے اب راستہ بالکل صاف تھا۔ ایک ماہ کے اندر سارا سیاسی سیٹ اپ تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے خلاف سازشیں کرنے والے مخالفین بھی اب دبک کر بیٹھ گئے تھے اور پارٹی کے ارکان اس کی آمد کے منتظر تھے۔ ”اب کی ہار روز بر اعلیٰ نہیں بن سکا تو کیا ہوا، اگلی دفعہ سہی۔“ اس نے آئندہ کی پلاننگ

مکمل کر لی تھی۔ اس پورے عرصے میں اس نے انہی طرح حالات کا جائزہ لیا تھا اور ان تمام لوگوں کے بارے میں سوچا تھا جو اس کے خلاف سازش میں ملوث تھے۔ آصف کے بارے میں شزانے اسے بتا دیا تھا۔ آصف کو تصویریں پہنچانے والا کون تھا یہ بھی اب اسے یاد آ چکا تھا۔ اسے انہی طرح یاد آ گیا تھا کہ اس صحافی کو قتل کرنے کے بعد اس نے ریوالور اور تصویریں سبیل کی طرف پھینکی تھیں۔ سبیل نے ان کا کیا کیا اس نے دوبارہ پوچھنا گوارا نہ کیا۔ سبیل کے بارے میں سوچ کر اسے ایک دم حیرانی بھی ہوئی تھی۔ سبیل اس کا ہا احتیاط سنا تھا اور اس نے اپنی زندگی اس کے لیے داؤ پر لگا دی تھی تو پھر اس نے ایسا کیوں کیا۔ وہ واپس جا کر جیل میں سب سے پہلے اسے ہی پوچھنے جائے گا۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا۔

سبیل پر روز بروز تشدد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک تو ملک منصور نے ایس ایچ او کو اس پر نظر رکھنے کو کہا تھا اور نظر رکھنے کا مطلب وہ انہی طرح جانتا تھا اور دوسرے وہ جیل کی زندگی سے سخت تنگ آ چکا تھا۔ ملک منصور کی طرف سے بھی اس کے دل میں ہر وقت کھٹکا رہتا۔ وہ ہر روز کسی نہ کسی کے ساتھ کوئی پھنسا کرنا اور پھر اس پر اتنا تشدد کیا جاتا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر جاتا۔ اس کا سارا جسم زخموں کے نشانات سے بھر چکا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی زخم دس رہا ہوتا۔ وہ سخت اذیت میں تھا جب ایک پولیس والے نے اسے ایک ملاقاتی سے ملانے کے لیے اسے کھولا۔ وہ ملاقاتی یقیناً ملک منصور ہوگا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ملک منصور ہمیشہ سے تنہائی میں رہتا۔ وہ کوئی عام ملاقاتی تو نہیں ہوتا تھا۔ سبیل، شفق کے انجام سے انہی طرح واقف تھا اور اب اسے اپنا انجام بھی سامنے نظر آ رہا تھا۔ وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا تو چونک گیا۔ ایسا ملاقاتی جس سے اس نے زندگی بھر ملاقات نہیں کی تھی اسے ملنے جیل میں آیا تھا۔ سبیل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ سفید کٹن کے اچلے اچلے، اکڑے سوٹ میں سرخ و سفید رنگت، بوراز قد، خوبصورت چہرہ، گرتے پھرتے ایک لمحے کو چونک گیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”آ..... آپ..... کون ہیں؟“ سبیل نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔

”میں سید ضرار حیدر ہوں۔ شفق کا اکل!“

”شفق..... کا تو کوئی اکل نہیں۔“

”ہے، اس نے تمہیں بتایا نہیں ہوگا۔“

”میں اس کی ساری فیملی کو جانتا ہوں۔“

”کیا تم اس کے خیال کبھی مگنے ہو؟“

”نہیں۔“

”تو پھر تم کیسے جان سکتے ہو۔ ہمارے ملک منصور کے ساتھ کچھ اختلافات ہیں اس لیے آپس میں میل جول نہیں اور اس وقت شفق نے

مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔“ حیدر نے اسے واضح انداز میں بتایا۔

”کیا مطلب..... کیا وہ زندہ ہے؟“

”ہاں اور میرے پاس گاؤں میں ہے لیکن اس کا ذکر کسی سے بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔ ملک منصور سے بھی نہیں!“

”وہ بی کیسے گئی اور ملک منصور کو خبر بھی نہیں۔“ سہیل بے حد حیران ہو رہا تھا۔

”ہاں یہ بھی ایک معجزہ ہے۔ خیر اس بات کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تم اب کیا چاہتے ہو؟“

”کیا مطلب؟“ سہیل نے چونک کر پوچھا۔

”شفیق تمہارے اور تمہارے گھر والوں کے بارے میں بے حد پریشان ہے۔ وہ تمہیں آزاد رکھنا چاہتی ہے۔“

”لیکن یہ تو اب ناممکن ہے جبکہ کورٹ مجھے سزا بھی دے چکی ہے۔“

”ہاں یہی تو میں اسے بتا رہا تھا۔“

”میں شفیق سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔“ سہیل آہستہ سے بولا۔ حیدر نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا اور پھر خاموش ہو گیا۔

”ٹھیک ہے، میں اسے تمہارے پاس لاؤں گا۔“ حیدر اٹھتے ہوئے بولا۔

”سرا جلدی کیجیے گا۔ اس سے پہلے کہ ملک منصور مجھے جان سے مار ڈالے۔“

”کیوں؟“

”میں جانتا ہوں، بس آپ شفیق کو مجھ سے جلدی ملوادیں۔“

”اچھا۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

شفیق، حیدر کے فون کی ہر وقت منتظر رہتی۔ صبح سے شام تک وہ انتظار کی کیفیت میں بے قرار رہتی مگر کوئی فون نہ آتا وہ مایوس ہو جاتی۔ گوکہ حویلی میں ہر طرح سے آرام اور سکون تھا مگر اب وہ آہستہ آہستہ اس یکسانیت اور خاموشی سے تنگ آ گئی تھی۔ وہ اس گاؤں سے باہر نہیں جاسکتی تھی۔ مگر کبھی بہت دنوں سے فون نہیں آیا تھا۔ کوئی ایک بھی تو ایسا نہ تھا جس سے وہ دل کی بات کرتی۔ اندر کا ڈپریشن اور باہر سکوت..... وہ بے حد مایوسی کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی جب اچانک بشری آپا نے حیدر کے آنے کی اطلاع دی۔

”اس وقت.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں وہ جلدی میں ہیں اور تمہیں بلارہے ہیں۔“ بشری آپا نے کہا۔

”اچھا۔“ وہ دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے اس کے ساتھ ان کے کمرے میں گئی۔

”السلام علیکم نکل!“

”وعلیکم السلام! کیسی ہیں آپ؟“

”ٹھیک ہوں۔“

”تو پھر آپ تیار ہو جائیے، میں آپ کو لینے آیا ہوں۔“

”کہاں اور کس لیے؟“

”سبیل آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

”کیا آپ اس سے ملنے گئے تھے؟“ وہ ایک دم بڑے جوش ہو کر بولی۔

”ہاں۔“

”کیا وہ ٹھیک ہے؟“

”ہاں اور آپ سے ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔“

”اچھا تو کب تک ہم جائیں گے؟“

”بس مغرب کی نماز کے بعد۔“

”ٹھیک ہے میں فریش ہو جاؤں۔“ وہ سرور سی باہر نکل گئی۔ ڈرائیور باہر کھڑا تھا۔ دونوں رات گئے لاہور پہنچے۔ حیدر کا ڈیفنس میں ایکڑوں پر محیط شاندار محل نما گھر تھا۔ شفق کا اپنا گھر بھی کسی محل سے کم نہیں تھا مگر اس گھر میں قدم رکھتے ہی ایک انوکھی طمانیت اور سکون کے گہرے احساس نے اسے گھیر لیا۔ اس گھر کے در و دیوار انتہائی آرٹسٹک اسٹائل میں ڈیکوریت کیے گئے تھے۔ جا بجا پینٹنگز، میڈیکل گلاس ڈورز، وڈ ورک، قیمتی ٹائیلز، ڈرائنگ روم کی دیواروں پر میڈل آرٹ، پروٹرایڈز کرسٹل ڈیکوریشن، ہمو، اس کے تصورات سے بھی حسین گھر تھا۔

”انکل! آپ کا گھر کس قدر خوبصورت ہے۔“ وہ ارد گرد دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں میری بیٹی کے ہاتھوں نے اسے سنوارا ہے۔“

”انکل! آپ شہلا باجی سے بہت پیار کرتے ہیں۔“ وہ حسرت سے بولی۔

”ہاں، ظاہر ہے بھی۔“

”انکل! کاش میرے پاپا بھی آپ جیسے ہوتے یا پھر آپ ہی ہمارے پاپا ہوتے۔“ اس نے اپنی ایک ناکمل آرزو کو بہت سادگی سے کہہ دیا تھا۔ حیدر اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ اس بات کے جواب میں کوئی تسلی بھی تو نہیں دی جاسکتی تھی۔ شفق کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

”بیٹا! کچھ چیزیں انسان کے بس میں نہیں ہوتیں۔ قدرت ان کے فیصلے کرتی ہے اور ہم تو بس ان فیصلوں کو ماننے ہیں۔“

”انکل! قدرت ایسے فیصلے کیوں کرتی ہے جو بہت سے دلوں کو توڑ دیتے ہیں۔ بہت سے گھر اجڑ جاتے ہیں اور نہ جانے کتنی زخم گھیاں جہاں ہو جاتی ہیں۔ قدرت کیوں ایسا کرتی ہے؟“ وہ بے بسی سے بولی۔

”اس لیے کہ قدرت انھیں آزما رہی ہے۔ کائنات میں ہر شے کی آزمائش ہوتی ہے اور جو جتنے زیادہ اختیارات کا مالک ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ آزما یا جاتا ہے اور انسان کو تو اللہ نے ساری مخلوقات پر فوقیت دی ہے اس لیے اسے وہ سب سے زیادہ آزما رہا ہے۔“ اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”انکل! ہماری آزمائش کب ختم ہوگی۔ لگتا ہے ہم ختم ہو جائیں گے مگر ہماری آزمائش ختم نہیں ہوگی۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ لگے۔

”گھبراؤ نہیں انشاء اللہ بہتر ہوگا۔ آؤ کھانا کھاتے ہیں۔“ حیدر نے خانساں کو کہہ کر کھانا لگوا دیا۔

”سر! شہلا بی بی کا فون آیا تھا۔“ کھانا رکھتے ہوئے خانساں نے بتایا۔

”اچھا کیا کہہ رہی تھی؟“

”وہ آنے کا کچھ کہہ رہی تھیں۔ کل پھر فون کریں گی۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ حیدر سرد مہری سے بولا۔

شفاق ایک لمحے کو چوکی۔ حیدر کا رویہ اسے کافی سرد لگا مگر وہ خاموش رہی۔ وہ کھانا سامنے رکھے نہ جانے کن سوچوں میں گمن تھی۔

”بیٹا! آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہیں؟“

”بس دل نہیں چاہ رہا۔“

”کیوں بھی؟“

”انگل! جب شہلا باجی کا کھانا کھانے کو دل نہیں چاہتا تھا تو آپ کیا کرتے تھے؟“

”تو پھر میں اسے خود اپنے ہاتھوں سے کھلاتا تھا۔“ وہ ایک دم بولا اور پھر خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپٹے کی ڈانگ

نیمبل پر گرے۔

”کیا ہوا بیٹا! آپ تو بے حد حساس ہو۔“

”انگل! زندگی میں ایک دفعہ بھی ہمیں کسی نے اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھلایا۔ نہ ممانے اور نہ پاپانے۔“ شدید احساس بحروری نے اس کو

ایک دم مہینجھوڑ ڈالا تھا۔

”تو بیٹا اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ لاؤ میں اپنی بیٹی کو کھلا دیتا ہوں۔“ اس نے چاولوں کا پیچ اس کی طرف بڑھایا۔ شفاق نے اس کی

طرف دیکھا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ حیدر کی آنکھوں میں بھی نمی ہی تیرنے لگی۔

”انگل! جن بچوں کے ماں باپ نہیں ہوتے وہ کتنے محروم بچے ہوتے ہیں۔ وہ کیا کچھ کھودیتے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی نعمت، سب

سے بڑا انعام۔“ وہ رورہی تھی اور اس کے ہاتھ سے پیچ پکڑ کر اس نے پلیٹ میں واپس رکھ دیا تھا۔

”تم پریشان نہ ہو، اٹھو اور سو جاؤ۔“ حیدر نے شیر شاہ کو بلایا جو گھر کے تمام امور کا انچارج تھا اور ہر بات کا وہی جوابدہ ہوتا تھا۔ شیر شاہ

درمیانی عمر کا دراز قد، محنت مند پنخان تھا اور حیدر اس کے ساتھ بہت ادب سے پیش آتا تھا۔

”شیر شاہ! بی بی کے لیے گیٹ روم کھلوادو۔“ حیدر نے اسے حکم دیا۔

”جی صاب جی! میں ابھی آیا بی بی صیب۔“ وہ باہر نکل گیا۔ شفاق نے ایک نوالہ بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ بہت تھک چکی تھی۔ حیدر بھی تھکا ہوا

لگ رہا تھا۔

”اگل اگیل ٹھیک تو ہے نا، وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟“ وہ ڈانٹنگ نچل سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”ہاں وہ ٹھیک ہے۔ شاید کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔“

”اچھا۔“ وہ گہری سوجی میں ڈوب گئی۔

”آ جاؤ بی صیب! کراٹیک کر دی ہے۔“

”ہاں شیر شاہ! بی بی کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ بھی میری بیٹی ہے۔“ حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا تو شفیق نے ڈھی مسکراہٹ سے اس کی طرف

دیکھا اور شیر شاہ کے ساتھ گیسٹ روم میں چلی گئی۔

لگے دن وہ بڑی ہی چاؤ مارڈھ کر سہیل سے ملنے گئی۔ سہیل کو اس علیے میں دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی اور سہیل اسے زندہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

”سہیل! تمہاری یہ حالت..... مائی گاڈ! میں اس سب کی ذمہ دار ہوں۔“ شفیق کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ حیدر ایس ایچ او کے پاس

بیٹا تھا اور وہ جیل میں اسے خود چھوڑ کر آیا تھا۔

”میری حالت کو چھوڑو، میں جانتا ہوں میری زندگی اب بہت تھوڑی ہے۔ بس میں چند دنوں کا مہمان ہوں۔“

”کیوں؟“

”ملک منصور نے آتے ہی مجھے شوٹ کر دینا ہے۔“

”مگر کیوں؟“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”اس لیے کہ ان کے خلاف اسکیٹرل میں نے ڈس کلوز کر دیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”بس میں مشتعل ہو گیا تھا اور آصف کو بھی انوالو کر لیا۔“

”کون آصف؟“ سہیل نے اسے ساری تفصیلات بتا دیں۔

”شفیق! کسی طرح آصف کو بچانے کی کوشش کرو۔ میں تو زندگی سے ہاتھ دھونے والا ہوں مگر آصف..... اس بے چارے کا کیا قصور۔ وہ

تو میری وجہ سے پھنس گیا۔ تم کسی طرح اسے بچانے کی کوشش کرو پلیز۔“

”لیکن تم.....“

”میری فکر چھوڑو، بس گھر میں خیریت پوچھنے جانا۔ شاید وہاں تو قاتلوں کی نوبت آ گئی ہے۔ اماں آئی تھیں، بہت پریشان تھیں۔“ سہیل

کی باتیں سن کر وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔

”تم اپنا خیال رکھنا، کیا میں کورٹ میں حاضر ہو جاؤں؟“

”نہیں، اس کی اب قطعی ضرورت نہیں۔ بس تم آصف کو بچانے کی کوشش کرو۔“ سہیل کو اپنے سے زیادہ آصف کی فکر تھی۔

”میں پھر آؤں گی اور پریشان نہ ہوں۔“

”ہاں اب میرے دل کا بوجھ کافی کم ہو گیا ہے۔“ حیدر اسے لینے آ گیا تھا۔ واپسی پر اس نے حیدر سے آصف کے بارے میں بات کی۔

”ٹھیک ہے، مجھے اس کے بارے میں تفصیلات بتا دینا۔ میں اسے بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔“

”انکل! میں آپ سے کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہوں۔“

”ہاں ہاں کہو، کیا بات ہے؟“

”انکل! میں سہیل کے گھر جانا چاہتی ہوں اور ان کی کچھ مدد کرنا چاہتی ہوں مگر میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔

”ٹھیک ہے تم میرے سیکرٹری اولیس کے ساتھ چلی جانا اور جس طرح بھی ان کی مدد کرنا چاہو، اولیس کو بتا دینا۔“ حیدر نے شفقت سے کہا۔

”تھینک یو انکل! آؤ ریلی گریٹ!“ جو اب حیدر مسکرا دیا۔

اگلے ہی دن وہ اولیس کے ساتھ سہیل کے گھر چلی گئی۔ ان لوگوں کی حالت دیکھ کر اسے سخت دکھ ہوا۔ اس کی ماں سوکھ کر جینا ہو گئی تھی اور

اب حواسوں میں نہیں تھی اور دونوں بہنیں بھی شدید غم و غصے سے دوچار تھیں۔ گھر کا تقریباً سارا سامان بک چکا تھا۔ اسے ایک کپ چائے پلانے کے لیے بھی ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔

”آپ لوگ کیسے گزارہ کرتے ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”بس جی مانگ مانگ کر یا کوئی خودی خدا خونی کر کے یا پھر کوئی صدقے خیرات میں دے جائے۔“ عذرا نے کہا تو اس کی آنکھیں

آنسوؤں سے ڈبڈبائے لگیں۔

”اب آپ فکر نہ کریں۔ آپ کو ہر ماہ یہ صاحب کچھ پیسے دے جایا کریں گے۔“ اس نے اولیس کی طرف اشارہ کیا۔

”نی الحال آپ یہ تو رکھیں۔“ اس نے دس ہزار روپے عذرا کو دیے۔ سب حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

”ڈاکٹر اماں جی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟“ اس نے اماں کی حالت دیکھ کر پوچھا۔ اماں نے اسے ہانکل نہیں پہچانا تھا بلکہ وہ تو اس کی

آواز سن کر چارپائی سے بھی نہ اٹھی تھی۔

”جب سے بھائی کو سزا ہوئی ہے اور اب تو رورو کر ان کی بیٹائی بھی بہت کم ہو گئی ہے۔ نہ جانے ہم کس کے گناہوں کی سزا بھگت رہے

ہیں۔ خدا اس کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ باجی! ویسے آپ کیسے بچ گئیں۔ اماں نے توجہ دیا تھا۔۔۔۔۔“

”ہاں بس قدرت نے بچا لیا۔“

”آپ اتنی اچھی ہیں اور اللہ اپنے اچھے بندوں کو ہمیشہ مصیبت سے بچا ہی لیتا ہے۔“

”اچھا اب میں چلتی ہوں مگر آتی رہوں گی۔“ وہ جیسے کہیں گم ہو گئی تھی بے دلی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”شکریہ آپ بہت اچھی ہیں۔“ دونوں بہنیں اسے خدا حافظ کہنے دروازے تک آئیں۔ سارا راستہ وہ بے چین رہی۔ عذرا کے الفاظ

اس کے دماغ میں مسلسل ہتھوڑے بجا رہے تھے۔ ”خدا اس کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔“ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ اس کے اندر شدید جھنجھٹ اور پھانس تھی۔ نہ جانے اس نے کیا کہہ دیا تھا کہ ایک لمحے کے لیے بھی اسے جھنجھٹ نہیں مل رہا تھا۔ وہ گاڑی میں ہار ہار پہلو بدل رہی تھی۔ ڈرائیور اور اوئیس اس کے ساتھ تھے۔ اوئیس نے ابھی فریٹش ایم پی اے کیا تھا۔ جاب کافی الحاح مسئلہ تھا تو حیدر نے اسے پرسنل سیکرٹری رکھ لیا۔

”میڈم! ان لوگوں کی طرف ہر ماہ خود آنا پڑے گا یا پھر ان کے کاؤنٹ میں پیسے جمع کرادیے جائیں۔“ اوئیس نے بغیر مڑے اس سے پوچھا۔ ”نہ جانے ہم کس کے گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ خدا اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔“ عذرا کے الفاظ کسی چیز دھار چاقو کی طرح اس کے دماغ کی شریانوں کو کاٹ رہے تھے۔ وہ اندر ہی اندر لہو لہان ہو رہی تھی۔

”میڈم!“ اوئیس نے مڑ کر اسے دیکھا مگر وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

”ایکسکیوز میڈم!“ وہ پھر بھی باہر دیکھ رہی تھی۔ اوئیس نے قدرے شرمندگی سے ڈرائیور کی طرف دیکھا اور پھر خاموش ہو گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ کہیں دور بھاگ جائے جہاں کوئی ایسی بازگشت نہ ہو۔ جہاں اس کا ماضی نہ ہو۔ یا خدایا! میرا ماضی میرے لیے کس قدر بڑا عذاب بن گیا ہے۔ میرا ماضی کتنا داغدار ہے اور حال بھی اور شاید مستقبل بھی ایسا ہو۔ اس نے سیٹ کے ساتھ سر ٹکا دیا۔

نور شدید الجھن کا شکار تھی۔ وہ زندگی کی جھنجھٹوں کو جان کر ہر مسئلے کا حل ڈھونڈنے کی عادی ہو چکی تھی لیکن سبز پٹری کی باتیں اس کی سمجھ سے ابھی بھی باہر تھیں۔ وہ ولیم سے ملنے آئی تو وہ بہت دنوں کے بعد قادر سے ملنے گیا ہوا تھا۔ سبز پٹری دوائیں کھا کر سو رہی تھیں اور وہ ان کے سامنے ایڑی چیر پٹٹی ان کے چہرے پر نظریں مرکوز کیے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ انسان کو جان لینا مشکل کام ہے۔ شاید دنیا کا سب سے مشکل کام۔ جو چیزیں سامنے نظر آ رہی ہوں ان کی تغیر مشکل نہیں۔ چوٹیاں سر کی جاسکتی ہیں مگر دنوں کو ان کے سارے رازوں اور اسراروں سمیت تغیر کرنا شاید دنیا کا مشکل ترین اور انوکھا کام ہے۔ شاید اسی لیے آج تک کسی نے بھی دل کی چوٹی سر کرنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ سبز پٹری کیا ہیں؟ اور ولیم! وہ بھی تو ان کی طرح نہیں۔ وہ تو شاید ان ساری باتوں سے ناواقف ہے اور اس کے لیے سب کچھ کس قدر غم انگیز ہوگا۔ وہ کیسے سب کچھ قبول کر پائے گا اور ان کے اور بچے بھی نہیں اور وہ ولیم کو اس صورت حال سے ٹکالنے کی بات کر رہی تھی۔ ولیم..... چرچ..... قادر اور اس کا ان سب سے شدید لگاؤ..... اس نے سب کچھ کہاں سے پایا تھا۔ وہ سوچوں میں گم تھی جب ولیم آ گیا۔

”تم کب آئی؟“ ولیم نے حیرت سے اس سے پوچھا۔

”کافی دیر سے۔“

”خیریت تو ہے تم آج کچھ پریشان ہی لگ رہی ہو؟“

”ہاں، ہوں تو سہی۔“

”مجھے کچھ نہیں بتاؤ گی۔“

”نہیں کیونکہ تم بھی پریشان ہو جاؤ گے اور تمہارا پریشان ہونا مجھے پسند نہیں۔“

”اچھا، ایسی بھی کیا بات ہے۔“ وہ کتابیں شیف میں رکھتے ہوئے بولا جو وہ ہاسٹل سے لایا تھا۔

”کہاں سے آرہے ہو؟“

”ہاسٹل گیا تھا، کچھ کتابوں کی ضرورت تھی اور پھر قادر کے پاس گیا تھا۔“

”کیوں؟“ اس نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

”تجسس معلوم تو ہے وہ مجھ سے بہت ناراض ہیں۔“

”تو پھر کیا اب ناراضگی ختم ہوگئی ہے۔“

”نہیں، انھوں نے مجھ سے ملنا گوارا ہی نہیں کیا۔ نہ جانے ان کو میرے بارے میں کیا شبہات ہیں۔ میں نے تو صاف صاف مہما کی

حالت کے بارے میں بتایا تھا پھر بھی..... پھر بھی وہ نہیں سمجھتے۔ کبھی کبھی تو مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ قادر سینے میں ایک انسان کا دل نہیں رکھتے۔ وہ

اپنی ہر بات میں اصول، قواعد و ضوابط کو لے آتے ہیں۔ زندگی میں کبھی کبھی اصول توڑنے پڑتے ہیں۔“ وہ مایوسی سے بول رہا تھا۔

”ولیم! نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ تم جرج جوائن کر کے قتل کر دو گے۔“

”نہیں، کبھی نہیں۔“ وہ دھوکہ لہجے میں بولا۔

”کیوں، تم اتنے دھوکے سے کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”اس لیے کہ میں جن مشکلات سے گزرا ہوں اب میں اپنا ذہن تبدیل نہیں کرنا چاہتا۔ میری زندگی کا خواب پائلٹ بننا تھا۔ تم جانتی ہو

اس خواب کو اپنے ذہن سے نوچنے کے لیے مجھے کتنا عذاب سہتا پڑا ایک ایک لمحہ میرے لیے عذاب بن گیا تھا اور اب جبکہ میں یہ سوچ چکا ہوں اب

اس سوچ کو پھر بدلنا میرے لیے ناممکن ہے۔ میں اپنے آپ کو بار بار مصیبتوں میں نہیں ڈالنا چاہتا۔“ وہ بڑا اعتماد لہجے میں بولا۔ نور اس کی طرف دیکھتی

رہی اور پھر خاموش ہوگئی۔

”مگر تم کیوں پریشان ہو؟ تم جیسی لڑکی کو پریشان دیکھ کر میں بھی پریشان ہو گیا ہوں۔“ وہ مدھم سی مسکراہٹ سے بولا۔

”کیوں، میں انسان نہیں ہوں؟“

”ہاں ہو مگر بہت بولڈ جس سے شاید مسئلے بھی دور بھاگتے ہیں۔“

”یہ تمہاری خام خیالی ہے۔“

”نہیں مجھے پورا یقین ہے۔“

”کبھی کبھی یقین بھی دھوکا دے جاتا ہے۔“

”اچھا الجھاؤ نہیں۔“

”کیسے نہ الجھاؤں۔ اس وقت تو میں خود شدید الجھن میں ہوں۔“ وہ آہ بھر کر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”کیا تم مجھ سے کچھ شیئر نہیں کرنا چاہتی یا پھر مجھے اس قابل نہیں سمجھتی؟“

”میرا خیال ہے دوسری بات زیادہ ٹھیک ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے جو تمہاری مرضی۔“

”آئی کوڈا کٹر کے پاس لے کر گئے تھے؟“

”نہیں، حیدر انکل خود لے کر جائیں گے اور ہاں قسمیں بتانا تھا کہ ہم لوگ ادھر سے شفٹ ہو رہے ہیں۔“

”کہاں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”حیدر انکل کا گلیبرگ میں ایک گھر ہے ادھر۔“

”ولیم! حیدر انکل اچانک کہاں سے آئے۔ کیا تم نے زندگی میں پہلے بھی انھیں دیکھا.....؟“

”نہیں اور ماما کی حالت ایسی ہے کہ میں ان سے کچھ بھی نہیں پوچھنا چاہتا۔ نور! اب تو ماما ہر وقت موت کی باتیں کرتی رہتی ہیں اور.....“

اور مجھے بہت خوف آتا ہے۔“ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”کیوں؟“

”ان کے بعد میں کیا کروں گا۔ میری ماما تو میرے لیے سب کچھ ہیں جیسے کرائسٹ کے لیے مری۔..... اور گاڈ..... پلیز سیو ہر۔“ اس

کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔ وہ ولیم کو یوں پریشان دیکھ کر مزید کچھ کہہ کر اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”پھر کب شفٹ ہو رہے ہو؟“

”کل انکل لینے آئیں گے۔“

”ولیم! حیدر انکل دوسری کیونٹی سے نہیں ہیں کیا؟“ اس نے عجیب استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”یوہی! کیا قسمیں حیرت نہیں ہوئی؟“

”نہیں، بالکل نہیں۔“

”کیوں؟“

”ہو سکتا ہے ماما بعد میں اپنا مذہب بدل چکی ہوں۔“

”نہیں، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایک سچا مسلمان کبھی مذہب بدل نہیں سکتا۔ ہمیشہ وہی اپنی راہ بدلتے ہیں جن کا ایمان بودا اور کمزور ہوتا ہے اور

جن کے دل دماغ کمزور اور شہادت میں جھکا ہوتے ہیں اور حیدر انکل کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ ایک اچھی مسلمان فیملی سے ہیں۔“

”تو پھر اس کا کیا مطلب ہوا؟“ ولیم نے یوں حیرت سے پوچھا جیسے اس کے سر پر ہتھوڑے برس رہے ہوں۔

”مظلوم نہیں، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں خود اسی وجہ سے الجھن کا شکار ہوں۔ میں تم سے بالکل ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی مگر میں مجیب غصے میں ہوں۔“ نور آہستہ سے بولی۔

”تم نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ پلیز تم اس وقت چلی جاؤ۔ میں سخت گھٹن محسوس کر رہا ہوں۔ میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چاہتا ہوں۔“ ولیم کی ہمیشہ سے یہی عادت تھی۔ جب وہ شدید الجھن کا شکار ہو تو دروازے، کھڑکیاں اور لائٹ بند کر کے اندر حیرے میں سوچنا رہتا اور ابھی بھی وہ اس ماحول میں اپنے آپ کو دفن کر کے چند ثانیوں کے لیے اپنے آپ سے کچھ ڈسکس کرنا چاہتا تھا۔

”ٹھیک ہے میں چلتی ہوں مگر کچھ ہونے والا ہے۔ شاید بہت عجیب..... بہت اذکھا.....“ نور آہستہ سے بولی اور کمرے سے نکل گئی۔ ولیم نے ماں کے چہرے کو بغور دیکھا۔ بیماری اور نقاہت نے صرف دو تین ماہ میں انھیں بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔ ان کے چہرے پر پھیلا کرپ اور پامیت سب کچھ تکلیف دہ لگ رہا تھا۔ وہ ان کے کمرے سے نکل گیا اور اس کمرے میں چلا گیا جو اس نے قیام کے دوران اپنے لیے سیٹ کیا تھا۔ وہ خاموشی سے دروازے، کھڑکیاں اور لائٹ آف کر کے کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنا رہا۔ مسلسل سوچنا رہا۔ وہ ہمیشہ ایسی سنگ کے بعد اپنے آپ کو ہلکا پھلکا اور مطمئن محسوس کرتا تھا مگر کئی گھنٹے گزارنے کے بعد بھی وہ شدید الجھن سے دوچار تھا۔ وہ مزید الجھ گیا تھا۔ ایک بات کا سرا بھی اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی..... بھنور میں پھنس گیا ہو۔ بیماریاں، ناراض قادر، قریب آتے ایگزامز، نور کی باتیں، حیدر انکل سے قربت داری، مالی پریشانیاں سب کچھ کس قدر تکلیف دہ تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے فرار چاہتا تھا مگر اب ایسی کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ قادر ناراض تھے اور نور خود الجھن میں تھی۔ وہ مزید پریشان ہو گیا۔

حیدر انھیں اگلے دن لینے آ گئے۔ ولیم اب حیدر اور ماما کی طرف ہر بات پر چونک کر اور تنہیدی نگاہ سے دیکھتا۔ ماما خاموشی سے جانے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔ حیدر انھیں گلبرگ میں ایک وسیع و عریض ویل فرنشڈ بنگلے پر لے گئے۔

”حیدر! یہاں رہتے ہو؟“ ماما نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، ڈیفنس میں۔“

”اور یہاں کون رہتا ہے؟“

”یہ آپ لوگوں کے لیے خریدا ہے۔“ وہ آہستہ سے بولے۔ اس بات پر ولیم کے کان کھڑے ہو گئے۔ اسے شدید حیرت ہوئی۔ اس نے ماما کی طرف دیکھا اور پھر حیدر انکل کی طرف مگر خاموش رہا۔

”اس کی کیا ضرورت تھی؟“

”تھی، تم کسی غیر کے گھر پڑی رہو یہ ہمارے خاندان کی روایت نہیں۔“ ولیم نے پھر چونک کر دونوں کو دیکھا۔

”حوالی میں کون ہے؟“ شہلانے ایک دم بے خیالی میں پوچھا۔

”کوئی نہیں، بس ملازم ہیں۔ کبھی کبھی میں بھی چلا جاتا ہوں زمینوں کی دیکھ بھال کے سلسلے میں یا پھر کوئی اور مسئلہ ہو۔“

”اچھا، سب ٹھیک ہیں نا؟“

”ہاں۔“

”ولیم کو بھی..... بھی.....“ وہ ایک دم رک گئی۔ حیدر کچھ بھانپتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”ہاں، بھئی، کیا کرنے کے ارادے ہیں؟“

”کچھ نہیں۔ چرچ جو اُن کرنے کا سوچ رہا ہوں۔“ اس نے جان بوجھ کرایا کہا تھا۔ حیدر نے حیرت اور استفہامیہ لگا ہوں سے شہلا کی طرف دیکھا اور شہلا نے حیدر کی طرف..... اس کی نظروں میں بلا کا کرب، مایوسی اور بے بسی تھی۔ ولیم کو بہت عجیب سا لگا۔ نور کی باتوں اور الجھنوں کی وجہ سمجھ میں آنے لگی۔ کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ تینوں اپنی اپنی جگہ شدید الجھن میں گرفتار تھے۔



ملک منصور واپس آ چکا تھا۔ اسے اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کی پارٹی نے اس کا یوں استقبال کیا جیسے وہ کسی محاذ سے واپس آیا ہو۔ اخبارات نے اسے خصوصی کوریج دی۔ اس کے قریبی سارے گناہ و عمل چکے تھے۔ وہ ہر طرح سے پاک صاف ہو کر آیا تھا۔ اب نہ کوئی کیس باقی تھا نہ کوئی مقدمہ کیونکہ اس کی پارٹی برسرِ اقتدار آ چکی تھی۔ اپنی حکومت سے کیسا خطرہ! ایسی بڑی دیکھ کر اس کا غم دھڑا اور زیادہ ہو جاتا۔ اسے یوں لگتا جیسے اسے نچا دکھانے کے لیے کسی نے چند ثانوں کے لیے شہرِ فتح کی بساط پر اسے مات دے دی تھی اور اب وہ صاف فک لگاتا تھا مگر اس مہرے کو اب وہ اپنے ہاتھوں سے پکھلتا چاہتا تھا۔ شزا اسے ایئر پورٹ لینے گئی۔ صحافیوں اور پارٹی ورکروں کی اتنی بڑی تعداد جمع تھی کہ وہ چونک گئی۔ ملک منصور! قدرت تم پر بڑی مہربان ہے، تم ہر دفعہ صاف فک لگتے ہو۔ نہ جانے کیوں قدرت تمہاری رسی دراز کر رہی ہے۔ اس نے ہجیر دچلاتے ہوئے سوچا۔ ملک منصور اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا نگاہیں رہا تھا۔

”ہجیر دچیل کی طرف مولو۔“ اس کے لہجے میں قلعیت تھی۔

”کیوں؟“

”بس ضروری کام ہے، سہیل سے ملنا ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن پہلے گھر چلتے ہیں۔“

”نہیں، میں اپنے ضروری کاموں کو موخر کرنے کا عادی نہیں۔“ وہ دونوں لہجے میں بولا اور شزا نے خاموشی سے ہجیر داس طرف موڑ لی۔ جیسے ہی وہ جیل میں داخل ہوا، ہر طرف ہنگامہ مچ گئی۔ اس کی غیر متوقع آمد نے سب کو چونکا دیا۔ اس کی سیاسی حیثیت سے کس کو انکار تھا۔ وہ الیکشن سے باہر ہو گیا تھا اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ وہ سیاست سے علیٰ ہاں تھا۔ اس کی پارٹی حکومت میں تھی اور وہ پارٹی کا لیڈر رہ چکا تھا۔ پارٹی اب بھی اس کے اشاروں کی منتظر رہتی تھی۔ وہ سیدھا سہیل کی طرف گیا۔ اس کے قدموں کی چاپ سہیل اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ جیل کی تاریک کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تا کہ اسے نظر نہ آئے۔ ملک منصور کا..... ادھر ادھر دیکھا پھر دیوار کی طرف دیکھا۔

”تم ہاتھ میں بھی چلے جاؤ تو ملک منصور تمہیں ڈھونڈ نکالے گا۔ تم نے اسے دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔ تم جیسی جھوٹی شیر سے لڑنے چلی تھی۔“ ملک منصور کے لہجے میں نہایت نفرت اور حقارت تھی۔

”نہیں، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“

”تم نے میرا کیریئر داؤ پر لگا دیا۔“

”اور آپ نے میری زندگی..... آپ نے میری زندگی کی کیا قیمت لگائی۔ یہی کہ میرے والے گھر سسک سسک کر مر رہے ہیں۔ کوئی ان کا پرسانہ حال نہیں۔ آپ کتنی دفعہ ان کے پاس گئے ہیں۔ میں بھی مجبور تھا۔ جب آپ اپنا وعدہ بھول گئے تو مجھے بھی بھولنا پڑا۔ مفادات کے لیے سر دھڑکی بازی لگانا میں نے بھی آپ سے ہی سیکھا ہے۔“ سہیل بھی غصے سے بولا۔

”اور دشمن کو کھانا، اس کو نرے میں لے کر مات دینا شاید یہ نہیں سیکھا۔“

”ہاں اس میں، میں ہار گیا۔“ وہ مایوسی سے بولا۔

”لیکن مجھے ہار پسند نہیں۔ اس ہار کو اب میں تمہارے گلے کا ہار بنانا چاہتا ہوں۔ ملک منصور جب تک اپنے دشمنوں کو اپنے قدموں تلے روندنے لے اس وقت تک سکون کا سانس نہیں لیتا۔“

”نھیک ہے، میں بھی آپ جیسے وحشی درندے سے زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ کر گزریے جو آپ چاہتے ہیں۔“ سہیل بڑے مطمئن لہجے میں بولا۔ ملک منصور نے اس کی طرف دیکھا، گہری سانس لی، رپوا اور جیب سے نکالا۔

”لیکن یاد رکھیے! قدرت اپنے مظلوم بندوں کا حساب خود لیتی ہے۔ اے اللہ! اس بندے سے گن گن کر حساب لینا۔ اس نے کئی زندگیوں کو اپنی خوشی اور مفادات کی جینٹ چڑھایا ہے۔“ سہیل نے چھت کی طرف منہ کر کے دعا کی۔

”تم جیسے لوگوں کی دعائیں پوری ہونے لگیں تو آسمان نہ پھٹ پڑے۔“ ملک منصور قہقہہ لگا کر بولا۔

”فرعون بھی تو یہی کہتا تھا اور آپ بھی اس وقت اپنے آپ کو خدا سمجھ رہے ہیں۔“ سہیل الفاظ چبایا کر بولا۔

”یہ بھی تمہارا ڈھونگ ہے سزا سے بچنے کا مگر میں تم لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں اس لیے اب تمہیں زمین پر رہنے کا کوئی حق نہیں۔“ ملک منصور نے دو قارے کیے۔ سہیل وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ملک منصور اطمینان سے باہر آ گیا اور ہجیرہ میں بیٹھ کر چلا گیا۔

”سہیل نھیک ہے نا۔“ شہزاد نے ملک منصور کی طرف بغور دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں بالکل! اور وہ آصف کا کچھ پتا چلا۔“ ملک منصور نے پوچھا۔

”ہاں بہت مشکل سے فریس آؤٹ ہوا ہے۔ پہلے لیصل آباد میں تھا اور آج کل جھنگ میں ہے۔“

”جھنگ میں کس کے پاس؟“

”ہماری مخالف پارٹی کے ڈیرے پر۔ اب آپ اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے لے آئیں پھر جو کرنا ہے کر لیں۔ میرا کام تو صرف اسے

فریس آؤٹ کرنا تھا۔" شزا آہستہ سے بولی۔

"تھیک یو ڈارلنگ! تم نے میرا بہت ساتھ دیا۔" ملک منصور نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"ملک صاحب! آپ سے ایک بات کرنی ہے۔"

"ہاں ہاں کہو۔"

"شمال بہت اپ سیٹ ہے اور اس نے اپنے آپ کو ختم کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔"

"وہاٹ مان سنس.....! لیکن کیوں؟"

"وہ بہت ڈسٹرب ہے۔ شاید ہماری وجہ سے۔ وہ آپ کو اور مجھے بہت مس کرتی ہے۔ پچھلے دنوں گھبراہٹ تھی۔ اس میں بہت زیادہ تبدیلیاں آ گئی ہیں۔ وہ پھوڑ بھی ہو گئی ہے اور جنونی بھی۔ پلیز اس کے لیے کچھ کریں ورنہ میں مر جاؤں گی۔" شزا کی نیلی آنکھیں پھٹکے لگیں اس نے ہجیرہ کی رفتار اور بڑھادی۔

"ملک اسٹ ایزی ڈارلنگ! کچھ نہیں ہوتا۔ اس عمر میں ایسا تو ہوتا ہے۔ میں ذرا اس مسئلے سے قاریغ ہوں تو پھر خود اس سے ملنے جاؤں گا۔"

"آخروہ کب تک ہاسٹل میں رہے گی؟"

"اس بات کو چھوڑو، میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ میں نے کہا ہے نا۔" وہ یہ بات ڈسکس نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ شزا خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی مگر دل میں بے شمار غم شات تھے اس شخص پر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے یقین کرنا پڑتا تھا۔

شوق گاؤں واپس آ چکی تھی۔ حیدر انکل نے فون کر کے اسے بتایا تھا کہ آصف جھنگ میں ان کے ایک دوست کے پاس ہے۔ ملک منصور کا مخالف حیدر کا گہرا دوست تھا۔ ملک منصور کے سیکینڈل کے بعد ہر سیاسی شخصیت کی آصف سے اچھی خاصی شناسائی ہو گئی تھی۔ ملک منصور نے آصف کو لاہور آئے کو کہا تھا اور اپنا ڈراما سچو بھی بھیجا تھا۔ شوق آصف کی طرف سے مطمئن تھی مگر گاؤں آ کر بھی وہ شدید ذہنی کرب میں مبتلا تھی۔ سہیل کی ابتر حالت اور فزرا کی باتیں اسے ہر وقت ڈستی دیتیں۔ شدید گناہ کا احساس اس کے اندر کو تہہ بالا کر رہا تھا۔ وہ ناشتے سے قاریغ ہو کر اخبار پھیلائے اسے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جہاں امدونی صفحے پر سہیل کی تصویر اور اس کے بڑے اسرار قتل کے بارے میں لکھا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے ایک دفعہ خبر پڑھی۔ ہار ہار پڑھی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ ایک بے گناہ انسان اس کی وجہ سے موت کی نذر ہو گیا تھا۔ خدا واقعی اسے کیسے معاف کرے گا۔ وہ واقعی اس کا بل نہیں تھی کہ اسے معاف کیا جاسکتا۔ اس کا مطلب ہے پایا واپس آ چکے ہیں اور..... اور اسی لیے سہیل خوفزدہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پایا اسے نہیں چھوڑیں گے۔ اس نے جلدی سے عکوفون ملا یا۔ اس کا موبائل بند تھا۔ نہ جانے وہ کیوں اپنا موبائل ہر وقت بند رکھتی تھی۔ گاؤں آنے کے بعد ایک دو دفعہ اس نے اسے فون کیا تھا مگر نہ جانے کیوں رابطہ منقطع ہو گیا..... اس نے حیدر انکل کو فون ملا یا۔

"انکل! سہیل قتل ہو گیا ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔" وہ آہ بھر کر بولے۔

”انکل! اسے پاپا نے قتل کیا ہے۔“

”مگر اس بات کو کون مانے گا۔“

”انکل! میں عدالت میں گواہی دوں گی۔“

”کیا فائدہ! کیا تم چشم دید گواہ ہو اور تمہارے پاپا بہت شاطر ذہن کے مالک ہیں اس لیے بیٹا ان باتوں کو مت سوچو۔“

”مگر انکل! وہ بے گناہ تھا۔“

”ہاں میں ابھی طرح جانتا ہوں۔“

”انکل! کب تک ایسا ظلم اور نا انصافی ہوتی رہے گی۔“

”جب تک لوگ مجبور ہیں اور ملک منصور جیسے لوگ زندہ ہیں۔ اچھا اب تم اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔“

”انکل! کیسے نہ سوچوں، وہ شخص میری وجہ سے مارا گیا ہے۔“

”تو پھر اب تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں..... میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ میں تو بہت بے بس ہوں۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ انکل! میں ابھی اس کے گھر جانا چاہتی

ہوں۔ دفنانے سے پہلے ایک دفعہ اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے، میں ڈرائیور کو بھیج دیتا ہوں۔ تم چلی جاؤ اور اپنی چادر وغیرہ اوڑھ کر جانا۔ ہو سکتا ہے تمہارے پاپا ابھی وہاں ہوں۔“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”وہ وہاں کیوں ہوں گے؟“

”ایسا ہی ہو گا تم دیکھ لینا۔ شاید تم نے خبر کی آخری لائن نہیں پڑھی۔ رسم قتل ملک منصور کی کوٹھی پر ہو گی کیونکہ وہ اس کا خاص قریبی ملازم تھا۔“

”اوہ نو! ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ چمک گئی۔

”ایسا ہی ہے، بس یہی سیاست ہے۔ میں ڈرائیور کو بھیج رہا ہوں۔“ حیدر نے فون رکھتے ہوئے کہا۔

اس کا باپ اتنا کریمہ انسان ہو سکتا ہے اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اتنا شاطر، اس قدر مکار، نہ اس کے نزدیک انسان اہم تھے اور نہ ہی

جذبہ، نہ رشتے، نہ جانے یہ سب کچھ وہ کس کے لیے جمع کر رہا تھا۔ اتنی حرص، اتنا لالچ، اف خدایا! کاش ہم اس شخص کی اولاد نہ ہوتے۔ یہ کتنی زندگیوں

کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ شاید ممانے ٹھیک فیصلہ کیا تھا اور اس شخص سے جان چھڑا لی تھی۔ اس نے کرب سے سوچا۔ وہ بشری آپا کی نقاب دہلی چادر پہن کر

گئی۔ سبیل کے گھر میں جیسے کہرام مچا تھا۔ اس کی ماں ابھی تک بے سدھ چار پائی پر پڑی تھی۔ بس بے بسی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ بہنوں نے رورو

کر برا حال کر رکھا تھا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ کون آ رہا تھا، کون جا رہا تھا۔ ملک منصور اور شہزادہاں پہلے سے موجود تھے۔ شہزادیت کے قریب ہی

خاموش بیٹھی تھی اور ملک منصور ہائرٹینٹ میں دریوں پر۔ یہ شخص اور کہیں اس طرح بیٹھے، شفق نے اندر داخل ہوتے ہوئے ایک تک باپ کو دیکھا۔ اس

کے اندر نفرت اور حقارت سے آتش خشاں پھٹنے کو تھا۔ وہ خاموشی سے اندر چلی گئی اور ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ جنازے میں بس چند منٹ باقی تھے۔ اسے

سکیل کی باتیں، اس کا لہجہ اور آخری ملاقات سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ پھر لوگ میٹ اٹھانے آئے تو ملک منصور سب سے آگے تھا چار پائی کو کندھا دینے کے لیے۔ انسان اتنا سفاک بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے ذہن میں بار بار یہی الفاظ گونج رہے تھے۔ جیسے ہی جنازہ لے کر گئے وہ واپس آ گئی۔ سفر لمبا ہوتا جا رہا تھا اور تاریکی بھلتی جا رہی تھی۔ زندگی کتنی مختصر ہے مگر کس قدر تکلیف دہ..... اس کا زندگی اور انسانوں سے اعتبار اٹھتا جا رہا تھا۔



سحر ہر وقت اپنے کمرے میں قید رہتی اور سوئی رہتی۔ جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ آفاق نے مددِ رخ سے شادی کر لی ہے وہ شدید ڈپریشن کا شکار تھی۔ آفاق اس خبر کے بعد گھر نہیں آیا تھا۔ اس نے ہر جگہ اسے ڈھونڈا تھا۔ ایک مہینہ تو وہ مری میں رہا پھر سوئٹزر لینڈ چلا گیا اور اب نہ جانے کہاں تھا۔ وہ اس کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ اس نے تنگ آ کر نشہ شروع کر دیا تھا۔ صرف یہی ایک راہ فرار نظر آئی۔ وہ اپنے آپ سے کہیں دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس گھر سے، اس کی فضا سے، اپنے ماضی سے اور اس حال سے، اس کا کوئی مستقبل نہیں تھا اس لیے اسے اس کی قطعی پروا نہیں تھی۔ اس نے کلب جانا چھوڑ دیا تھا۔ اپنے آپ کا کوئی ہوش نہ تھا بس ہر وقت آفاق اور مددِ رخ، نشا اور وہ۔ اس گھر میں پہلے بھی وہ ایک ناکارہ وجود تھی جس کی حیثیت ایک کارنس پر رکھے گلہ ان جتنی بھی نہ تھی اور اب کسی کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں پیسے موجود ہوتے۔ آفاق اپنے اس فرض سے بے خبر نہیں تھا اور وہ یہ کہہ کیسے اڑاتی، کسی کو بھی اس سے سروکار نہ تھا..... سوسائٹی کے یہی توفیشن ہیں۔ سب ترقی کی طرف گامزن تھے یا پھر تنزلی کی طرف۔ اس کا کسی کو شعور نہیں تھا اور سوچنے کے لیے فرصت تو بالکل ہی نہیں تھی۔ اس انخواہ ہے معنی زندگی کا حاصل کیا ہے؟ وہ سوچتی اور پھر سرگرم ہو جاتی تھی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

شمال کے اسکول سے رزلٹ کارڈ آیا تھا اور ساتھ پرہل کا لیٹر بھی کہ وہ پڑھائی میں بالکل دلچسپی نہیں لے رہی۔ ہر مضمون میں اس کے نمبر صفر یا ایک دو تھے۔ دس نمبر سے زیادہ کسی مضمون میں نہیں تھے۔ پرہل نے والدین کو آنے کے لیے کہا تھا۔ شزار رزلٹ کارڈ دیکھ کر شدید پریشان تھی۔ اس نے ملک منصور کو بتایا۔

”یہ شمال کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے۔ اس لڑکی نے تو تنگ کر کے رکھ دیا ہے۔“ ملک منصور جھنجھلا کر بولا۔

”میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ وہ شدید ذہنی الجھنوں کا شکار ہے۔“

”آخر اس کو تکلیف کیا ہے، ہر نعمت تو اس کو میسر ہے۔ پیسے اس کے اکاؤنٹ میں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ پھر کس چیز کی کمی ہے؟“

”محبت کی، پیار کی اور اعتماد کی۔ ملک صاحب! اب وہ ہم پر اعتماد نہیں کرتی۔ وہ مجھ سے اب اپنی کوئی بات شیئر نہیں کرنا چاہتی۔ وہ ہر

بات، ہر مسئلے میں بہت شدت پسند ہوتی جا رہی ہے۔ وہ جتنی شدت پسند ہو رہی ہے اتنی فحش در بھی ہوتی جا رہی ہے۔ کاش! آپ اسے اس دفعہ ملتے

تو پھر آپ کو معلوم ہوتا۔ وہ تو ہماری شمال ہی نہیں لگتی۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے۔“

”ہو جائے اگر اسے کسی کا احساس نہیں۔“ وہ غصے سے بولا۔

”ملک صاحب! آپ جانتے ہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اتنی بڑی بات اور آپ نے کس قدر عام انداز میں کہہ دی۔ وہ ہماری بیٹی ہے، کوئی کھلونا تو نہیں جو ٹوٹا ہے تو ٹوٹ جائے۔ کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ شہزادی آنکھیں بھرا آئیں اور آواز کپکپانے لگی۔

”او کے ریلیکس اٹم کل ہی چلی جاؤ۔ کل میری بہت اہم میٹنگ ہے ورنہ میں بھی چلتا۔ میں ڈرائیور کو کہتا ہوں تم صبح سویرے چلی جاؤ۔“

ملک منصور دھیمے لہجے میں بولا اور وہ خاموش ہو گئی۔

اگلے دن وہ صبح سویرے مری کے لیے روانہ ہو گئی۔ شام ہو گئی تھی اس لیے وہ اسکول نہ گئی۔ اگلے دن صبح ہی وہ اسکول پہنچ گئی۔ شائل کو بلایا۔ دو آئی تو وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کا حلیہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ وہ پہلے سے بے حد کمزور لگ رہی تھی۔ گندے ناخن، اس کے منہ سے بھی بہت بدبو آ رہی تھی۔ گندے چہرے ہوئے بالوں کی پونی، نہ جانے کب سے وہ نہیں نہائی تھی۔ وہ بے حد گندی لگ رہی تھی۔

”شائل بیٹا یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟“ شہزاد نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا...؟ نو... نو... آئی ایم رائٹ... ہنڈرڈ پرسنٹ رائٹ... آئی ایم دی بیسٹ... بیسٹ... بیسٹ... ایسٹ اینڈ ویسٹ... ویسٹ از دی بیسٹ... آئی ایم دی بیسٹ...“ وہ بے ربط انداز میں الفاظ دہرائی رہی۔ شہزاد دل تھام کر رہ گئی۔

”کیا ہوا؟ آپ روکیوں رہی ہیں۔ رونے سے آنکھیں خراب ہوتی ہیں۔ آنکھیں خراب ہوں تو صحت خراب ہوتی ہے اور صحت خراب ہو تو انسان مر جاتا ہے۔ مرجائے تو اچھا ہوتا ہے مگر پھر بھی آپ کیوں رو رہی ہیں۔ روتے تو وہ ہیں جو بیمار ہیں اور جن کو چوٹ لگی ہو۔ آپ کو کہاں چوٹ لگی ہے۔ پٹو آئی ایم دی بیسٹ۔“

”خدا کے لیے چپ کر جاؤ۔“ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

”ڈانٹتی کیوں ہیں، جائیں یہاں سے۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔ شہزادہا تھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ جا چکی تھی اور وہ نہ جانے کتنی دیر روئی رہی۔ پھر وہ ہسپتال سے لئے چلی گئی۔

”آئیے مسز منصور! ہمیں آپ کا شدت سے انتظار تھا۔ شائل کی حالت...“

”ہاں میں دیکھ چکی ہوں۔ یہ کب سے ایسی ہے؟“

”جب آپ اسے چھوڑ کر گئی تھیں تو پورا ہفتہ اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ مسز منصور! وہاں کیا ہوا تھا کہ بچی نے اس قدر گہرا صدمہ لیا ہے۔ وہ بہت ڈپریشنڈ ہے۔ کبھی آپ اس کا کرا جا کر دیکھیں۔ مائی گاڈ! اس قدر گندا ہے اور پھر کسی کو اندر بھی گھسنے نہیں دیتی۔ خود اپنی صفائی کا خیال نہیں رکھتی۔ ہر وقت عجیب و غریب باتیں کرتی رہتی ہے۔ آئی ایم دی بیسٹ... ایسٹ اینڈ ویسٹ... یہ جملہ دہراتے دہراتے وہ جھکتی بھی نہیں۔ کلاس میں وہ اپنی مرضی سے جاتی ہے اور جب جاتی ہے تو لڑ جھگڑا کرتی جاتی ہے۔ مسز منصور! بہتر یہی ہے کہ آپ اسے گھر لے جائیں، اس کا علاج کروائیں۔ ٹھیک ہوتی ہے تو پھر چھوڑ جائیے ورنہ...“

”نہیں، پلیز ایسی بات نہ کریں۔ میری زندگی تو صرف ان دو بچوں کے دم سے ہے۔“

”ٹھیک ہے مگر اس کی وجہ سے اسکول میں بہت ڈسٹر بنس ہے۔ پلیز سمجھنے کی کوشش کریں۔“
 ”اور سیر کیا ہے؟“

”وہ تو ٹھیک ہے، آپ اس سے مل سکتی ہیں۔“

”اچھا آپ شامل کو بھجوادیں اور اس کا سامان بھی، میں سیر سے مل لوں۔“

”ٹھیک ہے آپ وٹ کریں۔“

وہ سیر سے ملنے لگی۔ وہ خوش ہاش ملا۔ اسے دیکھ کر اسے قدرے اطمینان ہوا۔ وہ اس کے لیے کچھ چیزیں لائی تھی۔ اسے دیں، وہ خوشی خوشی چلا گیا۔

وہ کافی دیر بکھتری مگر شامل نہیں آ رہی تھی۔ وہ دوبارہ پرنسپل کے پاس گئی اور اس کے بارے میں پوچھا۔ پرنسپل نے آیا کو بلایا اور اس کے بارے میں پوچھا۔

”اس نے کمراندر سے بند کر لیا ہے اور دروازہ نہیں کھول رہی۔“ آیا نے بتایا۔

”مائی گاڈ.....!“ شزا گھبرا کر بولی۔

”آپ گھبرا نہیں نہیں، کچھ نہیں ہوتا۔“ پرنسپل خود گئیں۔ شزا بھی ساتھ تھی۔ پرنسپل نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ بہت آوازیں دیں مگر وہ تو جیسے سن ہی نہیں رہی تھی۔ دروازے کی ایک سائیڈ پر روشن دان تھا۔ پرنسپل نے آیا کو ادھر سے جھانکنے کو کہا۔ آیا اوپر چڑھی تو مسکراتی ہوئی نیچے آ گئی۔

”جی وہ تو سو رہی ہے۔“ آیا نے بتایا۔ شزا نے سکون کا سانس لیا۔

”اب وہ تب ہی دروازہ کھولے گی جب وہ اٹھے گی اس لیے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔“ پرنسپل نے اس سے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں ریٹ باؤس جاتی ہوں۔ جب وہ اٹھے تو مجھے فون کر دیجیے گا۔“ شزا کہہ کر بوجھل قدم اٹھاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ وہ شدید ذہنی اذیت میں تھی۔ اس نے جیسی جیسی ذمہ داری گزاری تھی۔ اسے اس کا اتنا جتن نہ تھا۔ ملک منصور نے اگر اسے محبت دی تھی تو اذیت بھی دی تھی۔ خوشیاں نہیں دی تھیں مگر ہر نعمت فراوانی سے دی تھی اس لیے اس نے کبھی اپنے آپ کو اتنا پست، کمزور اور شکستہ محسوس نہیں کیا تھا جتنا وہ اب کر رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رفتہ رفتہ اس کے ہاتھوں سے جان لگی جا رہی تھی۔ شامل سے اسے بہت محبت تھی۔ وہ تخیل میں خود اسے بچا بننے کے خواب دیکھتی۔ ساری رسمیں پوری کرتی۔ اس کے چاؤ اور غرے اٹھاتی۔ اس نے خود کس طرح ملک منصور سے شادی کی تھی اور اس سے پہلے اس کے کتنے افیئر تھے، کتنے اسکینڈل تھے پھر بھی ملک منصور نے اسے قبول کیا تھا۔ وہ اپنا ماضی بھولنے کی کوشش کرتی مگر ماضی سے فرار ممکن نہیں۔ حال ماضی کی طرف دیکھتا ہے اور مستقبل حال سے سوال کرتا ہے اور ہر زمانہ مشکوک وجود کو مٹانے کے درپے ہوتا ہے۔ یہی وقت کا فلسفہ ہے یا پھر المیہ۔ اس نے آہ بھر کر سوچا۔

اگلے دن صبح وہ اسے لے کر لاہور کے لیے روانہ ہوئی۔ سارا راستہ نہ جانے وہ کیا بڑبڑاتی رہی۔ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی، خود سے باتیں

کرتی رہی۔ کبھی کبھی اونچی آواز میں آئی ایم دی بیسٹ کا نعرہ لگاتی۔

”مئی! آوازیں سن رہی ہیں؟“ اس نے یک دم ماں سے کہا۔

”کہاں..... کیسی آوازیں.....؟“

”اسکول کی بیل بج رہی ہے۔ یہ سنیں..... ابھی.....“ وہ بغور سنتے ہوئے بولی۔ شزانے اس کی طرف بے بسی سے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔

”مم! آپ کو ہوتا ہے میرے پاس فیریز آتی ہیں اور کبھی کبھی گاڈ بھی، ایک گھوسٹ بھی۔ میں آپ سے ملواؤں گی۔“

”پلیز چپ کر جاؤ اور تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ۔“

”نہیں، مجھے سونا پسند نہیں۔ جو سوتے ہیں وہ مر جاتے ہیں اور میں ابھی سونا نہیں چاہتی۔ آئی ایم دی بیسٹ..... لا..... لا..... لا.....“ وہ

گانے کی ٹون میں بولی اور ہاتھوں سے..... اشارے کرنے لگی۔ شزانے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ پہلی نظر میں کسی شہزادی کا گمان ہوتا۔ خوبصورت سفید رنگ، بیضوی چہرہ، نیلی سرمئی آنکھیں، اوپر کو مڑی ہوئی گھنی پلکیں، چھوٹی سی ناک اور خوبصورت تراشیدہ ہونٹ، دہلی پتلی، لمبی سی، خوبصورت جواں سال لڑکی کہاں کمزری تھی۔ شاید زندگی کے کسی خطرناک موڑ پر۔ آگے کھائی تھی یا کھنڈہ نہیں جانتی تھی۔ شزا..... سارا راستہ آنسو جیتی رہی اور اسے دیکھتی رہی۔ کبھی وہ ٹارل ہو جاتی۔ ٹارل انداز میں..... تیزی سے باتیں کرتی، پھر رک جاتی، پھر شروع ہو جاتی۔

وہ گھر پہنچی تو ملک منصور بیڈروم میں گاؤن میں ملبوس کسی سے فون پر باتیں کر رہا تھا۔ گاڑی کی آواز سننے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ شکیل کو دیکھ کر چہ نکلا پھر اپنے آپ کو ٹارل کیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

”شکیل! مائی کیوٹ چائلڈ! ہاؤ آر یو ڈارلنگ؟“ وہ اسے پیار سے ساتھ لگاتے ہوئے بولا۔

”کائن..... آئی ایم دی بیسٹ..... ایسٹ اینڈ ویسٹ.....“ ملک منصور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں، ماڈرن سوسائٹی کے فیضو۔“ شزارو تے ہوئے بولی اور ملک منصور خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کب سے؟“

”پچھلے کئی ماہ سے۔“ وہ ہونٹ چبانے لگا اور پھر فون ملایا۔ ”ڈاکٹر سے مل گیا۔“

”کبھی کبھی نادانستہ کبھی ہوئی بات قدرت کیسے قبول کرتی ہے۔ کاش آپ کبھی ایسی بات زبان سے نہ نکالتے۔“ شزا کے ذہن میں ملک

منصور کے کہے ہوئے جملے گونجنے لگے اور وہ چٹھی روتی رہی۔ شکیل کو اس نے اس کے کمرے میں چھوڑا۔ اسے بستر پر لٹایا اور خود باہر آ گئی۔

”ڈاکٹر سے اس کا سیشن ہے۔ کل صبح دس بجے۔“ ملک منصور نے فون رکھتے ہوئے کہا۔ شزا خاموش رہی۔

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“ ملک منصور مضبوط لہجے میں بولا۔

”نہیں، مجھے اب ایسا نہیں لگتا۔ وہ شاید..... اب.....“ وہ آہ بھر کر بولی۔

”کم آن شزا! وہ اس کے گرد بازو دھائل کرتے ہوئے بولا۔

”میں اور وہ اتنے مضبوط اعصاب کے مالک نہیں جتنے آپ ہیں۔“

”ڈارلنگ! تو ہونا چاہیے۔ زندگی میں مضبوط ہونا چاہتا ہے۔“

”بولڈ، مضبوط، چالاک اور..... اور.....“ شزانے آنکھیں حیرت سے پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

”اور فرہی.....!“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”ہاں مگر ہر ایک کے لیے یہ ممکن نہیں۔“ وہ اپنا آپ اس سے چھڑاتے ہوئے بولی۔

”او کے ڈارلنگ! جسٹ ریٹیکس! میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ ایک پارٹی ڈنر ہے۔“ وہ بے پردائی سے بولا اور وہ خاموشی سے اسے دیکھتی

رہی۔ وہ اپنا قیمتی ڈریس پہنے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا پر فحوم لگا رہا تھا۔ نیوی بلیو پینٹ کوٹ میں گرے بالوں کے ساتھ وہ کس قدر وجہ لگ رہا

تھا۔ اس عمر میں بھی اس قدر رشک اور پیٹنڈ سم گراس کا اندر کتنا مختلف تھا۔ وہ ایک بے حس انسان تھا۔ شزا سوچ رہی تھی اس کی بیٹی کی حالت اچھی

خراب تھی اور وہ ایک پارٹی ڈنر اٹینڈ کرنے جا رہا تھا اور ایسے ڈنر میں کیا کچھ ہوتا تھا وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

”منصور! آقا نے مدد سے شادی کر لی ہے۔“ وہ اس کی طرف بنو رو دیکھتے ہوئے بولی۔

”اچھا..... کب؟“

”کیا واقعی آپ کو علم نہیں یا پھر.....“

”وہ نظر آئے تو پتا چلے گا اور میں تو ابھی اپنی پوزیشن کے بارے میں ہی بہت الجھا ہوا ہوں۔ ایسے الجھے معاملات آسانی سے تو نہیں سلجھتے

گا اور مدد کسی بے وقوف ہے۔ اس الو کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ چلو دونوں بے وقوف مل گئے ہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”مگر وہ تو آپ کی سیکرٹری تھی۔“

”تھی، اب تو نہیں نا۔“

”اور اب.....“ ملک منصور نے معنی خیز مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور ہانک لیا۔

”ملک منصور! تمہاری زندگی کا حاصل کیا ہے۔ تم کتنے گندے اور گھٹاؤ نے کام کرتے ہو۔ کیا تم واقعی انسان ہو۔ اگر ہو تو کیسے؟ تم تو انسان

کے روپ میں وحشی درندے سے بھی بڑھ کر ہو۔ وہ بیٹھی سوچتی رہی۔ کبھی شاکل کے بارے میں اور کبھی ملک منصور کے بارے میں۔ نہ جانے وہ کس

مٹی سے بنا تھا۔



آصف، حیدر کے سامنے بیٹھا تھا پریشان سا، مضطرب سا۔

”اب کیا چاہتے ہو؟“ حیدر نے اس سے پوچھا۔

”میں جلد از جلد یہ ملک چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں ورنہ ملک منصور اور اس کے آدمی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”اس کے علاوہ اور کوئی آپشن؟“

”نہیں، اب اس ملک میں میرا کوئی مستقبل نہیں۔ ہر کوئی دونوں ہاتھوں سے ایک دوسرے کو نوچ رہا ہے۔ مجھ جیسے ایماندار شخص کا اب یہاں بالکل گزارہ نہیں۔ سر! آپ ہی بتائیے کیا ہم جیسے لوگ یہاں رہ سکتے ہیں جہاں عداوتیں، انصاف، پولیس، تھانے، پکھڑیاں، اخبارات ہر ہر جگہ پر ان لوگوں کا قبضہ ہے۔ یہاں ایسی کوئی عدالت نہیں جہاں مجھ جیسے لوگ اپنا مقدمہ لے کر جائیں۔ کوئی پولیس تھانہ نہیں جہاں ان کے خلاف ایف۔آئی آر کٹائی جائے۔ سہیل مارا گیا اور اسے اس شخص نے جیل میں مارا۔ کیا ہوا وہ اس کی تدفین میں گیا، اس کے قتل کرائے، اخبارات میں خبر شائع ہوئی اور بس امر نے والا وقاداری میں مارا گیا اور منوں مٹی تھے دب گیا۔ جس نے گناہ کیا وہ دندنا تا بھر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ اور گریبان تو صاف ہیں، گناہگار تو ہم لوگ ہیں۔ میں زندگی بچانے کے لیے مارا مارا بھر رہا ہوں۔ شکر ہے آپ مل گئے ورنہ.....“

”سہیل کو تمہاری بہت غرضی۔ اس نے ہی تمہاری مدد کو کہا۔ ٹھیک ہے میں تمہارے جانے کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ تم جلد چلے جاؤ گے۔“

”ٹھیک یو سر! اب میں کہاں جاؤں؟“

”تم اپنے گھر چلے جاؤ۔ کچھ دن رہ لو پھر شاید موقع نہ ملے۔ میں جلد از جلد تمہارے کاغذات کھل کر دانے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے لیکن وہاں..... خیر چھوڑ بیٹے۔“



”تمہیں ڈرائیور چھوڑ آتا ہے۔“

”اور اگر ملک منصور کو بھگ چڑھ گئی تو؟“

”میں گاؤں کے زمیندار کو فون کر دوں گا۔ وہ تمہارا خاص خیال رکھے گا۔ گھبرانے کی بات نہیں اور پیسے بھی ملک منصور کو یہی معلوم ہے کہ

تم جھگ میں ہو۔ ہم بھی یہی ظاہر کریں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔

ولیم نے نور کو فون کر کے بلایا تھا۔ ماما کا کیو تھراپی کا دوسرا کورس ہونا تھا اور وہ حیدر انکل کے ساتھ ہاسپٹل جا رہا تھا۔ نور نے بھی وہیں آنے

کو کہا۔ ولیم اور حیدر باہر بیٹھے تھے جب نور پہنچی۔

”ہیلو انکل!“

”ہیلو بیٹا!“ اس نے اس کے سر پر پیار کیا۔ بیٹوں خاموش ہو گئے اور پھر حیدر تھوڑی دیر کے بعد چلا گیا۔

”ولیم بیٹا! مجھے ضروری کام ہے اس لیے جا رہا ہوں۔ جب فارغ ہو جاؤ تو مجھے فون کر دینا۔“ حیدر نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ اس کے جانے

کے بعد دونوں خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دونوں کے ذہنوں میں اُن گت سوال تھے مگر کوئی بھی پوچھنے میں ہل نہیں کر رہا تھا۔

”تمہارے مائیزا مرکب ہو رہے ہیں؟“ ہلا خرنور نے سکوت توڑا۔

”جون میں۔“

”تجاری کیسی ہے؟“

”بس ٹھیک ہے..... کوئی خاص نہیں..... ان حالات میں تجاری کرنے کے لیے وقت ہی کہاں ملتا ہے؟“

”ولیم..... تمہارا گھر کیسا ہے؟“

”بہت اچھا ہے۔“

”حیدر انکل کی فیملی بھی ادھر ہی رہتی ہے؟“

”نہیں، انکل ڈینٹس میں رہتے ہیں۔ یہ انھوں نے ہمارے لیے..... آئی مین، ماما کے لیے خریدا ہے۔“ ولیم کے لہجے میں بدگمانی سی تھی۔

”اچھا.....“ نور نے حیرت سے کہا اور پھر خاموش ہو گئی۔

مقامی رخ ہو چکی تھیں مگر ان کی طبیعت بے حد خراب تھی۔ انھیں بار بار بانٹیاں آ رہی تھیں۔ بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔ رنگت ایک دم جلی جلی محسوس ہونے لگی۔ رپورٹس یہی بتا رہی تھیں کہ وہ اب کافی ریکور کریں ہیں مگر موجودہ حالات سے تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ شاید بیان کا آخری لہجہ ہے۔ حیدر خود ہی انھیں لینے آ گئے۔ نور بھی ان کے ساتھ گھر چلی آئی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی شہلا نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ولیم کی طرف۔ ان کی حالت دیکھ کر نور ادھر ہی رک گئی۔ حیدر بھی کمرے میں ہی تھے۔ شہلا کی حالت دیکھ کر ان کے چہرے پر کرب کے آثار بہت نمایاں تھے۔ وہ بہت خاموش لگا ہوں سے شہلا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نور نے اس کی طرف دیکھا پھر کسی بات کو محسوس کر کے خاموش رہی۔

”انکل..... میں آپ کے لیے چائے لاؤں.....“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”ہاں..... وہ خاناماں بچن میں ہی ہے۔ اس کو کہہ دو..... وہ لے آتا ہے۔“ حیدر نے آہستہ سے کہا اور وہ باہر نکل گئی۔

”حیدر..... حیدر.....“ شہلا آنکھیں بند کیے آہستہ سے اسے پکارتی رہی۔

”ہاں..... کہو، کیا بات ہے؟“ وہ کرسی سے اٹھ کر اس کے اوپر قدم رکھتے ہوئے بولے۔ ولیم صوفے پر بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

”حیدر..... کیا..... خدا مجھے معاف کر دے گا..... میں نے بہت گناہ کیے ہیں..... دعا کرو، وہ مجھے معاف کر دے۔“ نہ جانے وہ کیوں ایسا

مسلل بول رہی تھی۔ شاید وہ شدید تکلیف میں تھی، اسی وجہ سے یا پھر موت سامنے نظر آ رہی تھی؟

”ہاں، شہلا..... خدا کیوں معاف نہیں کرے گا..... وہ رحمن جو ہے۔“ حیدر کے منہ سے شہلا سن کر ولیم ایک دم چونکا۔ وہ تو ساری زندگی

سز پائی رہا تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی تو وہ مری چلا گیا تھا اور ماما کے بارے میں وہ کبھی مشکوک نہیں ہوا تھا اس لیے کیا جاننے کی کوشش کرتا۔

”کیوں نہیں کرے گا..... تم کیوں ایسا سوچ رہی ہو؟“

”میں اس قابل جو نہیں.....“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”ایسا مت سوچو..... میں تمہارے لیے دعا کروں گا..... تم سونے کی کوشش کرو۔“

”ولیم کہاں ہے؟“

”یہاں ہے..... بیٹا ادھر آؤ.....“ حیدر نے ولیم کو کہا۔ ولیم اٹھ کر ماما کے پاس گیا اور اس کے کائے ہوئے سخت ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔

”مما! آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ میں نے گاڑ سے دعا کی ہے۔“

”ولیم..... تم..... تم کربچن نہیں ہو، خدا کے لیے چھوڑ دو یہ سب، سنا تم نے.....؟“ وہ ایک دم خود ہی پھٹ پڑی۔ حیدر اور ولیم چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ حیدر کو خود بھی قطعی توقع نہیں تھی کہ وہ یوں اچانک خود ہی سب کچھ بول دے گی اور ولیم کو جو شک تھا اب سب کچھ سامنے آنے والا تھا۔

”نہیں، ممما..... آپ سنسز میں نہیں ہیں۔“ ولیم نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”میں سنسز میں ہوں..... اور..... شاید یہ میرا آخری لمحہ ہے۔ نہ تم کربچن ہو اور نہ میں۔ میں تو مسلم..... ہوں اور تم..... میں نے تو تمہیں کچھ بھی نہیں دیا۔ تم تو خود ہی کچھ بن گئے..... اور میں دیکھتی رہ گئی۔ نہ جانے میں ہر دفعہ کبھی ہی کیوں رہ جاتی ہوں.....؟“ وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی اور آنسو بہہ بہہ کر نیچے میں جذب ہو رہے تھے۔ نور بھی آ کر ان کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے بھی ساری بات سن لی تھی۔ ولیم کو شدید دھچکا لگا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے زندگی داؤ پر لگی تھی اور اسے علم ہی نہ تھا۔ ماما کے اس انکشاف پر اسے ماما پر فدا آنے لگا وہ غصے میں اٹھ کر باہر چلا گیا۔

”شہلا..... یہ تم نے کیا کیا.....؟“ حیدر نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

”حیدر.....! اگر میں یہ نہ کہتی تو میرا خدا شاید مجھے کبھی معاف نہ کرتا۔ میں مرنے سے پہلے ایک دفعہ اسے ضرور بتانا چاہتی تھی۔“

”مگر اتنی بڑی بات اور اتنی اچانک.....“ حیدر حیرانی سے بولے۔

”اگر اچانک موت آ جائے تو..... پھر بھی اسے فیس تو کرنا ہی تھا۔“

”اچھا تم آرام کرو..... اور ذہن پر کوئی بوجھ نہ ڈالو۔“

”ہاں..... اب میں ٹھیک ہوں..... یہ بات غم کی طرح میرے سینے میں پھنس گئی اور میں اس غم کو نکالنا چاہتی تھی۔ اب میں ٹھیک ہوں۔“ نور خاموشی سے ہاہر نکل آئی۔ وہ مزید اچھٹکی تھی۔ ولیم سر جھکائے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں غم و غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔

”کیا ہوا..... اس قدر پریشان کیوں ہو رہے ہو؟“ نور نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

”کیا یہ کوئی چھوٹی بات ہے..... ممما نے یہ سب کیا کیا..... اتنا بڑا غم..... اور اب جبکہ میں میٹر می پر قدم رکھنے والا ہوں، انھوں نے

میرے قدموں سے زمین کھینچنے کی کوشش کی ہے..... اس اے گریٹ ٹریجنڈی..... ممما بہت.....“ وہ ہونٹ چبانے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”ولیم بیٹا! یہ سب نادانستہ ہے۔ شہلا نے مجھے سب باتیں بتائی تھیں۔ تمہاری ماں ہمارے معاشرے کا ایسا کیریئر ہے جو ساری زندگی صحیح

وقت اور موقع کی تلاش میں رہتا ہے اور ایسے لوگ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کبھی انھیں لفظ نہیں ملتے تو کبھی موقع مناسب نہیں لگتا۔ کوئی قدم اٹھانا چاہتے

ہیں تو مصلحتوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور اسی کشمکش میں غلط فیصلے کر لیتے ہیں۔ بنا سوچے سمجھے کہ ان کے فیصلوں سے دوسروں کا کیا کیا کچھ داؤ پر لگ جاتا ہے۔ کتنا بڑا نقصان ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں قسمت یا قدرت بھی کیوں ایسے لوگوں کا ساتھ نہیں دیتی۔ نہ جانے ان کے اٹھتے قدم اٹھنے ہی کیوں پڑتے ہیں؟“ حیدر کے لہجے میں بلا کی فکرتھی وہ ولیم کا کندھا تھپتھا کر بولے۔

”انگل..... تو میں کہاں ہوں..... میں کون ہوں..... اور کہاں کھڑا ہوں؟“ وہ بھی غصے سے پھٹ پڑا۔

”تم اس وقت ایسی جگہ پر کھڑے ہو جہاں ایک طرف اونچی چوٹی ہے اور دوسری طرف گہری کھائی ہے۔ اب فیصلہ تم نے ہی کرنا ہے۔“

حیدر نے پیار سے اسے سمجھایا۔

”انگل..... ہر دفعہ مجھے ہی کیوں فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ قدرت کیوں مجھے اس طرح آزماتی ہے..... اور ہر فیصلے میں مجھے کس قدر روٹی

الجنوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کاش! آپ اندازہ کر سکیں لیکن اب میں جو ہوں..... وہی رہوں گا۔“ وہ بڑا اعتماد لہجے میں بولا۔ حیدر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ نور کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت تھی۔

”نہ جانے..... ماما میں کیا کیا کرتی رہی ہیں اور اب.....“ ولیم ایک دم تلخ ہو کر بولا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ حیدر ایک دم دباڑے۔

”نہ آپ میری سمجھ میں آ رہے ہیں اور نہ ماما..... آپ دونوں میں کیا تعلق ہے اور پھر میں کون ہوں..... میرا آپ کون تھا.....؟“

”ولیم..... ایہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ نور نے حیرت سے کہا۔

”نور ماما نے مجھے دھوکا دیا ہے..... اور اب پھر.....“

”خاموش ہو جاؤ..... اور ان حالات میں آنکھیں بند کر کے سو جاؤ۔“ حیدر اسے ڈانٹتے ہوئے بولے۔

”کاش..... یہ آنکھیں ہمیشہ بند رہتیں..... مگر..... میں نہیں جانتا ماما نے ایسا کیوں کیا۔ میں ان سے نفرت کرنے لگا ہوں۔“

”وہاٹ مان سنس..... تم لوگ والدین کے ہارے میں ایک دم رائے کیوں بدل لیتے ہو؟“ حیدر نے پھر غصے سے کہا۔

”جب ان کا پاسٹ اس طرح کا ہوگا تو ایساری ایکشن بھی نیچرل ہے۔“

”وہ تمہاری ماما ہیں.....“ نور بھی ڈانٹتے ہوئے بولی۔

”نور..... اتم بھی مجھے ہی الزام دے رہی ہو؟“

”نہیں..... اپنے آپ کو نارٹل رکھو..... اور پھر بات کرو۔ تم غصے میں سب کچھ بھول رہے ہو۔“ نور نے لہجہ دہیما کرتے ہوئے کہا۔

”والدین تو اولاد کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں اور ماما نے مجھے داؤ پر لگایا..... ہر دفعہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟“ وہ

رندھے ہوئے لہجے میں بولا۔

”تم غلط سوچ رہے ہو..... تمہاری ماں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر تمہیں جنم دیا۔ تمہاری خاطر اس نے کیا کیا دکھ سہے ہیں۔ کس طرح کی

زندگی گزاری ہے..... کاش کبھی تمہیں اس کا اندازہ ہو سکے۔“ حیدر نے کہا۔

”کاش وہ مجھے جنم دینے کے بجائے، پہلے ہی ختم کر دیتیں تو ان کا مجھ پر کتنا بڑا احسان ہوتا.....“

”ولیم..... بیٹا ایسا آپ کے لیے ایک آزمائش ہے۔ اس کا بہادری سے مقابلہ کرو۔ پڑ سکون ہو کر سوچو..... اور ابھی ذہن پر اتنا بوجھ مت ڈالو۔ میں ابھی چلتا ہوں..... اور ماما کا خیال رکھنا۔“ وہ اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

نور حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی اور صورت حال کا جائزہ لیتی رہی۔ ولیم صوفے پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ جیسے شدید دہنی کرب میں مبتلا ہو۔

”آخر قصص کیا بات اتنی پریشان کر رہی ہے.....؟“ نور نے پوچھا۔

”اتنی بڑی بات کہ ماما اس کیونٹی سے تعلق رکھتی ہیں جس کے لیے میرے دل میں قطعی اچھے جذبات نہیں اور یہ کہ میرا کسی بھی کیونٹی سے کوئی تعلق نہیں منہ میرا تعلق ایسٹ سے ہے نہ ویسٹ سے۔ کتنا بڑا اور سنگین مذاق ہے..... یہ سب میرے ساتھ کیوں ہو رہا ہے؟“

”تمہارے دل میں ہمارے خلاف نفرت کیوں ہے.....؟“ نور نے چونک کر پوچھا۔

”میں نہیں جانتا..... قادر نہیں گے تو کیا کہیں گے..... اور ماما..... ماما ساری زندگی میرے سامنے جھوٹ بولتی رہیں۔ سز پینر کے نام سے سب کو دھوکا دیتی رہیں۔ نہ جانے انھوں نے مجھ سے اور کیا کچھ چھپایا ہے۔ میں ان پر کیسے اعتماد کر سکتا ہوں.....؟“ وہ تلخی سے بولا۔

”ولیم! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی جلدی بے قابو ہو جاؤ گے۔ میں تو ہر لمحہ تمہاری اس عادت کو بد لنے کی کوشش کرتی رہی مگر لگتا ہے میں بری طرح ناکام ہوئی ہوں۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”تو پھر تم ہی بتاؤ..... اگر تم میری جگہ ہو تیں تو کیا کرتی.....؟“

”میں صرف خاموش ہو جاتی..... سوچتی اور پھر وقت کو فیصلہ کرنے دیتی۔“

”تو کیا تم کوئی احتجاج نہ کرتیں.....؟“

”ضرور کرتی..... مگر اس طرح نہیں، تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ کبھی کبھی حالات ہم سے انوکھے فیصلے کرواتے ہیں اور اس وقت ہم کتنے بے بس اور مجبور ہوتے ہیں۔ فیصلہ کچھ کرنا ہوتا ہے اور کرتے کچھ اور ہیں۔ تم ہی بتاؤ کیا ایسا نہیں ہوتا.....؟“ تب ولیم خاموش رہا۔

ماما ساری رات شدید کرب میں بستر پر تڑپتی رہی تھیں۔ وہ ہر کروٹ پر کراہ رہی تھیں۔ بار بار انھیں ابکائیاں بھی آ رہی تھیں۔ ہر دفعہ کیونٹراپلی کے بعد انھیں شدید تکلیف کا سامنا ہوتا تھا۔ ولیم سامنے بیٹھا تھا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نور جا چکی تھی اور وہ مسلسل ماں کے چہرے پر نظریں جمائے گہری سوچ میں ڈوبا تھا۔ ماں کے کراہنے کی آواز بھی اسے ان کی طرف متوجہ نہیں کر رہی تھی۔

”ولیم..... ولیم.....؟“ وہ آہستہ آہستہ بلارہی تھیں مگر وہ کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔

”میں کہاں کھڑا ہوں..... میرے آگے پیچھے کیا ہے..... اور مجھے کہاں جانا ہے.....؟“ یہ سوالات اسے بار بار تنگ کر رہے تھے اور وہ ان کے جوابات ڈھونڈنے میں لگا تھا۔

”ولیم..... ولیم.....“ انھوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ گلاس ہاتھ نہ آیا اور نیچے گر گیا۔ ولیم نے چونک

کر ماما کی طرف دیکھا۔

”آپ کو پانی چاہیے تھا۔۔۔۔۔ تو مجھ سے کہیں۔۔۔۔۔ اس کے لہجے میں سرد مہری تھی۔

”کب سے تو بیمار ہی تھی مگر تم۔۔۔۔۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ میں لاتا ہوں۔۔۔۔۔“ وہ کچن سے گلاس لینے چلا گیا انھیں سہارا دے کر اٹھایا اور گلاس لیوں سے لگایا۔ ماما کا وجود بخار سے چپ رہا

تھا۔ وہ بالکل بڈیوں کا بچہ ہو گئی تھیں۔ نہ جانے کیسی میڈیسنز اور کیسا علاج تھا جو ہڈیوں سے لگے گوشت کو بھی جلانے کے درپے تھا۔

مما پانی پی کر لیٹ گئیں۔ ولیم کا دل ایک لمحے کو ماما کی اس حالت پر کڑھنے لگا۔ اس نے انھیں لٹا دیا اور پھر ایزی چیئر پر آ کر بیٹھ گیا۔

”اوہ گاڈ۔۔۔۔۔ یہ میری کیسی آزمائش ہے۔۔۔۔۔ میں کیوں اسکی اذیت سہہ رہا ہوں۔۔۔۔۔ آخر کس لیے۔۔۔۔۔ میرے ہم عمر لڑکے لڑکیاں کیسے ہر

پریشانی اور غم سے آزاد ہیں اور میں اس قدر۔۔۔۔۔ بے بس۔۔۔۔۔ اور اتنی سخت آزمائش میں۔۔۔۔۔ آخر میرے ساتھ ہی یہ سب کیوں ہوتا ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ

مسلسل سوچ رہا تھا۔ جب حیدر کا فون آ گیا۔ اس گھر میں آنے کے بعد اس نے ولیم کو ایک علیحدہ دھوا بائل لے کر دیا تھا۔

”ولیم بیٹا۔۔۔۔۔ ماما کیسی ہیں؟“ حیدر نے پوچھا۔

”بہت تکلیف میں ہیں۔“

”اور تم کہاں ہو؟“

”ان کے پاس۔۔۔۔۔ ان کے کمرے میں۔۔۔۔۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ میڈیسن میں ڈرائیور کے ہاتھ بھجوا رہا ہوں۔ اس وقت جلدی میں یا دیکھیں رہا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا، تکلیف زیادہ ہو تو یہ

کھلا دینا۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے انکل۔۔۔۔۔؟“

”اور تم ٹھیک ہوتاں۔۔۔۔۔؟“

”جی۔۔۔۔۔“

”اوکے ہائے۔۔۔۔۔“ حیدر نے فون بند کر دیا۔

”یہ شخص بھی ایک معما ہے۔ نہ جانے فرشتہ ہے یا پھر۔۔۔۔۔؟ لیکن ماما کے خاندان سے صرف یہی ایک کیوں ماما کی لیور کر رہا ہے؟“ ایک اور

سوال اسے پریشان کرنے لگا۔ ماما نے آج تک اسے کسی کے ہارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ نہ اس کے اپنے ہاپ کے ہارے میں اور نہ ہی حیدر انکل

کے ہارے میں۔ ڈرائیور گیٹ پر دو انٹیوں کا تقافہ دے کر جا چکا تھا۔ اس نے ان کی ہدایت کے مطابق ماما کو دو انٹیں کھلا دی تھیں اور پھر آہستہ آہستہ

ان کی تکلیف کم ہونے لگی۔۔۔۔۔ اور وہ نیند کی آغوش میں چلی گئیں۔

ڈنر پارٹی ہائیڈے ان کے ٹیکوٹ ہال میں تھی۔ خوب انتظامات تھے۔ شہر کی کریم جمع تھی۔ تمام سیاستدان اپنی بیویوں کے ہمراہ آرہے تھے۔ ملک منصور نے اس پارٹی کا خصوصی طور پر اہتمام کیا تھا۔ فرار کے بعد آف دی اسکرین ہونے کے بعد جو طرح طرح کی چیمگوائیاں ہو رہی تھیں ایسے میں اس طرح کی پارٹی کا منعقد کرنا بہت ضروری تھا۔ ہر طبقہ ملکر سے لوگ جمع تھے۔ سیاستدان، صحافی، بیوروکریٹس، ٹیکو کریٹس، ماڈلز اور ادیب و دانشور بھی۔ اتنی گرینڈ پارٹی تھی اور ملک منصور نے شہزاد کو اس کی بھٹک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ اس دفعہ ملک منصور تو جیسے ہر ایک کو چوکا دینے پر مصر تھا۔ اس کے پہلو میں ایک ایرانی نژاد خوبصورت جوان سال صحافی آنکھت تھی۔

آنکھت کا حسن و جمال دیکھ کر ہر کوئی ملک منصور کو حسد و رشک کی لٹا دے دیکھ رہا تھا۔ آنکھت کو پاکستان آئے ہوئے ابھی صرف چند روز ہی ہوئے تھے۔ اس سے پہلے وہ بی بی سی کے نمائندہ کی حیثیت سے ایران اور مصر میں کام کرتی رہی تھی۔ اب وہ پاکستان چند روز کے لیے آئی تھی۔ علاقہ غیر میں اس علاقے کی غیر جانبداری اور ان کی رسوم و رواج کے بارے میں رپورٹ لینے وہاں گئی تو وہاں اس کی ملاقات ملک منصور سے ہوئی چونکہ وہاں پر اس کو زبان کا مسئلہ تھا اس لیے ملک منصور اس کا ایک مضبوط مددگار ثابت ہوا اور تب سے آنکھت کے ساتھ اس کے تعلقات بڑھنے لگے۔ وہ بے حد ذہین اور موقع شناس تھی۔ آج شہزاد کے بجائے آنکھت کو دیکھ کر کئی ایک نے تو ملک منصور پر جیلے بھی کسے جنہیں آنکھت تو نہ سمجھ سکی مگر ملک منصور خوب انجوائے کرتا رہا اور دراصل اس پارٹی سے دو فوائد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایک تو آنکھت کا انٹروڈکشن اور اس کی آنکھ پھٹس اور دوسرے پارٹی کے لوگوں کے درمیان تھوڑی بہت رنجشوں کو دور کرنا۔

مسز زہیر بھی خصوصی طور پر مدعو تھیں اپنے بیوروکریٹ مسیوڈ کے ساتھ اور ملک منصور، مسز زہیر کے کلب میں ہولڈ اور اس کی زبان کی گل افشانیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ کسی کے بارے میں اچھے کمٹس لینے کے لیے مسز زہیر کو پہلے مدعو کرنا اور خصوصی پروڈکول دینا گویا اپنے لیے خصوصی راہ ہموار کرنے کے برابر تھا۔ اگر مسز زہیر کسی کی فحور میں جاتی تو بال اس کے کورٹ میں ہوتی اور پھر باقی گیم جیتنا مشکل نہ ہوتا۔

”آئیے مسز زہیر! یو آر لٹلک سویگ، اسارٹ ایڈ سوٹ!“ ملک منصور اس کی جج و جج دیکھ کر کچھ چالوسی اشائل میں خصوصی طور پر خوشدلی سے بولا۔ ملک منصور کے ان کمٹس پر زہیر صاحب بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

”تھینک یو ملک صاحب! آپ کی ایسی پزیرائی ہی تو ہمیں آپ کی محفلوں کی طرف کھینچ لاتی ہے۔ حسن اور حسن کی پزیرائی کرنا تو کوئی آپ سے سکھے۔ حسن کو چاند سمجھا ہر کسی کے بس میں کہاں۔ اس وقت آپ بھی تو یوسف خانی لگ رہے ہیں اور پہلو میں چمکتا چاند، کیا کہنا۔“ مسز زہیر قہقہہ لگا کر بولی تو ملک منصور کا دل آدھ قہقہہ فضا میں گونجنے لگا۔ زہیر صاحب کا تو گویا بیگم صاحبہ کی گفتگو میں قہقہہ ہونا ان کے عقاب کو خواہ مخواہ دعوت دینے کے مترادف تھا اس لیے وہ انہیں وہیں چھوڑ کر اپنے کسی بدم سے محو گفتگو ہو گئے۔

”یہ چاند کہاں سے چرایا؟“ مسز زہیر نے آنکھت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”قدرت ہمیں خود ہی لو لاتی ہے۔ ہمارا تو اس میں کوئی قصور نہیں اور دیسے بھی یہ اسم ہاسکی ہیں یعنی مبارک چاند..... جیسا نام دیا حسن اور آپ نے بھی حسن کو صحیح جانچا ہے۔“ ملک منصور اک ادا سے بولا۔

”ماشاء اللہ! کیا قسمت پائی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار۔ شزا بھی کم قیامت تو نہیں۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

”ہاں مگر وہ چاند گہنا گیا ہے اور خزاں رسیدہ چیزیں ملک منصور کا دل نہیں لہجاسکتیں اس لیے قدرت خود بخود ہی شکر خودے کو شکر دے دیتی ہے۔“ ملک منصور نے پھر قہقہہ لگایا۔

”آپ پر تو مجھے شک آتا ہے۔“ مسز زہرا اندر کے حسد کو چھپا کر بولی۔

”تھینک یو اور ہمیں آپ پر پیار۔“ ملک منصور نے بھرے تالاب میں گویا کنگر پھینکا اور بڑے لاڈ سے کہا۔

”مگر ہر دفعہ تو آپ کا انتخاب کچھ اور ہی نکلتا ہے۔“ مسز زہرا نے اپنے دل کا پھپھولا پھونٹتے ہوئے محسوس کیا اور جل کر کہا۔

”کیا کریں، قدرت موقع ہی نہیں دیتی۔“ وہ بھراپنے آپ کو صاف بچا گیا۔ وہ ایسی عورتوں کی چلتر بازیوں سے خوب واقف تھا اور ان

کی زبان، ان کے لفظوں اور ان کی ادا نگلی و مفہوم کو انہی کے لب و لہجے میں ادا کرنے کا فن اسے خوب آتا تھا۔ محاشرے کے اس طبقے سے بگاڑنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

”تھینک ہے بھئی، ہمارے انگوڑ نہ جانے کٹھے ہی کیوں نکلتے ہیں۔“ وہ آہ بھر کر بولی۔

”بھئی تم ہمیشہ میری گڈ بک میں رہتی ہو۔“ ملک منصور پھر خوشامدی لہجے میں بولا۔ تم اور ملک منصور کے قابل..... تمہارے بیک گراؤنڈ

اور چلتر بازیوں سے تو میں اچھی طرح واقف ہوں۔ شکر نہیں کرتی جو زہیر جیسا شوہر مل گیا اور تم باڈرن سوسائٹی میں داخل ہو گئیں۔ ملک منصور نے اس

کے جانے کے بعد سوچا۔ وہ آئینکٹ کو ہر ایک سے ملوار ہا تھا کہ وہ پاکستان میں خصوصی طور پر یہاں کی سیاست پر ریسرچ کرنے آئی ہے اور اس

پروجیکٹ پر کام کرنے سے پہلے اس کے لیے اس طبقے کا ایک سپورٹرز بہت ضروری تھا مگر ہر کوئی اس کہانی کے پیچھے ایک اور کہانی بنتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔ نجر

کی ادا انوں سے کچھ دیر پہلے پارٹی ختم ہوئی۔ خوب ہلاکلا ہوا۔

میوزک، ڈرنک، قہقہے، چٹکلے، سیاست بازی اور خوب بھلچھو یاں چلتی رہیں۔ ملک منصور نے خوب دل کھول کر پیر لگایا تھا۔ سب کو بہت

لطف آ یا تھا۔ ہر ایک کو جو خصوصی پروٹوکول ملک منصور نے دیا تھا اس نے تو سب کے دلوں سے ملک منصور کے خلاف ساری رنجشیں مٹا دی تھیں۔ سب

بہت خوش تھے۔ آئینکٹ کا قیام پی سی میں تھا اور وہ ملک منصور کی خصوصی مہمان تھی اس لیے ہوٹل میں بھی اس کے آرام کا خاص خیال رکھا جاتا۔

ملک منصور جس طرح محبت سے اسے ٹریٹ کر رہا تھا اسے سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ طلاقہ غیر سے لے کر یہاں تک ملک منصور نے

ایک دفعہ بھی اسے کچھ ایسا نہیں کہا تھا جس سے وہ اس شخص کے کردار کے بارے میں غلط اندازہ لگاتی۔ وہ تو ہر جگہ اس کے لیے بہترین گائیڈ اور گارڈ

ثابت ہو رہا تھا۔ وہ رات کے آخری پہرے سے خود ہوٹل چھوڑنے گیا اس کے کمرے تک اور بہت محتاط اور محبت بھرے انداز میں اسے خدا حافظ کہا۔ وہ

اس شخص سے رفتہ رفتہ بہت متاثر ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ باہر کے ملکوں میں گزارا تھا۔ وہ شخصیات کا اندازہ ان کے رکھ رکھاؤ

اور گفتگو سے لگاتی تھی مگر اس شخص نے تو ہمیشہ اس سے بہت سلجھے انداز میں بات کی تھی۔ کسی بھی وقت اس کے دل میں کوئی بدگمانی نہیں پیدا ہوئی تھی۔

ملک منصور اسے ہوٹل چھوڑنے کے بعد گھر چلا گیا۔ شزا اور شائل دونوں بیڈروم میں سو رہی تھیں۔ وہ شائل کے بیڈروم میں لیٹ گیا۔

صرف اسی کا دروازہ کھلا تھا باقی سب دروازے رات کو بند کر دیے جاتے۔ شزا، شائل کو اسپتال لے کر جانے کے لیے تیار تھی جب ملک منصور کمرے سے باہر نکلا۔

”آپ کب آئے؟“

”رات کو ہی۔“ وہ بے پردائی سے بولا۔

”کیسی رہی پارٹی؟“

”ہاں، اچھی تھی۔“ اس نے سر دلچے میں جواب دیا۔

”کس سلسلے میں تھی؟“

”بھئی پارٹی کی طرف سے تھی جو روٹین میں ہے۔ تم تو جرح کر رہی ہو اور ہاں شائل کو لے کر جا رہی ہو؟“ اس نے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا۔

”ہاں۔“

”ٹھیک ہے جلدی جاؤ۔ ڈاکٹر سے ٹائم لیا ہوا ہے؟“

”آپ نہیں چلیں گے۔“

”نہیں، تم چلی جاؤ، میں بہت تھکا ہوا ہوں اور مجھے کچھ کام بھی کرنا ہے۔“ وہ اکتاہٹ سے بولا۔

”اچھا۔“ اس نے خاموشی سے چائے کا کپ نیکل پر رکھتے ہوئے کہا اور شائل کو لے کر چل دی۔

ڈاکٹر نے تقریباً دو گھنٹے اس کا کیس بنانے میں لگائے۔ اس سے باتیں کیں۔ شزا نے بھی اس کے سارے سوالات کے ٹھیک ٹھیک جوابات دے دیے۔

”ڈاکٹر صاحب! آخر اس کو پتا کب لیا ہے؟“ شزا نے پریشانی سے پوچھا۔

”میرے خیال میں انھیں شیزوفرینیا کا مرض لاحق ہے۔“

”شیزوفرینیا؟“ شزا نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، یہ ایسی نفسیاتی بیماری ہے جو روز بروز بگڑتی جا رہی ہے پاکستان میں بھی اس کے مریضوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے۔“

”لیکن ڈاکٹر صاحب! اسے یہ مرض کیسے لاحق ہو گیا؟“

”شیزوفرینیا میں دراصل شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کی بہت ساری وجوہات ہوتی ہیں مگر شائل کے کیس میں پیرٹنس،

چائلڈ ایڈجسٹمنٹ، انٹرکشن جیسے عوامل زیادہ کارفرما ہیں۔ آپ نے جس طرح کی ہسٹری بتائی ہے اس میں تو صاف یہی نظر آ رہا ہے کہ بچی بہت زیادہ

حساس ہے۔ آپ لوگوں نے حتی المقدور اسے اپنے سے دور رکھا۔ اس چیز کو ہتھالی کو اس نے بہت زیادہ محسوس کیا۔ اندر ہی اندر وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار

ہوتی رہی۔ اس کے نتائج میرا مطلب ہے آپ اس کی علامتوں سے خود ہی اندازہ کریں کہ حالات کہاں تک بگڑ سکتے ہیں۔“

”ڈاکٹر صاحب! یہ ٹھیک تو ہو جائے گی نا؟“ شزا آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے بولی۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں لیکن آپ کو اپنے رویوں میں تبدیلی پیدا کرنی ہوگی۔ اسے بہت زیادہ محبت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ لڑائی جھگڑا تو اس کے سامنے بالکل نہیں ہونا چاہیے اور ہاں ایسے مریض سے زیادہ بچہ کچھ نہیں کرنی چاہیے۔ اگر تھوڑا سا بھی اشتعال دلا یا جائے تو یہ لوگ زیادہ مشتعل ہو جاتے ہیں پھر خود کو اور دوسروں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور کبھی کبھی خودکشی بھی کر سکتے ہیں۔“ شزا کو ایک دم سب کچھ یاد آنے لگا۔

”کیا کبھی ایسا ہوا؟“ ڈاکٹر نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں لیکن جب وہ ٹھیک تھی اس نے تین بار ایسی کوشش کی۔“

”اہل میں یہ بیماری اچانک نہیں ہوتی اس کا کافی لمبا چوڑا ایک گراؤنڈ اور بہت سے فیکٹرز ہوتے ہیں۔ بحث دہانے سے اجتناب کریں۔“

”لیکن یہ تو گھنٹوں خاموش بیٹھی رہتی ہے۔“

”ہاں میں اسی کی طرف آ رہا تھا۔ مسز منصور! میں نے یہ ساری ہدایات ایک کاغذ پر لکھ دی ہیں۔ ان پر سختی سے عمل کریں اور پلیز بہت محتاط

رویہ اختیار کریں۔“ ڈاکٹر نے میڈیسن لکھتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو ڈاکٹر صاحب!“ وہ اٹھتے ہوئے بے دلی سے بولی۔ ”چلو ٹائل چٹا!“ اس نے پیار سے کہا۔ وہ ڈاکٹر کے بی پی آپریشن کے

ساتھ مسلسل کھیل رہی تھی اور اسے کسی قیمت پر بھی چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔

”اٹھو چھوڑو اسے، ڈاکٹر صاحب ناراض ہوں گے۔“ شزا تھوڑے سخت لہجے میں بولی۔ اس نے آپریشن زور سے زمین پر پھینکا۔

”بیٹا! آپ کو اچھا لگتا ہے تو آپ لے جائیں۔“ ڈاکٹر نے محبت سے کہا تو وہ خوشی سے کھل اٹھی۔

”مسز منصور! ایسا تلخ رویہ تو کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں۔ آپ اپنے لہجے کو بالکل بدل دیں۔ وہ نارمل انسان نہیں۔“

”تو کیا یہ پاگل ہو گئی ہے؟“ شزا نے بے بسی سے پوچھا۔

”نہیں نہیں، ایسا مت کہیں۔ کسی بھی بیماری کا جب ایک ہوتا ہے تو اس وقت مریض نارمل تو نہیں ہوتا نا۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔“

”ڈاکٹر صاحب! آپ فیس میں آپریشن کے پیسے بھی ڈال لیجیے۔“ وہ نرم لہجے میں بولی۔

”ارے مسز منصور! ایسی کوئی بات نہیں۔ بعض اوقات تو مریض ہمیں بھی گھر لے جانے کے لیے ہند ہوتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیے،

ایسی کوئی بات نہیں۔“ ڈاکٹر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

کون اپنے رویے میں تبدیلی لائے گا۔ ملک منصور جس کے نزدیک اولاد قطعی اہم نہیں ہے۔ جو بیٹی کی ایسی حالت دیکھ کر رات بھر پارٹی

میں رہا۔ میں..... میں کس حد تک اسے مطمئن کر پاؤں گی۔ وہ سب کچھ جانتی ہے اور گھر کا ماحول کبھی بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ جس کی بنیادوں میں بے

حسی، آوارگی اور آلودگی شامل ہو چکی ہو کیا وہ لوگ بدلیں گے۔ کوئی بھی نہیں بد لے گا۔ کسی کے لیے بھی تو یہ لڑکی اور اس کی زندگی اہم نہیں۔ شکیل اذ

تھنک..... اس نے گاڑی میں مایوسی اور بے بسی سے سوچا۔

یاد آیا! رشتے بھی زندگی میں کس قدر اہم ہوتے ہیں۔ زندگی اور رشتے اور جب رشتے ہی بے بنیاد ہو جائیں تو زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ محبت کی چاشنی سے تو زندگی کا مزہ ہے اور جن بچوں نے محبت کا لمس محسوس نہ کیا ہو وہ ایسے نہیں بکھریں گے تو اور کیسے ہوں گے۔ ماڈرن سوسائٹی کے شکستہ وجود جنہیں نہ توجہ ملتی ہے اور نہ محبت، جو ساری زندگی جذبیوں کے لیے ہی تڑپتے تڑپتے مر جاتے ہیں۔

ٹریک کے ریڈیو سٹیشن پر ٹریک کا سیلاب رک سا گیا تھا۔ ایک ہا کر نے ذبردستی اخبار کار وٹوڈ سے اندر پھینکا۔ اس نے وقت گزارنے کے لیے اخبار کو الٹا پلٹا اور جلدی سے پیسے دیے۔ اخبار کے پچھلے صفحے پر ملک منصور اور آنکیت کی مسکراتی تصویریں تھیں۔ اس نے بے خیالی میں ہی تفصیل پڑھنا چاہی مگر پیچھے رکے ٹریک کے ہارن نے اسے چوکا دیا۔ اس نے جلدی سے گاڑی چلا دی اور ایک سائیڈ پر گاڑی پارک کر کے خبر پڑھنے لگی۔ ملک منصور کی طرف سے گریڈ پارٹی ایہ شخص کتنا جھوٹا ہے اور کس قدر مکار بھی۔ آنکیت کی تصویر پر وہ مسلسل نگاہیں مرکوز کیے ہوئے تھی۔ اس کے اندر شدید رقابت اور دکھ کا احساس بیدار ہونے لگا۔ ملک منصور اتم نہیں بدلو گے۔ عورت تمہارے لیے محض کھلونا ہی ہے اور اب اس کی شامت آئے گی۔ اس کی پنهائی کا مطلب شزا کی ذات کی نفی تھا اور جب کسی کو بھی اپنی ذات کی نفی کا احساس ہو تو وہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ اس وقت وہ بھی شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ کسی سے اپنا دکھ کہے مگر کوئی بھی تو پاس نہیں تھا۔ اس نے شاکل کی طرف دیکھا۔ وہ گم صم وٹوڈ سے باہر دیکھ رہی تھی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر بکھری بکھری شخصیتوں کے ساتھ بیٹھی تھیں اور کوئی بے سارنا حال نہیں تھا۔



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

آصف کے کاغذات تیار ہو چکے تھے۔ حیدر نے اسے فون کر کے لاہور آنے کو کہا تھا۔ اس نے اس کا اٹلی جانے کا انتظام کر دیا تھا۔ حیدر کا ڈرائیور اسے لینے گاؤں گیا تھا۔ وہ گھر والوں سے مل کر ابھی گاڑی میں بیٹھنے ہی لگا تھا کہ کہیں سے سنسناتی گولیاں اس کے سینے پر آ کر لگیں۔ اس کا ایک پاؤں گاڑی میں تھا اور ایک باہر، وہ وہیں زمین پر تڑپنے لگا۔ ڈرائیور بدحواس ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا اور گاڑی کو ریس دے دی۔ آصف زندہ تھا یا مر گیا تھا اسے کچھ علم نہیں تھا۔ حیدر اس کی بات سن کے بے حد پریشان ہو گیا۔ ڈرائیور اس کے سامنے کھڑا اسے ساری تفصیلات بتا رہا تھا اور وہ سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا۔

”تم واپس جاؤ مگر گاڑی میں نہیں اور اپنا حلیہ بھی بدل کر جانا۔ جا کر ساری صورت حال کا جائزہ لو اور یہ سوہاگل رکھو۔ میں تم سے خود رابطہ کروں گا پھر باقی کی باتیں بعد میں ہوں گی۔“ حیدر نے سوہاگل اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے سہرا“ اس نے سوہاگل جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

حیدر کو یقین تھا کہ یہ کارستانی ملک منصور کی ہی تھی۔ اس کے علاوہ آصف کی کسی اور کے ساتھ کوئی دشمنی نہ تھی مگر ملک منصور کو اس کی خبر ہونا بہت حیرت کی بات تھی۔ اس نے تو ہر ممکن طریقے سے اسے صیغہ از میں رکھنے کی کوشش کی تھی اور اب یقیناً وہ حیدر کے بارے میں بھی جان چکا ہوگا۔ اسے آصف پر یوں اچانک حملے کا سن کر سخت دکھ اور حیرانی ہوئی تھی۔ ملک منصور اس قدر سفاک تھا۔ پہلے سہیل کو خود قتل کیا اور اب آصف، شفق بھی

اس سے محفوظ نہ رہی تھی۔ وہ کیسا انسان تھا۔ درندوں سے بڑھ کر وحشت اور زندگی اس کے اندر تھی۔ وہ سخت مایوسی کے عالم میں کرے کا چکر لگا رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر اخبار پر پڑی۔ ملک منصور کی آنکھ کے ساتھ ہنسی مسکراتی تصویر۔ اس نے اخبار پکڑ کر بغور دیکھا۔

”تم واقعی شہلا کے قابل نہ تھے۔ تم نے اس کی زندگی تو برباد کی ہی اس کے ساتھ اور بھی بہت سی زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا اور پھر بھی تم کس قدر مطمئن اور خوش نظر آ رہے ہو۔ ملک منصور! تم کس مٹی کے بنے ہو۔“ وہ اپنے آپ سے سوالات کر رہا تھا اور پھر گھڑی دیکھ کر اس نے موبائل کا نمبر ملایا۔

”ہاں کیا خبر ہے؟“

”سر، وہ مر چکا ہے۔ لاش پوسٹ مارٹم کے بعد لواحقین کے حوالے کی جائے گی۔ مغرب کے بعد جنازہ ہے۔“ ڈرائیور نے اسے بتایا۔

”اچھا۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”سر، اب میرے لیے کیا حکم ہے؟“

”تم واپس آ جاؤ اور ہاں کوئی مشکوک شخص تو تمہیں وہاں دکھائی نہیں دیا۔“

”نہیں سر، سب گاؤں کے لوگ ہی ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے، تم واپس آ جاؤ۔“ حیدر نے کہا۔

اگلے دو تین دن وہ مسلسل اخبارات دیکھتا رہا۔ آصف کے بارے میں ذرا سی خبر بھی اخبار میں نہیں تھی۔ اس کا مطلب صاف ظاہر تھا مگر حقائق کے پس منظر میں کون دیکھتا ہے۔ وہ شفق کو کیسے بتائے گا۔ وہ تو پہلے ہی سہیل کی وجہ سے بہت ڈسٹرب ہے اور اب آصف.....

شفق، سہیل کی ڈیجھ کے بعد شدید ذہنی اضطراب میں تھی۔ ایک تو گناہ کا شدید احساس اور دوسرے عذرا کے الفاظ دن رات، اٹھتے بیٹھتے اس کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔ نہ دن کو چین آتا اور نہ رات کو نیند۔ نہ وہ کسی سے دکھ شیر کر سکتی تھی نہ ہی کوئی کفارہ ادا کر سکتی تھی۔ کیا ساری زندگی یونہی سولی پر لٹکتی رہے گی۔ شدید احساس زیاں نے اس کو بہت حد تک ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے ٹھگ آ کر سحر کا نمبر ملایا۔ بہت بیلز جانے کے بعد کسی نے ٹھگ آ کر فون اکٹا ہٹ میں اٹھایا تھا۔ وہ سوئے سوئے لہجے میں بول رہی تھی۔

”ہیلو سحر! تم کہاں ہو؟“ شفق آہستہ سے بولی۔

”کون؟“

”میں شفق بول رہی ہوں۔“

”کون شفق؟“

”سحر! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”میں سحر نہیں، میں تو محنتی ہوں۔ درور بھیک مانگنے والی اللہ کے نام پر، ہاں کون، بولو کون ہو تم؟“

”سحر! کیا تم نشتے میں ہو؟“ وہ اس کی آواز اور لہجے سے اندازہ لگاتے ہوئے بولی۔

”ہاں مگر اب تو کجنت نشہ بھی نہیں ہوتا۔“

”آفاق کہاں ہے؟“

”آفاق..... آفاق..... میرا آفاق تو مادرِ رخ نے چھین لیا۔“ وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”اومائی گاڈا کیا اس نے شادی کر لی؟“

”جہاں نہیں، وہ تو مجھ سے روٹھ گیا ہے۔ گھر ہی نہیں آتا اور مجھ سے بات بھی نہیں کرتا۔ فون بھی نہیں کرتا اور اب تو مجھے مارتا بھی نہیں۔ میں اس کے بغیر مر جاؤں گی، پاگل ہو جاؤں گی۔ وہ جانتا بھی ہے کہ میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں اس دنیا میں سب سے زیادہ پھر بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ کیا تمہیں معلوم ہے؟“ اسے تو جیسے موقع ملا تھا وہ اچانک پھٹ پڑی تھی۔ دل چاہ رہا تھا اپنا دل چیر کر اس کے سامنے رکھ دے۔

”سحرا تم فکر نہیں کرو، وہ آ جائے گا۔“ شفیق نے اسے تسلی دی۔

”نہیں، اب نہیں آئے گا۔ میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔ وہ تو مجھے دفنانے بھی نہیں آئے گا۔“

”سحرا حوصلہ کرو۔ دیکھو صحت نہ ہارو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اس گھر میں آج تک کچھ بھی تو ٹھیک نہیں ہوا۔“ اس نے خود ہی موبائل غصے سے دوڑ پھینکا۔ شفیق اس کے حالات سن کر بہت ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ اس نے تو اپنا دکھ شہر کرنے کے لیے اسے فون کیا تھا اور وہ خود ہی پریشان ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ حویلی کی اونچی اونچی دیواروں کو توڑ کر کہیں بھاگ جائے۔ گو کہ اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی اور وہ ادھر مجبوس نہیں تھی مگر اس کا دل فرار چاہ رہا تھا۔ اس نے حیدر کا نمبر ملایا۔

”ہاں بیٹا! کیا بات ہے؟“

”انکل! میں بہت پریشان ہوں اور شہر آنا چاہ رہی ہوں۔ انکل میں آ جاؤں۔“ حیدر اس کی بات سن کر چمک گیا۔ کہیں اسے آصف کی کوئی خبر تو نہیں مل گئی تھی۔

”بیٹا! آپ کیوں پریشان ہیں؟“

”مظلوم نہیں۔ بس دل بہت پریشان ہے۔ نہ جانے کیوں ٹینشن سی ہو رہی ہے۔ میں نے سحر کو فون کیا تھا اور.....“

”ہاں ہاں کہو، کیا بات ہے؟“

”وہ بہت زیادہ اپ سیٹ ہے۔ شاید آفاق نے شادی کر لی ہے۔“

”او آئی سی!“ حیدر کو اس کی پریشانی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ ”ٹھیک ہے، ابھی ڈرائیور بہت مصروف ہے۔ دو تین دن بعد میں اسے آپ کی

طرف بھیجوں گا پھر آ جانا۔“

”ٹھیک ہے انکل!“ وہ مطمئن لہجے میں بولی اور حیدر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ کیسے اس کو آصف کے بارے میں بتائے گا جبکہ وہ پہلے ہی بہت

ڈسٹرب ہے۔ لیکن حقائق سے فرار تو ممکن نہیں۔ آج نہیں تو کل اسے حالات کا علم تو ہونا ہی ہے۔

دو دن بعد وہ ڈرائیور کے ساتھ شہر آگئی تھی۔ وہ واقعی بہت پریشان تھی۔ حیدر نے اسے بہت تسلی دینے کی کوشش کی۔
 ”انکل! میں سحر سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”ہاں تو مل لو۔“

”اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں اسے ادھر بلا لوں؟“

”ہاں ہاں، مائنڈ کرنے کی کیا بات ہے؟“

”تھینک یو انکل!“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

اگلے دن اس نے سحر کو فون کیا۔ فون بھارت ہاگر کسی نے نہ اٹھایا۔ وہ رات گئے تک فون کرتی رہی مگر کسی نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔ اسے سخت تشویش ہو رہی تھی۔ حیدر صبح سے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اچانک فون کی بیل بجنے لگی۔ اس نے فون اٹھایا۔

”ہیلو کون؟“

”حیدر! انکل کہاں ہیں؟“

”آپ کون؟“

”میں ولیم بات کر رہا ہوں۔ ماما کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ انہیں اسپتال لے کر جانا ہے۔ ان کا موبائل آف ہے اسی لیے مگر فون کیا ہے۔“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
 www.pvlib.com

”مگر وہ تو گھر پر نہیں۔ شہر سے باہر کسی ضروری کام کے سلسلے میں گئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، جب وہ آئیں تو انہیں میرا پیج ضرور دے دیں۔ اس وقت بہت اہم جیسی ہے۔“ اس نے فون رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈرائیور ذوالفقار کا فون آ گیا۔ ”بی بی جی! شاہ جی کہاں ہیں؟“

”وہ تو گھر پر نہیں، آپ کون؟“

”میں ذوالفقار ڈرائیور بول رہا ہوں۔ بہت ضروری بات تھی۔ ان کا موبائل بھی بند ہے اور بات بہت ضروری ہے۔“

”ٹھیک ہے، آپ پیغام دے دیں، میں ان کو دے دوں گی۔“

”آپ جی! ان کو بتا دیں کہ آصف کی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا پتا چل گیا ہے۔“

”کیا مطلب! کیا ہوا آصف کو؟“ وہ چیختے ہوئے بولی۔

”جی! اس کو کسی نے دو تین دن پہلے قتل کر دیا تھا۔“

”اوہ نوا یہ نہیں ہو سکتا۔“ اس سے بولنا مشکل ہو گیا تھا اس نے فون رکھ دیا۔ فون بند کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ پہلے

سہیل اور اب آصف بھی اور اسے علم بھی نہیں ہوا۔ دو بے گناہ انسان اور ان کا خون اس کی گردن پر تھا۔ پہلے وہ سہیل کی وجہ سے شدید دھچکی کرب میں

جتلا تھی اور اب آصف بھی۔ سکیل مرتے دم تک اسے آصف کے بارے میں اصرار کرتا رہا اور وہ اس کے لیے یہ کام بھی نہیں کر سکی تھی۔ اس شخص کے لیے جس نے اپنی زندگی اس کے لیے داؤ پر لگا دی تھی۔ اُف خدایا! میں اس قدر ذلیل ہو سکتی ہوں۔ میری وجہ سے دو بے گناہ انسان موت کے منہ میں چلے گئے اور میں زندہ ہوں۔ مجھے تو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ شدید ذہنی اضطراب میں تھی۔ ہر طرف سے صد مات نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ د بے قدموں حیدر کے کمرے میں مچی اور ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں، شیلٹ کے اندرونی خالوں اور بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی درازوں میں کچھ ڈھونڈتی رہی۔ کوئی ایسی چیز، کوئی ایسا ہتھیار، کچھ بھی سکی۔

اسے ایک دراز میں سے کچھ گولیاں ملیں۔ اس نے ساری کھائیں۔ شاید وہ حیدر شدید ڈپریشن میں لیتا تھا۔ وہ گولیاں کھا کر ادھر ہی بیڈ پر لیٹ مچی۔ باہر مسلسل گیٹ تھل بچ رہی تھی۔ شیر شاہ کسی کام سے باہر گیا تھا۔ خانساہاں نے بہت دیر بعد اپنے کوارٹر سے آ کر گیٹ کھولا تھا۔ شہلا اسد اپنے شوہر کے ساتھ بہت دلوں کے بعد آئی تھی۔

”کیا بات ہے بابا! پاپا کہاں ہیں؟“ شہلا نے خانساہاں سے پوچھا۔

”وہ جی کسی کام سے شہر سے باہر گئے ہیں۔“

”آج کل کہاں ہوتے ہیں۔ نہ موبائل پر ملتے ہیں اور نہ گھر پر۔“

”معلوم نہیں جی، گھر پر ہی نہیں ہوتے۔ بی بی جی بھی گاؤں سے آئی ہوئی ہیں۔“

”کون بی بی؟“ شہلا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسد گاڑی میں ہی تھا۔

”شفیق بی بی!“

”کہاں ہے وہ؟“ نہ جانے کیوں وہ جاتے جاتے رک گئی تھی۔

”اندھ ہی ہیں۔“

”اچھا۔“ شہلا کے اندر پھر ایک دم نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا اور وہ نادانستہ اندر چل مچی۔ خاموشی سے سارے کمروں کا جائزہ لیتی رہی۔ پاپا کے بیڈر دم تک جاتے جاتے اس کے قدم اچانک لرزنے لگے۔ اس نے دروازہ کھولا۔ شفیق ان کے بیڈ پر نیم دراز تھی۔ کمرے میں بالکل اندھیرا تھا۔ شہلا کا خون کھولنے لگا۔ اس کی اتنی جرأت..... اور پاپا کیا وہ پھر..... وہ ایک دم صرف چند لمحوں میں یقین کی وادی سے شلوک و شبہات کی خاردار جھاڑیوں میں الجھ چکی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ تھپڑ مار مار کر اس لڑکی کے ناپاک جسم کو پاپا کے مصفا بستر سے کہیں دور پھینک دے۔ وہ بہت دنوں کے بعد اپنے آپ کو کپڑوں کے آئی تھی اور اب صرف چند لمحوں میں جنونی ہو چکی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر لائٹ آن کی۔ اس کا خیال تھا کہ لائٹ آن کرنے پر وہ اٹھ جائے گی مگر وہ بے سدھ پڑی تھی۔

”تمہاری یہ جرأت کہ پاپا کے بیڈر دم میں گھسی ہو اور ان کے بیڈ پر.....“ وہ چلائی مگر جواب نہ دروا“ اٹھو یہاں سے اور باہر دفع ہو جاؤ۔“

اس نے ہاتھ سے اسے جھٹک دیا تو اس کا ہاتھ اور سر ایک طرف کوٹک گئے۔ ادھ کھلی آنکھیں کچھ ادھر ہی کہانی بتا رہی تھیں۔ وہ خود بھی ایک لمحے کو چوگی۔

اس کا ڈھیلا، بے جان جسم..... اس نے جلدی سے نبض چیک کی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس نے ارد گرد دیکھا۔ ڈریسنگ نچل پر گولیوں کی کھلی فیشی نظر آ گئی۔

”مائی گاڈ!“ وہ کہتے ہوئے ہاہر بھاگی۔

”اسد..... اسد! جلدی سے اندر آئیں..... وہ..... اس لڑکی نے شاید خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے۔“

”کون شہلا..... کون لڑکی؟“ اسد نے گھبرا کر پوچھا۔

”وہ اندر ہے شفق!“ وہ ہکلاتے ہوئے یولی اور دونوں اندر بھاگے۔

”اس کی حالت تو بہت سیریس لگ رہی ہے۔“ اسد نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کو جلدی سے اسپتال لے چلتے ہیں۔“ وہ خود ہی بولی۔

”ہاں، بابا کو بلاؤ۔ اسے گاڑی میں ڈالیں۔“ تینوں نے مل کر اسے بڑی مشکل سے گاڑی میں ڈالا اور ایک پرائیویٹ اسپتال میں لے

گئے۔ ڈاکٹروں نے جلدی سے اس کا معہہ وائش کیا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔

”اگر آپ صرف چند منٹ اور لیٹ کر دیتے تو ان کا بچتا بہت مشکل تھا۔“ ایک ڈاکٹر نے دونوں سے کہا تو وہ خاموش ہو گئے اور خالی خالی

نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ شہلا مسلسل پاپا سے رابطہ کیے ہوئے تھی۔ رات کے دو بجے موبائل سے رسپانس ملا۔

”ہیلو شہلا تم اس وقت! خیریت تو ہے؟“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”ہاں پاپا! آپ کہاں ہیں؟“

”میں صبح فیصل آباد گیا تھا۔ ابھی واپس آ رہا ہوں۔ راتے میں ہی ہوں مگر تم نے اس وقت فون کیوں کیا ہے؟“

”پاپا! وہ میں اسپتال سے بول رہی ہوں۔“

”کیوں، خیریت تو ہے؟“

”ہاں، وہ دراصل شفق نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ میں اچانک گھر گئی تو اسے اسپتال لے کر آئی۔“

”کیا..... کیا کہہ رہی ہو؟“ حیدر کے ماتھے پر ایک دم پسینا آ گیا۔

”ہاں مگر اب وہ ٹھیک ہے۔ میں اور اسد اسپتال میں ہی ہیں۔“

”او مائی گاڈ! یہ اس نے کیا کیا۔ میں اسپتال ہی آتا ہوں۔“ حیدر نے ایڈریس نوٹ کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔ وہ خود ہی گاڑی ڈرائیو

کر رہا تھا اس لیے ڈرائیو کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ یہ لڑکی اس قدر جنونی بھی ہو سکتی ہے۔ اسے سخت انسوس ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ولیم کا فون آ گیا۔ ”انکل! آپ کہاں ہیں، ماما کی طبیعت بہت خراب ہے۔ میں اسپتال سے بول رہا ہوں اور آپ کو

مسلسل فون کر رہا ہوں۔ میں اور نور بہت مشکل سے انہیں اسپتال لائے ہیں۔ انکل! آپ آ رہے ہیں نا؟“ ولیم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کیوں کیا ہوا؟“

”آج ان کو خون کی الٹی ہوئی ہے۔“

”اوہ لو! حیدر پریشانی سے بولا۔

”انکل! وہ ہوش میں بھی نہیں۔“

”بیٹا آپ گھبراؤ نہیں۔ میں آ رہا ہوں۔ ایک گھنٹے تک پہنچ جاؤں گا۔“ حیدر نے موبائل آف کیا۔ وہ سخت شش و پنج میں تھا۔ دونوں زندگیوں خطرے میں تھیں، دونوں کو پہچانا ضروری تھا اور وہ تنہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف جائے۔ نادانستہ اس نے گاڑی کا رخ شوکت خانم کی طرف موڑ دیا۔ ولیم سر جھکائے پریشان بیٹھا تھا۔ نور کو زبردستی اس نے بڑے چچا کے ساتھ بھیج دیا تھا جو اس کو لینے خود ہی اسپتال پہنچ گئے تھے۔

”شہلا کیسی ہے اب؟“

”معلوم نہیں۔“ ولیم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”اچھا میں ڈاکٹر سے مل کر آتا ہوں۔“ وہ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے ملنے چلا گیا۔

”فکر کی بات نہیں۔ کچھ کلائنگ ہوگئی تھی اس لیے الٹی ہوئی ہے۔“ ایک دم موبائل بجنے لگا۔

”ہاں شہلا! بولو کیا بات ہے؟“ اچانک حیدر کے منہ سے نکلا۔ ولیم نے پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں گہرا استغہام

تھا۔ ”میں ابھی تھوڑی دیر تک پہنچتا ہوں۔“ اس نے موبائل بند کر کے ولیم کی طرف دیکھا۔

”میری بیٹی کا فون تھا مجھے اسپتال جانا ہوگا۔“ ولیم کہیں کھوسا گیا تھا اور خاموشی سے حیدر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کوئی چیز کہیں انک سی گئی

تھی۔ وہ کچھ پوچھتا چاہتا تھا مگر اسے اس کا کوئی حق نہیں تھا اور صمت بھی.....

”میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ جلدی آ جاؤں۔ کل تک تو اسپتال میں رہنا پڑے گا اور اگر میں نہ آ سکا تو مجھے

فون کر دینا۔ میں ڈرائیور کو بھیج دوں گا اور ہاں میں نے بلز کی پے منٹ کر دی ہے اور یہاں سے ٹی ایم کارڈ ہے۔ اس کا یہ پاس ورڈ ہے۔ اگر میں نہ ہوں تو

اس سے پیسے نکلا لینا۔“ حیدر نے اسے اے ٹی ایم کارڈ پکڑاتے ہوئے کہا۔ ولیم خاموشی سے اس فرشتہ صفت انسان کی طرف دیکھتا رہا جس کے

بارے میں وہ کچھ کچھ مشکوک بھی تھا اور معترف بھی۔ وہ اس کے مرتبے کا تعین نہیں کر سکا تھا۔ وہ شخص اس کے دل کے کسی گوشے میں براہیمان ہو چکا

تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، جیسا بھی تھا اس کی عزت کرنے کو دل چاہتا تھا۔ اس کی کسی بات کو رد کرنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

حیدر اسپتال پہنچا تو وہ بستر پر بے ہوش پڑی تھی۔ شہلا اس کے پاس ہی تھی اور اسد گھر جا چکا تھا۔ ساری رات دونوں اسپتال میں ہی رہے تھے۔

”پاپا! آپ کہاں رہ گئے تھے؟“ شہلانے بے صبری سے پوچھا۔

”مجھے اچانک شوکت خانم جانا پڑا۔ ایک مریض بہت بیمار تھا۔ ڈاکٹر اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟“

”معدہ وراثت کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر تک ہوش میں آ جائے گی مگر پاپا یہ آپ کے پیڈروم میں اور ٹیبلٹس بھی اس نے آپ کے روم سے لی

تھیں۔ آپ نے اسے اتنی لبرٹی دے رکھی ہے۔“ شہلا آہستہ مگر قدرے چپچپے ہوئے لہجے میں بولی۔ وہ اس کی زندگی سے زیادہ اس کی حیدر کے گھر میں موجودگی سے پریشان تھی۔

”شہلا! تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ جو بھی تمہارے دل میں ہے صاف صاف کہو۔ ذوقنی چلے اور لہجہ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ حیدر کا اندر ہا ہر ہمیشہ صاف رہا ہے اور رہے گا اور اسے اپنی کسی بھی بات پر کوئی شرمندہ گی نہیں۔“ حیدر مضبوط لہجے میں بولا۔

”آئی ایم سوری امیر ایہ مطلب نہیں تھا۔“ حیدر نے بھرپور لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھ کر گہری سانس لی اور خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد شفق نے آنکھیں کھولیں۔ حیدر سامنے نظر آیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”انگل! میں کیوں زندہ ہوں۔ مجھے کیوں بچایا؟“

”تم نے کتنی بڑی حرکت کی ہے۔ کیا تمہیں اس کا اندازہ ہے؟“

”انگل! میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ میری وجہ سے دو انسان مارے گئے۔ سہیل بھی اور اب آصف بھی۔ میں اپنے آپ کو کیسے معاف کروں گی۔“ وہ سستے گئی۔ حیدر نے شہلا کی طرف دیکھا۔ وہ شرمندہ سی کھڑی تھی۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“ حیدر نے اس سے پوچھا۔

”ذوالفقار ڈرائیور نے اور آپ نے مجھے بالکل بھی نہیں بتایا۔ میں بہت بری ہوں انگل! بہت بری، میں اب کیا کروں گی۔“ وہ مسلسل رو رہی تھی اور آنسو ٹپکے میں جذب ہو رہے تھے۔

”بہت کرو بیٹا! ان کی موت ایسے ہی لگتی تھی۔“ حیدر نے اسے حوصلہ دینا چاہا۔

”میری وجہ سے، میں اس کی وجہ بنی۔“

”اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔ قسمت کا لکھا کوئی نہیں مٹا سکتا۔“ وہ خاموش ہو گئی اور آنکھیں بند کر لیں مگر بند آنکھوں سے بھی آنسو مسلسل بہتے رہے۔



ولیم بے حد مضطرب تھا۔ ماما کے اس انکشاف کے بعد اس موضوع پر دوبارہ کوئی بات نہیں ہوئی تھی مگر اس نے آج حیدر انگل اور ماما کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ ہار ہار انھیں اصرار کر رہی تھی کہ ولیم کو ایک دلدادہ ان کی زندگی میں کلمہ پڑھا کر مسلمان کر دیں اور حیدر انگل ہار ہار بھی کہہ رہے تھے کہ جبر سے نہیں بلکہ جب ولیم کا اپنا دل چاہے گا تب وہ ایسا کریں گے۔ اس کی باتیں سننے کے بعد وہ گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ موسم بہت سرد ہو رہا تھا مگر نہ تو اسے موسم کی شدت کا احساس ہو رہا تھا نہ رگ و پے میں سرایت کرتی ٹھنڈ کا۔ اس کا اندر تو مسلسل جل رہا تھا۔ یہ سب کیسے ممکن ہوگا؟

اوہ کرائسٹ، اوہ گاڈ! آئی ایم ریل سک آف لائف! اسے کوئی راستہ اور کوئی منزل کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے قدم نادانستہ طور کی طرف اٹھ گئے۔ وہ کسی جائے پناہ کی تلاش میں ان کی طرف چلتا گیا۔ امید کی کرن روشن تھی۔ قادر کو وہ کیسے ساری صورت حال بتائے گا اور وہ کس

طرح اس پر یقین کریں گے۔ وہ قادر کے گھر پہنچا تو کچھ گاڑیاں باہر کھڑی تھیں۔ اسے باہر بھاڑے میں ہی بیٹھنا پڑا۔ باہر شدید ٹھنڈ ہو رہی تھی۔ نوکر نے بس اسے یہی بتایا تھا کہ کوئی قارن ڈیپارٹمنٹ آ یا ہے اور قادر ان کے ساتھ مصروف ہیں۔ کب فارغ ہوں گے وہ نہیں جانتا تھا۔

”آپ ان کو بتادیں کہ دلیم آیا ہے۔“ اس نے بڑی امید لہجے میں کہا۔

”وہ تو میں نے ان کو کب کا بتا دیا ہے۔“

”تو پھر؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

”آپ ایک دفعہ اور.....“

”ان کا کہنا ہے کہ انھیں بار بار ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“ نوکر نے کہا اور اندر چلا گیا۔ اسے سخت مایوسی ہو رہی تھی۔ قادر اسے نہ جانے کیوں اتنا نظر انداز کر رہے تھے۔ اس کا قصور اتنا بڑا تو نہیں تھا۔ اس کا دل کٹنے لگا اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ایسی بے اعتنائی اور بے رخی پر وہ مایوسی سے اٹھا اور گیٹ سے باہر نکل گیا۔ ہوا میں قدرے خشکی بڑھ گئی تھی اور اس نے ایک بلیو کمر کا پتلا سا سوئٹر پہن رکھا تھا۔ اس نے جھر جھری سی لی۔ اسے ایک دم شدید سردی محسوس ہونے لگی۔ سارا جسم کپکپاہٹ کا شکار ہو گیا۔ نہ جانے اندر کیسی تہذیبی آئی تھی کہ سارا وجود لرزنے لگا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پوجھل قدم اٹھاتا ہوا سڑک کے کنارے کنارے چلتے لگا۔ چاک ایک گاڑی چلتے چلتے رک گئی۔

”بیلوئیک مین!“ گاڑی سے نور کے بڑے بچے باہر نکلے۔

”بیلوئیک!“

”کیا آج سڑکیں تاپنے نکلے ہو؟“ انکل نے خوش انداز میں پوچھا۔

”نہیں..... بس یونہی ادھر آ یا تھا مگر طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“

”کیا ہوا؟“ انھوں نے اس کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا۔ ”اوہ! تمہیں تو بخار ہو رہا ہے۔ چلو میں تمہیں گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔ سنا ہے تم

نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ اب کہاں رہتے ہو؟“

”گلبرگ میں۔“

”ٹھیک ہے، مجھے راستہ بتاتے جاؤ۔ میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“

”نہیں انکل! میں گھسی کر لیتا ہوں۔“

”ارے بھئی، میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ جب اس کے بتائے ہوئے ایڈریس پر انھوں نے گاڑی روکی تو وہ گمرد کچھ کر چکے۔

”تم میرا مطلب ہے آج کل کس کے ہاں مہمان ہو؟“

”حیدر اگل کے۔“ وہ بے پردائی سے بولا۔

”کون حیدر؟“

”وہی جو فٹنر بھی ہیں۔“

”سید ضرار حیدر کے؟“ انور چچا اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے بولے۔

”ہاں شاید۔“

”وہ تمہارے کیا لگتے ہیں؟“

”مطلوبہ نہیں، مہما کے کوئی کزن ہیں۔“ وہ اکتاہٹ سے بولا۔

”مگر وہ تو سید ہیں۔“

”میں نہیں جانتا۔“ وہ بے زاری سے گاڑی سے اترتے ہوئے بولا اور اندر چلا گیا مگر چچا کافی دیر وہیں گاڑی میں بیٹھے۔ الٹی سیدھی

کڑیاں ملائے رہے۔ مہما اس کو دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔

”تم کہاں چلے گئے تھے؟“ انھوں نے فحاشت سے اس کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا جو بخار سے تپ رہی تھی۔

”گاڑی کی طرف گیا تھا مگر.....“

”مگر کیا؟“

”وہ مجھ سے ناراض ہیں اس لیے انھوں نے مجھ سے ملاقات نہیں کی۔“

”تم کیوں ان کی طرف بار بار جاتے ہو؟“

”میں بہت پریشان ہوں اور آپ نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ مہما! جو باتیں آپ کو اب پریشان کر رہی ہیں۔ میرے بچپن میں ہی آپ

نے اس کے بارے میں کیوں نہیں سوچا تھا اور اب مجھے دورا ہے پر کھڑا کر دیا ہے۔“ وہ قدرے غلگی سے بولا۔

”ہاں نہ جانے کیوں مجھ سے ہمیشہ غلطیاں ہی ہوتی رہی ہیں۔ میں مانتی ہوں کہ تم میری وجہ سے وقتی اذیت میں مبتلا ہو مگر میں کیا کروں۔

میں کبھی بھی دور اندیش نہیں رہی۔ وقتی مصلحتوں کے ہاتھوں خاموشی سے سرخیز رکرتی رہی اور غلطیاں اور گناہ مجھ سے سرزد ہوتے رہے۔ میں

انسانوں کے ہجوم میں کھڑی ایک بے حد کمزور مخلوق ہوں۔ جس طرف سے دغا آ یا اسی طرف بہہ گئی اور گناہ کرتی رہی۔“

”کیسے گناہ؟“ اس کا چہرہ بخار سے تپ رہا تھا اور دل انجانے خدشوں سے کہ مہما کہیں کچھ اور انکشاف نہ کریں۔

”تمہارا باپ پیئر کرچن تھا اور میں مسلم۔ وہ تمہارا وجود نہیں چاہتا تھا مگر تم میری زندگی تھے۔ جس نے تمہاری وجہ سے مجھے طلاق دی۔ میں

نے اسے ہی جنمیں نام دینے کو کہا۔ کسی بڑی غلطی تھی۔“ اس کے چہرے پر ابھری ہڈیوں پر آنسو تھینے لگے۔ ولیم نے چونک کر ہاں کی طرف دیکھا۔

”مہما آپ.....!“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”تمہارا نام صرف اسی کا دیا ہوا ہے اور کچھ بھی نہیں۔“

”تو آپ نے مجھے کیا دیا؟“ وہ قدرے ٹپکے لہجے میں بولا۔

”میں نے..... میں نے.....“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اسے ولیم کا سوال بڑا اٹو کھا لگا۔ وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

”تمہیں میں نے مرکز جنم دیا اور پھر جیسے پالا سب تمہارے سامنے ہے مگر میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ کوئی بھی ماں اولاد پر احسان

نہیں کرتی۔“

”کاش آپ مجھ پر یا احسان نہ کرتیں۔ آپ نے مجھے ادھوری زندگی دی ہے۔ انسانوں کے اس جنگل میں نہ تو میرا کوئی نام ہے، نہ وجود،

نہ کوئی شناخت اور نہ ہی کوئی پہچان، میں کیا ہوں؟ کون ہوں؟ میرا منی کیا تھا؟ میرا حال کیا ہے اور میرا مستقبل کیا ہوگا؟ آپ نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ نہ جانے اس کہانی میں بھی سچائی ہے کہ نہیں۔“ وہ تکی سے بولا۔

”ولیم! خدا کے لیے یوں نہ کہو۔ میں نے تمہیں کچھ نہیں دیا۔ میں جانتی ہوں مگر میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“ اس کی آنکھوں

میں ہلا کا کرب تھا اور لہجے میں بے حد بے بسی!

”مما! آپ نے بہت ظلم کیا ہے۔“

”اور مجھ پر جو کچھ ہوا؟“ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ ولیم وہیں صوفے پر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھوں

سے آنسو بہتے رہے۔ ولیم کی باتوں پر اس کا دل کٹنے لگا۔

وہ بھی تو اپنی شناخت و حور نے نگل تھی۔ شناسائی کے سفر پر اس نے بھی تو قدم رکھے تھے مگر اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ جو اس کے ساتھ ہوا

تھا وہی کچھ اس کی اولاد سہہ رہی تھی۔ ولیم کے اندر بھی ویسا ہی کرب تھا۔ ویسا ہی الاؤ تھا اور ویسا ہی آتش فشاں..... ادھورے اور بکھرے وجود کا۔

نوٹی پھوٹی شخصیت کا، بے حقیقت انسان کا۔ کہیں وہ بھی ایسی غلطیاں نہ کرتا جائے جو اس سے مرزدہوئی تھیں۔ آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔

کوشی میں صرف ایک نوکر تھا افضل جو کلنگ بھی کرتا تھا اور گھر کے دوسرے کام بھی کرتا تھا۔ شام سے اس کی طبیعت بھی خراب تھی اور گھر پر

کوئی بھی نہیں تھا کہ کوئی انہیں پانی کا گلاس ہی پوچھتا۔ ولیم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ تو گھر سے صرف ناشتا کر کے لٹا تھا اور مسلسل گھومنے

پھرنے کے بعد بخار میں تپتا ہوا لوٹا تھا۔ کوئی پرسان حال نہ تھا۔ موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ کوئی اٹھ کر ٹیبل سے اسے اٹھانے والا نہیں تھا۔ شہلا بڑی

مشکل سے اٹھ کر گئیں۔ دوسری طرف نور بول رہی تھی۔

”آئی! کیا بات ہے۔ فون کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ پچھتا رہے تھے کہ ولیم کو بہت بخار ہے۔ اب کہاں ہے؟“

”ہاں، سو رہا ہے۔ بیٹی تم تھوڑی دیر کے لیے آ کیوں نہیں جاتیں۔“

”کیوں، خیریت تو ہے؟“

”ہاں ٹھیک ہے، ولیم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ کک بھی بیمار ہے اور مجھ میں بھی ہست نہیں۔ اگر تم برا نہ متاؤ تو آ جاؤ۔“

”ٹھیک ہے آئی، میں آ جاتی ہوں۔“ اس نے فون رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آ گئی۔ ولیم کا بخارا اور جیز ہو گیا تھا۔ اس نے آ کر اسے دودھ گرم کر کے دیا اور دوائی کھلائی۔ ماما کے لیے جوس پٹایا۔ ولیم کو اٹھا کر اس کے کمرے میں لٹایا اور ماما کے پاس آ گئی۔

”نورا! ولیم بہت پریشان ہے۔“

”کیوں آئی؟“

”تم بھی حقیقت جانتی ہو مگر وہ حقیقت ماننے کو تیار نہیں۔ کوشش کرو کہ اسے واپس لاؤ حقیقت کی طرف، سچائی کی طرف۔ میں اپنی زندگی میں اسے مسلمان دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”آئی! وہ بہت ڈسٹرب ہو چکا ہے اور کسی بھی موضوع اور خاص طور پر اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتا۔“

”ہاں میں جانتی ہوں مگر پلیز کوشش تو کرو تا کہ میں آرام سے مر تو سکوں۔“

”آئی! آپ ٹھیک ہو جائیں گی اور ولیم بھی۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”جا کر دیکھو اس کا بخارا کم ہوا ہے کہ نہیں ورنہ کچھ پیاس بھی رکھ دو۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ اٹھ کر اس کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ اس نے اپنا سر دہاتھا اس کے گرم ماتھے پر رکھا۔ اس نے پھر بھی آنکھیں نہ کھولیں۔ اس نے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنی شروع کیں۔ کافی دیر وہ پیاس رکھتی رہی۔ بخارا کی حدت کچھ کم ہوئی تو اسے بھی نیند آنے لگی۔ وہ ماما کے کمرے میں آ کر صوفے پر لیٹ گئی۔ تھکاوٹ سے اسے سخت نیند آ رہی تھی۔

صبح جب بیدار ہوئی تو ولیم نہ جانے کب سے اٹھ کر لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر چوٹا۔

”نورا! تم کب آئی؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تم سناؤ کیسے ہو؟“

”ہاں اب کافی بہتر ہوں مگر تم کب آئی؟“

”یہ بھی خوب رہی، ہماری رات تمہاری خدمت کرتی رہی۔ ٹھنڈی پیاس رکھتی رہی اور جناب کیسے انجان بن رہے ہیں۔“

”ریٹلی؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تو اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ میں نے فون کیا تو آئی نے آنے کو کہا، میں آ گئی۔ کک بھی بنا رہے۔ ہاں اب جلدی سے بناؤ ناشتا

کیا کرو گے۔“ وہ جلدی جلدی بولی اور وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”نورا! وہ اس کے قریب آ گیا۔

”ہوں!“

”جھینک یو!“ اس کی آنکھوں میں تشکر سے پانی بھرا یا۔

”کوئی اپنے آپ کو بھی قہیجک بوہوتا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔
 ”اب بخار تو نہیں۔“ اس نے اس کی کلائی پر اپنا ٹھٹھا نازک ہاتھ رکھا۔ ”اب کوئی خاص تو نہیں۔“ وہ خود ہی بولی اور ولیم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

”نور! میں ٹوٹ گیا ہوں۔ اکیلا رہ گیا ہوں اس دنیا میں۔“ وہ اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے جکڑ کر شدید دکھ سے بولا۔
 ”ولیم! میں نے تم سے ہزار دفعہ کہا ہے مجھ سے دور رہنا اور منتنا رہے ہوئے لوگ قطعی پسند نہیں۔“ وہ قدرے غصے سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔
 ”مگر اس وقت میں بہت ٹوٹ چکا ہوں۔“ وہ بے بسی سے بولا۔
 ”تو ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔ پہلے بتاؤ ناشتا کیا کرو گے۔ پھر میں تم سے بات کرتی ہوں۔“
 ”کچھ نہیں۔“

”کچھ کیوں نہیں۔ میرا خیال ہے پورج بناتی ہوں۔“
 ”نہیں، میں نے نہیں کھانا۔“ وہ بچوں کی طرح منہ بنا کر بولا۔
 ”اچھا تو پھر کارن فلیکس تو کھا لو گے؟“
 ”ہاں۔“

”تم بیٹھو میں ابھی لاتی ہوں۔“ وہ منہ دھو کر کچن میں چلی گئی۔ آنٹی کے لیے بھی ناشتا بنایا، اپنے لیے اور اس کے لیے بھی۔ دونوں ڈائیننگ
 ٹیبل پر بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔
 www.pdfbooksfree.pl

”ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟“ وہ ٹیبلن سے منہ صاف کرتے ہوئے بولی۔
 ”نور! میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ایسا کبھی کسی کے ساتھ ہوا ہے؟“ وہ روہانے لہجے میں بولا۔
 ”پھر بھی کچھ تو بتاؤ۔“ وہ انجان بننے ہوئے بولی۔
 ”تم سب کچھ جانتی ہو اور انجان بن رہی ہو۔“ وہ جھجھلا کر بولا۔
 ”تم خواہ مخواہ الجھ رہے ہو۔“
 ”کیا تمہارے نزدیک کوئی بات بھی اہم نہیں؟“
 ”مثلاً کیا اہم ہونی چاہیے؟“
 ”شاید تم بات سننے کے موڑ میں نہیں۔“
 ”نہیں، تمہیں کس نے کہا؟“
 ”پلیز؟“ وہ پھر جھجھلا کر بولا۔

”اچھا، بھئی کھل کر بات کر دو تو میں کچھ سمجھوں؟“

”میرا ماضی، میرے حال کو سمجھو رہا ہے۔ میں ایسے دوراں پر کھڑا ہوں جہاں میرا وجود، میری شناخت سب کچھ ادمورا ہے۔ میں تو شاید.....؟ اور ماما اب مجھے سب کچھ چھوڑنے کو کہہ رہی ہیں۔ یہ سب کس طرح ممکن ہے۔ میں تو بہت کنفیوز ہو رہا ہوں۔“

”اس میں کنفیوزن کی کیا بات ہے۔ سٹیٹ سے وحدانیت کی طرف کیوں نہیں آ جاتے؟“ وہ آہستہ سے بولی۔

”کیا مطلب؟“ وہ چرلگا۔

”جو خدا تھا ہے اس کے ساتھ کیوں بہت سوں کو شریک کرتے ہو۔“ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ تم دن رات لگا کر ایک شاہکار پینٹنگ بناتے ہو۔ کیا تم یہ بات سننا پسند کرو گے کہ میں نے یا تمہاری ماما نے اس میں برابر کا کام کیا۔ کیا تم ان کو کچھ کریڈٹ دو گے جبکہ انھوں نے یا میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

”کبھی نہیں۔“ وہ قدرے سختی سے بولا۔

”تو پھر پوری دنیا کو تخلیق کرنے والا کس طرح پسند کرے گا کہ اس کی خدائی میں کسی کو شریک کیا جائے اور ان کو جس اس نے خود بنایا ہو یا جسے انسان نے بنایا ہو۔ انسان کے اندر عقل ہے اور عقل میں ایک پیمانہ ہے جسے منطق کہتے ہیں اور جو سچائی اور حقیقت پر خود بخود کلک کرتا ہے۔ اسلام تو محض وحدانیت، محمد ﷺ، عہدیت اور انسانیت پر قائم ہے۔ ہم خدا کی وحدانیت کو مانتے ہیں کہ ہماری عقل میں موجود سچائی کا پیمانہ اس پر کلک کرتا ہے اور محمد ﷺ کی عہدیت پر یقین رکھتے ہیں کیونکہ منطق اس کو بھی مانتی ہے۔ ہمارا راستہ تو ٹھوک و شبہات سے پاک سیدھا راستہ ہے جس میں کہیں کوئی جھول نہیں۔ ہمیں اپنے باپ دھونے کے لیے نہ تو گنگا میں اشان کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی قادر کے سامنے کھٹیشن کی۔ ہم تو سیدھے اس کے پاس جاتے ہیں۔ تنہا بغیر کسی سفارش یا وسیلے کے اور سرکشوں میں اپنے دل کا حال اسے سناتے ہیں۔ وہ جو ہمارے دلوں کے اندر رہتا ہے۔ جو شریک سے قریب ہے جو انسان اور بندے کے تعلق کو سمجھتا ہے اور اس تعلق کی نزاکتوں کو بھی، بندے کی مجبوریوں، لاچار یوں کو بھی اور اس کی سرکشیوں کو بھی۔ ہمارے دین میں جبر نہیں۔ سب کے لیے راستے کھلے ہیں۔“ نور کی اس بات پر اس نے چمک کر دیکھا۔ حیدر انکل کے الفاظ اسے یاد آنے لگے۔

”اس کا کیا مطلب ہے کہ ہمارے دین میں جبر نہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”بھئی خدا نے انسان کو عقل دی، تو تمہیں دیں۔ اسے جانچنے کے پیمانے دیے اور پھر راستے بتا دیے اور اس سے کہہ دیا جو چاہے منتخب کرو۔ ہادی بھی آ گیا اور ہدایت بھی۔ اب جو دونوں کو قبول کرے تو فلاح میں ہے، نہ قبول کرے تو نقصان میں ہے۔ یہ تو دلوں کے معاملے ہیں۔ جس پر دل لبیک کہے وہی حقیقت ہے۔ اسلام زبردستی کا قائل نہیں۔ دراصل تم حقیقت سے نا آشنا ہو۔ تمہیں نہ اسلام کا علم ہے نہ خدا سے شناسائی کا۔“

”کیا تمہیں یہ سب ہے؟“ ولیم نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں شکر ہے۔ تم تو بہت مکرر یاد نہیں۔“

”تمہیں یہ سب کچھ کس نے بتایا ہے؟“

”کسی نے نہیں، میں نے سب کچھ خود پڑھا ہے۔ اس پر سوچا ہے اور پھر میرے دل و دماغ نے اس پر لبیک کہا ہے اور پھر میں نے سب کچھ مان لیا۔ جب میں نے دل سے مان لیا تو وہ میرا ایمان بن گیا۔ ولیم! تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟“ اس نے ایک دم بات کا رخ موڑا۔

”کیوں؟“

”یونہی پوچھ رہی ہوں۔“

”کیا یہ بات پوچھنے کی ضرورت ہے۔ کیا تم نہیں جانتیں؟“

”نہیں۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”کیا تم واقعی نہیں جانتیں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔“

”نہیں، مجھے کیا معلوم؟“

”نور، غصہ!“

”کیا تم نے مجھے کبھی بتایا؟“

”تو کیا تم واقعی نہیں جانتیں؟“ اس کی حیرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

”جو تم نے کبھی مجھ سے کہا ہی نہیں اسے میں کیسے جان سکتی ہوں۔“

”کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میرے لیے زندگی میں صرف دو لوگ اہم ہیں ماما اور تم۔“

”ہاں لیکن اس میں محبت کی مقدار اور پیکش کو تو نہیں بتایا۔“ وہ مسکراتی ہوئی بے پروائی سے اسے چڑانے کے انداز میں بولی۔

”محبت کو چاہنے کا دنیا میں کوئی پیمانہ نہیں۔ جب کوئی پیمانہ ہی نہیں تو میں کیسے بتاؤں؟“

”تو اس دنیا کے خالق کو حلیٹ کے پیمانے میں ناپتے ہو۔ بڑی حیرت ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ ایک دم بھونچکا رہ گیا۔

”تم محبت کو جانچ نہیں سکتے تو خدائی کو کیسے جانچ سکتے ہو ولیم! سیدھا راستہ تمہارا اختراع ہے۔ بس تمہیں قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ہم

تمہیں فورس نہیں کریں گے۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہوگا۔ تمہارا اندر تمہیں بتائے گا کیسے کیا ہے۔ جو سچ ہے بس اس کو مان لو اور جس کو مان لو اس پر ایمان لے

آؤ۔ بس اس کے بعد اس موضوع پر میں کچھ نہیں کہوں گی۔ ہاں بس دعا کروں گی۔“

”کیسی دعا؟“

”یہ خدا اور میرے درمیان راز ہے۔ جب تم کسی راز کو پالو گے تو پھر تمہیں بھی بتا دوں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”میرا خیال ہے اب تم لہیک ہو، میں گھر جاؤں۔“ وہ ڈانٹنگ نچل سے سب برتن سینٹے ہوئے بولی۔

”ہاں تمہاری مرضی ہے۔“

”اچھا میں تمہارے لیے اور آنٹی کے لیے کچھ بنا کر کچن میں رکھ جاتی ہوں۔ چچا بھی گھر میں بکھرے ہوئے گئے۔“ وہ بول رہی تھی اور ولیم کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔

نور جا بھگی تھی اور وہ وہیں بیٹھا تھا گہری سوچوں میں گم، دورا ہے پر قدم بڑھائے تو کیسے اور کس طرح، بنا سوچے، سمجھے، جانچے اور آزمائے۔ اتنا بڑا فیصلہ جو ساری زندگی کو تبدیل کر دے محض چند لمحوں میں تو نہیں کیا جاسکتا۔ وہ جس نچ پر چل نکلا تھا جس کی تعلیمات پر اس نے غور و فکر کیا تھا۔ جس مشن پر وہ جانے کی تیاریاں کر رہا تھا سب کچھ کیسے بدل دے۔ اومائی گاڈا وہ بار بار اپنے سر کے بالوں کو کھینچ رہا تھا۔ کنٹیوں کو دوبارہ ہاتھ۔ بخار کی حدت پھر سے اسے محسوس ہونے لگی تھی۔ اندر ہی اندر کوئی چیز پھر دوبارہ ڈال رہی تھی۔ آتش نشاں شاید لاوا اکٹھا کر رہا تھا۔ اس کی سفید رنگت سیب کی طرح سرخ ہو رہی تھی۔ نہ کوئی راہ فرار ہے اور نہ ہی جائے پناہ..... کہاں جاؤں؟



”آفاق اتم مجھے اپنے گھر کیوں نہیں لے کر جاتے۔ ہم کب تک اس فلیٹ میں رہیں گے۔“ مدرخ کراچی میں اپنی خالہ کے گھر تین ماہ سے رہ رہی تھی۔ آفاق سے شادی کرنے کے بعد وہ سوئٹزر لینڈ، ہانگ کانگ، گھومنے کے بعد اب تین ماہ سے خالہ کے گھر مقیم تھی۔ خالہ خود تو ڈیفنس میں رہتی تھیں اس لیے ان کا کینٹ میں فلیٹ خالی تھا۔ آفاق سے وہ بار بار لاہور جانے کو کہتی مگر وہ سنی اُن سنی کر دیتا۔ مدرخ اس سے عمر میں چھ سال بڑی تھی۔ وہ تو ملک منصور کو پھنسانے نکلے تھی مگر آفاق فکے میں آ گیا۔ آفاق ابھی اتنا گھٹیا نہیں ہوا تھا۔ زمانے کی اونچی نیچی اور بدلتے رنگوں کا اسے شعور نہیں تھا۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی کہ اس نے سحر سے شادی کر لی۔ وہ سحر کے ساتھ جس طرح کی زندگی گزارتا آ رہا تھا، مدرخ کے ساتھ اسے بہت محتاط ہونا پڑتا تھا۔ وہ اپنا خاصہ برتنوں اور چیزوں پر نکالتا۔ مدرخ کو اسے سنبھالنا آتا تھا۔ وہ جب انتہائی فحشے میں ہوتا تو وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل جاتی اور اس وقت تک نہ لوٹی جب تک وہ ٹارل نہ ہو جاتا۔

”آفاق! تم میری بات کا جواب نہیں دے رہے؟“ مدرخ نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش تھا۔ سحر کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

”تم بے شک مدرخ سے شادی کر لو۔ جو کچھ مرضی کر دو مگر اسے گھر مت لانا۔“ وہ جانتا تھا کہ سحر کے ساتھ اس نے بڑی زیادتیاں کی تھیں۔ ہر رات کو اس کے لیے قیامت بٹایا تھا اور اس کے وجود سے اس کی زرخیزی تک چھین لی تھی۔ اس نمر زمین میں وہ مزید قہور کے پیر نہیں آگاتا چاہتا تھا۔

”آفاق اتم بولتے کیوں نہیں۔ میں تمہارے گھر جانا چاہتی ہوں جو تمہارا ہے اور میرا ہے۔“ مدرخ محبت سے بولی۔

”نہیں مدرخ! نہ میرا کوئی گھر ہے اور نہ تمہارا۔ وہ ملک منصور کا گھر ہے اور ہم وہاں نہیں رہ سکتے۔“

”لیکن سحر بھی تو وہیں رہتی ہے۔“ مدرخ نے گہری نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں وہ وہاں شفق کی وجہ سے ہے۔“ آفاق نے بات بنانے کی کوشش کی۔

”اچھا اگر شفق اس کو، اس فقیرنی کو قبول کر سکتی ہے تو کیا مجھے قبول نہیں کرے گی؟“ مدرخ قدرے غوت سے بولی۔

”نہیں، میں نے کہہ دیا تاہم وہاں نہیں جاسکتے۔“

”مگر میں وہاں جاؤں گی؟“

”میں نے کہا ہرگز نہیں۔“

”اور میں دیکھوں گی مجھے کون روکے گا۔“ وہ غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آفاق ایک دم طیش میں آ گیا اور اسی طرح اس پرکوں اور گھونسوں کی برسات شروع کی جیسے وہ سحر پر کرتا تھا۔ مدرخ نے ایک دم زانے دار تھپڑا سے مارا۔ آفاق کا تو سر گھوم گیا۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ مدرخ یوں ری ایکٹ کرے گی۔

”تم ہوش میں ہو، مجھے تو تم بالکل ایسا مل لگ رہے ہو۔“ مدرخ نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا اور آفاق جیسے کسی رو بوٹ کی طرح اپنے اعضا اٹھیلے چھوڑ کر بیلے پر بیٹھ گیا۔ مدرخ اس کے کندھے دبائے لگی۔

”کیا تم جانتے ہو تمہیں دورہ پڑتا ہے؟“ آفاق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ نیا انکشاف اس کے لیے قدرے حیران کن تھا۔ وہ اسے جھٹلاتا چاہتا تھا مگر کچھ نہ بول سکا۔

”اپنے آپ کو نارمل رکھو ورنہ پاگل کہلاؤ گے۔ میں تمہیں ٹھیک کروں گی۔ تم بہت اچھے ہو، کبھی تم اچھے ہو، کبھی تم اچھے ہو، کبھی تم اچھے ہو۔“ وہ آہستہ آہستہ سرگوشیوں کے انداز میں اس کے کان کے پاس یوں بول رہی تھی جیسے سے پہچانا نہ کر رہی ہو۔ وہ اس کی باتوں کو سن بھی رہا تھا۔ سمجھ بھی رہا تھا اور ان پر عمل کرنے کا حلیہ بھی کر رہا تھا جیسے اس کی بغل مدرخ کے ہاتھ میں تھی۔ مدرخ اس کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کی کلائیوں، بازوؤں اور پنوں کو اپنی مخروطی انگلیوں کی پوروں سے دباتے ہوئے اس کی گردن کے پیچھے مسلز کو پوروں سے دبائے لگی اور وہ جیسے مدہوش ہو رہا تھا۔ اس کو سکون مل رہا تھا جس طرح آ کو بچکر میں نیڈ لڑکو مخصوص جگہوں پر رکھا جاتا ہے اسی طرح وہ اپنی پوروں سے مخصوص جگہوں کو دبا رہی تھی۔ یہ فن اس نے یوگا کلب میں ایک پارسی لڑکی سے سیکھا تھا۔ اس نے مدرخ کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا جیسے زندگی میں پہلی دفعہ کسی نے اسے سمجھا ہو۔ کوئی تو ہے پوری دنیا میں۔ سحر کہیں دور چلی گئی تھی۔ اب صرف مدرخ تھی صرف وہ رخ اور اس سے بڑھ کر دنیا میں اب اسے کوئی عزیز نہ تھا۔

”ہاں، میں تمہیں لے چلوں گا۔ بہت جلد ہم لاہور چلے جائیں گے۔ میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم ہی میری زندگی ہو۔“ وہ اس کے ساتھ یوں لپٹ رہا تھا جیسے بچہ ماں کے ساتھ ضد منوانے کے لیے لپٹتا ہے اور مدرخ اپنی کامیابی پر مسکرا رہی تھی۔



ملک منصور نے موبائل پر خبر دیکھا اور مسکرا دیا۔ آنکھت کا نمبر دیکھ کر اس نے گہری سانس لی۔ وہ عورتوں کی نفسیات اور ان کی مجبور یوں سے فائدہ اٹھانے کا ماہر فنکار تھا۔ فون ہار بار بج رہا تھا۔ ہلا خراس نے فون اٹھایا۔

”ہیلاؤ ٹیکٹ کیا ہات ہے؟“ وہ بڑی ادا سے بولا۔ وہ رو رہی تھی۔ سسکیاں بھر رہی تھی اور کچھ بھی نہیں بول رہی تھی۔

”ڈیز کیا مسئلہ ہے، میں ہوں نا!“ اس نے لاڈ سے کہا۔

”منصور! مائی مم از لومور..... شی ازا یکہا ٹرڈ۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”اوہو! وہ ایک دم چٹکا۔

”نیں!“

”لیکن کب اور کیسے ہوا؟“

”آج صبح، میں کب سے فون کر رہی ہوں مگر آپ فون ہی اٹینڈ نہیں کر رہے تھے۔“

”ہاں میں بڑی تھا لیکن میں ابھی بچھی رہا ہوں۔“ اس نے اپنی پھیر کی رفتار مزید بڑھا دی۔ وہ جلد سے جلد پی سی پیچا۔ آنکھ کا رو رو کر برا

حال تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔ اس دیا ر غیر میں صرف ایک ہی ہمدرد انسان اسے نظر آیا تھا۔ جس پر وہ اندھا ہوا کر سکتی تھی۔

”آئی ایم ایکسٹریملی سوری! اب تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں ابھی واپس جانا چاہتی ہوں۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”اچھا میں ابھی شیٹس کنفرم کرواتا ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ آنکھ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں

میں اُن گنت سوال تھے۔

”تمہاری حالت ایسی نہیں کہ تم اکیلی جاؤ اس لیے میں خود تمہارے ساتھ جاؤں گا کیونکہ تم مجھے بہت عزیز ہو، آئی میڈیو!“ ملک منصور کی

آنکھوں سے محبت جھلک رہی تھی اور لہجے سے محاس۔ وہ ہمیشہ سے ایسے لمحوں کا شہسوار رہتا تھا جب عورت خود کو تنہا اور بے بس محسوس کرتی ہو۔ جب

اسے مضبوط سہارے کی ضرورت ہو۔ جب اسے تحفظ چاہیے ہو جب وہ اپنے آپ کو اندر سے ٹوٹتا پھوٹتا محسوس کر رہی ہو اور جب کسی ایک پراعتاد

کرنے کو طبیعت چل رہی ہو۔ آنکھ اس کے ساتھ لگ کر اونچی آواز میں رونے لگی اور وہ اس کے خوبصورت شولڈر کٹ بالوں میں محبت سے

الگیاں پھیرنے لگا۔ آنکھ آدھی سے زیادہ دنیا گھوم چکی تھی اور بہت بولڈ بھی جاتی تھی۔ وہ اپنے پروفیشن میں بہت ماہر تھی۔ بڑی بڑی شخصیات

سے چمکے چمکے سوالات کر کے ان کو زچ کرنے کی عادی تھی۔ اس کی بولڈنس کو لوگ بہت انجوائے کرتے تھے اور اب وہ بے بسی کی تصویر بنی ملک

منصور کے ہاتھوں میں ایک کھلونا سی بنی تھی۔ ملک منصور کے لیے یہ نیا تجربہ نہیں تھا۔ وہ ایسے مواقع سے قائد اٹھانا خوب جانتا تھا۔ اس نے تہران

کے لیے دو ایرجنسی شیٹس لیں اور فوراً تہران کے لیے روانہ ہو گئے۔ آنکھ سارا راستہ روتی رہی اور ملک منصور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے

اور اسے ساتھ لگائے تسلیاں دیتا رہا۔

آنکھ کا بھائی اسمعی شیرازی انھیں ایئر پورٹ پر لینے آیا تھا۔ آنکھ اس کے گلے لگ کر روتی رہی۔ آنکھ کی ماما کی میت بس دفنانے

کے مراحل میں تھی۔ وہ لوگ سیدھے قبرستان پہنچے۔ آنکھ ماما کی میت کے ساتھ لپٹ کر روتی رہی۔ اس کی ایک بڑی بہن ہادیہ ناصر اور بھائی اسے

تسلیاں دیتے رہے۔ جنازے کے بعد وہ ان کے گھر آیا تو ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ آنکھ کے سر میں شدید درد تھا۔ وہ سلیپنگ پلائے کر سگئی۔

آنیکٹ کے بہن بھائی اور چند عزیز ملک منصور پر فدا ہو رہے تھے۔ اس کی اتنی محبت اور ہمدردیوں کا بار بار شکریہ ادا کر رہے تھے اور ملک منصور کا سر فخر سے بلند ہو رہا تھا۔ اس نے اسی وقت پاکستانی سفارت خانے میں فون ملایا اور وہاں پاکستان کے سفیر سے بات کی اور ذاتی طور پر ایک تعویجی محفل منعقد کرنے کو کہا کیونکہ سفیر اس کا گہرا دوست تھا۔ وہ لوگ اس کے اس قدم کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کی توقعات سے بڑھ کر ان کے لیے سب کچھ کر رہا تھا۔

وہ دو دن وہاں رہا اور یہ دو دن ان سب کے لیے بہت سرور کن تھے۔ گوکہ آنیکٹ بہت اداس تھی۔ اس نے بیس سال کی عمر میں اپنے کیرئیر کا آغاز کیا تھا کیونکہ اس کے باپ کی اچانک موت ہو گئی تھی اور ماما کو بلڈ کینسر کا مرض لاحق ہو گیا۔ وہ دن رات محنت کرتی۔ در در خاک چھاتی رہی ماما کے علاج کے لیے۔ کبھی کبھی بہت ایڈولجس اور ریکی کام بھی کرنے پڑے کیونکہ ان میں پیسے زیادہ ملنے کے امکانات ہوتے۔ وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر سب کام کرتی کیونکہ ماما کے علاج کے لیے اسے بہت پیسوں کی ضرورت تھی۔ بھائی ابھی چھوٹا تھا اور پڑھ رہا تھا لیکن اتنی جگہ دو بھی ماما کو نہ بچا سکی۔ اس کی ماما کے ساتھ بہت اچھٹ تھی مگر اسے زیادہ عرصہ گھر سے دور رہنا پڑا اور اس کی جدائی سہنا پڑی لیکن اسے خوشی کا احساس تھا کہ وہ گھر سے دور رہ کر بھی ماما کی خدمت کر رہی تھی لیکن اب تو جیسے سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی کا مقصد اس کی دن رات کی محنت کا سبب، اب وہ کس کے لیے سب کچھ کرے گی۔ سب کچھ بے معنی لگ رہا تھا۔ ملک منصور اسے بہت تسلیاں دیتا ہوا وہاں آ گیا تھا۔ وہ اسے چھوڑنے لیتا پورٹ گئی تھی۔

”آنیکٹ! اب رونا نہیں۔ کسی سے تمہارے پیارے سو برداشت نہیں ہوتے اور سنو! پاکستان جلد واپس آ جاتا۔ کوئی وہاں تمہارا بہت شدت سے منتظر ہوگا۔“ اس نے محبت سے کہا۔ آنیکٹ نے قدرے حیران کن لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ملک منصور تمہیں تم سے بڑھ کر چاہتا ہے۔ تم اس کی زندگی بن چکی ہو اور تمہاری چاہت کے لیے وہ سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔“ وہ سرگوشی کے انداز میں اس کے کندھے پر بازو رکھتے ہوئے بولا۔

آنیکٹ اس کے لفظوں اور لہجے کے بحر میں گم ہو رہی تھی۔ اس کا اپنا وجود محض رہا تھا اور وہ ملک منصور کی ذات میں غم ہو رہی تھی۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ بس اس کی طرف دیکھتی رہی۔ شاید وہ بھی اندر سے ایسا ہی چاہتی تھی۔ پاکستان میں ایک ماہ کے قیام کے دوران ملک منصور نے اس کی جس طرح پزیرائی کی تھی اور جتنی ہمت بڑھائی تھی اس کے لیے تو اپنی ہستی مٹا دینا بھی کچھ معنی نہ رکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی چمک پیدا ہوئی مگر شاید وہ جگہ اور وقت نامناسب تھے یا پھر یہ انکشاف اتنا اچانک اور حسین تھا کہ وہ اسٹنڈ ہو کر رہ گئی تھی۔

”تو کیا میں انتظار کروں؟“ ملک منصور نے خدا حافظ کہنے سے پہلے پوچھا۔ وہ گہری سوچوں میں گم تھی۔ فیصلہ کرنے یا نہ کرنے کی پھوٹن میں۔

”بولو آنیکٹ!“ آنیکٹ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ خوش ہو گیا۔

”تھینک یو!“ وہ خوشی سے بولا۔ وہ خوش خوش لوٹ رہا تھا۔ کامیاب و کامران اپنے ہر مشن میں ہمیشہ کی طرف کامیاب..... کچھ لوگوں کی قسمت میں قدرت کا میاں و کامرانیاں ہی لکھ دی جاتی ہیں۔ جس چیز میں ہاتھ ڈالتے ہیں وہ آپ ہی آپ سونا بن جاتی ہے ملک منصور نے مسکرا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے اپنا آپ آسمان پر اڑتا ہوا محسوس ہوا۔

شزا اپنے آپ کو ہر وقت شہل کے ساتھ مصروف رکھتی۔ اس کا بہت خیال رکھتی۔ دوائیں وقت پر دیتی۔ باہر گھمانے پھرانے کے لیے لے جاتی مگر وہ ہر وقت خاموش رو بوٹ کی طرح گم صم بٹھی رہتی۔ شزا کچھ پوچھتی تو الٹا پلٹا جواب دیتی۔ ایک بات کے جواب میں دس بے ربط جملے سناتی۔ کبھی عجیب و غریب آوازیں نکالتی تو کبھی عجیب و غریب الفاظ اور محاورے استعمال کرتی اور ان کو نان اسٹاپ ڈہراتی رہتی۔ انگلیوں کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ وہ اپنے آپ سے بالکل لاتعلقی ہوتی جا رہی تھی۔ شزا خود اسے کپڑے پہناتی۔ اس کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھتی۔ کافی دنوں کی کینر اور دواؤں کے بعد دوا سے ایک دن کچھ بھر محسوس ہوئی۔ جب اس نے خود نگہبانی کی اور ناشتے کی ٹبل پر مناسب انداز میں ناشتا کیا اور نہ روزانہ کبھی وہ فرائیڈ اٹھے کو چائے میں ڈال دیتی تو جیم کو پلیٹ میں اٹھے کی طرح پھیلا کر اوپر تک چھڑکتی اور کانٹے سے کھانا شروع کر دیتی۔ شزا کو ناشتا بھی اسے خود ہی کروانا پڑتا تھا۔ آج وہ اسے دیکھ کر قدرے مطمئن ہوتی تھی۔ اس نے خود ہی سلائس پر جیم لگایا اور آرام سے کھا رہی تھی کہ ملک منصور اچانک آ گیا۔ وہ چار پانچ دن بعد گھر لوٹا تھا۔ شزا اسے یوں اچانک دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ ان دنوں اس نے نہ گھر فون کیا تھا نہ کسی اور طرح کو ٹیکٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ شزا کو اس پر سخت طعنے تھا۔ بیٹی اتنی بیمار اور اس شخص نے ایک دفعہ بھی اس کو فون کر کے نہیں پوچھا تھا۔

”ہائے ڈارلنگ! کیسی ہو؟“ اس نے شزا کو مخاطب کیا۔ دونوں خاموشی سے ناشتا کرتی رہیں۔ شزا نے کوئی جواب نہ دیا۔

”شہل! کیسی ہو بیٹا؟“

”ٹھیک ہوں، آپ نے ٹرین کی آواز سنی ہے۔ وسل بج رہی ہے۔“ اس نے ایک دم اٹھ کر ٹرین کی طرح چمک چمک کر ناشتا شروع کر دیا۔

شزا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ وہ چند لمحے پہلے اسے بالکل ٹھیک سمجھ رہی تھی۔ اب بالکل ایئرلنگ رہی تھی۔

”اٹس ویری سیڈ!“ ملک منصور بولا۔

”آپ کو اس سے کیا۔ یا آپ کی اولاد تھوڑی ہے۔“ شزا اٹھنے سے بولی۔

”اچھا یا انکشاف اب کر رہی ہو۔“ وہ ہر سکون لہجے میں بولا۔

”منصور! کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ آپ اس طرح بی ہو کر رہے ہیں جیسے وہ آپ کی سوتیلی اولاد ہو۔“

”اوہ آئی سی! اس طرح کہونا۔ شزا! کیوں ناراض ہو رہی ہو۔ میں مصروف ہی اتنا ہوں کہ میرے پاس وقت نہیں ہوتا۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ اچانک مجھے ایران جانا پڑا۔ وہ پاکستان کے سفیر احمد علی شیروانی کی قریبی رشتے دار کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ مراسم اتنے اچھے تھے کہ اچانک جانا پڑا۔ گھر فون کیا مگر تم مصروف تھیں۔ ظاہر ہے پھر دو دن رہنا پڑا۔ تعویذی اجلاس ہوا۔ دعائے مغفرت کرانے کے بعد رات کو تو لوٹا ہوں اور اب گھر آ رہا ہوں۔ تم نے اخبارات میں پڑھا تو ہوگا۔“ ملک منصور نے بات تو زبردستی کر بتائی۔

”نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”تم کفر کر سکتی ہو اگر مجھ پر یقین نہیں۔ یہی ایسی مصروفیات سے اب انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اتنی ساکھ بنا کر آپ پیچھے تو نہیں ہٹ سکتے۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

”اور آنیکت بھی آپ کے ساتھ تھی؟“ شزا نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

”کون آنیکت؟“

”وہی جس کے اعزاز میں پارٹی دی گئی تھی۔“

”یہ کیا خرافات بکری ہو۔“

”مسز بیر نے فون کر کے مجھے نئے ٹک پر مبارکباد دی تھی۔“

”اوہ..... شزا ازاے.....!“ وہ بڑبڑایا۔

”خدا کے لیے منصور! کچھ تو شرم کریں۔ کس دلدل میں پھنستے جا رہے ہیں۔ چھوڑ دیں عورتوں کو ٹریپ کرنا۔ یہ دیکھیں سامنے دیکھیں، خدا

کیا کیا آپ کو دکھا رہا ہے۔“ اس نے چمک چمک کی آوازیں نکالتی ٹائل کی طرف اشارہ کیا۔ ”آپ کی ساری اولاد ایسی ہے..... کب تک ایسی اولادیں پیدا کرتے رہیں گے اور کتنی عورتوں کو اندر ہی اندر تباہ و برباد کریں گے۔“ وہ روہانسی ہو کر بولی۔

”شزا! فضول ہو اس کی ضرورت نہیں۔ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ میں نے جو لبرٹی تمہیں دی ہے اس کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ، اپنی

حیثیت بچاؤ۔ تم کیا تمہیں اور کیا ہو؟“ وہ الفاظ چبا چبا کر بولا۔

”میں اپنی حیثیت اچھی طرح بچاؤتی ہوں اور اب اس وقت کو کوئی ہوں جب تم سے ملی تھی۔ تم نے میرا اندر چھلنی کر دیا ہے۔ تم نے تو میری

دوزخ کا سامان کر دیا ہے کاش.....“ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”کیا مصیبت ہے، گھر آتے ہی جی جی جی۔“ اس نے ہاتھ مار کر سارے برتن ٹیبل سے نیچے پھینک دیے۔ برتنوں کے ٹوٹنے کی آواز سن کر

شمال خوفزدہ ہو گئی اور چٹخیں مارتی ہوئی اندر کمرے کی طرف بھاگی اور دروازے کو لاک لگا لیا۔ شزا دروازے سے دروازہ پٹنے لگی۔ ملک منصور دونوں کو

چھوڑ کر بیڈروم میں جا چکا تھا۔ شزا درہی تھی، چیخ رہی تھی۔ اس کی آوازیں سن کر سحر کمرے سے باہر نکلی تو شزا اسے دیکھ کر چمک گئی۔ اس کے بال

اڑے ہوئے تھے۔ بے حد کمزور اور کالی رنگت۔ نشہ کر کے اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے گہرے ہو گئے تھے۔ اس کا تو کافی دنوں سے اس سے

سامنا نہیں ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ جیسے سکتے میں آ گئی۔

”ت..... تم..... تمہیں کیا ہوا ہے؟“ شزا شمال کو بھول کر اس کی طرف لگ گئی۔

”کچھ نہیں، آپ کیوں شور مچا رہی ہیں۔ کیا کوئی مر گیا ہے؟“ وہ تھابت سے بولی۔

”شمال نے دروازے کو لاک کر دیا ہے۔“

”تو پھر کیا ہو گیا ہے۔ مجھے تو سونے دیں۔ اتنا شور، میں تو ڈر رہی گئی۔“ وہ گرتی پڑتی پھر اپنے کمرے میں لوٹ گئی شزا شدید سکتے میں آ

گئی۔ اسے قطعی علم نہ تھا کہ سحر کیا کرتی تھی۔ وہ تو ہمیشہ یہی سمجھتی آ رہی تھی کہ وہ ہمیشہ کی طرح اسے دیکھ کر یا اس کی آواز سن کر اپنے کمرے میں چلی جاتی

تھی مگر یہاں تو معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ پھر شمال کو آوازیں دے رہی تھی۔ اسے باہر کھڑی ہو کر سمجھاتی رہی۔ بہت دیر کے بعد آہستہ سے دروازہ کھٹکنے

کی آواز آئی۔ شزا جلدی سے اندر داخل ہوئی۔ شکیل کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ مچے کا گچ کا گلدان ٹوٹا پڑا تھا۔ اس نے مشتعل ہو کر گلدان اپنے سر پہ مار لیا تھا۔ شزا تو سر پیٹ کر رہ گئی۔ جلدی سے اس کا سر دیکھا۔ ذہم زیادہ گہرائی میں آ گیا تھا اور کوئی کرچی بھی سر میں نہیں چسپی تھی۔ وہ جلدی سے اس کے سر پر ہینڈ ج لگا کر ایک پرائیویٹ کلینک میں لے گئی۔ وہ سخت پریشان تھی۔ اسے ڈرینگ کروانے کے بعد وہ گھر لے آئی۔ ملک منصور لائٹ آف کیے پر سکون سو رہا تھا۔ شکیل کو میڈیکل سٹوڈنٹس نے اسے سلا دیا تھا۔ ڈاڈا نے اس کے قدم سر کے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر جھانکا۔ وہ کارپٹ پر بے ہوش پڑی تھی اور پاس رکھے ایٹل ٹرے اور اس کے ارد گرد سگریٹوں کے ادھ بٹے ٹکڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا۔

اُف خدایا! یہ گھر ہے یا پاگل خانہ..... وہ شدید ذہنی اضطراب میں مبتلا ہو گئی تھی۔



شفیق گھر آ چکی تھی اور حیدر اسے بیٹھا سمجھا رہا تھا۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے بارے میں اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اسے آمادہ کر رہا تھا۔ شہلا بھی اس کے ساتھ گھر جا چکی تھی۔

”انگل امیں کیا کروں۔ میں اتنے گناہوں کے بوجھ تلے کیسے جی پاؤں گی۔ میں اپنے ذہن سے سب کچھ جھٹکنا چاہتی ہوں مگر سب کچھ جوں کا توں رہتا ہے۔ میں بہت کمزور اور بے بس ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا میں کیا کروں۔ آپ ہی بتائیے میرے گناہوں کا کیا کفارہ ہونا چاہیے۔ سہیل اور آصف کے ناحق خون میری گردن پر ہیں جو مجھے ایک پل بھی چین نہیں لینے دے رہے۔“ وہ شدید ذہنی اذیت میں تھی اور جھنجھلا تے ہوئے سب کچھ بول رہی تھی۔

”کیا تم نے خود اپنے ہاتھوں سے انھیں قتل کیا ہے؟“

”لیکن وہ تو میں ہی بنی ہوں۔“

”بہت سی باتوں کی بہت سی وجوہات بنتی ہیں مگر زمانہ اور عقل اسے تسلیم نہیں کرتے ہیں جو حقیقت ہو اور حقیقت کو جو بھی ملے جامہ پہنائے وہی تصور وار سمجھتا ہے۔“

”تو بہت سے ایسے گناہ جن کا تعلق صرف اور صرف انسان اور خدا سے ہو جنھیں بندہ اور خدا جانتا ہو تو کیا ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ کیا قدرت انھیں معاف کر دیتی ہے؟“

”تم بھی ٹھیک کہتی ہو لیکن اب تم کیا کر سکتی ہو۔ کیا اپنے آپ کو قتل کر کے تم کسی ایک شخص کو بھی ذمہ دلا سکتی ہو یا پھر اس طرح کوئی کفارہ ادا کر سکتی ہو تو میں تمھیں ضرور ایسا کرنے کو کہتا لیکن یہ سب بے معنی ہے۔“

”میں اس اذیت سے کیسے اپنے آپ کو نجات دلاؤں جو میں لمحہ بہ لمحہ رہی ہوں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے میں کس قدر کرب میں

ہوں۔“

”میں اچھی طرح جانتا ہوں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ ان بچھتاؤں کا کوئی فائدہ نہیں اس لیے اگر اس اذیت سے نجات چاہتی ہو تو ان کے خاندانوں کے لیے کچھ کر سکتی ہو تو کرو۔ یہی ایک طریقہ ہے اور یہی راستہ ہے۔“ حیدر نے کہا تو وہ اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئی جیسے اس کے ذہن کی سوئی کہیں انک گئی ہو۔

”ہاں بیٹا، یہی ایک راستہ ہے۔ اپنے آپ کو ان کے لیے وقف کر دو۔ ان کی تکلیفیں کم کرنے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ تمہیں معاف کر دیں۔“ حیدر کے سمجھانے پر وہ کچھ سمجھ گئی تھی اسی لیے خاموش ہو گئی۔

”انگل امیں کچھ دن ادھر ہی شہر میں رہنا چاہتی ہوں۔“

”ہاں ہاں بیٹا، یہ گھر آپ کا اپنا ہے۔ جہاں چاہو رہ سکتی ہو۔ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔“

”تھینک یو انگل!“ وہ آہستہ سے بولی اور وہ مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔



ولیم ایک ٹوٹی ہوئی چار پائی پر لیٹا بری طرح کراہ رہا تھا۔ اسے سخت بخار تھا۔ سارے جسم پر کچلی طاری تھی۔ باہر شدید ٹھنڈ اور دھند تھی۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ایک فقیرنی اس کے پاس بیٹھی تھی۔

”اٹھ گیا رہے پتہ! انکھیں تو کھول۔ شکر کر مولا نے تیری جان بخشی کی۔ منے تو بھی تو اللہ کو بس پیارا ہی ہو گیا۔ تیری حیاتی تو بس مولا کا کرم ہے۔ ساری رات ٹھنڈے پانی میں ناگھیں پڑی رہیں، تنے کچھ والوم ہے۔“ بوڑھی فقیرنی بول رہی تھی اور اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

”تو کدھر کور ہے؟“ وہ اس سے پوچھ رہی تھی اور موٹی سی گندی سی رضائی سے اس کی ناگھیں ڈھانپ رہی تھی۔

”میں کہاں ہوں؟“ وہ آہستہ سے کراہتا ہوا بولا۔

”پتہ تو ٹکرنہ کرا تو بس نام پتا تادے۔ منے خود تنے گھر سے کسی کو بلاؤں ہوں۔“

”ایک کاغذ پسل دو۔“ اس نے بمشکل کہا۔ وہ عورت جھگی سے باہر نکل گئی۔ نہ جانے کہاں سے کاغذ کا ٹکڑا اور چھوٹی سی پستل ڈھونڈ کر لائی اور اسے پکڑائی۔ اس نے بمشکل گھر کا ایڈریس لکھ کر دیا۔

”تو بس لیٹے رہو۔ میں ابھی آؤں ہوں۔“ وہ کاغذ سنبھال کر باہر نکل گئی۔

”ولیم کل شام سے گھر سے نکلا تھا اور رات بھر گھر نہیں آیا۔ اور اگلے دن کی دوپہر ہو چکی تھی اور اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ شہلا بہت پریشان تھی۔ اس کی طبیعت بھی بہت خراب تھی۔ اس نے حیدر کو فون کر کے بلایا اور وہ ہر جگہ اس کے ایک دو دوستوں کے گھر ہاٹل ہر جگہ تلاش کر رہا تھا۔ نور بھی فون سن کر پہنچ چکی تھی۔ سب کو حیرت تھی کہ وہ کہاں چلا گیا تھا۔ وہ تو ماما کی دوائیاں لینے گیا تھا اور خانہ ماں کی موٹر سائیکل پر گیا تھا البتہ اے ٹی ایم کارڈ اس کے پاس تھا مگر وہ کہاں جاسکتا ہے۔ شہلا بار بار اپنے آپ سے پوچھتی۔ حیدر اسے تسلیاں دیتا مگر وہ خود بھی اندر ہی اندر پریشان تھا۔ کہیں سے کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔

”انکل! اگر آپ کہیں تو میں اپنے بڑے چچا سے بات کروں۔ وہ پولیس میں ہیں۔“ نور نے مشورہ دیا۔

”نہیں، ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے تھوڑا سا انتظار کر لینے دو۔“

”مگر حیدر! میرا دل بیضا جا رہا ہے۔ وہ تو کبھی بھی کہیں نہیں گیا۔ اسے تو یہاں کے راستوں کا بھی علم نہیں۔ وہ کہاں جاسکتا ہے۔“ شہلا بے صبری سے بستر پر تڑپ رہی تھی۔

”پلیز شہلا! حوصلہ کرو۔ وہ آ جائے گا۔ میرا دل کہتا ہے وہ آ جائے گا۔“ حیدر نے اسے تسلی دی اور کہیں فون ملانے لگا۔ ”میں ابھی اپر لیول پر بات نہیں کر رہا۔ پہلے خود تلاش کروں تو پھر۔“ وہ باہر جانے لگا تو شہلا نے استغہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اسے کہاں ڈھونڈ دے؟“

”میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ گیٹ تک پہنچا ہی تھا کہ وہ فقیرنی کاغذ کا ٹکڑا لپے گیٹ پر کھڑی تھی۔ وہ اسے بھکارن سمجھ کر جیب سے پیسے نکالنے لگا۔

”نہ صاحب جی! میں تو تیرے پت کی خبر لاؤں ہوں۔ وہ سویرے سے امارے پاس ہے۔ مولانا نے کرم کیا وہ بچ گیا۔ وہ تو امارے سائیں نے اسے چھپر میں دیکھ لیا۔“

”چھپر میں؟“ حیدر نے حیرت سے پوچھا۔

”آں..... آں..... ساری رات نمانے کی ٹانگیں خٹھڑے برف پانی میں ڈبی رہیں۔ اس کو گھر لے آؤ۔“ مولانا جانے چل بھی سکے تھے کہ بھیس۔

www.pdfbooksfree.pk

”کیا مطلب؟“ حیدر چونک گیا۔

”خود ای چل کے دیکھو، میں تو کچھ نہیں مالوم۔“

”اچھا گاڑی میں بیٹھو۔“ حیدر نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ نور بھی باہر آ چکی تھی۔

”انکل! کیا کچھ معلوم ہوا؟“ وہ فقیرنی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں اور شاید وہ ٹھیک نہیں۔“

”انکل میں آؤں؟“

”نہیں، تم شہلا کے پاس رہو۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور وہ اکیلی بھی ہے۔ اس کو بتاؤ کہ میں ولیم کو لینے جا رہا ہوں۔“ حیدر نے کہا تو وہ خاموشی سے اندر چلی گئی۔ اس نے شہلا کو بتایا تو اسے قدرے سکون ملا۔

وہ فقیرنی حیدر کو اندر جھکی میں لے گئی۔ ولیم کو اس حالت میں دیکھ کر اسے سخت حیرت ہوئی۔ اس کے سر پر چوٹ لگی تھی اور اس فقیرنی نے اس کے سر پر ہلکا سا کپڑا باندھا تھا۔

”ولیم بیٹا! کیا ہوا؟“ حیدر نے پیار سے کہا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”انکل! میں کہاں ہوں؟“

”اشھو بیٹا! میں قسمیں لینے آیا ہوں۔ مگر چلو۔ تمہاری ماما بہت پریشان ہیں، ہمت کرو۔“ حیدر نے رضائی پیچھے کی اور اسے سہارا دے کر اٹھاتا چاہا مگر اس کی دونوں ٹانگیں تو جیسے سن ہو گئی تھیں۔ ان میں ہانکل حرکت باقی نہیں تھی۔ حیدر کو شدید شاک لگا۔ اس نے خود اس کے پاؤں زمین پر رکھے اور اسے کھڑا کرنے کی کوشش کی مگر اگلے ہی لمحے وہ دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ حیدر جیسے صحت مند توانا شخص سے بھی اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

”اماں! کوئی بندے باہر ہیں تو ان کو بلاؤ۔ اسے گاڑی تک لے جائیں۔“ حیدر نے فقیرنی سے کہا۔

”جی صاحب جی!“ وہ باہر نکل گئی اور دو تین جوان لڑکوں کو باہر سے بلا لائی جنہوں نے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا۔ ولیم قد کاٹھ میں سب سے لہا تھا۔ اگرچہ دہلا چلا تھا مگر پھر بھی اسے اٹھانا قدرے مشکل ہو رہا تھا۔ حیدر نے فقیرنی کو کچھ پیسے دیے اور اس کا شکریہ ادا کر کے واپس آ گیا۔ اس نے گاڑی کا رخ ایک پرائیویٹ اسپتال کی طرف موڑا۔ ڈاکٹروں نے فوراً اس کو ایڈمٹ کر لیا۔ اس کے ٹیٹ لپے جا رہے تھے۔ بخار کم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس نے مگرفون کر کے نور کو صورت حال بتائی کہ ولیم کو بخار ہے اس لیے وہ اسے اسپتال لے آیا ہے۔ اسے خود ایک اہم میٹنگ کے لیے بھی جانا تھا۔ اس نے اپنے پی اے کو وہاں بلا لیا اور خود میٹنگ انینڈ کرنے چلا گیا۔ رات گئے وہ وہاں سے لوٹا تو ولیم ابھی تک بے ہوش تھا۔ حیدر نے سرجن سے ملاقات کی اور اس کی ٹانگوں کے بارے میں پوچھا۔

”حیدر صاحب! آئی ایم سوری..... رپورٹس کچھ ہو پ فل نہیں۔ شاید ساری رات شدید ٹھنڈ اور ٹھنڈے پانی میں رہنے کی وجہ سے ان میں حرکت باقی نہیں رہی۔ وہ سن ہو چکی ہیں۔ خدا سے امید ہے کہ رفتہ رفتہ ٹھیک ہو جائے گا مگر فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آپ تو خود ڈاکٹر ہیں۔ پھویشن کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر کے لہجے میں مہمی مایوسی کو اس نے محسوس کر لیا۔ اسے سخت افسوس ہو رہا تھا کہ وہ شہلا کو کیسے سب کچھ بتائے گا جبکہ وہ خود انتہائی سیریس حالت میں بستر پر ہے۔

”ٹھیک ہے، آپ علاج جاری رکھیے۔ کیا فز پو تھرائی سے کچھ ممکن نہیں؟“

”میں نے کہا نا ہم ہر ممکن طریقے سے کوشش کریں گے کہ وہ نارمل ہو جائے لیکن اس کے لیے وقت درکار ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔

اس نے اگلی صبح فون کر کے نور کو اسپتال بلا لیا اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی بے حد پریشان ہو گئی۔ اس کے لیے بھی یہ ایک ناقابل برداشت صدمہ تھا۔ وہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسی افتاد اس پر آ پڑے گی۔

”انکل! لیکن یہ سب کیسے ہوا؟“

”معلوم نہیں، میں نے تو اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ شدید بخار میں تھا۔ اب پوچھتے ہیں مگر جو بھی ہوا بہت برا ہوا ہے۔“ حیدر کے چہرے پر بھی افسردگی اور مایوسی چھائی تھی۔ ولیم آنکھیں کھولے چہت کو گھور رہا تھا۔

”ولیم کیسے ہوا؟“ نور اپنے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ لا کر بولی۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”لیکن بیٹا! تم کہاں گئے تھے اور یہ سب کیا ہوا؟“

”انکل! میں اے ٹی ایم کارڈ سے پیسے لینے کہین میں گیا تو وہاں پہلے ہی ایک شخص موجود تھا۔ میں نے خیال نہ کیا اور پیسے نکالنے لگا۔ اس نے شاید اناؤنٹ دیکھ لیا یا پھر کیا ہوا مجھے سمجھ نہیں آیا۔ اس نے مجھ سے کارڈ چھیننے کی کوشش کی۔ میں باہر بھاگا اور موٹر سائیکل جیزی سے چلانے لگا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس کے کتنے ساتھی میرا پیچھا کر رہے تھے۔ ایک دم پورا گینگ میرے پیچھے پڑ گیا۔ میں اندھا دھند موٹر سائیکل دوڑاتا رہا کہ ایک لڑکا میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کارڈ چھینا اور پھر کسی نے میرے سر پر کچھ مارا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔ آنکھیں کھلیں تو اس فقیرنی کی جھونپڑی میں تھا اور وہی بتا رہی تھی کہ کسی جوہڑ کے ٹھٹھے سے رخ پانی میں میری ٹانگیں ساری رات پڑی رہی تھیں۔ جسم باہر تھا۔ انکل! میری ٹانگیں حرکت نہیں کر رہیں۔ کیا اب.....؟“ اس نے استغما یہ لگا ہوں سے حیدر کی طرف دیکھا۔

”نہیں بیٹا، ایسی کوئی بات نہیں۔ میری ابھی سرجن سے بات ہوئی ہے اور وہ بھی یہی کہہ رہے کہ یہ وقتی پرالیم ہے۔ تم اپنی دل پاور سے جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بس کوشش کرو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ حیدر نے اسے تسلی دی مگر نور کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اسے شدید صدمہ ہو رہا تھا۔ اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا مگر وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی کیونکہ وہ تو خود اسے ہمیشہ تسلی دیتی آ رہی تھی اب کیسے اس کے سامنے حوصلہ بار دیتی۔

دو تین دن بعد ولیم کو جیل جیڑ پر بٹھا کر گھر لے جایا گیا۔ اسے اپنی اس بے بس حالت پر شدید دکھ ہو رہا تھا۔ شہلا اسے یوں دیکھ کر جیسے سکتے میں آگئی تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی ولیم کی طرف دیکھتیں تو کبھی جیڑ کی طرف..... سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔ وہ کتنی ہی دیر خاموش رہیں۔ کبھی نور کی طرف دیکھتیں، کبھی حیدر کی طرف تو کبھی ولیم کی طرف۔

”ولیم بہت جلد اچھا ہو جائے گا۔ ڈاکٹروں نے بہت تسلی دی ہے۔ بس چند ہفتوں کی بات ہے۔“ حیدر قدرے اونچائی آواز میں بولے۔

”انکل! چند ہفتے..... تو کیا میں ایسے ہی رہوں گا؟“ ولیم نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں بیٹا، مجبوری ہے۔“ حیدر سمجھانے کے انداز میں بولے۔

”مگر پھر بھی کب تک؟“ ولیم جاننے پر مصر تھا۔

”یہی دو تین ہفتے۔“ حیدر نے اس سے کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔

اس کے لیے یہ بے بسی اور صدمہ برداشت کرنا قطعی مشکل ہو رہا تھا۔ وہ تو بچپن سے اپنے آپ کو فضاؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتا آیا تھا۔ جہازوں کو اڑاتا ہوا، پرندوں کے سنگ پرواز کرتا ہوا اور جب قادر نے روح کی پرواز کی بات کی تو اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سمجھایا۔ اتنی اڑائیں بھرنے والا زندگی اور انسانوں کو بہت اونچائی سے دیکھنے والا یکدم زمین پر ریگتے کیڑے کے مانند آگرا تھا۔ اتنی بے بسی کہ دو قدم چلنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ دوسروں کا سہارا بننے کا خواب دیکھنے والا خود بے آسرا ہو گیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کرتا تو وہ آنسوؤں سے بھر جاتیں۔ کھولا تو آنسو

اشک بن کے بہہ نکلتے۔ وہ جن شدید جذبات سے دوچار ہو رہا تھا اس نے اس کو اندر سے بے حد کمزور اور کھوکھلا کر دیا تھا۔ کاش وہ زندہ نہ پچتا۔ ایسی بے بسی کی زندگی سے تو موت بہتر تھی۔ وہ ہار ہار اپنے دل میں دعا کرتا۔ کیسی بے چارگی تھی۔ ہاں بستر مرگ پر تھی اور وہ اپانچ بنا اینڈیاں رگڑ رہا تھا۔ زندگی کی سانسیں دلوں کے لیے مشکل ہو رہی تھیں مگر اس گاڑی کو دونوں سمجھ رہے تھے۔

اگر نور اور حیدر انکل نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ وہ اکثر ان دونوں کی تیمارداری سے متاثر ہو کر سوچتا۔ وہ شخص پہلے ماما کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اب وہ اسے بھی ہاسپٹل لے کر جاتا تھا۔ ایک مستقل اینڈینٹ کریم خان انھوں نے اس کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ وہ ہر روز اس کی ٹانگوں کی مالش کرتا۔ اس کو ایک سرساز کر داتا اور فزیو تھراپی کے لیے وہی اب اسے ہاسپٹل لے کر جاتا۔ نور ہر روز اس کا حال پوچھنے آتی۔ اس کے لیے اور ماما کے لیے کھانے بناتی۔ اس کے قمر ڈائیز کے انگیزا بھی ہونے والے تھے مگر وہ ان دنوں بھی روزانہ چکر لگاتی۔ اسے حوصلہ دیتی مگر اب اس سے ناراض نہیں ہوتی تھی۔ پانچ مہینے گزر گئے تھے نہ فزیو تھراپی کا اثر ہو رہا تھا اور نہ دوائیوں کا۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے، ولیم کا ڈپریشن بڑھتا جا رہا تھا۔ ماما اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتیں۔ بستر پر لیٹی اندر ہی اندر نہ جانے کیا کچھ سمجھتی۔ وہ کیمو تھراپی کے چار کورس کروا چکی تھیں اور اب ان کا دل مزید اس کے بارے میں سوچ کر گھبرانا شروع ہو جاتا تھا۔ اتنی اذیت سب سے سب سے وہ ٹھہرا کر رہ گئی تھی۔ پورے جسم کی جلد جیسے جل چکی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے رگوں میں دھڑنے والا خون بھی جل کر سیاد ہو چکا تھا۔ سر پر بال تھے نہ آنکھوں اور بھونڈے پر آنکھیں دیکھ کر خوف سا آتا تھا اور ولیم کو دیکھ کر فحش ہوتا تھا۔

ولیم اب بہت بھنبھلائے لگا تھا۔ شہلا کے ساتھ بھی بدتمیزی سے بات کرتا اور کریم خان کو تو اکثر مارنے کو لپکتا اور اکثر غصے میں کوئی نہ کوئی چیز اپنے آپ کو مار لیتا۔ حیدر اس کی وجہ سے بہت پریشان ہو رہے تھے۔ نور امتحانات کے بعد فارغ ہو کر ادھر ہی آ گئی تھی۔ انور بچا اس پر بہت برے تھے مگر وہ کسی کی پروا کب کرتی تھی۔ جب وہ کوئی کام کرنا چاہتی تھی، کر کے رہتی تھی اور ایسا کرنے کو حیدر انکل نے کہا تھا کیونکہ ولیم کی حالت روز بروز بگڑ رہی تھی اور حیدر انکل کو خسر ہونے کے ناطے ایک میٹنگ کے سلسلے میں پیرس جاتا تھا۔ ان کا وہاں قیام دس روزہ تھا اس لیے انھوں نے نور کو وہاں رہنے کو کہا۔ شیر شاہ کو بھی انھوں نے وہاں ان کی دیکھ بھال کے لیے بھیج دیا۔ وہ ہر روز دن میں دو تین دفعہ فون کرتے۔ ولیم اور شہلا کی خیریت پوچھتے۔ کوئی مسئلہ نہ تھا تو وہ بتا دیتی۔

ولیم زیادہ تر اندھیرے کمرے میں بند رہتا۔ اس نے اب فزیو تھراپی کے لیے بھی جانا چھوڑ دیا تھا۔ کریم خان کو بھی کمرے میں نہیں آنے دیتا تھا۔ نہ وہیل چیئر پر بیٹھتا، نہ ماما کے پاس جاتا اور نور سے بھی اکثر اکڑا کرتا رہتا۔ نور اس کے لیے سوپ بنا کر لاتی تھی۔ کمرے میں بالکل اندھیرا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر لائٹ آن کی تو وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نور کو دیکھ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

”ولیم اٹھو! سوپ پی لو۔“ نور نے اس کے بیڈ کے پاس رکھے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہا۔

”ولیم اٹھو!“ اس نے اس کا ہاروا ہستہ سے پیچھے کیا۔

”مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔“ وہ غصے سے چلا یا تو وہ چونک گئی بلکہ قدرے ڈر بھی گئی۔ وہ تو ہمیشہ دھیمے لہجے میں بات کرنے کا عادی تھا۔ وہ

خندی تو ہو رہا تھا مگر اتنا زیادہ، اسے قطعی توقع نہیں تھی۔

”ولیم! میں کہہ رہی ہوں اٹھو۔“ وہ بھی اپنی بات پر ہنسنے لگی اس نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑے ہٹایا۔

”ہاں دیکھ لو میری بے بسی، مجھ پانچ، لو لے، لنگڑے کود کچھ لو۔ ہار ہار اٹھنے کو کہہ رہی ہو، کیسے اٹھوں؟“ وہ پھوٹ پھوٹ کر دنا شروع ہو گیا۔

”ولیم! تم اس قدر جلدی بہت ہار جاؤ گے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”کیا ابھی بھی جلدی ہے، مجھے دو ماہ ہو گئے ہیں اس طرح بستر پر ایڑیاں رگڑتے، اس جسم کو تھینچتے تھینچتے۔ فوراً تم مجھے شوٹ کیوں نہیں کر

دیتی۔ پلیز مجھ پر احسان کرو۔“ وہ بے بسی سے بولا۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا اور تمہیں شوٹ کر دے۔ اور جو تم سے محبت کرتی ہے۔ دن رات تمہاری محبت کے لیے دعا نہیں کرتی ہے۔

وہ خود تمہیں اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر دے۔“ وہ غلطی سے بولی۔

”کیا تم اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، پہلے سے بھی زیادہ۔“

”نہیں، تم محبت نہیں اہردی کر رہی ہو۔“

”ٹھیک ہے، اہردی بھی ان کے ساتھ کی جاتی ہے جن کے لیے دل میں محبت ہو اور میں تم سے محبت بھی کرتی ہوں اور اہردی بھی، کبھی تم؟“

”کیا ابھی بھی مجھ جیسے پانچ انسان کے ساتھ؟“

”ہاں، تم میری محبت کو کسی بھی شے میں نہ تول سکتے ہو نہ ناپ سکتے ہو اور میں تمہیں پانچ نہیں صرف اور صرف ایک اچھا انسان سمجھتی

ہوں۔ ایسا جس کو میں نے سب سے بڑھ کر چاہا ہے اور چاہتی رہوں گی۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ وہ حیرت

سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے اس کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”تم کب تک ایسا کرتی رہو گی؟“

”جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتے اور اپنے پاؤں پر نہیں چلتے۔“

”میں اب کبھی بھی نہیں چل پاؤں گا۔“ وہ مایوسی سے بولا۔

”کیوں؟“

”کیونکہ یہی حقیقت ہے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”لیکن میں کہتی ہوں تم جلد چل پاؤ گے اور مجھے نہ صرف یقین ہے بلکہ یہ میرا ایمان بھی ہے۔“ وہ معصوم ارادے سے بولی۔

”تم حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کرتیں؟“

”میں صرف خدا پر ایمان رکھتی ہوں۔ ساری سچائیاں، ساری کرامتیں اور معجزے اس کی ذات سے وابستہ ہیں۔“

”تمہارا خدا مجھے کبھی ٹھیک نہیں کرے گا۔“

”کیوں ماس کی تم سے کیا دشمنی ہے؟“ وہ مسکرا کر بولی۔

”کیونکہ میرا ناس پر ایمان ہے اور نہ اپنے خدا پر۔“

”تو پھر کس پر ہے؟“

”کسی پر نہیں۔“

”ٹھیک ہے، میں بحث نہیں کرتی۔ مجھے تو جس پر پورا یقین اور اعتماد ہے اس تک تو رسائی کرنے دو پھر دیکھتے ہیں کون کس کو چھوڑتا ہے۔“

وہ یقین لہجے میں بولی۔

”تم کیا کرو گی؟“

”ابھی تو تم سوپ پیو گے۔ آج سے میں ایک وظیفہ پڑھوں گی اور پھر تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ وہ بڑا امید ہو کر بولی۔

”ہونہا یہ کہنا کس قدر آسان ہے۔“

”اس کے لیے کرنا اس سے بھی زیادہ آسان ہے۔ وہ صرف ”کن“ کہتا ہے اور زندگی وجود میں آ جاتی ہے۔ گارے کے ٹکٹے ہوئے

وجود میں روحیں پھونکتا ہے اور پھر ان روحوں کو قبض بھی دے کر دیتا ہے۔“ وہ بول رہی تھی اور وہ محو ہو کر سن رہا تھا۔

”اب جلدی سے سوپ پیو۔ بس انگریزوں کو ہونا چھوڑ دو میرے لیے، کیا تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے۔“ نور نے اس کے ہاتھ کو اپنے

ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ کر محبت سے کہا۔

”تمہارے لیے..... تمہارے لیے۔“ وہ خاموش ہو گیا اور اس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا کر سسکنے لگا۔

”میں تمہیں یوں سسکتا ہوں نہیں دیکھ سکتی۔ صرف میری خاطر ناراض ہونا اور مایوس ہونا چھوڑ دو۔ کوئی بھی شکوہ، کوئی بھی دکھ اور ناراضی

تمہاری باتوں اور لہجے سے نہ چٹکے۔ وعدہ کرو تم آئندہ ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ تم تنہا نہیں ہو۔ میں زندگی کی آخری سالوں تک تمہارے ساتھ ہوں۔

اگر تم اپنا ج بھی رہے تو تمہاری بیساکھی بنوں گی اور جب تم چلتا شروع کرو گے تو تمہارے ہر قدم کے ساتھ میرا قدم اٹھے گا۔ معذور انسان کو یہی مایوسی

ہوتی ہے تاکہ وہ زندگی میں تمہارا رہ جائے گا۔ میرا تم سے وعدہ ہے تم کبھی بھی زندگی میں تنہا نہیں رہو گے اور نور جو بات کہتی ہے وہ کرتی ہے وہ کرتی بھی

ہے بشرطیکہ.....“ وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”بشرطیکہ کیا؟“

”اگر خدا بھی ایسا چاہے۔ جب وہ نہیں چاہتا تو انسان شدید جذبیوں اور خواہشوں سمیت بھی کچھ نہیں کر پاتا۔“ وہ قلعیت سے بولی۔ وہ

نور کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے بہت بڑا امید ہوا تھا اور دوسری بات سن کر ایک دم پھر تاریکی کی طرف جانے لگا۔ مایوسی کا سایہ اس کے چہرے پر

لہرانے لگا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”تم..... تم مجھ سے جدا نہ ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔“

”ڈونٹ بی سلی! ہم دونوں دنیا میں تھا آئے تھے اور تنہا ہی جانا ہے۔ تم حقیقت پسند ہو۔“

”تم مجھے الجھاتی ہو۔ جب میں حقیقت پسند ہو کر سوچتا ہوں تو تم مجھے خواب دکھاتی ہو اور جب میں خوابوں میں کھونا چاہتا ہوں تو تم تلخ

حقیقت کی باتیں کرتی ہو۔ تم ہمیشہ میرے ساتھ ایسا کیوں کرتی ہو؟“

”کیونکہ میں ایسی ہی ہوں۔ میں نے زندگی کے دونوں رخ دیکھے ہیں اس لیے میری سوچ بھی ایسی ہی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”اب تم سوپ پی لو۔“ نور نے باؤل اس کے آگے کیا اور وہ خاموشی سے سوپ پینے لگا۔

”تم پڑھائی کیوں نہیں شروع کرتے۔ وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟“ نور برتن سمیٹتے ہوئے بولی۔

”بہت مشکل ہے۔ اب میرا ذہن کچھ زڈ نہیں رہا۔“

”یہ کوئی لاجبک نہیں۔ کل سے پڑھائی شروع کرو۔ وقت بہت قیمتی ہے۔ انسان کو وقت کی قدر کرنی چاہیے۔“ وہ کہتے ہوئے کمرے سے

نکل گئی اور ولیم اس کی باتوں کو ذہن میں ڈھرانے لگا۔ نور بہت پازینٹو ہے۔ وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا۔

رات گئے وہ عشاء کی نماز پڑھ کر اس کے کمرے میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈائری، چھوٹی سی عربی میں کتاب تھی اور ایک گلاس پانی

کا تھا۔ ولیم بہت دنوں کے بعد ایک کتاب کھول کر بیٹھا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ولیم نے اسے مخاطب کرنا چاہا مگر اس نے اسے ہاتھ

کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا اور چھوٹی کتاب سے پڑھنا شروع ہو گئی۔ ڈائری سے جیسے وہ ہدایات لے رہی تھی اور پھر پانی پر پھونک مارتی پھر

اس کی ٹانگوں پر پھونکیں مارتی۔ ولیم حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا انہماک، اس کا سراپا، سفید چادر میں لمبوس، ہلکوتی حسن لیے، عقیدت

سے آنکھیں بند کیے وہ اسے اس وقت بہت مختلف لگ رہی تھی۔ اس نے تین دفعہ یہ عمل ڈھرایا اور پھر پھونک مار کر پانی اسے پینے کو کہا۔

”اس میں کیا ہے؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”میرا ایمان اور تمہاری صحت کی دعا۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“ وہ بے اعتبار سے لہجے میں بولا۔

”کوئی فضول بات نہیں ہوگی۔ بس تم اسے پیو گے۔“ وہ حکمانہ لہجے میں بولی اور اسے پانی پینا پڑا۔ وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔

ولیم اس کی محبت اور لگن کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے ایک دم شدت سے احساس ہونے لگا کہ وہ واقعی تنہا نہیں تھا۔ اتنی محبت، اتنی

چاہت، اتنا خلوص..... اس لڑکی نے تو اپنا گھر اس کے لیے اور اس کی ماما کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ وہ جذباتوں کو سمجھتی تھی۔ چاہتیں اُچھاڑ کر بنا جاتی تھی۔

ہر ایک کا درد اپنے دل میں محسوس کرتی تھی، وہ کس قدر محترم ہے۔ کس قدر پیاری ہے۔ ولیم کے دل میں اس کی چاہت کے لیے ایک نیا درد اُٹھ رہا تھا۔ اس

سے قبل وہ اس کو چاہتا تھا مگر اس کو احساس تھا کہ چرچ جو اُن کرنے کے بعد وہ اسے چھوڑ دے گا۔ جدائی کی سوچ اس نے ہمیشہ ذہن میں رکھی تھی اس

لیے وہ کوئی بھی قدم بڑھانے سے گریزاں تھا لیکن جب سے اس نے زندگی کی مایوسیوں میں قدم رکھا تھا..... اس کا کیریئر، مستقبل سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے وجود کی شناخت مبہم تھی۔ نور اس موڑ پر اسے اپنے قریب، بہت قریب محسوس ہوتی ہوئی دکھائی دی۔ پہلے وہ اس سے صرف محبت کا وعیدار تھا اور اب پوزیٹو محبت کا علمبردار بننا جا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی وہ اس سے دور ہو، یہ سوچنا بھی اس کے لیے محال تھا۔ جب کبھی وہ گھر جانے کا کہتی تو وہ بار بار یہی پوچھتا۔ ”کب آؤ گی؟“ اور وہ مسکرا دیتی۔ وہ اس کی ضرورت بنتی جا رہی تھی۔ محرم راز یا پھر کچھ اور..... وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ہر جذبہ ابھی پردیس میں تھا۔

نور نے کتابوں کا ڈھیر لا کر انھیں کین کے ریک میں لگا دیا تھا اور ہر چیز اس کے بیڈ کی سائڈ پر ترتیب دے دی تھی۔ ایک تیل بھی پاس رکھ دی تاکہ جب وہ کمرے سے باہر ہو وہ اسے تیل بجا کر بلا لے۔ اس نے کچپیٹر، ٹی وی، ڈی وی ڈی، ہر چیز اس کے کمرے میں اور اس کی پہنچ میں قریب سے رکھی تھی۔ وہ زیادہ تر وقت ماما کے پاس رہتی اور گاہے بگاہے اس کے پاس آتی۔ اسے پڑھتا ہوا یا مصروف دیکھ کر وہ کمرے سے باہر نکل جاتی۔ اس نے واقعی پڑھنا شروع کر دیا تھا اور جب سے پڑھنا شروع کیا تھا ڈپریشن بھی کم ہو گیا تھا۔ وہ ہر رات مخصوص وقت پر کمرے میں آتی۔ کچھ پڑھ کر پھونکتی۔ اسے پانی پلاتی اور چلی جاتی۔ ہر پھونک کے ساتھ اس کے دل میں اس کے لیے محبت کا نیا جذبہ بیدار ہوتا اور وہ جذبہ حریت تقویت پکڑتا۔

حیدر دس دن کے بعد آ گئے تھے اور وہ دیکھ کر کافی خوش ہوئے تھے کہ ولیم میں کافی پازیتو منیج آ یا ہے۔ وہ جس طرح سوچ کر آئے تھے اس کے برعکس وہ انھیں مسکراتا ہوا ملا مگر شہلا کو دیکھ کر وہ پریشان ہو گئے تھے۔ وہ بس چراغ سحری لگ رہی تھی۔

”نور بیٹا تھیک ہو! آپ نے ان لوگوں کو بہت سنبھالا اور نہ میں پریشان ہو رہا تھا اور باں تمہیں ایک خوشخبری سنائی تھی۔“ حیدر نے ہنر امید ہو کر بتایا۔

”جی انکل!“

”میں ولیم کا کیس جرمی میں بھی ڈسکس کر کے آیا ہوں۔ انھوں نے فنانس پر سٹف امید دلائی ہے۔ آگے دیکھو جو خدا کی مرضی۔ یہاں تو ایک پرسنٹ کی امید بھی نہیں تھی اور دیکھو اتنا قافانجھے پیرس سے جرمی جانا پڑا۔“

”واقعی انکل!“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”ہاں مگر ابھی تم ولیم سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ ایسی بات سن کر انسان کی امید بندھ جاتی ہے۔ اگر خدا نخواستہ کچھ اور ہو جائے تو پھر ڈپریشن سے لکنا مشکل ہو جاتا ہے۔“ حیدر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے انکل!“

”اب تم گھر جانا چاہو تو چلی جاؤ۔ تمہارے گھر والے کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔“

”ہاں، انور چچا کا موڈ کچھ آف تھا لیکن میں رات کو چکر لگایا کروں گی۔ وہ دراصل میں نے ولیم کے لیے ایک وظیفہ شروع کیا ہے۔ اس کے لیے مجھے آنا پڑے گا۔“ وہ اپنی ہی لے میں بولی تو حیدر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے اور پھر ان کے لبوں پر مسکراہٹ سی پھیلی۔

”بہت محبت کرتی ہو اس سے؟“ حیدر نے پوچھا۔ وہ جواہر خاموش رہی اور سر جھکا لیا۔

”خدا کرے جس کو تم چاہتی ہو وہ تمہارا ہی بنے۔ اگر انسان سمجھے تو دنیا میں یہ خدا کی طرف سے بہت بڑی عطا ہے۔“ حیدر کی آواز بھرا گئی اور انھوں نے بمشکل تھوک نکالا۔ نور کو کچھ کچھ اندازہ تھا مگر آج حیدر کی زبان سے ایسی باتیں سن کر وہ افسردہ ہو گئی تھی۔

”انگل میں جاؤں؟“ وہ اب حریص وہاں رکنا نہیں چاہتی تھی۔

”ہاں بیٹا شکریہ ادا“ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ وہ جا چکی تھی۔ مگر سونا سونا لگ رہا تھا۔ سب اس کی کمی محسوس کر رہے تھے۔ اس کے وجود کی خوشبو ہر طرف رچ بس گئی تھی۔



آئینکٹ کے لیے اب گھر میں رہنا دشوار ہو رہا تھا۔ بھائی جاب پر چلا جاتا۔ بہن اپنے گھر جا چکی تھی۔ وہ گھر میں تنہا بیٹھی ماما کو بہت مس کرتی۔ ہر روز ملک منصور کے فون کا وہ شدت سے انتظار کرتی۔ وہ صبح سویرے اسے ضرور فون کرنا پھر رات کو۔ وہ اس کی باتوں کی عادی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے لہجے کی مٹھاس میں وہ اپنا پورا پورا محفل محسوس کرتی۔ ملک منصور اسے پاکستان آنے کے لیے کہہ رہا تھا ہمیشہ کے لیے اور اس بیٹنگلی پر وہ بار بار سوچ رہی تھی۔ وہ دور ہے پر کھڑی تھی۔ اس نے بھائی بہن سے مشورہ کیا تو دونوں نے ملک منصور کے حق میں ووٹ دے دیا۔ وہ ملک منصور سے مل چکے تھے اور اس سے بہت حائر تھے مگر آئینکٹ گہری سوچ میں تھی۔ اس نے پاکستان میں رہ کر سیاست پر جتنی ریسرچ کی تھی اس نے اس کے ذہن میں بہت سے شبہات پیدا کر دیے تھے۔ اس کی پاکستان کی سیاست پر گہری نظر تھی اور یہاں کے سیاستدانوں سے بھی اچھی طرح واقف تھی اس لیے وہ ملک منصور کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ کوئی بھی فیصلہ کرنا اس کے لیے نہ جانے کیوں مشکل ہو رہا تھا۔

وہ ملک منصور کی ہر ہر بات، لہجے اور الفاظ کو ذہن میں ڈھرتی۔ انھیں جانچنے کی کوشش کرتی۔ اسے کہیں بھی ملک منصور میں کوئی عجیب نظر نہیں آتا۔ وہ شخص واقعی اس قابل ہے کہ اس پر اعتبار کیا جائے لیکن اس کی ذاتی زندگی..... نہیں جو جذباتوں کو سمجھنے والا ہو، محبت کی زبان تک جسے رسائی ہو اور جو پڑائی کے فن سے بھی شناسا ہو وہ کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ وہ سوچ کر خود ہی مسکرا دی۔ اس پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ اس نے ہلا خرفیصلہ کر لیا تھا۔

اس نے موبائل پر نمبر ملایا۔ ملک منصور اس وقت ہاتھ روم میں تھا اور ڈریسنگ روم پر پڑا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ درندہ اکثر موبائل ہاتھ روم میں ساتھ لے جاتا تھا۔ نہ جانے آج کیسے بھول گیا تھا۔ شزائینہ روم میں داخل ہوئی تو موبائل بج رہا تھا۔ اس نے اٹھایا تو آئینکٹ بول رہی تھی۔

”ہیلو! میں آئینکٹ بول رہی ہوں۔ ملک منصور کہاں ہیں؟“ اس نے شستہ انگریزی میں پوچھا۔

”وہ مصروف ہیں۔“

”اچھا انھیں بتا دیجیے کہ میں آج شام کی فلائٹ سے پاکستان آ رہی ہوں۔“ اس نے حریص کچھ کچھ بغیر فون بند کر دیا۔ شزائینہ جلدی سے اپنے موبائل پر اس کا نمبر لایا اور موبائل رکھ دیا اور باہر نکل گئی۔ ملک منصور ہاتھ روم سے نکلا تو نمبر دیکھنے لگا اور فوراً اس کا نمبر ملایا۔

”ہیلو ڈارلنگ! سواری میں بڑی تھا۔“ وہ مسکراتا ہوا بولا۔

”ہاں، مجھے معلوم ہے اسی لیے اسٹینڈ نہیں کر رہے تھے۔ میں آج شام کو پاکستان آ رہی ہوں۔“ وہ بھی مسکراتے ہوئے بولی۔

”رینلی! تھیک یو سو میٹ ہارٹ..... ونگم ونگم! کب سے یہ آنکھیں تمہاری کھٹک رہیں۔ آئی لو یو سو میٹ!“ وہ مسکراتے ہوئے بولا اسی لئے شزا کمرے میں داخل ہوئی تو ملک منصور نے اپنا لہجہ بدلا اور گھاٹکھارے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے شیروانی صاحب! میں ایئر پورٹ پہنچ جاؤں گا۔ ہاں ہاں بھائی، آپ میرے ہی مہمان ہیں۔ آپ کو لینے میں خود آؤں گا۔“ اس نے جلدی سے فون بند کر دیا۔ شزا نے کن آنکھیں سے اسے دیکھا۔ ملک منصور اتم اور تمہاری مکاریاں، کیسے کیسے دھوکے دیتے ہو۔ وہ بے وقوف لڑکی بھی اب اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی تباہ کرنے پر تلی ہے۔ تم بہت مکاریاں انسان ہو۔

”کون آرہا ہے؟“ شزا دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے بولی۔

”وہ میں نے بتایا تھا نا، ایران میں جو میرے دوست ہیں شیروانی صاحب، وہ کچھ روز کے لیے یہاں آرہے ہیں۔“

”اچھا تو کیا یہاں میرا مطلب ہے گھر میں ٹھہریں گے؟“

”یہاں..... یہاں؟ کم آن شزا! اس گھر میں یہ تو فقیروں اور سر پھروں کا ٹھکانا ہے۔ یہاں تو کوئی دو دن نہیں رہ سکتا۔“

”رینلی منصور! یہ آپ کہہ رہے ہیں۔ شکر ہے آپ کو آج اعزازہ تو ہوا کہ یہ کن کن لوگوں کا ٹھکانا ہے۔ اس میں مزید اضافہ کر لیں۔ یہ اب پاگلوں اور ننھیوں کا بھی ٹھکانا ہے۔“

”کون؟“ ملک منصور ایک دم چٹکا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”آپ کی بہو صاحبہ ایڈ کالڈ ہیں۔“

”اوہ نو! اس غلامت نے یہ کام بھی شروع کر لیے۔ شزا! بس اس کو یہاں سے نکالو۔ میرے گھر کو گندگی کا ڈھیر بنادیا ہے اس نے۔“

”نہیں..... میں یہ نہیں کر سکتی۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔

”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ آفاق کی بیوی ہے اور میں کسی کے ساتھ بھی کوئی نسل نہیں چاہتی۔“

”اچھا، مجھے جلدی جانا ہے۔ تم ہا شتا لگواؤ۔“ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور ایئر نیٹی کا بھرپور اسپرے اپنے اوپر کیا۔ وہ اس کی بات سن کر دل مسوس کر رہ گئی۔ ملک منصور! آف تمہاری مکاریاں اور چالاکیاں..... اس نے دل میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

ملک منصور، آنکھت کوریسیو کرنے کے لیے آدھا گھنٹا پہلے ہی ایئر پورٹ پہنچ گیا تھا۔ اس نے گاڑی میں ہر طرف پھولوں کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ ایسی پزیرائی تو اس نے آج تک کسی اور کی نہیں کی تھی۔ وہ خود بھی حیران تھا۔ جب شزا اس کی زندگی میں آئی تھی تو اس نے سوچا تھا اب اور کوئی نہیں۔ اس کے بعد کتنی لڑکیوں سے مراسم بڑھے مگر شادی کے لیے صرف آنکھت پسند آئی۔ وہ بلیک اور آف وائٹ اسکرٹ اور کوٹ میں بہت حسین لگ رہی تھی۔ اس کے بلوئٹ شارٹ ہنر اور فیس کٹ بہت حد تک لیڈی ڈیانا سے ملتے تھے۔ کوئی ایک دفعہ دیکھتا تو چونک کر دوبارہ ضرور دیکھتا۔ ملک

منصور سگار لگائے بھاپ اڑاتی رات میں بھی اپنے اندر ایک حرارت اور مہک سی محسوس کر رہا تھا۔ آج کل اسے نہ سیاست کی فکر تھی اور نہ ہی کوئی اور سوائے آنکیت کے۔

”وکیل ڈارنگ!“ اس نے اسے آہستہ سے کہا کیونکہ ارد گرد بہت سے لوگ جمع تھے اور ملک منصور ایک جانی پہچانی شخصیت تھی۔ وہ پریس سے نہیں ڈرتا تھا بلکہ پریس اس سے ڈرتا تھا۔ کوئی بھی ایسی خبر جو ملک منصور کو ناراض کرتی تو پھر اس کے بعد اس اخبار کے ایڈیٹر سمیت کسی کی بھی خیر نہ ہوتی۔ وہ اس گندی مچھلی کی طرف کنڈی ڈالنے سے پہلے ہزار دلعہ سوچتے لیکن پھر بھی وہ جھٹکا دیتا۔

ملک منصور نے جیسے ہی گاڑی کا دروازہ کھولا تو مدھوش کرنے والی پھولوں کی خوشبو نے آنکیت کا بھرپور استقبال کیا۔ وہ چونک گئی۔ گاڑی میں ہر طرف رنگ برنگے پھولوں کے گلدستے بوندے قرینے سے رکھے تھے۔ گاڑی کے فرش اور سیٹوں پر گلاب کی پتیوں کا ڈھیر تھا۔ ایسی پتی پرانی، ایسی محبت..... اس نے محبت اور حیرت سے ملک منصور کی طرف دیکھا۔ اس کے لیوں پر پھیلی مسکراہٹ اور آنکھوں سے جھلکتی مستی نے اسے اور سرور کر دیا۔

”اتنا سب کچھ.....؟“ وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی اور گاڑی کی سیٹ سے چپاں صاف کرتے ہوئے بٹھی۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں آنکیت! اس دن کا سوچو جب تم مسز منصور بن کر ملک منصور کے دل کے تاروں کو چھینرو گی اور پھر اس دھرتی پر تم اپنے آپ کو جنت میں محسوس کرو گی۔ ہر شے تمہارے قدموں میں ہو گی۔ تم نے مجھے بہت خوش کیا ہے۔“ وہ گاڑی کا ٹرن لیتے ہوئے ایئر پورٹ سے نکلنے ہوئے بولا اور اس کے کندھے پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھا۔

”کیا میں واقعی..... آئی مین آئی ڈونٹ بلیواٹ!“ وہ جھینپتے ہوئے بولی۔

”میں نے قسمیں کھانا تم اپنے آپ کو اس دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھاؤ وہاں تم لاہور میں نہیں رہو گی۔“

”تو پھر کہاں؟“

”اسلام آباد میں..... بلیو ایریا میں، میں نے تمہارے لیے ایک ویل فرنشز گھر خریدا ہے اور جانتی ہو اس میں ہر چیز تمہاری چوائس کی ہے۔“

”مثلاً؟“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔

”اس کے کمرے، کارڈس، کراکری، فرنیچر، پیسنگز، سارا ڈیکور، ہلڈز سے لے کر آنکلیٹس تک صرف اور صرف تمہاری پسند کا خیال رکھا ہے۔“

”آپ کو میرا ٹیٹ کیسے معلوم ہوا؟“

”ایک ایرانی انٹریٹر ڈیکور کرنے سے ڈیکورٹ کیا ہے اور وہ برصغیر تک تمہاری بہن اور بھائی سے لیتا رہا ہے۔ یہ ایک سر پرانز تھا جو میں تمہیں دینا چاہتا تھا۔“

”لیکن میں نے تو یہاں آنے کا فیصلہ کل کیا تھا۔“

”مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گی۔“ وہ مکارانہ مسکراہٹ سے بولا۔

”آپ کو کیسے معلوم تھا؟“ آنکیت کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

”مجھ اپنی محبت پر اعتماد تھا اور ایسے بھی محبت میں اتنی ٹرپ ہوتی ہے کہ کسی کو مزاحمت کرنے کا موقع نہیں دیتی۔“

"آپ بہت کونفیڈنٹ ہیں۔"

”ہاں وہ تو میں ہوں۔“ وہ ہتھکڑیاں لگا کر بولا۔ ”آج تم ریست کرنا۔ کل ہم اسلام آباد چلیں گے۔ پہلے تمہارا گھر تمہیں دکھاؤں گا پھر اس گھر میں تمہیں بٹھاؤں گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہاں میری ایک دو کمٹنٹس بھی ہیں۔“
 ”کیسی کمٹنٹس؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”کیسی سنس؟“ اس نے چمک کر پوچھا۔

”جوائنٹشن ہوئے ہیں اس کی پالیسیوں کے سلسلے میں ایک رپورٹ تیار کرنی ہے۔ رات کو ہی مجھے بی بی سی کی طرف سے فیکس موصول ہوا ہے۔ بہت اہم اور ریکرڈ ہے۔“

"نہیں نہیں۔۔۔ اب تم مردان کاموں میں دلچسپی نہ لو ہم اپنی زندگی شروع کرنے والے ہیں اور ایسی مصروفیات بلکہ تم جاب ہی چھوڑ دو۔"
 "نہیں منصوصاً اب یہ محفل جاب نہیں بلکہ میرے لیے ایک ڈشٹن بن چکا ہے۔ کیا آپ میری جاب کے خلاف ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔
 "نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔۔۔۔۔ میں تو لبرل ورکنگ ویمن کو پسند کرتا ہوں۔ زندگی میں قمرل تو انہی عورتوں کی وجہ سے ہے اور مجھے زندگی میں
 قمرل بہت پسند ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "تو پھر کب شادی کا پروگرام ہے؟" وہ بات کا رخ موڑتے ہوئے بولا۔
 "دس پندرہ دن کے بعد پہلے میں وہ کام مکمل کر لوں پھر۔"

”نہیں منصور! اب یہ محفل جاب نہیں بلکہ سرے لیے ایک ڈاشن بن چکا ہے۔ کیا آپ میری جاب کے خلاف ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔
 ”نہیں نہیں، ہرگز نہیں..... میں تو لبرل ورکنگ ویمن کو پسند کرتا ہوں۔ زندگی میں تحرل تو انہی عورتوں کی وجہ سے ہے اور مجھے زندگی میں پسند ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”تو پھر کب شادی کا پروگرام ہے؟“ وہ بات کا رخ موڑتے ہوئے بولا۔

”نہیں نہیں، ہرگز نہیں..... میں تو لبرل ورکنگ ویمن کو پسند کرتا ہوں۔ زندگی میں قمرل تو انہی عورتوں کی وجہ سے ہے اور مجھے زندگی میں قمرل بہت پسند ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”تو پھر کب شادی کا پروگرام ہے؟“ وہ بات کا رخ موڑتے ہوئے بولا۔

”وہیں پھر وہ دن کے بعد، پہلے میں وہ کام مکمل کر لوں پھر۔“

”لٹیک ہے ڈیزائز یوڈس! تم میرے پاس ہو یہ احساس ہی میرے لیے بہت خوش کن ہے۔“ اس نے گاڑی آواری میں داخل کرتے ہوئے کہا۔ دونوں نے پہلے ڈنر کیا اور پھر ملک منصور نے اسے اس کا کمراد کھایا۔ اس نے اپنے لیے ایک دوسرا کراک کر دیا تھا اور آٹھکے کو اس کی یہ ادا بہت پسند آئی تھی۔ اس کی شرافت پر اور یقین آ گیا تھا۔ اس کا انتخاب بہت بہتر تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی اور سنے بنے گئی۔

اگلے دن وہ اسلام آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ ملک منصور نے گاڑی خود درایو کرنے کا پروگرام بنایا۔ بائے ایئر جانے سے سفر کا لطف نہیں آتا اور وہ اس کی رفاقت اور سفر کی طوالت دونوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ آنکھیں بھی اندر ہی اندر بہت خوش تھیں۔ اپنا گھر دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ اس قدر خوبصورت، ہر چیز اور ہر کمر واقعی اس کی چو اُس کا تھا۔ سب اس کی سوچوں سے بڑھ کر حسین تھا۔

”پسند آیا؟“ ملک منصور نے اس کی آنکھوں سے چمکتی مسرت دیکھ کر پوچھا۔

”پسند آیا؟“ ملک منصور نے اس کی آنکھوں سے چھلکتی مسرت دیکھ کر پوچھا۔

”واذا اس رتلی امیرنگ..... وغرقل ا“ و دیرانی سے بولی۔

”نہیں، یہ ایمرنگ تپ لگے گا جب تم اس میں چلتی پھرتی نظر آؤ گی۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”کیا آپ واقعی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں؟“ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”اگر کبھی ہوتا اپنا دل کھول کر دکھا دوں۔“ اس نے اسے بازوؤں کے حصار میں مضبوطی سے جکڑتے ہوئے کہا۔

”ہنس، مجھے آپ پر پورا یقین ہے۔“ وہ بھی مسکرا کر بولی۔ اسی لمحے آنکھ کا موبائل بجنے لگا۔

”افنو! یہ کون ہے؟ کہاں سے آئیگا؟“ ملک منصور نے عی اس کا موبائل پکڑتے ہوئے عجبتاًتے ہوئے کہا اور نمبر دیکھا۔

”آئیٹ! یہ نمبر کس کا ہے؟ بہت عجیب سا ہے۔“ اس نے موبائل پر نمبر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

”معلوم نہیں، آپ نے بات نہیں کی۔“

”نہیں، میری آواز سن کر شاید کسی نے بند کر دیا ہے۔“

”شاید آفس سے کسی کا ہو۔“

”نہیں، ہے تو پاکستان سے کال مگر نمبر کچھ مختلف ہے۔ بہر حال چھوڑو اس بات کو، مگر قسمیں پسند آیا؟“

”ہاں، بہت زیادہ۔“

”ٹھیک ہے، اب میرے میں تمہارا اسٹے ہے۔ کیا تم اسلام آباد میں کچھ روز رکھنا چاہتی ہو؟“

”ہاں، ایک دو روز۔“

”ٹھیک ہے، میں کل صبح واپس لاہور چلا جاؤں گا۔ آج ایک دوست کے ہاں پارٹی کی اہم میٹنگ کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔ تم اپنا خیال

رکھنا۔ آؤ اب میں قسمیں ہوٹل ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ وہ مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ باہر موسم بہت ٹھنڈا اور ہاتھ مگر گاڑی میں ہر طرف حرارت تھی۔ ملک منصور کی قربت کی اور اس کے سگار کی بھٹی بھٹی مہک، اس کے گلون کی اور اس کی باتوں کی خوشبو ہر طرف ایک خوشگوار سا احساس تھا۔

”تمہارے لیے ایک اور سر پرانز ہے۔“ ملک منصور نے کہا۔

”کیا؟“ وہ چونکی۔

”قسمیں پر فیوچر، اٹالین جیولری اور وائٹ گولڈ وڈ آئینڈ بہت پسند ہیں نا۔ میں نے یہ سب امریکا اور فرانس سے منگوائے ہیں۔ ایک دو

www.pdfbooksfree.pk

روز میں سب کچھ یہاں پہنچ جائے گا۔“

”رنجی!“ وہ پھر حیرت سے بولی۔

”ہاں، میں نے کہا نا کہ تم.....“ ایک مرتبہ پھر آئیٹ کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے چونک کر نمبر دیکھا۔ اب دوسرا نمبر تھا۔ وہ ہیلو ہیلو کرتی

رہی مگر فون بند ہو چکا تھا۔

”آئیٹ! یہ کون ہو سکتا ہے جو اس طرح ڈسٹرب کر رہا ہے۔ تم اپنا موبائل منیج کر لو۔“ وہ قدرے خشکی سے بولا۔

”اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ بعض اوقات سگنلز ٹھیک طرح سے نہیں جاتے۔ اگر رانگ کالز بھی ہوں تو ہمارا کیا جاتا ہے۔“ وہ

بہت سکون سے بولی۔ ملک منصور کو اس کے لہجے کی سچائی پر یقین آ گیا۔

”اچھا اپنا خیال رکھنا اور کوئی مسئلہ ہو تو مجھے رنگ کر لینا۔“

”گڈ نائٹ!“ اس نے اسے ڈراپ کرتے ہوئے کہا۔

”گڈ نائٹ!“ وہ بھی مسکراتے ہوئے بولی اور ہال میں داخل ہو گئی۔



مدرخ بہت خوش تھی۔ اس کی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ آفاق اسے لے کر گھر جا رہا تھا۔ اس نے اسے کتنی مشکل سے منایا تھا۔ کیسے کیسے حریجے آزمائے تھے تب وہ کہیں جا کر مانا تھا۔ وہ بھی جیسے جیسے اس کے نروں پر کنٹرول کرنا سیکھ رہی تھی ویسے ہی وہ اس کے ہاتھ میں کھ پکلی بننا جا رہا تھا۔ بعض اوقات تو وہ بالکل اس کے اشاروں پر یوں تاجتا جیسے روبوٹ ہو اور اس کا ریوٹ کنٹرول مدرخ کے ہاتھوں میں ہو۔

”آفاق اہم سیدھے گھر ہی جائیں گے نا؟“ مدرخ نے جہاز میں اس سے پوچھا۔

”نہیں، پہلے ہوٹل میں اسٹے کریں گے۔ کل صبح گھر جائیں گے۔“

”آفاق اتم سوچ نہیں سکتے میں کس قدر خوش ہوں۔“

”اس میں اتنی خوشی کی کیا بات ہے؟“ وہ بدولی سے بولا۔

”تم نہیں سمجھ سکتے۔ ساری زندگی ایک گھر کی خواہش میں، میں نے کیا کیا پڑ نہیں پیلے اور اب خدا مجھے میرے اپنے گھر سے نوازنے لگا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں خوشی سے پانی بھر آیا۔ آفاق اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا اور گہری آہ بھری۔

اگلے دن دو بجے کے قریب جیسے ہی آفاق اور مدرخ نے گھر میں قدم رکھا، ہر طرف چھائی یا سیت، مایوسی اور ستانے نے ان کا استقبال کیا۔ اتنا بڑا گھر اور ہر طرف چھائی اُداسی..... زندگی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ آفاق نے لاؤنج کا دروازہ کھولا تو لاؤنج میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے بیڈروم کی طرف بڑھا تو کمرے میں پھیلے دھوئیں اور سگریٹ کی مخصوص بو نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ محرکار پٹ پر بری حالت میں پڑی تھی۔ سگریٹ ایش ٹرے میں آدھ جلا پڑا تھا۔ اس میں سے ہلکا سا دھواں نکل رہا تھا۔ ہر طرف سگریٹ اور پڑیوں کے ٹکڑے اور راکھ بکھری پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر ایک دم آفاق کو دھچکا سا لگا۔ وہ جب اسے چھوڑ کر گیا تھا تو وہ ایسی نہیں تھی۔

”سحر..... سحر..... اٹھو..... یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“ آفاق اس کے اوپر جھکتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھیں اور ان کے گرد پھیلے سیاہ حلقے اس کی داستانِ فراق اور غم سنار ہے تھے۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔

”کون آفاق..... آفاق تم آگئے..... کب آئے.....؟“ وہ اس کے بازوؤں میں جھولتی ہوئی اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔ مدرخ حقارت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ہاں، میں آ گیا ہوں۔“

”تم کہاں چلے گئے تھے؟“

”یہیں تھا، اب آ گیا ہوں۔ اب نہیں جاؤں گا مگر تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“

”جب سے تم مجھے چھوڑ کر گئے ہو..... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم جانتے ہو نا؟“ وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ مدرخ کو اس کی باتوں پر غصہ آ رہا تھا اور آفاق اس کی دل جوئی میں مصروف تھا۔ اس نے اسے اٹھا کر بیڈ پر لٹایا۔

”آفاق! کیا تم نے مدرخ سے شادی کر لی؟“ وہ آنکھیں بند کیے مدھوشی کے عالم میں بول رہی تھی۔ آفاق خاموش رہا اور ایک بجک

دروازے کے پاس کھڑی مدد کو دیکھا۔

”تم بے شک شادی کر لو گھر اس کو گھر نہ لانا۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، کیا ہے نا۔“ وہ یکدم خاموش ہو گئی اور مدد کو آفاق کے سارے بہانے اور گھر نہ لانے کی حیلہ بازیوں یاد آنے لگیں۔ ”تو یہ بات تھی۔“ اس نے دل میں دہرایا۔ وہ اسے بستر پر لٹا کر مدد کے پاس آیا۔

”آؤ، میں تمہیں شفق کے کمرے میں لے چلتا ہوں۔ وہ بھی نظر نہیں آ رہی۔ شاید کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔“ آفاق قدرے غصے محسوس کر رہا تھا۔ مدد خاموشی سے اس کے ساتھ باہر آ گئی تو شکیل لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ شاید وہ ابھی آئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں جوس اور پانی کا گلاس تھا۔ وہ ٹیبل پر رکھے جوس اور پانی کو ایک دوسرے میں اٹھیل کر دیکھ رہی تھی۔

”ہیلو شکیل اکیسی ہو؟“ آفاق نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”تم کون ہو اور یہ لڑکی..... ہمارے گھر میں چور کہاں سے کس آئے۔ ماما..... ماما..... چور آ گئے..... چور..... چور.....“ وہ اونچی آواز میں چیخنے لگی۔ شزا اپنے بیڈروم سے بھاگتی ہوئی آئی تو سامنے آفاق اور مدد کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

”اوہ تو یہ تم ہو۔“ اس نے تکیں نظروں سے مدد کو دیکھ کر کہا۔ شکیل ابھی بھی چیخ رہی تھی۔

”چپ کرو شکیل! یہ چور نہیں بلکہ نئی دلہن کے روپ میں چور آئی ہے۔ واقعی تمہاری اندر کی آنکھیں کھلتی ہیں۔“ وہ دھڑ سے چپتے ہوئے لہجے میں بولی تو مدد گڑبڑا گئی۔

”پلیز مسر منصور! ماضی کو دہرانے سے فائدہ۔“ وہ قدرے غصے سے بولی۔

”ہاں بھئی، واقعی ماضی کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم لوگ تو اپنے مقصد میں ویسے بھی کامیاب ہو چکی ہو۔ تم اور تمہاری بہن..... ایک نے پانچ بچوں کے باپ کو پھنسا لیا اور ایک نے اتنے امیر باپ کے بیٹے کو..... واقعی کیا کہنا۔“

”ہاں تو بسا بھی تو آپ نے ہی بچائی تھی۔ ہم تو بس مہرے تھے۔ ملک منصور کو پھنسانے کے لیے مجھے ہی بھیجا تھا نا۔ وہ تو آپ کا پول کھل گیا ورنہ.....“ اس نے بھی وار کیا تو شزا اٹھلانے لگی۔

”آفاق! تم اسے اس گھر میں نہیں رکھ سکتے۔“

”کیوں، آپ کون ہوتی ہیں اسے روکنے والی؟“

”ایک گند تو سنبھالا نہیں جا رہا اور ایک اور لے آئے ہو۔ یہ گھر ہے کہ کوڑا دان۔“

”اس گھر میں ویسے بھی کوڑا ہی آتا رہا ہے۔ پھول تو کبھی نہیں جے۔ جہاں اتنے ہیں وہاں یہ بھی سہی۔“ آفاق نے اس پر وار کیا تو اس نے خشکیں ٹکا ہوں سے اس کی طرف دیکھا اور شکیل کا بازو پکڑتے ہوئے اندر چلی گئی۔ وہ اس کو لے کر شفق کے کمرے میں چلا گیا۔ ہر چیز پر گردی چھائی تھی اور چیزیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ یوں معلوم ہو رہا تھا نہ جانے کب سے کمر اس کے بغیر خالی پڑا ہو۔

”آفاق! اس گھر میں میرا کمر کون سا ہے؟“ وہ جو کچھ سوچ کر آئی تھی سب کچھ اس کے برعکس تھا۔ وہ قدرے تکی سے بولی۔

”جہاں سما سکتی ہو، سما جاؤ۔“ وہ بھی اکڑ لہجے میں بولا۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ گھر اس قدر.....“

”میں اسی لیے تمہیں یہاں نہیں لانا چاہ رہا تھا۔“

”یہی وجہ تھی یا کچھ اور.....؟“ اس نے طرہ لہجے میں پوچھا۔

”کیا مطلب؟“

”مجھے تو لگا جیسے کسی کی محبت میں تم ایسا نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔“

”یہ تمہارا وہم ہے۔“

”وہم پر بھی حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے جب حقیقت خود بخود سامنے آ جائے۔“

”جو مرضی چاہے سمجھو۔“ وہ غصے سے بولا۔

”تم مجھے بتاؤ میں کہاں جاؤں؟“

”مجھے نہیں معلوم، جہاں جانا چاہتی ہو جاؤ۔ جہاں رہنا چاہتی ہو رہو۔ بس مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔“ وہ پھر اپنے حواس کھونے لگا اور وہ اس کی

بات سن کر خاموش ہو گئی۔ وقت اور عقل مندری کا تقاضا بھی یہی تھا کہ خاموشی سے پھولشن کو وینڈل کیا جائے۔

”تم ادھر لیٹ جاؤ۔“ اس نے بیڈ پر سے کھڑے کپڑے اٹھا کر ادھر ادھر کرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے لیٹ گیا تو اس نے اس کے

پاؤں کے انگوٹھوں اور انگلیوں کی پوروں کو اپنی انگلیوں سے دبانا شروع کیا تو وہ جیسے بڑے سکون ہونے لگا۔ اس کے پاؤں کو اپنی گود میں رکھے ہوئے وہ

گہری سوچ میں تھی۔ یہاں سب کچھ بہت منتشر ہے اور یہاں گزارہ کیسے ہوگا اسی لیے آفاق ایسا ہے۔ انسان کی سوچ پر اس کے ماحول کا گہرا اور دیرپا

اثر ہوتا ہے۔ گروڈ پر سٹائٹی کے چپے ہمیشہ گروڈ ماحول ہوتا ہے۔ تمام بکھری اور ادھوری شخصیات ہمیشہ منتشر ماحول اور غلامی پر دان چڑھتی ہیں اور

یہی غلام ساری زندگی ایک کی بن کر محسوس ہوتا رہتا ہے۔ ایسی شخصیات کبھی بھی گھر کر سامنے نہیں آتیں۔ ہر طرف خلائی غلام نظر آتا ہے۔ اکثر بوجھا کلب

میں پر سٹائٹی ڈیو پلینٹ کے حوالے سے یہی باتیں ڈسکس ہوتی تھیں۔ شائل، آفاق اور عورتوں ایک ہی ماحول کے پروردہ نظر آ رہے تھے۔ اس نے

اس کی طرف دیکھا۔ اب وہ بڑے سکون ہو کر سو رہا تھا۔ وہ انہی اور کمرے میں چکر لگانے لگی۔

وہ حکمزد بھی تھی اور شاطر بھی۔ بچپن سے دونوں بینس کس کس طرح کے حالات کا سامنا کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھیں۔ ماں باپ کی

وقات کے بعد خالہ کے گھر، خالہ کے گھر سے بچھو کے گھر اور وہاں سے ورنگ و بھن ہاٹل اور پھر وہاں سے آشیانوں کی تلاش میں سرگرداں، کیسے

کیسے مردوں کے ہاتھوں ذلیل ہوئیں جہاں قدم رکھتیں وہ ریت کے نیلے ثابت ہوتے۔ دیسے بھی گھروں کی بنیاد رشتے ہوتے ہیں اور رشتوں کی

بنیاد محبت، جذبے اور سچائیاں ہوتی ہیں اور یہاں سب کچھ مفلوک تھا۔ جس گھر کی تمنا میں وہ تربتی ہوئی یہاں تک آئی تھی وہ تو سرائے بھی ثابت نہیں ہو

رہا تھا جہاں سانس لینے کو انسان کچھ لمبے ہی بڑے سکون ہو کر گزارے۔

شہزادہ بحر، آفاق، شہناز اور سب سے بڑھ کر ملک منصور..... کوئی ایک رشتہ بھی مضبوط نہیں تھا۔ کسی ایک میں بھی نہ زندگی کی سچائی تھی اور نہ ہی اصلی چمک..... آفاق بھی کردار کا بودا تھا۔ اس پر بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسے ایک دم یہ گھر شیشے کا لگنے لگا۔ ٹوٹتا ہوا، بکھرتا ہوا، کرہچی کرہچی ہوتا ہوا اور وہ جیسے نگار انگلیوں کے ساتھ ان کرہچیوں کو سپینے میں مصروف تھی اور انگلیوں کے ساتھ ساتھ روح بھی زخمی ہوتی جا رہی تھی۔ محبت کہیں نہیں۔ عورت دھوکے میں آ جاتی ہے۔ مرد کی خود ساختہ محبت کے دام میں۔ اس کے سائے کو سایہ بریں سمجھتی ہے اور اپنی زندگی تباہ دیتی ہے مگر ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔ کبھی مجبور یوں کے ہاتھوں تو کبھی جذبیوں کے ہاتھوں۔ سب کچھ اکارت جاتا ہے۔ اب اسے کوئی راہنما نظر نہیں آ رہی تھی۔

اگلے دن آفاق دیر سے اٹھا اور جیسے ہی باہر نکلا، بحر لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ وہ کل سے قدرے بہتر لگ رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی حواسوں میں، آفاق کو دیکھ کر اس کی طرف لپکی۔

”تم کہاں چلے گئے تھے اور شفق کے کمرے میں کیوں؟“ اس سے قبل کہ آفاق کچھ کہتا مہدیٰ اس کے پیچھے آگئی۔

”یہ... ک... گک... کون؟“ اس نے حیرت سے آفاق سے پوچھا۔

”میں مہر خ ہوں۔“ وہ خود ہی بولی۔

”62 ق... تم... تم... تم نے... اور اسے گھر بھی لے آئے۔“ وہ بدحواس ہوتے ہوئے غصے سے پھٹ پڑی۔

”ہاں، تو اس میں تمہیں کیا مسئلہ ہے؟“ مہر خ نے غصے سے کہا۔ آفاق شرمندگی سے دونوں کے درمیان کھڑا تھا۔

”آفاق! میں تمہارے ساتھ کسی اور کی جھلک بھی اس گھر میں نہیں دیکھ سکتی۔ تم نے مجھے بے باوکیا میں خاموش رہی۔ تم مجھے مارتے پیٹتے رہے میں چپ رہی۔ تم نے مجھ سے میرے وجود کی شناخت اور زندگی بھی چھین لی۔ میں تڑپتی رہی مگر خاموش رہی مگر میں نے تم سے صرف ایک بات کہی اور تم وہ بھی نہ کر سکے۔ آفاق! کاش..... کاش میں تمہارے لیے اتنی بددعا نہیں کر سکتوں کہ تم زندگی کی ایک ایک سانس کے لیے اس طرح تڑپو جس طرح میں تڑپتی رہی ہوں۔ جیسے کبھی میں دور سے ایک ایک روپے کی بھیک مانگتی تھی تم بھی ایسے زندگی کی بھیک مانگو۔ کاش میں ایسا کر سکتی۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آفاق کچھ نہ بولا اور پوچھل قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں واپس چلا گیا۔

”سنو! اب یہ تمہارا گھر نہیں۔ صرف اور صرف میرا گھر ہے اور میں اس گھر کو تمہارے گندے، تھکن زدہ وجود سے جلد از جلد پاک دیکھنا چاہتی ہوں۔ خود ہی یہاں سے نکلنے کی راہ لو ورنہ مجھے یہ کام خود کرنا پڑے گا۔“ مہ درخ اس کے قریب بیٹھ کر سرگوشیوں کے انداز میں اسے دھمکیاں دینے لگی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مہ درخ کی طرف دیکھا جیسے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ شزا اور ملک منصور اس کے بہت خلاف تھے۔ اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے مگر آج تک کسی نے بھی اسے یوں گھر سے نکلنے کو نہیں کہا تھا اور وہ تو آتے ہی اس کے سر سے ساتباں اور قدموں کے نیچے سے زمین چھیننے کی بات کر رہی تھی۔ اس کا وجود خطرے میں تھا۔ اسے ہر طرف خطرے کی گھنٹیاں سنائی دینے لگیں اور وہ خوفزدہ ہو گئی۔

”اور تم مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔“

ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ چاروں طرف دبیز پردے اور نخل یسپ کی مدھم روشنی سے پھیلی ٹخن میں وہ جیسے اپنے آپ کو کسی قبر میں محسوس کر رہا تھا۔ آیت کی آواز مسلسل اس کے دماغ میں گونج رہی تھی جیسے دماغ کے ہر خلیے سے چپک گئی تھی۔ اس نے صبح سویرے لی وی آن کیا تو یہ آیت سن کر اس کے اندر ایک دم کوئی لاوا سا جوش مارنے لگا۔ اس نے غصے میں جلدی سے چھیل بدلا مگر وہ تو جیسے اعلیٰ کی طرح اس کے دماغ سے چپک گئی تھی۔ وہ بار بار ذہن سے جھٹکتا، اپنے آپ کو مختلف سوچوں میں الجھاتا۔ جھنجھلا کر اپنے آپ کو کوستا کہ اس نے کیوں لی وی آن کیا۔ یہ مسلمانوں کا پروپیگنڈا..... اس کا دل اندر ہی اندر کتنا ہڈیاں بک رہا تھا مگر کسی طور اسے تسلی ہی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ جتنا جھنجھلاتا، جتنا ہڈیاں بکتا وہی الفاظ بھر نہ جانے کہاں سے اچانک آ کر اسے جس نہیں کر دیتے۔ سارا دن وہ اپنے آپ سے لڑتا کر اور الجھ الجھ کر تھک گیا تھا اور جیسے ہی اس نے سونے کی کوشش کی بھر وی آیت اس کو موٹے نہیں دے رہی تھی۔

”اوہ گاڈ.....!“ وہ بڑبڑایا۔ ”اوہ.... کرائسٹ.....“ وہ کہتے کہتے نادانستہ رک گیا۔ ”سٹیٹ سے وحدانیت کی طرف کیوں نہیں آتے۔“ نور بلارہی تھی۔ ”میں الجھ گیا ہوں، کہاں پھنس گیا ہوں، میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں کہاں جاؤں؟“ وہ اپنے آپ کو بے حد شکست، جھنجھلایا ہوا، کمزور و بے بس، مظلوم و ناکارہ انسان سمجھ رہا تھا جو صرف اور صرف اپنی ایک سوچ پر بھی قادر نہیں تھا۔ وہ اس سوچ کو جھٹلانا چاہتا تھا اور وہ نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ وہ محض اس ایک آیت کو اپنے دماغ سے کھرچ نہیں سکتا تھا۔ ”ولیم! تم بے حد کمزور انسان ہو، بہت بڑے.....“ وہ سر پکڑ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہر طرف تاریکی پھیل گئی تھی۔ ایسی تاریکی جو کالے ناگ کی طرح پھن پھیلائے اسے۔ بے لحد دس رہی تھی۔ وہ اتنا جھنجھلا گیا کہ رونے لگا۔

”گاڈ! مجھے صرف ایک لمحے کی پرسکون نیند دو۔ آئی ریگسٹ ہو.....“ اس کا دماغ زور زور سے بج رہا تھا۔ جیسے بولتے بولتے اچانک ہلپنے لگا ہو۔ جیسے تیز تیز چلتے ہوئے رک جانے پر دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہو۔ دل کی دھڑکن کی طرح دماغ بھی مسلسل دھڑک رہا تھا۔ ٹک ٹک..... ٹک ٹک..... اور وہ اسے خاموش نہیں کر پا رہا تھا۔ ”چپ کر جاؤ..... خدا کے لیے چپ کر جاؤ۔ میں پورا دن الجھا رہا ہوں۔ سو نہیں پایا۔“ اس نے اپنے سر کے بالوں کو کھینچنا شروع کر دیا۔ جتنی زیادہ وہ التجائیں کر رہا تھا اتنا ہی زیادہ الجھ رہا تھا۔ اس نے یسپ کی روشنی میں جہنم میں کود دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر پیا مگر کوئی شے بھی اندر کی جھنجھلاہٹ کو کم نہیں کر پا رہی تھی۔

”آئی ہیٹ مسٹر.....“ وہ تسلی دینے کے لیے اپنے آپ سے بولا۔ ”آئی ہیٹ ویم آل..... آئی ہیٹ.....“ وہ چلانے لگا اور جیسے ہی خاموش ہوا، اندر سے آواز ابھری۔ ”اور تم مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔“

”کیوں کیوں میں مسلم..... نہیں..... یہ کبھی نہیں ہوگا۔“ وہ چلا چلا کر جواب دینے لگا۔ اس کی چیخوں نے سکوت کے پردے کو تار تار کرنا شروع کیا۔ ہر طرف مرقش آواز کی لہریں کائنات کے سکون کو درہم برہم کرنے لگیں۔ شہلا اس کی آواز سن کر ایک دم بیدار ہو گئی تھیں۔ ان کا دل لرزنے لگا۔ خدا غور است کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو رہا تھا۔ رات کے اس پہر اس کی چھین، اللہ نہ کرے یا اللہ اس پر کرم کر، اپنا رحم کر، اس طرح جس دلیل

میں اور پھنوس میں پھنسے انسانوں اور اپنی مخلوق پر کرتا آیا ہے۔ شہلانے انٹنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکیں۔ لیٹے لیٹے دونوں ہاتھ دعا کی صورت میں اوپر کی طرف بلند کیے۔

بہت عرصے کے بعد وہ اپنے خدا سے کچھ مانگ رہی تھی۔ بالکل اس طرح جب حیدر کے لیے وہ لیٹے لیٹے، اٹھتے بیٹھتے اچانک ہاتھ فضا میں بلند کر کے دعا کرتی تھی۔ حیدر نہ ملا تو اس نے دعائیں کرنا بھی چھوڑ دیں اور عبادت بھی۔ خدا سے سرگوشیاں بھی چھوڑ دیں اور مناجات بھی۔ آج جب اچھے عرصے کے بعد ولیم کے لیے ہاتھ اٹھائے تو آنسوؤں کی جھری لگ گئی، نادانستہ یادداشت صرف دو ہفتیوں کے لیے وہ دل کی گہرائی سے اپنے رب کو پکار رہی تھی۔ اس نے تو اپنے لیے بھی اس کو پکارنا چھوڑ دیا تھا جو کبھی اس کا بھی محرم راز تھا اور پھر وہ کیسے بدل گئی یا پھر زمانے نے اسے بدل دیا۔ وہ لمحہ اسے یاد آنے لگا جب وہ پیٹر کے ساتھ چرچ میں داخل ہو رہی تھی۔ پیٹر صرف نام کا کرچن تھا اور وہ نام کی کچھ بھی نہیں رہی تھی۔ ملک منصور نے اس سے اس کے وجود کی شناخت اور اہمیت چھینی تھی اور پیٹر نے اس کا ذہن..... وہ تو نکلتے گارے کا خالی وجود رہ گئی تھی جو جہاں چاہے رکھ دے، جہاں چاہے بیچ دے۔ جب چاہے توڑ دے اور جس وقت چاہے چھوڑ دے۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اسے اس کے گناہ پر اس کا ضمیر سرزنش کرنے لگا۔ اس نے قرآن کے حکم کو ٹالا تھا۔ ”اور مسلمان عورتیں مشرک مردوں سے نکاح نہ کریں۔“ اس وقت تو وہ انڈمی ہو رہی تھی۔ اپنی ذات کے نشے میں خود کو کھود یا تھا۔ اس نے اپنے رب کا فرمان ٹالا تھا۔ اس کی حدوں کو پار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے قرآن پڑھا تھا مگر سب کچھ بھلا دیا تھا اور اس وقت ضمیر نے بھی اسے نہیں سمجھوڑا تھا جیسے اب سمجھوڑ رہا تھا۔ ولیم کی چٹخیں بلند ہو رہی تھیں اور وہ بستر پر ایڑیاں رگڑتی ہوئی تڑپ رہی تھی۔ وہ کتنی بے بس، کمزور اور نادان انسان تھی۔ کیا یہ سب میرے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ میں یوں سسک سسک کر مر رہی ہوں اور ولیم نہ جانے کس لیے تڑپ رہا ہے۔ وہ بھی بستر پر ایسے ہی ایڑیاں رگڑ رہا ہے جیسے میں موت مانگتی ہوں اور وہ زندگی مگر دونوں کو کچھ بھی نہیں مل رہا۔ یا اللہ! مجھے معاف کر دے۔ اس کا دل چاہا کسی طرح اٹھے اور اپنے رب کے حضور ماتھا رگڑ رگڑ کر معافیاں مانگے مگر شاید اب اس کا وقت نہیں رہا تھا۔ اسے اس کی توفیق نہیں ہو رہی تھی۔ معافی مانگنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ اس کے دربار میں جانے کے لیے ناگوں میں سکت نہیں رہی تھی۔ اس کے سامنے کھڑے ہونے کا اذن نہیں مل رہا تھا۔ ”وہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔“ ایک آیت اس کے ذہن میں ابھری۔ آنکھیں پھر چشموں کی طرح اُٹل پڑیں۔ ولیم اسے اپنا گناہ لگ رہا تھا۔ جس بات سے خدا نے روکا تھا وہ اس فجر منوعہ کا شمر تھا۔ وہ اب کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس کے دل سے آواز آئی۔ نہیں..... یا اللہ! یہاں نہ کرنا۔ تجھے تجھے تیرے محمد ﷺ کا واسطہ..... محمد ﷺ کا نام زبان پر آتے ہی وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

”کیا تم اس قابل ہو کہ اس ہستی کا واسطہ دو جس کی عظمت، ذات، اخلاق اور معصومیت کی پروردگار قسمیں کھائے..... کائنات کا مالک..... ارض و سما کا خالق اپنی محبوب ہستی کو بھلانے والے پر غضب ناک ہوتا ہے۔ کیا تم ہو اس قابل.....؟“ ایک اور آواز نے سرزنش کی۔ وہ اور شدت سے رونا شروع ہو گئی اور مرغ بیل کی طرح تڑپنے لگی۔ اپنے ہاتھ اٹھا اٹھا کر بستر پر مارنے لگی۔ ولیم کی چٹخیں اب ختم گئی تھیں مگر اب اس کے اندر اس کا دل چیخ رہا تھا۔

”تم اس قابل نہیں..... تم اس قابل نہیں.....“ اسے لگ رہا تھا جیسے خدا اس سے بہت زیادہ ناراض ہے اور لمحہ بہ لمحہ دور ہو رہا ہے۔ وہ اسے

روکنا چاہتی تھی گزرا کرتا کہ کرنا چاہتی تھی مگر وہ سن ہی نہیں رہا تھا۔

”ہاں، میں ہوں اس قافلہ..... نہ تو میں نے تیری ذات میں کسی کو شریک ٹھہرایا اور نہ ہی محمد ﷺ کی عہدیت میں شک کیا تو پھر..... تو مجھ سے کیونکر ناراض ہو گیا۔ میں مانتی ہوں میں نے گناہ کیا ہے مگر تو نے بھی تو اپنے آپ کو رحمن اور ان کو رحمت اللعالمین کہا ہے۔ انھوں نے تو کافروں سے بھی درگزر فرمایا۔ میں کافر نہ تھیں۔ تو جانتا ہے میں کافر نہ تھیں۔“ وہ بڑبڑانے لگی۔

”ہاں اور تو ایمان والی بھی نہیں۔“ کسی نے پھر ٹھوکا دیا۔ وہ پھر سکھنے لگی۔ اس کے پاس دلائل ختم ہونے لگے۔ وہ خاموش ہو گئی۔ اندر کی آواز کہیں گم ہو گئی۔ سکوت چھانے لگا اور وہ پریشاں و پشیمانی سی جگہ کو بھگوانے لگی۔ لمحہ بہ لمحہ پتھلی شمع کے موم کے مانند آنسو پٹ آنسو پٹکانے لگی۔ موم پتھلار ہا اور آنسو ٹپکتے رہے اور پھر شمع نہ جانے کب بجھ گئی۔

ولیم سلپینک بلوے کر سور ہا تھا۔ پیٹھے چلاتے ہوئے اس نے دراز میں سے گولیاں نکال کر کھائی تھیں اور پھر وہ کب سو گیا اسے کچھ خبر نہ تھی۔ سارا دن وہ سوتار ہا اور وہ بار بار گنگ سے اس کے بارے میں پوچھتی رہی۔ نور بھی نہیں آئی تھی۔ وہ سور ہا تھا۔ گنگ نے اسے آوازیں بھی دیں مگر وہ گہری نیند میں سور ہا تھا۔

”اے جھوڑ کر، ہلاؤ۔ کہیں وہ.....“ وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے افضل سے کہا۔

”جی ہاں جی“ وہ باہر نکل گیا۔

”اس کی سانسیں دیکھتا۔ وہ..... وہ زندہ تو ہے ناں۔“ اس نے پیچھے سے آہستہ سے آواز دی اور پھر ایک دم خاموش ہو گئی۔ ”خدا نہ کرے اسے کچھ ہو۔ جو بھی کیا میں نے کیا۔ اس کا تو کوئی قصور نہیں۔“ وہ پھر بڑبڑائی۔

”جی وہ کہہ رہے ہیں تھوڑی دیر بعد اٹھیں گے۔“ افضل نے آکر اطلاع دی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ شکر ہے وہ ابھی زندہ ہے۔ جیسے اسے اس کی زندگی کا پروانہ مل گیا ہو مگر وہ رات کو جیج کیوں رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ وہ اس سے کیسے پوچھے۔ وہ تو اس سے تقی سے بات کرنے لگا تھا۔ شام گہری ہونے لگی۔ نہ آج نور آئی تھی نہ ہی حیدر۔ جہاں کی اور اسی سے شدید ڈپریشن ہونے لگا۔ جب ایک دم حیدر کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ اس کے کمرے میں آیا تو حیدرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”آج نور نہیں آئی؟“ حیدر نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں، کیوں؟“ اس نے بھی حیدرانی سے پوچھا۔

”آج تم نے کپڑے نہیں بدلے۔ سہیل آرہی ہے۔“ حیدر آہستہ سے بولا۔ نور روزانہ اسے کپڑے خود چھینج کر داتی تھی۔

”حیدر! یہ میرے جسم کی نہیں، میرے گناہوں کی بدبو ہے۔ میرے گناہوں کے پھوڑے اب پھٹنے شروع ہو گئے ہیں۔“ وہ بے بسی سے

آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب! تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟“

”حیدر! خدا مجھ سے ناراض ہے۔ وہ مجھ سے بات نہیں کرتا۔“

”تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”حیدر! میرا گناہ واقعی ناقابل معافی ہے۔“

”شہلا! قصص کیا ہو گیا ہے؟“

”یو لوٹا! پلیز یو لوٹو..... بتاؤ.....؟“

”وہ رخصت ہے، انسان نہیں۔ وہ تو بس ہر ایک پر مہربان ہے۔“ حیدر نے آہستہ سے جواب دیا۔

”تو پھر وہ مجھے کیوں معاف نہیں کر دیتا۔ ہم جیسوں کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے؟“

”تم جیسے کیا مطلب؟“ حیدر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”جو مسلم، نہ کافر، نہ منافق اور نہ ہی مرتد۔“ حیدر خاموش ہو گیا اور سوچنے لگا۔ وہ اس کے جواب میں کون سی آیت کا حوالہ دے۔ کس

دلیل کو پیش کرے۔ وہ سوچوں میں گم بیٹھا تھا۔

”حیدر! قرآن کہتا ہے کہ اس نے اس واضح کتاب میں کسی شک اور ترشے کا ذکر نہیں چھوڑا تو کیا اس نے ہم جیسوں کا ذکر نہیں کیا۔ ہمارا

ذکر کرنا اس نے پسند نہیں کیا۔ حیدر! اس کے دربار میں واقعی ہماری کوئی جگہ نہیں۔ اس نے واقعی ہمارا ذکر نہیں کیا۔“ وہ رونے لگی۔

”شہلا! قصص کیا ہو گیا ہے۔ کیسی باتیں کرنے لگی ہو۔ تم نے اور میں نے قرآن پاک کا ترجمہ رشید صاحب سے اکٹھے پڑھا تھا کیا تم

بھول گئیں جب وہ کہتا ہے۔ ”وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کے قصور معاف فرماتا ہے اور جو تم کرتے ہو، سب جانتا ہے۔“

حیدر نے چہت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس کے آبلہ پائینے میں جیسے ٹھنڈی پھواری پڑ گئی۔ وہ خاموش ہو گئی۔ حیدر بھی خاموش تھا۔

”ماپوی کفر ہے۔ انسان گناہگار ہے، بھٹک جاتا ہے مگر وہ رخصت ہے۔ وہ بھٹک دل اور بھٹک نظر نہیں۔ اس سے اچھی امید رکھو۔“ حیدر نے

اس کی مضطرب حالت دیکھ کر اسے دلاسا دینا چاہا۔

”حیدر! کیا واقعی وہ مجھے معاف کر دے گا؟“

”یہ تو آنسوؤں کی شدت اور دلوں کی تڑپ میں مضمر ہے مگر مجھے یقین ہے جو عداوت سے اس کی طرف قدم بڑھاتا ہے وہ رحمت کے

دروازے کبھی بھی اس پر بند نہیں کرتا۔“

”حیدر! کیا میرا گناہ معاف کیا جاسکتا ہے؟“

”شہلا! مجھے یہ آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ تم خدا اور اس کے احکامات سے نا آشنا تو نہ تھیں۔ سید صاحب نے قصص قرآن ترجمہ کے

ساتھ پڑھوایا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم عبادت گزار بھی تھیں پھر تم نے فیصلہ کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوچا کہ خدا تم سے ناراض ہو

جائے گا۔ تم اس کی کتنی بڑی حد کو توڑنے جا رہی تھیں۔ کیا واقعی تم نے کچھ نہ سوچا۔ ایک لاعلم شخص پر اتنی حیرت نہیں ہوتی جتنی اس پر جو علم بھی رکھتا ہو

اور عقل بھی۔" حیدر نے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سوال کر ڈالا۔ وہ حیدر کی طرف دیکھنے لگی اور پھر گہری آہ بھری۔

"اسی لیے تو میں اپنے آپ کو ناقابل معافی سمجھتی ہوں۔ حیدر! اس وقت میرے ذہن میں صرف یہی ایک سوچ تھی کہ میں ایک انسان ہوں جس کے کچھ حقوق ہیں اور میں نے کسی بھی بات کے بارے میں نہ سوچا۔ سب کچھ پس پشت ڈال دیا۔ سب کچھ بھلا دیا کہ میں کون ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ کوئی تو مجھے انسان مانے اور مجھ سے انسانوں جیسا سلوک کرے۔ کوئی تو خوشبو جیسی محبت کرے جو ایک سچا انسان دوسرے سے کرتا ہے۔ کوئی تو ہو، کوئی ایک تو ہو۔" اس کی آنکھیں پھر برسنے لگیں۔

"کیا تمہارے لیے یہی کافی نہیں تھا کہ جس "کوئی" کو تم ڈھونڈنے لگی ہو کیا وہ حیدر نہیں؟ تم جانتی تھیں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا تھا اور اسی کی وجہ سے شاید مجھ سے بھی گناہ سرزد ہو گیا۔ میں اپنی بیوی کو وہ محبت نہ دے سکا جو شاید اس کا حق تھا۔"

"حیدر! تم نے ایسا کیوں کیا۔ حقہ اور اس کا حق کیوں نہ دیا؟"

"معلوم نہیں شہلا! شاید اس کے دل میں کوئی گہرہ پڑ گئی تھی یا پھر میرے قدم ہی کسی نے جکڑ لیے تھے۔ ہم دونوں بس اپنی اپنی جگہ ساکت بنے تھے۔ بہت جذباتی، وہ مجھے معاف نہیں کرتی تھی اور میں بھی اسے وہ مقام نہ دے سکا۔ وہ روٹھی رہتی، میں بھی اسے نہ مناتا اور جب مناتا تو وہ نہ مانتی۔ بس زندگی کیسے گزر گئی سمجھ ہی نہیں آیا۔ شہلا ہماری محبت کی نہیں جذباتیت کی پیداوار ہے اس لیے اس میں شعلہ فطانی ہے اور کبھی کبھی ایسی کڑواہٹ اگلتی ہے کہ میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں جس پورے کے بیچ کو محبت سے نہ بویا گیا ہو اس کے پھل سے مٹھاس اور سائے سے ٹھنڈک کی توقع ہی بے بنیاد ہے۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے مجھ سے بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔" وہ آہ بھر کر بولا۔ شہلا اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی اور اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" حیدر نے بلا خزانہ دیر کے بعد سکوت توڑا۔

"سوچ رہی ہوں ہم کیسے بھک گئے۔ انسان کو بھگنے میں صرف چند لمبے لگتے ہیں اور وہ بھگتا جاتا ہے جیسے پیاز کی چوٹی سے لڑھکتا پتھر گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ شاید انسان بھی اسل ترین کھانوں میں جا کر دم لیتا ہے پھر اسے معلوم ہوتا ہے کہ جس پھسلن پر اس نے قدم بھانے کی کوشش کی تھی اسے تو اس نے بہت ہموار زمین سمجھا تھا۔ اُف! یہ زندگی کس قدر مشکل ہے۔ حیدر! ہم بھک گئے۔ ہم کیوں نہ مطمئن ہو گئے۔ ہماری رو میں کیوں منتشر اور بے قرار ہیں اور یہ وہ انتشار تھا کہ ہم بھک گئے۔ ہم گنہگار بن گئے کاش۔۔۔۔۔" وہ ایک دم پھر خاموش ہو گئی۔

"شہلا! فرمانی نہیں سکتی ہے۔ سارے کے سارے انسان خطا کار ہیں اور بہترین خطا کار وہ ہیں جو بہت زیادہ توبہ کرنے والے ہیں اور میں تو دن رات اپنے رب سے معافی مانگتا رہتا ہوں۔ تم بھی توبہ کرو۔" گو یا حیدر بھی آج صاف گوئی سے اعتراف جرم کے موڈ میں تھا۔

"کیا ہمیں معافی مل جائے گی؟" وہ پھر بے یقینی کے عالم میں بولی۔

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟"

"اس ستر مرگ پر انسان جس طرح امید و بیم کے درمیان سفر کر رہا ہوتا ہے وہ بہت تکلیف دہ ہے، کاش تم سمجھ سکو۔"

”تم مطمئن ہو جاؤ، اس کی رحمت انسان کے گناہوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔“ حیدر نے پھر اسے تسلی دینا چاہی اور اسی لمحے نور کمرے میں داخل ہوئی۔

”آئی ایم سوری ہاں میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا۔“

”نہیں بیٹا ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ آج کافی لیٹ آئی ہو۔“ حیدر نے اس سے پوچھا۔
 ”ہاں انکل آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے لیٹ ہو گئی پھر یاد آیا کہ آئی کو چنچ بھی کرانا ہوتا ہے اس لیے میڈیٹر کھا کر آئی ہوں۔“

”تھیک ہو بیٹا تم ہمارے لیے اتنا کچھ کر رہی ہو۔ خدا تمہیں اس کا اجر دے۔“ شہلانے لیٹے لیٹے اسے دعا دی۔ حیدر نے بھی اس کی طرف پرستش نظروں سے دیکھا تو وہ باہر نکل گئی۔ شہلا کو چنچ کرانے کے بعد وہ ولیم کے کمرے میں آئی تو وہ میڈ پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کی متورم آنکھیں اور چہرہ رات کی کہانی سن رہے تھے۔ وہ ابھی تک الجھا الجھا سا لگ رہا تھا۔

”ولیم! کیا بات ہے تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ نور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”میری طرف دیکھ کر بات کرو۔ کیا مسئلہ ہے؟“

”کچھ نہیں، کیا تم کل جلدی آ سکتی ہو؟“

”ہاں کیوں، کہیں جانا ہے کیا؟“

”ہاں، بہت دن ہوئے چھ گئے ہوئے۔ میں چھ جانا چاہتا ہوں۔“ اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر چہرہ لٹکا ہوں سے کہا جیسے وہ کسی قابل اعتراض جگہ کے بارے میں بات کر رہا ہو۔ نور اس کی بات سن کر ایک دم چوکی۔ کوئی چیز چھٹا کے سے اندر ہی اندر ٹوٹی۔ اس نے گہری سانس لی اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”ٹھیک ہے، کتنے بچے آ جاؤں؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”صبح نو بجے کے قریب۔“ اس نے بھی بے دلی سے جواب دیا۔ نور اٹھ کر باہر آ گئی۔ اسے سخت محسوس ہو رہا تھا۔ اسے نہ جانے کیوں یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ رفتہ رفتہ وہ اسے سچائی کی طرف لے آئے گی مگر وہ اپنی جگہ پر ہی کھڑا تھا اور وہ اپنے مقصد کی کامیابی کا تعین کر کے بیٹھی تھی۔ اسے سب کچھ سراپ نظر آنے لگا۔ ساری محنت اکارت جاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک انسان کے دل کو بدلنا بہت مشکل ہے۔ اس نے سوچا۔ دلوں کو صرف خدا ہی بدل سکتا ہے۔ وہ سنگین چہروں سے جھٹکے بہا سکتا ہے تو کیا دل اس سے بھی زیادہ سخت ہو سکتے ہیں۔ یا اللہ! ولیم کے دل کو بدل دے آئی کے لیے اور میرے لیے۔ اس نے دل ہی دل میں گڑگڑا کر دعا کی اور خاموشی سے دغیفہ پڑھ کر اس کی ناگوں پر پھونک مارنے لگی۔ ولیم حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے امید تھی آج وہ ایسا نہیں کرے گی لیکن اس کی مستقل مزاجی دیکھ کر وہ ٹھیک سا گیا اور زبان سے کچھ نہ بولا۔ وہ بھی

خاموشی سے خدا حافظ کہہ کر نکل گئی۔

اس رات وہ سکون سے سويا۔ ذہن میں کسی چنگاری نے آگ نہ لگائی۔ کوئی طوفان نہ برپا ہوا۔ کسی بھی شے نے ظالم اور تذبذب میں نہ جکڑا۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ وہ محض ذہن کا وقتی رجحان تھا اور یہ تو انسانی نفسیات ہے کہ کبھی کوئی بات ایسی ذہن میں اٹکتی ہے کہ ہزار بار کھرچو، صاف ہی نہیں ہوتی لیکن پھر ایسی غائب ہوتی ہے کہ دوبارہ بھول کر بھی یاد نہیں آتی۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ اس نے رات کو بھرپور اسٹڈی کی اور پھر سو گیا۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے نوراً چکی تھی اور وہ بھی تیار ہو رہا تھا۔ افضل نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور وہ خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگی۔

”نورا! کیا بات ہے۔ تم کیوں خاموش ہو؟“

”میری طبیعت کل سے خراب ہے۔ ابھی بھی مجھے بتانا ہے۔“

”تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“ اس نے ایک دم حیرت سے پوچھا اور میسر پر رکھے اس کے ہاتھ کو چھوا تو چونک گیا۔ ”واقعی تمہیں تو بہت

تیر بخارہ ہے۔ تم آئیں کیوں؟“

”تمہاری خواہش کے لیے تم جانے ہو میں تمہیں کبھی بھی انکار نہیں کر سکتی۔“

”افوہ! یہ کیا حماقت ہے۔ تم بیمار ہو اور تم..... چلو واپس چلو۔“

”نہیں، اب تم چرچ سے ہوئی آؤ تو بہتر ہے۔ تھوڑا سا فاصلہ دیا گیا ہے۔“ اس نے چرچ کے سامنے گاڑی روکی۔ اسے چرچ میں چھوڑ کر وہ خود گاڑی کی کچلی سیٹ پر لیٹ گئی۔ باہر قدرے ٹھنڈا ہوا ہی تھی۔ گوکہ موسم بدل رہا تھا مگر ابھی بھی فضا میں خنکی باقی تھی۔ اکاؤنٹ کا لوگ چرچ آرہے تھے۔ چرچ کے احاطے میں ہر طرف اونچی اونچی بازوؤں اور لمبے لمبے سفیدے کے درختوں نے چرچ کی سگوار فضا میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ سردیوں کی تاریک رات جیسی گہری خاموشی ہر طرف چھائی تھی۔ وہ وحیل چیئر پر بیٹھا کرائسٹ اور مدر میری کے مجسمے کے سامنے سر جھکا کر، آنکھیں بند کیے، ہاتھ باندھے ہوئے آہستہ آہستہ سرگوشیاں کر رہا تھا۔ اپنا دعا بیان کر رہا تھا۔

”میں بہت پریشان ہوں۔ بہت کھرا ہوا، مجھے سکون چاہیے۔ مجھے اپنی طرف لے آؤ۔ مجھے اپنی طرف لے آؤ ورنہ میں..... میں کھر جاؤں گا۔“ وہ گہرے ناسف میں کھویا آہستہ آہستہ سر ہلا رہا تھا۔

”اور تم مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔“ پھر آیت نے پوری شدت سے نہ جانے کہاں سے آ کر اس پر حملہ کیا۔ اُف! یہ کہاں سے..... وہ تو اسے
 بھلا چکا تھا۔ اس کا اندر پھر جھنجھلا نے لگا۔ اس کی روح تڑپنے لگی۔ وہ تو مطمئن ہو چکا تھا اور اب پھر مضطرب ہونے لگا۔ یہ سب کیا ہونے لگا تھا۔
 کرائسٹ کے سامنے بیٹھ کر وہ کیا سوچ رہا تھا۔ کاش کوئی جسم شے اسے ٹھک کرتی تو وہ اس کے پر فچی اڑا دیتا اور اب اپنے اندر سے کہاں سے اسے
 صاف کرے۔ یہ سب کیا تھا..... ”میں گناہ کر رہا ہوں..... اوہ گاڈ!“ وہ پھر سر کے بال نوچنے لگا۔ ”مجھے اپنی طرف لے آؤ..... اوہ گاڈ.....!“ وہ اب
 زور زور سے بڑبڑانے لگا۔

”یا اللہ! اس کی ہدایت کی طرف رہنمائی کر۔ اس کو اپنی طرف لے آ، سچائی کی طرف۔“ نور آنکھیں بند کیے سخت بتار میں جہلا پورے

خلوص کے ساتھ، دل کی گہرائیوں سے اس کے لیے دعا کر رہی تھی۔ ایسے خلوص اور سچائی کے ساتھ جی دعا جو عرش تک بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچتی ہے۔
 ”کرائسٹ! مجھے معاف کر دو۔ درمیری..... گاڈ.....“ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ التجائیں کر رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا۔ اس کا سر گھٹنوں کے ساتھ لگا ان کے حضور جھکا چلا جا رہا تھا۔

”اس کا اندر بدل دو۔ اسے اپنی طرف لے آؤ۔“ وہ بھی مسلسل دعائیں کر رہی تھی۔ نیم بے ہوشی میں بڑبڑا رہی تھی، گڑگڑا رہی تھی۔
 کراہتی آواز اور بیمار جسم کے ساتھ التجائیں کر رہی تھی پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ نہ جانے کتنی ہی دیر گزر گئی۔ باہر دھوپ کا پیلا ہلکا تھا۔ کسی نے گاڑی کا شیشہ کھٹکھٹایا۔ اس نے بڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ بوڑھا چوکیدار اسے اٹھا رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے بڑبڑا کر پوچھا۔

”ولیم صاحب آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔“

”اوہ آئی سی امیں تو بھول ہی گئی۔ بابا، آپ میرے ساتھ اندر آئیے۔ ہم اس کو اندر سے لے آتے ہیں۔“ وہ چوکیدار کو روکتے ہوئے بولی اور دونوں نے اسے لا کر گاڑی میں بٹھایا۔ اس نے ویل چیر کو فونڈ کر کے ڈیگی میں رکھا اور گاڑی ڈرائیو کرنے لگی۔ دونوں خاموش تھے۔ ولیم ونڈو سے مسلسل باہر دیکھ رہا تھا اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ بہت الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ مختلف تاثرات اس کے چہرے پر نمودار ہو رہے تھے جیسے کبھی کسی بات کو جھٹلا رہا ہو، تروید کر رہا ہو، مان رہا ہو، چمک رہا ہو۔ الجھ رہا ہو۔ وہ بھی کن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے بدلے ہوئے رویے سے چمک رہی تھی۔ چرچ جانے سے پہلے وہ اس قدر خاموش اور الجھا ہوا نہیں تھا اور اب بہت پریشان لگ رہا تھا۔

”لگتا ہے تم چرچ جا کر کافی پر سکون ہو گئے ہو۔“ نور نے جان بوجھ کر پوچھا۔

”اوں..... ہاں..... ہاں.....“ وہ پھر خاموش ہو گیا۔ نور کو اس کے جواب سے حیرت تشویش ہونے لگی۔

”پھر قادر سے کوئیٹ نہیں ہوا؟“

”نہیں۔“ اس نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔ وہ بھی خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگی۔ اسے کمرے میں چھوڑ کر وہ باہر نکلنے لگی تو رک گئی۔

”ولیم! میرے وقتینے کے چالیس دن پورے ہو گئے ہیں اور اب میں کل سے یہاں نہیں آیا کروں گی۔“

”کیوں کیا مطلب؟ کیا تم مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو؟“ وہ ایک دم بے صبری سے بولا۔

”نہیں، لیکن میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”اوہ اچھا! شکر ہے یہ بات ہے۔“ اس نے سکھ کا سانس لیا۔

”ولیم! کیا تمہیں اپنی تنہائی سے بہت ڈر لگتا ہے؟“

”ن..... نہیں تو..... مگر میں.....“ وہ اس سے کچھ شتر کرنا چاہتا تھا مگر خاموش رہا۔

”میں دیکھ رہی ہوں تم اپنی سوچوں کو اب القاذیہ سے ڈرنے لگے ہو۔ تم کیوں الجھ رہے ہو۔ اگر اسی طرح الجھتے جاؤ گے تو تم جنونی ہو

جاؤ گے۔ تم کیوں اس طرح کر رہے ہو۔" وہ اس کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے آنسو اس کی بے بسی اور اندر کے شدید کرب کی داستانیں سنارہے تھے۔ اس کی نیلی بلوریں آنکھیں جیسے سفید شیشے کے جار میں تیرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ڈبڈباتی ہوئیں، ڈڈتی ہوئیں۔

"ٹھیک ہے اب میں چلتی ہوں۔ میں حیدر انکل کو بتا دوں گی۔ وہ ویسے بھی آٹی کے لیے نرس کا انتظام کرنے کی بات کر رہے تھے۔ ضرورت ہوئی تو فون کر لینا۔" وہ کہہ رہی تھی مگر وہ سن نہیں رہا تھا، کہیں کھویا ہوا تھا جیسے کسی ہمنور میں کشتی لحد بہ لحد ڈوب رہی ہو۔ اس کی سوجھیں گرداب میں پھنس رہی تھیں۔ لحد بہ لحد نیچے کو ستر کر رہی تھیں اور سارے جذبے جیسا نانا ہو رہے تھے۔ شتم ہو رہے تھے۔ وہ ڈوب رہا تھا۔ ساحل کہیں دور تھا۔ شاید افق کے پار..... نظروں سے دور..... ہر شے سراپ تھی..... وہ جا بھگی تھی اور وہ سر جھکائے کہیں گم ہو چکا تھا۔



وہ سہیل اور آصف کے گھر ہو کر آئی تھی۔ ان لوگوں کی مالی اور اخلاقی مدد کے آئی تھی۔ دونوں خاندان تو اسے مسیحا سمجھ کر اس کی پزیرائی کرتے رہے اور بہت سی دعاؤں سے کر رخصت کیا۔ اسے گوندہ اطمینان محسوس ہوا۔ اندر کی ملاحتوں سے قدرے جان چھوٹی۔ وہ ناشتا کرنے کے بعد حسب عادت اخبار پھیلانے سامنے بیٹھی تھی کہ ایک دم چمکی۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ حلق خشک ہونے لگا۔ دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ سارا جسم کاپٹنے لگا۔ وہ بار بار خبر پڑھ رہی تھی۔ وہ اونچی آواز میں چیخا چلانا چاہتی تھی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی مگر آواز جیسے کسی صحرا میں گم ہو گئی تھی جہاں ہر طرف ریت کے گولے اسے ادھر سے ادھر اٹھا اٹھا کر پھینک رہے تھے۔ اس نے جلدی سے موبائل کا نمبر ملایا مگر وہ بڑی تھا۔ آف خدایا..... یہ سب کیا ہو گیا۔ وہ اخبار اٹھا کر پھر پڑھنے لگی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی نظریں دھوکا کھا گئی ہوں۔ اس نے کوئی غلط خبر پڑھ لی ہو۔

"آفاق کیسے مر سکتا ہے اور مدد بخ بھی۔ مرنے والوں کو شوٹ کر دیا ہے۔ مرنے..... مرقو آفاق سے بہت محبت کرتی تھی۔" وہ خود بخ بڑا رہی تھی۔ اس نے پھر نمبر ملایا مگر وہ مسلسل الٹیج جا رہا تھا۔ اس نے پھر اخبار اٹھا کر خبر پڑھی۔ مرنے والے نشتے میں دھت والوں کو شوٹ کر دیا تھا اور پھر اپنے آپ کو بھی گولی مار لی تھی مگر وہ زندہ تھی اور زخمی حالت میں اسپتال میں داخل تھی۔ اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ آفاق اس کا بھائی، بھائیوں اور تکلیفوں کا ساتھی، اسے اس سے کتنی محبت تھی اور وہ کیسے مر گیا۔ اتنی جلدی..... پہلے فلک اور اب آفاق، آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے۔ آفاق! تم اس طرح نہیں جاسکتے۔ میں کیسے زندہ رہوں گی۔ تم بے شک دور تھے مگر زندہ تو تھے۔ تم نے تو زندگی میں تکلیاں ہی دیکھی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کبھی بھی پرسکون نہیں رہا تھا۔ اس نے بہت مشتر زندگی گزاری تھی۔ ایک ڈال سے دوسری ڈال پر، بے سوداڑا نہیں بھری تھیں۔ بے مقصد گھومتا پھرتا رہا تھا۔ نہ جانے کس کی تلاش میں..... اس نے پھر نمبر ملایا۔ وہ پھر بڑی تھا۔ اس نے گھر کا نمبر ملایا۔ کسی اجنبی آواز نے بیلو کہا۔ اس نے کانچی آواز میں جنازے کا وقت پوچھا۔

"شام کو مغرب کے بعد۔" فون بند کر دیا گیا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے گیارہ بج رہے تھے اور شہر کچھنے میں دو تین گھنٹے تو ضرور لگیں

گے۔ پہلے ڈرائیور اسے لینے آئے گا اور پھر اسے لے کر جائے گا۔ وہ بار بار حیدر کو فون ملاتی رہی مگر اس کا موبائل آف تھا۔ اس نے ڈو الفکار ڈرائیور کا موبائل نمبر ملایا اور اسے جلدی گاؤں آنے کو کہا۔

”بی بی جی! میں پانچ بجے پہنچ جاؤں گا۔“

”نہیں، جلدی آؤ۔ میری جنسی ہے اور تم اس وقت کہاں ہو؟“

”میں جی جہلم سے بات کر رہا ہوں۔ حیدر صاحب آگے منگلا گئے ہیں۔ کوئی سرکاری کام تھا۔ میں ان کو چھوڑ کر لاہور آ رہا ہوں۔ وہ رات کو خود آ جائیں گے۔“

”لیکن تم جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش کرو۔“

”جی بی بی! میں بس آ رہا ہوں مگر تم تو لگے لگے گانا۔ جہلم سے شیخوپورہ۔ ٹھیک ہے جی، آپ میرا انتظار کریں۔“ اس نے فون بند کر دیا۔ اس کے لیے ایک ایک لمحہ شدید کربناک ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل رورہی تھی۔ آفاق اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ سحرا تم نے کیوں ایسا کیا۔ تم بھی تو اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ یہ محبت کرنے والوں کو اچانک کیا ہو جاتا ہے۔ اتنے سلاک، اتنے ظالم، اس قدر خوفناک وحشی ورنہ کیوں بن جاتے ہیں۔ جیسے ہی سدرخ کی طرف خیال جاتا تو جیسے کچھ سمجھ آنے لگتا۔ وہ اپنی محبت میں شراکت داری برداشت نہیں کر سکی ہوگی۔ شاید اس لیے..... شاید یہی وجہ تھی مگر آفاق..... اس کے ساتھ کیوں ایسا کیا..... کیوں؟ وہ رورہ کر پاگل ہو رہی تھی۔

سحرا کا بہت خون بہہ چکا تھا۔ وہ کس طرح ہسپتال پہنچائی گئی۔ کون لایا، کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کے پاس اب کوئی بھی نہیں تھا۔ باہر پولیس کھڑی تھی اس کا بیان لینے کے لیے۔ شاید اس کی حالت بھی خطرے میں تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ ڈاکٹر بھی کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ نہ کوئی آپریشن کر کے گولی نکال رہا تھا اور نہ کوئی اسے پراپرلی چیک کر رہا تھا۔ بس کاشن رکھ کر وینڈج کر دی گئی تھی۔

”ڈاکٹر صاحب! ملزم کا بیان لینا ہے۔“ ایک سپاہی نے سرجن سے پوچھا۔

”ہاں لے لو، کس نے روکا ہے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

”کیا وہ بیان دینے کی حالت میں ہے؟“

”ہاں، ہاں جاؤ۔“ سرجن نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔ وہ نرس کے ساتھ اندر گیا۔

”بی بی! آنکھیں کھولو۔“ نرس نے اسے جھنجھوڑا۔

”اوں.....“

”بیان دو۔“ سپاہی نے کہا۔

”ہاں، میں نے قتل کیے ہیں۔ گولیاں ماری ہیں۔ وہ سو گئے ہیں۔ وہ مجھے گھر سے نکال رہی تھی۔“ اور وہ پھر خاموش ہو گئی۔

”ٹھیک ہے، ادھر سائن کر دو۔“ مگر اس کے ہاتھوں میں جان ہی نہیں تھی۔ نرس نے بین کی سی ای انگوٹھے پر لگا کر کانڈوں پر انگوٹھا لگا

دیا۔ کارروائی ختم ہو چکی تھی۔ وہ بے بس، بے آسرا پڑی تھی۔ ایک دم اس نے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف دیکھا اور پھر کچھ یاد آنے لگا۔ مہر رخ اس سے کہہ رہی تھی۔ جلدی اس گھر سے نکلو۔ سڑکوں پر بھیک مانگو یا پھر کہیں اور جاؤ مگر یہ گھر خالی کر دو۔ اس نے اس کا سامان پیک کر کے لاؤنج میں رکھ دیا تھا۔

وہ اس وقت کتنی بے بس تھی جب وہ اسے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی شدت سے۔ کہاں جائے، کوئی بھی تو آسرا نہ تھا۔ شزا گھر پر نہیں تھی اور مہر رخ آفاق کو بتائے بغیر سب کچھ کر رہی تھی۔ آفاق سو رہا تھا اور وہ اسے دھکے دے رہی تھی، ذلیل کر رہی تھی۔ وہ لڑھکتی ہوئی راستے کے پتھر کی طرح ٹھوکریں کھاتی ہوئی گیٹ سے باہر پھینگی جا رہی تھی۔ وہ بھکارن جوتھی اس لیے اسے دھکے دیے جا رہے تھے۔ پیدائشی بھکارن جس کے نصیب میں پہلے دن سے ہی دھکے کھائے گئے تھے۔ دھکے، ٹھوکریں، جگالیاں، جھڑکیاں کچھ بھی تو نہیں بدلاتا تھا۔ کیا نصیب بھی بدل سکتا ہے۔ وہ ٹوٹ چکی تھی، بکھر چکی تھی۔ ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔ مہر رخ پھری شیرنی کی طرح اس پر ٹوٹ رہی تھی۔ اسے جھجھوڑ رہی تھی۔ مسلسل کچھ کے لگا رہی تھی، دھکار رہی تھی۔ اس نے آخری ٹھوکر مار کر اسے گیٹ سے باہر دھکا دے دیا تھا۔ وہ ویران سڑک پر بیٹھی تھی جیسے تھکی ہاری بھکارن سارا دن چلتے چلتے تھک ہار کر لب سڑک بیٹھ جائے اور اس کا کاسہ بھی خالی ہو۔ اس کے اندر شدید انتقام کی چنگاریاں آہستہ آہستہ بھڑک رہی تھیں جوالا کھسی بننے کو تیار تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی چند قدم کے فاصلے پر پی سی او پر آئی اور ایک فون کرنے کی اجازت مانگی۔ پی سی او کے مالک نے اس کا حلیہ دیکھ کر اسے فون کرنے دیا۔ اس نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے مسز زبیر کا نمبر ملایا اور انھیں ساری بات بتائی۔

”تم..... تمہیں تو چاہیے کہ ان دونوں کو شوٹ کر دو۔“ مسز زبیر غصے سے بولی۔ جوالا کھسی کو آگ بھری ہو املی۔

”مگر میرے پاس ریوالور نہیں۔“

”تم فکر کیوں کرتی ہو۔ تم کہاں ہو، میں تمہیں دوں گی۔ میرے پاس بہت سے بغیر لائسنس کے ریوالورز ہیں۔ میں ابھی لوڈ کر کے لاتی ہوں۔“ مسز زبیر نے فون بند کر دیا اور چند لمحوں میں وہ اس کے سامنے تھی۔ اسے گاڑی میں بٹھا کر انھوں نے گیٹ کے سامنے اتارا۔

”ذرا بھی نہ ڈرنا اور نہ گھبرانا۔ ایسے مردوں کا ایسا ہی انجام ہونا چاہیے اور مہر رخ تو ویسے بھی بہت ذلیل ہے۔ میری اس کی پرانی دشمنی ہے۔ ملک منصور کے سامنے جب میں نے اس کا سارا پول کھولا تو بڑی تھلائی تھی۔ شزا نے اس کو ملک منصور کو پھانسنے کے لیے بھیجا تھا۔ خیر تم چھوڑو، دونوں میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑنا۔ دونوں اس قابل نہیں۔ آفاق نے تمہیں کس طرح ہانچہ بنا دیا اور پھر خود دوسری شادی بھی کر لی۔ یہ مرد تو ہوتے ہی ہر جاتی ہیں۔“ وہ مسلسل بول کر اس کے اندر انتقام کی آگ کو بھڑکا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سن رہی تھی۔ اندر ہی اندر جلتے بجتے کونکوں کی طرح دھبہ رہی تھی جیسے کسی پتھر سے ہوا دینے سے وہ دھبے ہیں اور پھر ایک دم آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے گیٹ کو دھکا دیا اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اندر بھاگتی ہوئی گئی۔ مہر رخ ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھی ناشتا کر رہی تھی۔ اس کی طرف اس کی پشت تھی۔ اس نے دو تین گولیاں اسے ماریں۔ اس نے وہیں بغیر اس کی طرف دیکھے ٹیبل پر سر رکھ دیا۔ آفاق گولیوں کی آواز سن کر جیسے ہی باہر آیا، اس نے اس پر بھی دو فائر کیے اور پھر اپنے پیٹ کی طرف رخ کر کے ریوالور چلا دیا۔ تینوں وجود خون میں لت پت توپ رہے تھے۔ خون بہہ رہا تھا، سائیں اکڑ رہی تھیں۔ زعم گیاں ختم ہو رہی تھیں۔

تینوں لمحہ بہ لمحہ ساکت ہو رہے تھے۔ پھر کیا ہوا وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ آفاق مر گیا۔ اس کا آفاق مر گیا تھا۔ وہ چھت کو گھور رہی تھی۔ اسے چھت میں آفاق نظر آ رہا تھا۔ وہ اسے بھی بلارہا تھا اور وہ اس کی طرف جانا چاہتی تھی۔ ہمیشہ کے لیے اس کے وجود میں مانا جاتا ہی تھی۔ میں آ رہی ہوں۔ تمہارے بغیر میں کچھ بھی نہیں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ مچی بالکل مچی محبت، دنیا کی ہر شے سے زیادہ، تمہیں میں کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ ہم دونوں ہاں صرف ہم دونوں اور کوئی نہیں۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ ہمیشہ کے لیے آواز ختم ہو گئی۔ کاشن خون میں بھیک گئی تھی اب قطرہ قطرہ رس رہا تھا جیسے کوئی دھم مسلسل رستا رہتا ہے۔ اسے لادارٹ لاشوں کے ساتھ رکھ دیا گیا تھا کیونکہ اس کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ وہ کسی کی بیٹی نہیں تھی۔ اس کی قیمت نے کراس کا باپ نہ جانے کہاں جا چکا تھا کہ پھر اس نے کبھی بھی مڑ کر خبر نہ لی۔ وہ کسی کی بیوی نہیں تھی۔ اسے تو کبھی بھی بیوی کا درجہ نہیں ملا تھا۔ وہ تو بھکارن تھی اسی لیے لادارٹوں کی طرح مر گئی اور وہ کسی کی ماں بھی نہیں بن سکی تھی۔ مائیں تو شرف والیاں بنتی ہیں اور وہ تو وحکار ہی ہوئی، درمائدہ، پھر زودہ، ویران بھتی تھی جس پر پالا پڑا تھا اور اس کی زرخیزی کہیں کم ہو گئی تھی۔ اس کا نام و نشان باقی نہیں رہا تھا جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ نہ نقطہ ہا، نہ زورہ اور نہ نام..... وہ تو صحرا کی ہوا میں کہیں کم ہو چکی تھی۔

شفق جنازے سے کچھ دیر پہلے گھر پہنچی تو لان میں دونوں لاشیں رکھی تھیں۔ میتوں کے پاس چند ناشا سا مورتیں بیٹی تھیں۔ شزا بھی ایک کونے میں تھی۔ وہ نقاب والی چادر لیے اندر داخل ہوئی۔ نہ کوئی رو رہا تھا اور نہ ان کی بات کر رہا تھا۔ وہ آفاق کی میت کے پاس بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ شزا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے پاس کھسک آئی۔

”شفق..... تم..... تم..... تم انگلیٹھ سے کب آئیں؟“ مگر وہ رو رہی تھی اور اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ملک منصور سلید اٹھ کر سوٹ میں ہشاش بشاش، چہرے پر مصنوعی انفرادی طاری کیسے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ تھے۔ وہ سب ہمیں اٹھانے کے لیے آ رہے تھے۔ آفاق کی میت اٹھانے لگے تو وہ زور زور سے چیختے لگی۔ ملک منصور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور جیسے سکتے میں آ گیا ہو۔

”تم..... تم کہاں سے آئی ہو؟“ اس نے ارد گرد دیکھتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں اس سے پوچھا۔

”ہاں، آپ نے تو مجھے ماری دیا تھا نا۔ آپ تو ہیں ہی قاتل، دنیا کے خالم ترین انسان..... قاتل باپ..... پہلے فلک کو مارا پھر مجھے اور اب آفاق کو بھی آپ نے ہی مارا ہے۔“

”بکواس بند کرو، تمہیں تو میں بعد میں دیکھوں گا۔ خاموش ہو جاؤ۔“

”نہیں، میں چپ نہیں رہوں گی۔ ساری دنیا کو بتاؤں گی۔ آپ نے سہیل کو قتل کیا اور پھر آصف کو بھی۔“

”شٹ اپ!“ ملک منصور نے تزاخ سے زوردار ہتھکڑا سے مارا۔

”آج میں ساری دنیا کو بتاؤں گی۔ اس سفید سوٹ میں کتنا بڑا قاتل چھپا ہوا ہے، ہر ایک کا قاتل۔“

”میں کہہ رہا ہوں دفع ہو جاؤ اندر!“ وہ اس کا بازو کھینچ کر اندر لے جانے لگا۔ وہ اسے تھمٹ رہا تھا اور وہ چلا رہی تھی۔ ہر کوئی حیرت اور

خاموشی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے سب کے سب پتھر کے بجسے بن گئے ہوں۔ اس نے ایک دم جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور بھاگتی ہوئی گیٹ سے

باہر نکل گئی۔ چادر وہیں آدمی گیٹ کے اندر اور آدمی باہر فرش پر پڑی تھی۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیور کو تیزی سے چلانے کو کہا۔ ملک منصور نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی کو اشارہ کیا اور ایک سفید کرولا ان کا پیچھا کرنے لگی۔

”بی بی جی، آپ گھبرا ئیں نہیں۔“ ڈرائیور نے تسلی دی۔

”حیدر انکل کہاں ہوں گے؟“

”اس وقت تو معلوم نہیں لیکن رات کو دس بجے انھوں نے گلبرگ والے گھر مجھے آنے کو کہا تھا۔“ ڈرائیور نے بتایا۔

”بس وہیں مجھے لے چلو۔“

”ٹھیک ہے۔“ گاڑی مسلسل ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ ذوالفقار بھی ایکسپریٹ ڈرائیور تھا۔ وہ بھی ان کو ڈانچ دے رہا تھا پھر اس نے ایک دم

گاڑی صحبان آباد علاقے کی طرف موڑ دی۔ گلیوں اور بازاروں سے ہوتا ہوا وہ اب سنان سڑک پر تھا۔ دور دور تک کوئی روشنی نہ تھی۔ اب کوئی گاڑی پیچھا نہیں کر رہی تھی۔

”آپ بڑے سکون ہو جائیں، اب وہ لوگ ہمارا پیچھا نہیں کر سکتے۔ میں نے ان کو بہت ڈانچ دیا ہے۔ ویسے یہ لوگ کون تھے؟“

”میرے باپ کے کارندے!“ وہ آہستہ سے بولی تو وہ چونک گیا مگر خاموش رہا اور گاڑی چلاتا رہا۔ اس نے گیٹ کے سامنے جا کر ہارن

دیا۔ حیدر کی گاڑی پورچ میں کھڑی تھی۔ افضل نے گیٹ کھولا۔

”حیدر انکل آگئے ہیں؟“ اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”ہاں، وہ کمرے میں بی بی جی کے پاس ہیں۔“ افضل نے بتایا۔

”مجھے جلدی سے ان کے پاس لے چلو۔“ وہ بھٹکائی ہوئی بولی۔

”انکل! انکل! آپ کہاں چلے گئے تھے۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔ اس کا جسم مسلسل کانپ رہا تھا۔ وہ ارد گرد دیکھے بغیر ان سے پوچھ

رہی تھی۔ اس کے سر پر نہ چادر تھی نہ دوپٹا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا جیسے موت کے منہ سے آئی ہو۔ حیدر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور ایک

نظر ہستر پر پڑی شہلا کی طرف..... اسے پھوٹیشن ہانکل سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ مسلسل پوچھ رہی تھی اور وہ حیرت میں ڈوبا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

انکل..... آپ کو معلوم ہے آفاق مر گیا ہے..... بحر نے آفاق کو گولی مار دی ہے اور..... اور اب پاپا کے لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ مجھے

ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں آفاق کو دیکھنے گئی تھی..... انکل سب کچھ ختم ہو گیا..... آفاق..... بھی مر گیا..... پہلے فلک مر گئی..... اور اب آفاق..... نہ جانے

میں کب تک زندہ رہوں گی۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ اس کی ہچکی بندھی ہوئی تھی اور سانسیں بے ربط ہو رہی تھیں۔ وہ شدید صدمے

سے غمگین ہو رہی تھی۔ ایک دم وہ فرش پر گر گئی۔

شہلا تو سب کچھ سن کر سکتے میں آگئی وہ اپنی جگہ سے اٹھ بھی نہیں رہی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ پتھر کی ہو گئی ہو۔ حیدر نے جلدی سے شفق کو

ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ اسے پانی پلایا اور اپنی گاڑی سے فرسٹ ایڈ باکس منگوا کر اس میں سے انجکشن نکال کر اسے لگائے۔ وہ خود اس پھوٹیشن

سے ایک دم بہت پریشان ہو رہے تھے۔ وہ تو شہلا سے ہر بات چھپاتے آ رہے تھے اور اب ہر بات اس کے سامنے خود بخود آ گئی تھی۔ وہ یوں ساکت لہی تھی جیسے سانس بھی نہیں لے رہی ہو۔ بس آنسو دونوں آنکھوں سے بہہ بہہ کر ٹپکے میں جذب ہو رہے تھے۔

”شہلا ہمت کرو۔۔۔۔۔ تم منصور کو اچھی طرح جانتی تو ہو۔۔۔۔۔ اس انسان سے یہی توقع کی جاسکتی ہے۔ وہ بہت ظالم انسان ہے۔“

”اور میں اس سے بڑھ کر۔۔۔۔۔ میرے گناہوں کے پھل کتنے کڑے، کیسے ہیں۔۔۔۔۔ سب کچھ میرے سامنے آ گیا ہے۔۔۔۔۔ سارے بکھرے ہوئے وجود یہ۔۔۔۔۔ وہ شفق تو نہیں لگ رہی۔۔۔۔۔ میری شفق ایسی نہیں تھی۔۔۔۔۔ یہ تو بہت بکھری بکھری ہے۔۔۔۔۔ اور ملک کب مرگئی۔۔۔۔۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا اور تم نے بھی مجھ سے چھپایا۔۔۔۔۔ میں اپنے بچوں کی قاتل ہوں۔۔۔۔۔ میں ہی اپنے بچوں کی دشمن تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا ایک فیصلہ ان کی زندگیوں کو کیسے تباہ و برباد کر دے گا۔ کسی ماں نے ایسے نہیں کیا ہوگا جو کچھ میں نے کیا۔۔۔۔۔ میں نے جس طرح شفق کو روکتے بلکتے چھوڑا۔۔۔۔۔ وہ آج بھی ویسی ہی نظر آتی۔۔۔۔۔ خدا مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔۔۔۔۔ اور اب مجھے معاف بھی نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ دونوں ہاتھ زور زور سے اپنے چہرے پر مارنے لگی۔

”شہلا یہ کیا حماقت ہے۔۔۔۔۔ کیا کر رہی ہو؟“ حیدر نے زبردستی اس کے ہاتھ کو پکڑا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”میرا آقا ق بھی مر گیا۔۔۔۔۔ ملک بھی اور میں زندہ ہوں اب مجھے بھی مرجانا چاہیے۔“ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اس کی چیخیں بلند تر ہو رہی تھیں۔ ولیم ایک دم چوک گیا اور ویل جیئر تیزی سے چلا تا ہوا ماں کے کمرے کی طرف بڑھا۔ حیدر ان کے پاس بیٹھنے ان کے ہاتھوں کو سختی سے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے اور وہ رو رہی تھیں۔ ولیم کا خون ایک دم کھولنے لگا۔۔۔۔۔ اسے پھوٹیشن سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اسے حیدر پر خصر آنے لگا۔۔۔۔۔ نہ جانے وہ ماما کے ساتھ۔۔۔۔۔ کہ وہ چلا رہی تھیں۔ وہ سخت بوکھلا گیا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ دھبے سے حیدر کی طرف دیکھ کر بولا۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ حیدر آہستہ سے بولے۔

”مگر مجھے تو کوئی اہم بات لگ رہی ہے۔۔۔۔۔“ اس کے لہجے میں بلا کا طعنا تھا۔ شہلا ابھی تک رو رہی تھی۔ حیدر نے حیرت سے ولیم کی طرف

دیکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

”کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔۔۔؟“ جواباً وہ خاموش رہا۔ شہلا پھر اپنے چہرے پر تھپڑ مارنے لگی۔

”خود دیکھ لو۔۔۔۔۔ اسے میں اس حرکت سے روک رہا تھا۔۔۔۔۔ نہ جانے ہماری اولادیں لکھوں میں کیوں ہد گمان ہو جاتی ہیں۔۔۔۔۔ تم لوگوں کے

دلوں میں ایمان اور اعتماد کتنا کم ہے۔۔۔۔۔ کسی نتیجے تک پہنچنے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگاتے اور ایک دم فیصلہ کر لیتے ہو۔ تم لوگ کتنے جذباتی ہو۔۔۔۔۔“ حیدر کو بھی اب خصر آ رہا تھا مگر وہ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھے ہوئے تھے۔

”ماما۔۔۔۔۔ ماما۔۔۔۔۔ کیا کر رہی ہیں۔۔۔۔۔؟“ اب ولیم نے اس کے ہاتھوں کو روکنا چاہا مگر وہ شدت جذبات و غم سے بالکل غلط حال ہو

رہی تھی، رو رہی تھی، سسکیاں بھر رہی تھی۔

”آخربات تو بتائیں، کیا ہوا ہے.....؟“ اس نے انہیں منجھوڑا۔

”کچھ نہیں..... بس تم سب یہاں سے جاؤ..... مجھے تنہا چھوڑ دو.....“ اس نے ہچکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

”نہیں، آپ کو بتانا ہوگا۔ آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں.....؟“ وہ بھی بھند تھا۔

”تم جاؤ یہاں سے..... وہ شدید ڈپریشن میں ہے.....“ حیدر نے آہستہ سے کہا تو وہ خاموش ہو گیا اور باہر جانے لگا..... ایک دم مڑا.....

اس کی طرف دیکھا۔

”آئی ایم سوری انکل.....“ وہ قدرے شرمندگی سے بولا۔ حیدر خاموش رہے..... وہ کمرے سے باہر نکل چکا تھا۔

”اب رونے سے کیا فائدہ؟“ حیدر نے اسے سمجھایا۔

”تو میں کیا کروں..... تم ہی بتاؤ..... اپنے گناہوں اور ان کی تباہی پر روؤں بھی نہ تو کیا کروں..... حیدر میرا دل پھٹ رہا ہے..... خدا کے

لیے مجھے کوئی ایسا انجکشن لگا دو..... کہ میں مزید کچھ سننے کے لیے زندہ نہ رہوں..... پلیز کچھ تو کرو..... خدا کے لیے.....“ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ لہجہ نہیں کر رہی تھی۔

”ہوش میں آؤ شہلا..... یہ کیا پاگل پن ہے.....“ وہ قدرے خشکی سے اور ڈانٹتے ہوئے بولے اور اسے اس کی دواؤں میں سے ٹیبلٹ

دی..... حیدر پریشان تھے، کمری کی پشت سے ٹپک لگائے گہری سوچ میں گم تھے اور وہ آہستہ آہستہ نیند کی وادی کی بھول بھلیوں میں کہیں گم ہو رہی تھی۔

ولیم سخت نادم ہو رہا تھا انجانے میں اس سے کتنی غلط حرکت ہو گئی تھی۔ حیدر انکل بالکل بھی ایسے نہ تھے جیسے اس وقت اس نے سوچا۔ اس

نے بلا واسطہ انداز میں ہر طرح سے ان کا جائزہ لیا تھا۔ ان کی اور ماما کی باتوں سے اس نے یہ تو اندازہ لگا لیا تھا کہ دونوں کی ماضی میں کافی الجھنیں

تھی لیکن ان کے چہرے سے نیچتی شرافت اور عظمت کو وہ کبھی شک کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ عظمت اور شرافت کے پیمانے میں قطعی کم وزن نہیں

رکھتے تھے۔ اس نے ان پر شک بھی کیا اور طنز بھی..... وہ سخت پریشان ہو رہا تھا اس سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے نور کو فون ملایا۔ وہ

اس سے یہ بات جلد از جلد شیئر کرنا چاہتا تھا۔ تیل جاری تھی مگر کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا ہلا خرا کافی ہارنرائی کرنے کے بعد کسی خاتون نے فون اٹھایا۔

اس نے نور کا پوچھا۔

”وہ تو کراچی گئی ہے.....“ خاتون نے بتایا۔

”کب؟“ حیرت سے رہے سیر اس کے ہاتھ سے چھوٹنے لگا۔

”دو تین دن ہو گئے ہیں.....“

”اور واپس کب آئے گی.....؟“

”معلوم نہیں.....“ دوسری طرف سے فون رکھ دیا گیا۔

یہ انکشاف اس کے لیے سخت حیران کن تھا۔ نور اسے کچھ بتائے بغیر اچانک کہاں چلی گئی تھی۔ ”نہیں..... وہ کہیں نہیں جاسکتی۔ اس نے

مجھ سے وعدہ کیا تھا اور یوں اچانک..... مجھے بتائے بغیر..... نو..... نو..... اس امپاسمیل..... نور ایسا نہیں کر سکتی..... وہ تو کبہ رعی تھی کہ وہ بیمار ہے اس لیے نہیں آ سکے گی..... اس کا مطلب ہے اس نے مجھ سے جھوٹ بولا..... لیکن اس کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی اور..... ویسے بھی اس نے آج تک مجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔ اس نے کیونکر یہ کیا..... آخر کیوں؟“ وہ الجھ رہا تھا۔

”دنیا میں کوئی رشتہ پائیدار نہیں..... ہم سب کو کبھی نہ کبھی..... کہیں نہ کہیں..... جلد یا بدیر..... ہلا خرابیک دوسرے سے جدا ہونا پڑتا ہے..... یہی زندگی ہے.....“ ایک دن نور اسے سمجھا رہی تھی اور اب اس کے کہے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

”لیکن میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا..... تم جانتی ہو..... میں اپنا بیچ اور معذور ہوں..... تمہارے سہارے کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا..... تم مجھے یوں زندہ موت نہیں دے سکتی ہو..... میں کیسے سروائیو کروں گا۔“

وہ سخت ڈپریشن کا شکار ہو رہا تھا۔ پہلے عداوت تنگ کر رہی تھی اب تنہائی اور ڈپریشن.....

حیدر یہیں رک گئے تھے۔ گھر کے سارے کمین اس وقت شدید ٹینشن میں تھے۔ شفق شدت غم سے غم حال بالکل بے ہوش پڑی تھی۔ شہلا شدید احساس گناہ سے تڑپ رہی تھی اور ولیم شدت عداوت سے بے چین ہو رہا تھا حیدر کا یہاں ٹھہر جانا ہی مناسب تھا حیدر نے ایک نرس کو کال کیا تھا۔ فوراً نہیں بتا کر گئی تھی کہ وہ کراچی کسی اہم کام کے سلسلے میں جا رہی ہے اور چند دن اسے وہیں لگ جائیں گے۔ اس نے ولیم کو بھی رنگ کیا تھا مگر وہ سو رہا تھا اس لیے اس نے اسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہا۔ حیدر ڈرائنگ روم میں بیٹھنے والا تھا راناخند سے ساری بات سن رہے تھے اور گہری سوچ میں گم تھے۔

”یقیناً انھوں نے گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا ہوگا.....“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”معلوم نہیں سر..... اندھیرا بھی اتنا گہرا نہیں تھا۔“

”ذوالفقار اب تم اس گھر کی طرف مت آنا اور اس گاڑی کو بھی استعمال نہ کرنا چند روز کے لیے فیکٹری کے گیراج میں کھڑی کر دو..... تم میری لینڈ کروزر استعمال کر لیا کرو..... اور میرے لیے بلیک وی ٹی آئی اور شیر شاہ کو بھیج دو.....“ حیدر نے اسے ہدایات دیں۔

”ٹھیک ہے سر اب میں چلتا ہوں.....“ ذوالفقار اٹھ کر چلا گیا تو وہ شہلا کے کمرے میں آ گئے اور وہاں پر موجود نرس سائرہ کو شہلا کے بارے میں مختلف ہدایات دینے لگے۔ وہ اس کی دوائیوں کے بارے میں سمجھا رہے تھے۔ جب شفق متورم آنکھوں اور چہرے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی..... اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ الجھش کی وجہ سے اس کا سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ وہ پورا دن اور رات سوئی رہی تھی۔ شہلا اس کی طرف مسلسل دیکھ رہی تھی مگر اس نے ایک دفعہ بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا..... شہلا کا بیڈ کونے میں لگا تھا اور وسیع چوکور کمرے کے اس کونے میں روشنی بھی قدرے کم تھی۔ حیدر اس سے کافی فاصلے پر صوفے پر بیٹھے تھے..... ایک صوفہ کم بیڈ شہلا کے بیڈ کے پاس تھا جبکہ دوسرا صوفہ..... ٹی وی ٹرائی اور ٹیبل اس سے کافی فاصلے پر بیڈ کی پائنتی کی جانب رکھے تھے..... حیدر دونوں کو آہستہ آہستہ دیکھ رہے تھے۔

”انگل..... اب میں کیا کروں گی..... کہاں جاؤں گی پاپا کے لوگ یہاں تک بھی آ سکتے ہیں۔“ وہ قدرے تشویش سے بولی۔

”گھبرانے کی بات نہیں..... اس گھر کا انھیں کبھی بھی علم نہیں ہوگا۔“ حیدر نے اسے تسلی دینا چاہی۔

”انگل آپ نے یہ مگر کب خریدا.....؟ آپ نے بتایا بھی نہیں.....“

”بس کچھ ماہ پہلے.....“

”انگل..... سحر اسپتال میں ہے اور۔“

”نہیں..... وہ بھی اب ذمہ نہیں رہی..... میں نے اسپتال فون کیا تھا۔“

”کب.....؟“ وہ پریشان ہو کر اپنی جگہ سے اٹھی۔

”کل رات کو.....“

”اور..... اس کو کس نے دیا.....؟“ پاپا اس کی میت کو تو گھر نہیں لائے ہوں گے۔“

”ہاں..... اسے لاوارث قرار دے کر ایڈمیٹسٹ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ مجھے ساری بات کی خبر بہت بعد میں ملی..... ورنہ..... خیر.....“

اب تم پریشان نہ ہو۔“

ایک دم شہلا کو زور سے کھانسی ہوئی تو حیدر نادانستہ اندھ کر اس کی طرف لپکے شفق نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور وہ بھی حیدر کے پیچھے گئی۔ ایک نیم مردہ..... ہڈیوں کا وجود..... گہری سیاہ رنگت کے ساتھ بستر پر پڑا کھانس رہا تھا۔ نہ سر پر بال نہ جسم پر گوشت..... کوئی بھی اجنبی ایک دفعہ دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا۔

”انگل..... یہ کون ہیں؟“ شفق نے حیرت سے پوچھا۔

”حیدر نے شہلا کی طرف دیکھا..... وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں نفی کا اشارہ کر رہی تھی..... اسے نہ بتانے پر اصرار کر رہی تھی۔ حیدر نے

گہری سانس لی۔ شفق کے حیرت زدہ مشکوک چہرے کی طرف دیکھا۔

”شفق یہ تمہاری ماں ہے شہلا.....“ وہ آہستہ سے بولے۔ شفق نے حیرت سے منہ کھولا اور منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

”ن..... ن..... نہیں.....“ وہ بغیر کچھ کہے بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ حیدر سر جھکائے بیٹھے تھے۔

”حیدر..... یہ کیا کیا.....؟ وہ تو پہلے ہی شدید اذیت میں ہے اور اب.....“

”حقیقت کو چھپانے سے بہت سی تکلیاں جنم لیتی ہیں اور ویسے بھی سچ نے ایک نہ ایک دن ظاہر تو ہونا ہی ہوتا ہے..... اسے سارے

صدے ایک ساتھ برداشت کر لینے دو.....“

”اور اگر وہ اس کو بیٹھی تو.....“

”نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا..... اس نے زندگی میں بہت تکلیاں دیکھی ہیں۔ بہت اذیتیں سہی ہیں اور ایسے انسانوں کا اندر ایسی باتوں کا

عادی ہو جاتا ہے..... اس لیے ایسے شاکس انھیں زیادہ ڈسٹرب نہیں کرتے۔“

”ہاں..... اس نے میری گود سے جدائی تک..... اور اب تک نہ جانے کتنے دکھ سہے ہیں۔ پلیز اسے جا کر دیکھو..... اسے سمجھاؤ..... کہ وہ

روئے نہ..... وہ روتی ہے تو میرا دل تڑپنے لگتا ہے۔ میں گناہ کے احساس سے اور تھلائے لگتی ہوں..... پلیز حیدر جاؤ..... پلیز.....“ وہ اس سے التجا

کر رہی تھی۔ حیدر اٹھ کر گئے تو وہ بستر پر ادھر سے منہ لٹکی سسکیاں بھر رہی تھی۔

”شفق... شفق جیٹا... اٹھو... ایسے بی بی نہیں کرتے...“ حیدر نے پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”انکل یہ سب کیا ہے... اور میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے... آخر میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے... ماما... یہاں کیوں آئیں... اور

آپ نے انھیں کیوں اس گھر میں رکھا ہے جہاں میں آئی ہوں... انھیں کیوں یہاں رکھا ہے؟“

”بیٹا وہ اس دنیا میں بالکل تنہا ہے اور بیمار بھی... تم نہیں جانتیں کہ وہ اب صرف چند دنوں یا پھر مہینوں کی مہمان ہے۔ اسے برین ٹیور ہے۔

آپریشن تو ہوا... مگر ٹیور پھر پھیل رہا ہے... وہ کہاں جاتی... کب تک غیروں کے گھر میں پڑی رہتی۔ اس لیے میں اسے اس گھر میں لے آیا۔“

”انکل آپ کیوں لائے... انھیں ان کے دوسرے شوہر کے پاس کیوں نہیں چھوڑ دیا۔ اب وہ کہاں ہے... جس کے لیے مجھے آفاق

اور فلک کو چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔“ وہ غصے سے بول رہی تھی اور آنسو بہہ رہے تھے۔

”اس نے اسے بھی چھوڑ دیا...“

”اور اب جب کسی قابل نہیں رہیں تو یہاں آ گئیں۔“

”وہ خود نہیں آئی... میں اسے لایا ہوں۔“

”کیوں انکل؟“

”کیونکہ تاپا ابا نے اسے بیٹیوں کی طرح پالا تھا اور انھوں نے مرتے ہوئے مجھے وصیت کی تھی کہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر اسے تنہا نہ

چھوڑوں وہ اس سے بہت محبت کرتے تھے اور شاید جانتے بھی تھے کہ جتنی شو کریں وہ کھا چکی ہے کہیں زندگی میں تنہا نہ جائے... میں نے یہ بات

www.pdfbooksfree.pk

کسی کو نہیں بتائی صرف قصصیں بتا رہا ہوں... تم بھی اسے معاف کرو۔“

”نہیں انکل... میں انھیں معاف نہیں کر سکتی... وہ ہماری زندگیوں کے ساتھ کھلی ہیں... کیا وہ رات میں بھول سکتی ہوں جب ہم

بالکل تنہا تھے اور فلک تڑپ رہی تھی... وہ کیسے مر گئی ہمیں پتا ہی نہ چلا... میں اور آفاق... پانگوں کی طرح کمروں میں گھومتے رہے، روتے اور

چلاتے رہے، ماما... ماما پکارتے رہے مگر وہ تو اپنے شوہر کے ساتھ تھیں... اور پاپاشزا آئی انٹی کے ساتھ بیٹی مون منانے گئے تھے انکل میں ان دونوں کو

معاف نہیں کر سکتی... آفاق... اس کی تو کوئی زندگی ہی نہ تھی... وہ آوارہ بچوں کی طرح سکون کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا... میں جانتی تھی

اس کے اندر آگ تھی۔ ایک لاوا تھا جو ہر وقت پھٹنے کو تیار رہتا تھا... میں نے اس کے چہرے پر ایک دفعہ بھی مسکراہٹ اور قہقہہ نہیں دیکھا... میرا

بھائی خود اندر ہی اندر جلتا رہا... اور پھر بجھ گیا...“ اس نے سسکیاں بھرنا شروع کر دیں ”اور میں خود... کیسے بھٹک گئی میں نے کیسے کیسے گناہ

کیسے... قتل بھی کیے اور... ان سب باتوں کی صرف وہی ذمہ دار ہیں۔ انکل میں یہاں نہیں رہوں گی... ایک دن بھی نہیں رہوں گی۔ آپ مجھے

گاؤں بھیج دیں۔ میں ان کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی...“ اس کے اندر شدید نفرت تھی جو وہ اگل رہی تھی۔

”شفق جیٹا... پلیز کول ڈاؤن ہو جاؤ۔ اس وقت تمہاری ماما کو تمہاری ضرورت ہے، کوئی بھی نہیں جو اسے سنبھال سکے۔ میں بہت مشکل

سے وقت دے پاتا ہوں اور اسے فل ٹائم اینشن چاہیے...“ حیدر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”نہیں انکل..... میں اتنی وسیع القلب نہیں۔ کہتے ہیں ماں باپ کا دل بہت وسیع ہوتا ہے جس میں اولاد کی برخطا اور گناہ سما سکتا ہے مگر اولاد کا دل کبھی بھی اتنا بڑا نہیں ہو سکتا اور ماں تو اولاد کے لیے ہر قربانی دے سکتی ہے لیکن ہماری ماں نے تو ہمارے لیے کچھ بھی نہیں کیا..... اب وہ مجھ سے کچھ توقع نہ کریں..... میں ان کی کچھ نہیں لگتی۔“ وہ دھڑکے سے پھٹ پڑی۔

”شفق اگر ہر انسان یوں سوچنا شروع کر دے تو اس دنیا میں سانس لینا بھی دشوار ہو جائے۔ انسان کا وجود تو انسانیت سے ہے۔“ حیدر نے پیار سے سمجھانا چاہا۔

”انکل تو کیا ہم نے کبھی زندگی میں سکون کا سانس لیا..... ہم نے تو ایک دن کیا ایک لمحہ بھی اپنے آپ کو بے سکون محسوس نہیں کیا..... ہم تو ہر وقت دیکھتے کوکلوں کی طرح اندر ہی اندر سلگتے رہے ہیں۔“ اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔

”تو کیا تم اس حالت میں بھی اپنی ماں کو معاف نہیں کرو گی.....؟“ حیدر نے استغما میں لہجے میں پوچھا۔

انکل پلینز اس موضوع پر بات مت کریں۔ میں پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہوں اب مزید کچھ نہیں سوچنا چاہتی ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ میرے دل میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں..... ہم نے تو ان کے ہارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“ وہ قدرے سختی سے بولی تو حیدر پریشان ہو کر ہا ہر نکل گئے۔

”حیدر وہ ٹھیک تو ہے نا؟“ شہلا اسے یوں انفرادہ دیکھ کر بولی۔

”ہاں..... اب بہتر ہے۔“

”حیدر وہ میرے بارے میں کیا کہتی ہے؟“

”کچھ نہیں.....“

”تم کچھ چھپا رہے ہو.....“

”جب کہنے کو کچھ نہ ہو تو چھپانا کیسا.....؟“

شہلا نے گہری سانس لی اور خاموش ہو گئی۔

حیدر ولیم سے کچھ ناراض تھے۔ اس لیے وہ اس کے کمرے میں نہیں گئے۔ البتہ الفضل اور نرس کو ہدایات دے رکھی تھیں کہ دونوں کا ہر ممکن خیال رکھیں۔ شفق داش روم میں تھی وہ حیدر کے ساتھ گاؤں جا رہی تھی۔ حیدر لاؤنج میں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے ولیم وکیل چیئر پر آہستہ آہستہ ان کی جانب بڑھا۔

”انکل..... آئی ایم سوری..... آپ مجھ سے ابھی تک ناراض ہیں.....“ حیدر نے اس کی طرف بغور دیکھا اور خاموش رہے۔

”آئی ایکسٹریملی سوری..... نہ جانے مجھے کیا ہو گیا.....“

”ولیم تم لو جوان لوگوں کی سوچ بہت چھوٹی اور دعوے بہت بڑے ہوتے ہیں..... سب کچھ لحوں میں جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے..... تم لوگوں کو نہ تو کسی پر اعتبار ہے اور نہ ہی خود پر اعتماد تم لوگ تو مٹی کے بھر بھرے وجود اور کھٹکتے جسم ہو۔“ ان کے لہجے میں ظہیر اؤنگر الفاظ میں قدرے کاٹ

اور نظروں میں غفلت تھی۔ ولیم خاموش رہا۔

شوق ایک دم دروازہ کھول کر باہر نکل..... اور ولیم کو دیکھ کر غفلت..... ”شرق و مغرب کا خوبصورت احتجاج.....“ وہ چنگی۔

”حیرت انگیز حد تک مہمان کی عیب.....“ ولیم نے اسے حیرت سے دیکھ کر سوچا۔ شوق نے حیدر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گہرا

استہمام تھا۔

”شوق یہ تمہارا اسٹیپ برادر ہے۔“ ولیم اور ولیم یہ تمہاری اسٹیپ سسر ہے ”شوق“ اور اگر تم دونوں اسٹیپ کا ورڈ نکال دو تو تم دونوں

بہن بھائی ہو..... جو کہ ایک خوبصورت ترین رشتہ ہے۔“ حیدر نے قدرے اطمینان سے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی

طرف دیکھا اور خاموش رہے۔

”انگل چلیں.....“ وہ اس کو ایک دم نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

”نھیک ہے..... میں اپنا ریف کیس لے آؤں.....“ وہ اٹھ کر اوپر کمرے میں چلے گئے..... جہاں وہ آرام کرتے تھے۔ شوق صوفے پر

بیٹھ گئی۔

”آپ مہمان سے بہت ملتی ہیں..... اور آپ کی آواز بھی۔“ ولیم نے بات بڑھانے کے انداز میں کہا۔

”نہیں، میں ان سے بالکل نہیں ملتی..... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”آپ مہمان سے ناراض لگتی ہیں..... کیا آپ ان سے ملتی ہیں..... وہ بہت پیار ہیں.....“

”جو گناہ کرتا ہے وہ اسی طرح.....“ وہ اچانک خاموش ہو گئی۔ ولیم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

اس کا خوبصورت چہرہ..... نیلی آنکھیں..... بھورے بال..... کراس والا لاکٹ۔

”کیا تم کو سچن ہو.....؟“ شوق نے قدرے چپے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ولیم اس کی بات سن کر بوکھلا سا گیا..... اور کچھ سوچنے لگا۔

”ہاں..... ہاں..... میں کر سکتی ہوں.....“ وہ آہستہ آواز میں بولا لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے شوق دنیا کی کسی حقیر ترین مخلوق سے

خطاب ہو۔

”تمہاری مہمان بھی کر سکتی ہیں.....“ اس کے لہجے میں پھر چہین تھی۔

”معلوم نہیں، شاید نہیں۔“

”کسی گندی زندگی ممانے گزاری ہے.....؟“ وہ پھر حقارت سے بولی۔

”کیا مطلب؟“ ولیم نے حیرت سے پوچھا۔

”گناہوں سے بھری دلدل میں..... تف ہے ایسی زندگی پر..... بچوں کے ساتھ ساتھ ایمان کو بھی داؤ پر لگا دیا کفر کی خاطر.....“ وہ غصے

سے بولی۔

”آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟“ ولیم اس کی باتوں پر دنگی ہو رہا تھا۔

”ایک مسلمان عورت جب کفر کو جنم دے تو اس سے بڑھ کر اس کی بد نصیبی کیا ہوگی..... اور پھر چلتا پھرتا گناہ بھی ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہے.....“ اس کے اندر آتش فشاں پھٹ چکا تھا اور اب لاوا آہستہ آہستہ باہر آ رہا تھا وہ ہر ممکن اندر کا زہرا گلنا چاہ رہی تھی۔

”آپ مجھ پر طنز کیوں کر رہی ہیں.....“ اس نے تو محبت سے اس کی طرف قدم بڑھانا چاہا تھا اور وہ پھری ہوئی شیرنی کی طرح اس پر تازہ توڑ حملے کر رہی تھی۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر پوچھا۔

”اس لیے کہ تمہارے باپ نے ماما کو بہکایا.....“

”مگر میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا.....“

”اب تو جان گئے ہوتا.....“ وہ طنز سے لہجے میں بولی۔

”میرا اس میں کیا قصور ہے.....؟“

”تو ہمارا کیا قصور تھا..... جب ہم تینوں بہن بھائیوں کو چھوڑ کر تمہارے باپ کے ساتھ چلی گئیں..... تم جانتے ہو..... فلک سب سے چھوٹی صرف دو سال کی میری گود میں روتی رہی..... آفاق چننا رہا اور ماما چلی گئیں..... اب وہ دونوں مر گئے ہیں اور میں زندہ رہ گئی ہوں..... میں ان کو اس حالت میں دیکھنے کے لیے زندہ رہ گئی ہوں۔ اب تم دونوں تڑپ تڑپ کر چیو گے..... خدا کرے ایسا ہی ہو..... جس طرح ہم تڑپے ہیں..... روئے ہیں..... تم اور ماما بھی اسی طرح روؤ..... جس طرح ہمارا روننا کوئی نہیں سنتا تھا..... تم لوگ بھی روؤ، سسکو..... اور کوئی بھی تمہاری مدد کو نہ آئے اور خدا تم لوگوں کے ساتھ بھی تو کر رہا ہے..... ماما کی کیسی خوفناک حالت ہے اور تم اس قدر محتاج.....“ اس نے اس کی ناگوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے..... ولیم حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا..... اس کی باتیں سن کر اس کا اندر کا پھٹنے لگا..... وہ تو قطعی توقع نہیں کر رہا تھا کہ کوئی ذمہ گی میں اسے یوں بددعا دے گا..... اور وہ اس کے سامنے بیٹھ کر نہ صرف اسے کوس رہی تھی، بددعا کہیں بھی دے رہی تھی اور وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔

حیدر بریف کیس لے کر آئے..... شفیق کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ٹھٹھکے..... ولیم کی طرف دیکھا..... اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا..... وہ خاموشی سے دروازے کی طرف چل پڑے..... وہ بھی بنا کچھ کہے اور دیکھے ان کے پیچھے ہا ہر نکل گئی۔

ولیم کا وجود انگاروں پر لوٹ رہا تھا نہ جانے وہ انگاروں کی کیسی چادر بچھا گئی تھی جس میں وہ بری طرح جھلس رہا تھا اس کی باتیں اس کے کانوں میں پچھلے سپیس کی طرح مسلسل نشر چھو رہی تھیں..... اتنی کڑواہٹ..... اتنا زہر..... اس کا حلق سوکھ رہا تھا..... اس میں مسلسل کانٹے چھب رہے تھے..... ”چلتا پھرتا گناہ..... چلتا پھرتا گناہ.....“ اس کی سخت توہین ہوئی تھی..... اس کا دل چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر روئے..... اتنا روئے کہ اس کا دل پھٹ جائے۔ اس کا دماغ پھٹ جائے..... کاش وہ یہ سب نہ سنتا۔ کاش وہ اس سے بات نہ کرتا۔ کاش وہ اس سے نہ ملتا..... ہر لمحہ تاسف و ملال سے بڑھتا..... وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا..... اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ تھا..... اور شاید شفیق کے پاس بہت کچھ تھا۔ وہ اپنے کمرے میں لوٹ آیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

شہلا کو سخت دکھ ہو رہا تھا کہ وہ اس سے ملے بغیر چلی گئی تھی۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ اس کے دل میں ماں کے لیے کتنی نفرت تھی۔ اس کا مطلب ہے اس نے اسے معاف نہیں کیا تھا۔ حیدر بھی جا چکا تھا اور وہ بھی اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ اس نے نرس کے ذریعے ولیم کو بلایا۔

”ان کو تھادو کہ میں نہیں آسکتا۔ میری طبیعت خراب ہے۔“ وہ سختی سے بولا۔۔۔۔۔ مسلسل رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ شفق کے کہے ہوئے الفاظ نے اس کی روح تک کو چھلنی کر دیا تھا۔ نرس نے یہی پیغام دیا تو وہ تڑپ اٹھی۔ ولیم بھی اس سے غرت کرنے لگا تھا۔

”یا خدا یا۔۔۔۔۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ میں کب تک۔۔۔۔۔ آخر کب تک یونہی سب کے ہاتھوں ذلیل ہوتی رہوں گی۔۔۔۔۔ کیا مجھے سمجھنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔ تو تو مجھے اور میری مجبور یوں کو سمجھتا ہے۔۔۔۔۔“

”سارہ۔۔۔۔۔ مجھے سہارے سے اس کے کمرے میں لے چلو۔۔۔۔۔“ اس نے نرس کو کہا۔

”میڈم۔۔۔۔۔ آپ کیسے انہیں گی۔۔۔۔۔“

”کوشش کرتی ہوں۔۔۔۔۔“

”وہ اس کے سہارے بمشکل چلتی ہوئی ولیم کے کمرے میں گئی تو وہ بستر پر لیٹا تھا۔ آنکھوں پر ہازور کھے وہ آہستہ آہستہ سسک رہا تھا۔

”سارہ تم جاؤ۔۔۔۔۔“ اس نے نرس کو کہا تو وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

”کیا بات ہے ولیم۔۔۔۔۔ بیٹا کیا تم مجھ سے ناراض ہو۔۔۔۔۔؟“ وہ جیسے محرم بنی اس سے سوال کر رہی تھی۔

وہ خاموش رہا۔

”کیا تم رورہے ہو۔۔۔۔۔؟“ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہازو بٹانے کی کوشش کی تو اس نے سختی سے ہازو چھڑایا اور اس کے ہاتھ کو پرے دھکیلا۔

”آخر تم بتاؤ تو سہی کیوں ناراض ہو۔۔۔۔۔ ولیم پلیز اس طرح مت کرو۔۔۔۔۔ ورنہ میں مرجاؤں گی۔۔۔۔۔ میں بہت مشکل سے تمہارے پاس

آئی ہوں۔“

”مجھے جو آپ نے زندہ رسوائی کی قبر میں ڈال دیا ہے۔۔۔۔۔ وہ کیا ہے۔۔۔۔۔ مجھے آپ کی وجہ سے کیا کچھ سننا پڑ رہا ہے۔“

”کیا سننا پڑ رہا ہے۔۔۔۔۔ اور کس نے کہا؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”آپ کی بیٹی نے؟“

”شفق نے۔۔۔۔۔ اس نے کیا کہا تم سے۔۔۔۔۔؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”اس نے مجھے آپ کا ”چلتا پھرتا گناہ“ کہا ہے۔ اس سے بڑھ کر مجھے کون ذلیل کرے گا ہما۔۔۔۔۔ کاش آپ مجھے پیرا ہی نہ کرتیں اور اگر

کیا تھا تو مجھے وہیں چھوڑ آئیں۔ میرا ملک اور میرا مذہب تو وہاں کا ہوتا جہاں کا میں ہوں۔ یہاں تو میں ایک تماشائین گیا ہوں۔ آپ سب مسلمانوں

کے درمیان ایک کافر۔۔۔۔۔ آپ کیسے مسلمان ہیں۔۔۔۔۔ مجھ سے یوں بی ہو کرتے ہیں جیسے میں کوئی ناپاک انسان ہوں۔ آپ نے مجھے ایک نجاست بنا

دیا ہے۔۔۔۔۔ آخر آپ نے ایسا کیوں کیا؟“ وہ بلبلانے لگا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں ہی سب کی گناہگار ہوں۔۔۔۔۔ ہر کوئی مجھے ہی قصور وار سمجھتا ہے۔ میں مانتی ہوں مجھ سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ کیا میرے

اقرار کی سزا ہے کہ ہر کوئی مجھ پر حملہ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے اپنے گناہ کا اقرار خدا کے سامنے کرو تو وہ بھی معاف کر دیتا ہے مگر تم لوگوں نے تو مجھے

اس کتھرے میں کھڑا کر دیا ہے جہاں میرے لیے کوئی معافی نہیں۔۔۔۔۔“ اس کی بھی آنکھیں برسنے لگیں۔

”آپ بتائیں میں کیا کروں..... کہاں جاؤں..... آپ..... آپ مجھے واپس بھیج دیں میرے بڑے کے پاس۔“
 ”کیا کہا..... کیا کہا تم نے..... اس کے پاس جس نے مجھے طلاق صرف تمہاری وجہ سے دی تھی جو کہتا تھا کہ اسے تمہارا وجود ہی نہیں چاہیے
 کل کو کہیں میں اسے تمہاری وجہ سے تنگ نہ کرو اور تمہاری زندگی کے بدلے میں نے طلاق لینا منظور کی..... اس باپ کے پاس واپس بھیج دوں.....“
 اس کا جسم غصے سے تھر تھرانے لگا۔

”پھر آپ مجھے یہاں کیوں لائیں؟“

”تمہارے بہت سے کیوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں..... تم جتنی سزا مجھے دینا چاہتے ہو..... اس کا فیصلہ کر لو..... جہاں میں نے اتنا
 سہا ہے یہ بھی سہہ لوں گی..... لیکن اس طرح میں مجرم بن کر اپنی زندگی کے دن پورے نہیں کر سکتی..... ہو سکتا ہے یہی میری زندگی کا آخری دن
 ہو.....“ اس نے ارد گرد دیکھتے ہوئے آہ بھر کر کہا۔

ولیم نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا..... اور اپنے وجود کو گھسیٹتے ہوئے اس کے گھٹنے پر اپنا سر رکھ دیا وہ اس کے سر کو گود میں رکھ کر والہانہ
 چومنے لگی اس کے سارے وجود سے دوائیوں کی مہک آرہی تھی مگر وہ تو ایسے بے قراری سے اس کے ساتھ چٹا تھا جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ بہت دنوں کی
 جدائی کے بعد ماں کے سینے سے لپٹ کر اپنی اداسی دور کر رہا ہو۔

”شوق نے جو کچھ بھی کہا ہے اسے بھول جاؤ..... وہ بہت دکی ہے اور وہ مجھ سے ناراض بھی ہے۔ تم تو میرے پاس رہے اور میں جتنی محبت
 تمہیں دے سکتی تھی وہی..... مگر وہ نہ تو باپ کی محبت کو پا سکی اور نہ ماں کی.....“ اس نے اس کی پیشانی اپنے ہڈیوں والے ہاتھ میں لے کر ان پر چھڑی
 زدہ ہونٹ رکھ دیے..... وہ روتا رہا..... وہ اسے سہلاتی رہی..... اور اس کے اندر کی کدورت اور نفرت رفتہ رفتہ آلسوؤں کے ساتھ بہتی گئی۔

www.pdfbooksfree.pk

راجکماری

راجکماری جناب ڈاکٹر کرم حسین شاہ رانی کا اسلامی تاریخ پر تحریر کردہ ناول ہے۔ یہ ناول آسام کے خاص راجہ کرشن
 کمار اور حاکم بنگال علی گلی خان کے بیچ ہونے والے لرزہ خیز معرکہ خیز و شرکی کہانی ہے۔ آج کل اسلامی تاریخ پر بہت کم ناول لکھے جا رہے
 ہیں کیونکہ تاریخی ناول لکھنے کے لئے بہت زیادہ تحقیق اور مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس ناول میں ڈاکٹر کرم حسین نے بہت خوبصورتی
 سے اس وقت کے ماحول اور معاشرت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس جنگ کے تاریخی واقعات بیان کیے ہیں۔ امید ہے ڈاکٹر کرم حسین کی یہ کاوش
 آپ کو پسند آئے گی۔

”راجکماری“ کتاب گمر پور دستیاب ہے۔ جسے اسلامی تاریخی ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

جب سے شاکل نے تین خون آلود انسان تڑپے، سکتے دیکھے تھے اس واقعے نے اس کے ذہن پر گہرا اثر کیا تھا۔ وہ چنچنی چلاتی اپنے کمرے میں چلی گئی اور اس نے خوفزدہ ہو کر اپنا کمرالاک کر لیا تھا۔ شزاوردوازہ ناک کر کے تھک چکی تھی مگر وہ کھولتی ہی نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے وہ چوکیدار کی مدد سے کھڑکی کا شیشہ تڑوا کر اندر داخل ہوئی اور یہ دیکھ کر چمک گئی اس کے ہاتھوں اور سر سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بے ہوش پڑی تھی۔ اس کی سانس بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔۔۔۔۔ باہر آفاق اور ماہ رخ کی مٹھیں پڑی تھیں شزا اسے ہوش میں لانے میں مصروف تھی۔ اس نے ڈاکٹر کو فون کر کے بلایا اس نے انجکشن لگا کر اسے سلا دیا۔

شفق کی آمد سے ملک منصور کی بہت سکی ہوئی تھی۔ ہر نظر میں استغہام تھا۔ وہ باپ کو سر عام رسوا کر کے گئی تھی لیکن ملک منصور نے کمال ہوشیاری سے اس بات کو کور کرنے کی کوشش کی تھی اس نے سب کو بتا دیا کہ اس کا ذہنی توازن بگاڑ چکا تھا اور وہ فونشین ہاؤس میں ایڈمٹ تھی نہ جانے کیسے وہاں سے بھاگ آئی مگر کوئی بھی اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کیونکہ وہ جس گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہوئی تھی وہ فونشین ہاؤس کی نہیں بلکہ اس پر مخصوص گرین کلر کی نمبر پلیٹ تھی اور شفق بھی بظاہر نارمل لگ رہی تھی۔

ملک منصور اندر ہی اندر کھول رہا تھا بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا تھا اور ان کی تدفین کی تھی۔ اس کے بعد وہ اور اس کے کارندے مسلسل اس کی تلاش میں تھے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ زندہ کیسے بچ گئی اور اتنا عرصہ کہاں رہی۔ کیا ایسا بھی ممکن تھا اور سب سے بڑھ کر کہ اسے پتا کس نے دی تھی۔۔۔۔۔ کون ایسا ہو سکتا ہے جو ملک منصور سے دشمنی مول لے۔۔۔۔۔ اس کا ذہن مسلسل سوچ رہا تھا۔۔۔۔۔ اور ایک دم اس کے ذہن میں "حیدر" کا نام گونجنے لگا۔۔۔۔۔ یقیناً وہ حیدر ہی ہوگا۔ حیدر کے علاوہ یہ کام اور جرأت اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔۔۔۔۔ اس نے پی اے سے حیدر کا نمبر ملانے کو کہا۔ حیدر شفق کو چھوڑنے گاؤں جا رہا تھا۔

"ملک منصور بات کر رہا ہوں؟"

"ہوں۔۔۔۔۔" حیدر نے گہری سانس بھر کر کہا۔

"شفق کو میرے حوالے کر دو۔۔۔۔۔"

"کون شفق۔۔۔۔۔؟"

"میرے ساتھ بحث مت کرو۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔"

"ملک منصور میں ایسا لہجہ سننے کا عادی نہیں ہوں۔۔۔۔۔ اور نہ ہی کوئی عام انسان ہوں، جس کے ساتھ آپ جیسی چاہیں گفتگو کریں۔" حیدر نے غصے سے سواہل آف کر دیا اور شیخوپورہ جانے کے بجائے اس نے ریٹالہ خورد جا کر گاڑی روکی۔ وہاں ان کے دیرینہ دوست نجیب احمد رہتے تھے۔ وہ رات وہیں ٹھہرے اور ان سے کہا کہ وہ شفق کو جلد از جلد پشاور میں تبسم آپا کے ہاں پہنچا دے۔۔۔۔۔ شفق حیران ہو رہی تھی کہ وہ اس کے لیے کتنی ٹینشن لے رہے تھے۔ پہلے دن کی ملاقات سے لے کر اب تک وہ اس کے لیے مضبوط ڈھال بنے ہوئے تھے۔ ایسے ساتہاں جس کے سائے تلے آ کر وہ اپنے آپ کو بہت محفوظ محسوس کرتی تھی۔ اس کا اندر ڈر رہا تھا۔ اسے اپنے باپ کے لیے ہاتھوں کا بخوبی اندازہ تھا۔ وہ تو پاتال سے بھی اپنے

دشمنوں کو نکال لانے کا عادی تھا اور اب تو وہ اسے کبھی بھی نہیں چھوڑے گا مگر حیدر اسے بہت تسلیم دے رہے تھے۔۔۔۔۔

”میں بہت جلد تمہیں پٹار میں آ کر ملوں گا۔۔۔۔۔ تبسم آپ کے شوہر آدمی میں ہیں۔ وہاں تم ہر طرح سے محفوظ ہوگی۔ گھبراؤ نہیں۔“

”انگل کیا ہم دوبارہ زندگی میں مل سکیں گے۔۔۔۔۔“ نہ جانے وہ کیوں بے یقینی کا شکار ہو گئی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔۔۔ انشاء اللہ۔۔۔۔۔ میں تم سے کوئی شک رکھوں گا اور سنو زندگی میں اتنی جلدی ہمت نہیں ہارتے۔۔۔۔۔ زندگی کا

ہر لمحہ آزمائشوں سے بڑھتا ہے۔۔۔۔۔“

”کاش ہر کوئی آپ جیسا باہمت اور وسیع القلب ہو۔۔۔۔۔ میں نے آپ کو بہت تنگ کیا ہے۔ آئی ایم سوری۔۔۔۔۔“ وہ مشکورانہ لہجے میں بولی۔

”اگر تمہارے دل میں میرے لیے کوئی اچھا جذبہ ہے تو اس کی خاطر اپنی ماما کے بارے میں اپنا دل صاف کرنے کی کوشش کرو۔ وہ چراغ

سحری ہے کسی بھی وقت بجھ سکتا ہے۔“

”انگل۔۔۔۔۔ میں اپنی زندگی کے اتنے سالوں کی اذیتوں کو کیسے بھول جاؤں کاش میں آپ کو وہ لمحے بتا سکتی جب لندن میں ہم ان سے جدا

ہو رہے تھے انھوں نے ہمیں چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔۔۔۔۔ اس وقت ہم کتنا رو رہے تھے مگر ماما نے ہماری خاطر بھی اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔۔۔۔۔ سوری میں سب

کچھ نہیں بھول سکتی۔ نہ جانے کتنی تمہارا میں ہم نے خوف میں گزاریں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ کتنے لمحے اذیت میں۔۔۔۔۔ جب ہمیں مایوسیوں نے گھیرا تو کوئی

ایک بھی دلاسا دینے کے لیے ہمارے پاس نہ تھا اور ہم۔۔۔۔۔ جھکتے جھکتے۔۔۔۔۔ بگڑتے جھکتے۔۔۔۔۔ براہوتے جھکتے۔۔۔۔۔ کسی نے نہ ہمیں سمجھایا اور نہ بچایا۔۔۔۔۔“

وہ پھر سسکتے گئی۔ اس کی بات سن کر حیدر خاموش ہو گئے۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میں جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ اپنا خیال رکھنا۔“ خدا حافظ کہتے ہوئے اور نجیب احمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ باہر نکل آئے۔

موبائل آن کیا تو ملک منصور کی کال ان کی منتظر تھی۔

”حیدر۔۔۔۔۔ مجھے سیدھی طرح بتا دو۔۔۔۔۔ شفق کہاں ہے۔۔۔۔۔؟“ ملک منصور غصے سے بولا۔

”حیرت ہے۔۔۔۔۔ بیٹی تمہاری ہے اور پوچھ مجھ سے رہے ہو۔۔۔۔۔“ حیدر بے سکون لہجے میں بولے۔

”مجھے معلوم نہیں تھا وہ بھی اپنی ماں پر گئی ہے جو اس کی طرح پچھلے تعلقات نہ بھلا سکی۔۔۔۔۔“ ملک منصور کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔

”تم تو پھر بہت کمزور شخص ہو جو دونوں کو نہ بدل سکے۔۔۔۔۔“

”جسٹ شٹ اپ۔۔۔۔۔ اور اسے میرے حوالے کر دو۔۔۔۔۔“ ملک منصور غصے سے دہاڑا۔

”تمہاری بیٹی ہے خود ڈھونڈو اور آئندہ مجھے فون کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں بدکردار اور بد اخلاق لوگوں سے بات کرنا بھی پسند نہیں

کرنا۔۔۔۔۔“ حیدر نے فون غصے سے بند کر دیا۔ ملک منصور نے موبائل غصے سے پرے پھینکا۔ شزا اس کی باتیں سن رہی تھی وہ شائل کی وجہ سے بے حد

پریشان تھی اور ملک منصور شفق کی وجہ سے۔

”منصور۔۔۔۔۔ شائل بہت بیمار ہے۔۔۔۔۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا اس نے اس واقعے کا شدید اثر لیا ہے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ شزا بول رہی تھی مگر وہ

سن نہیں رہا تھا۔ وہ تو کہیں گم تھا۔ کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا شزا اس کی عدم دلچسپی دیکھ کر ہنڑک اٹھی۔

”میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔“ وہ غصے سے بولی۔

”لیکن میں اس وقت کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔“ وہ بھی غصے سے بولا۔

”تم کب تک یوں غریب کی زندگی گزارتے رہو گے۔ جتنا تمہارا گھر نکھر چکا ہے اب اور کس بات کے منتظر ہو تم انسان نہیں۔۔۔۔۔ کبھی نہ کبھی کسی انسان کے دل میں بھی کسی کے لیے درد جاگ اٹھتا ہے مگر تمہارا دل تو جیسے پتھر کا ہے۔۔۔۔۔ مثال کس قدر بچار ہے تمہیں اندازہ ہے۔ کس کی خاطر اتنی گہری چالیں چل رہے ہو۔۔۔۔۔“ شزا چلاتے ہوئے بولی۔

”میری باتوں میں دخل دینے کی کوشش مت کیا کرو۔۔۔۔۔ تمہیں مثال کی زیادہ فکر ہے تو جاؤ اسے پاگل خانے چھوڑ آؤ۔۔۔۔۔ اور سنو۔۔۔۔۔ اگر تم اس گھر میں ہو تو میرا احسان مانو۔۔۔۔۔ ورنہ تم جیسی عورتوں کو تو میں دودن میں قارغ کر دیتا ہوں۔۔۔۔۔“ وہ اس پر دباڑتے ہوئے بولا۔

”کیا کہا۔۔۔۔۔ مجھ جیسی عورتوں کو۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ تم کس قماش کے انسان ہو۔ جانتے ہو۔۔۔۔۔ گھٹیا۔۔۔۔۔ بد کردار۔۔۔۔۔ رذیل ترین۔۔۔۔۔ دھوکے باز جس سے شیطان بھی پناہ مانگے۔“ شزا بھی غصے سے پھٹ پڑی ملک منصور نے دو تین تھپڑا سے مارے۔۔۔۔۔ شزا چلانے لگی۔ اسے شور و غل سے ایک دم مثال کی آنکھ کھل گئی وہ جلدی سے باہر آئی اور باپ کو یوں مارتے ہوئے دیکھ کر بدحواس ہو گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔۔۔۔۔ ہونٹ نیلے پڑنے لگے۔۔۔۔۔ آنکھیں جیسے پتھری گئیں، وہ وہیں گر گئی۔

شزا سب کچھ چھوڑ چھاڑ اس کی طرف بھاگی۔۔۔۔۔ اور اس کا سر گود میں رکھ کر چیخیں مارنے لگی کسی کو مدد کے لیے پکارنے لگی۔۔۔۔۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ ملک منصور جا چکا تھا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا اور وہ خود اسے گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گئی۔ وہ شدید صدمے سے دو چار تھی۔ مثال نیم مردہ حالت میں بستر پر پڑی تھی۔ وہ گیلی آنکھیں کھولتی کبھی بند کرتی کبھی ہنستی کبھی خاموش ہو جاتی۔

”اس کو الیکٹرک شاخس دینے پڑیں گے۔۔۔۔۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”آخری کوشش ہے، شدید پر سنائی ڈس آرڈر اسے اس اسٹیج پر لے آئی ہے۔“ ڈاکٹر کہہ رہا تھا اور وہ ہونٹوں کی طرح سن رہی تھی۔

”پر سنائی ڈس آرڈر۔۔۔۔۔“ وہ بڑبڑا رہی تھی۔ جیسے کچھ نہیں سن رہی تھی کچھ بھی کہیں ذہن میں ایک گیا تھا۔۔۔۔۔ وہ الجھ گئی تھی پھنس گئی تھی کسی

بہنور میں۔۔۔۔۔ کسی گرداب میں۔۔۔۔۔ گہرے پانی میں غوطہ زن زندگی کی چند سانسوں کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی مگر سب کچھ ناممکن نظر آ رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ شدید کرائس میں تھی۔۔۔۔۔ شدید ذہنی بحران میں۔۔۔۔۔ شاید پر سنائی ڈس آرڈر اسے بھی آہستہ آہستہ اندر ہی اندر جاہ کر رہا تھا۔



آنکھیں، ملک منصور کی باتوں پر حیران ہو رہی تھی۔ وہ آج اسے بہت کمزور۔۔۔۔۔ معطل۔۔۔۔۔ اور قدرے عمر رسیدہ لگ رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ ایسا تو نہیں تھا وہ تو ہمیشہ اس کی صاف ستھری، اجلی اجلی شخصیت دیکھنے کی عادی تھی۔۔۔۔۔ اس کی خوبصورت باتیں اس کو تقریرت بخشی تھیں۔۔۔۔۔ اس کا نرم گرم لب و لہجہ،

خوشبوؤں سے محطرسائیں، مدھوش کرتی نظریں..... اور اب وہ ٹوٹا پھوٹا لگ رہا تھا..... ملک منصور ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ زندگی سے ہار ماننے والا تو نہیں تھا۔ کیا وہ ہار مان گیا تھا..... وہ اس سے ملنے رات کے دو بجے اسلام آباد چلا آیا تھا..... وہ ہوٹل میں مقیم تھی اور اس نے فون کر کے اسے اطلاع دی تھی۔ وہ حیران تھی کہ وہ کافی دنوں کے بعد آیا تھا۔ اس دوران اس نے اس سے کوئی رابطہ بھی نہیں کیا تھا اور اب اچانک..... رات کے اس پہر.....

”آپ اس وقت..... اور بہت پریشان لگ رہے ہیں؟“ آنیکٹ نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں..... میں بہت ڈپریشن میں ہوں اس لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔ آنیکٹ مجھے سکون چاہیے۔ صرف چند لمحوں کے لیے..... میں..... میں..... بہت الجھ چکا ہوں.....“ وہ آنیکٹ کا نرم و نازک ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

”لیکن بات کیا ہے، میں آپ کو یوں اس طرح کبھی سوچ بھی نہیں سکتی.....“ آنیکٹ حیران ہو رہی تھی۔

”میں تم سے جلد از جلد شادی کرنا چاہتا ہوں ورنہ میں بکھر جاؤں گا۔ میں انتظار نہیں کر سکتا.....“ وہ قدرے بے صبری سے بولا۔

”آپ کو کیا ہو گیا ہے..... ابھی آپ کو آرام کی ضرورت ہے..... میں آپ کو ٹیبلٹ دیتی ہوں..... آپ سو جائیے..... میں صبح آپ سے بات کروں گی.....“

”نہیں..... مجھے تمہاری ضرورت ہے.....“ وہ شکستہ لہجے میں بولا۔

”نہیں..... آپ کو آرام کی اور سکون کی ضرورت ہے.....“ آنیکٹ نے محبت بھرے لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ جیسے مطمئن ہو گیا۔ اس وقت وہ مکمل طور پر آنیکٹ کے رحم و کرم پر تھا..... آنیکٹ نے ٹیبلٹ سائڈ ٹیبل کی دراز میں سے نکال کر اسے پانی کا گلاس دیا۔ اس نے خاموش سے گلاس لیا اور ٹیبلٹ کھا کر اس کے بستر پر لیٹ گیا..... آنیکٹ صوفے پر بیٹھی گہری سوچ میں گم تھی۔ یہ شخص اسے اب الجھا رہا تھا..... اس نے جو فیصلہ بہت دن پہلے کیا تھا اب اس پر سوچنے کا ایک اور موقع مل گیا تھا۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی اور وہ سوچکا تھا پورا کرا اس کے خرافوں سے گونج رہا تھا۔ وہ صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ ملک منصور کے ساتھ گزرا ایک ایک لمحہ اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا اور وہ اس میں سے اب سچ تلاش کرنے کی کوشش میں تھی۔ فیصلہ بہت مشکل تھا مگر اسے کرنا تھا۔

صبح جب وہ بیدار ہوا تو وہ آفس کے کام کے سلسلے میں جا چکی تھی ایک میج لکھ کر وہ سائڈ ٹیبل پر رکھ گئی تھی۔ اس نے اسے موبائل پر کال کی مگر وہ جلدی میں اپنا موبائل ادھر ہی چھوڑ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی آ گئی۔ ملک منصور اب قدرے بہتر لگ رہا تھا۔ نہادھو کر شیو کر کے، اسکن شرٹ اور براؤن چنٹ میں ملیں وہ پھر پہلے جیسا لگ رہا تھا آنیکٹ نیوی بلیو جینز کے ساتھ ڈینم کی ہی واسٹ اور اسکائے بلیو شرٹ پہنے ہوئے تھی..... اس کے بال قدرے بڑھ چکے تھے اور جسم بھی قدرے کمزوری کی طرف مائل تھا..... البتہ اس کے چہرے پر پھلکی پائیت نے اس کے چہرے کی دلکشی کو بہت حد تک مائل کر دیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

”کیا بات ہے..... تم کچھ بیمار لگ رہی ہو..... اور بہت مختلف بھی.....“ ملک منصور نے اس کے گرد بازوؤں کا گھیراٹک کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں، پچھلے دنوں میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی.....“ وہ آہستہ سے اپنے آپ کو اس کے گلے سے آزاد کراتے ہوئے بولی۔

”اور تم نے مجھے بتایا ہی نہیں.....“ وہ قدرے بے صبری سے بولا۔

”ایسی خاص بات نہیں تھی۔ بس بخار تھا..... مگر اب تو میں ٹھیک ہوں۔“

”نہیں..... تم اب بھی مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی ہو..... چلو میں ابھی تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتا ہوں..... سنو..... مجھے پہلے والی

آنکھ چاہیے..... خواہ صورت..... سر میں..... نرم و نازک..... گل بدن.....“ وہ اس کے سامنے کھڑا ہو کر بولا۔

”اور اگر وہ نیل سی تو.....“

”تو..... تو..... میں اسے کہیں سے بھی ڈھونڈ لٹاؤں گا..... چاہے اس کے لیے مجھے کسی بھی گہرے سمندر میں کودنا پڑے یا پھر آسمان پر

سفر کرنا پڑے۔“ وہ مسکرا کر بولا اور اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھنا چاہے آنکھ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔ ملک منصور نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا وہ

ہر طرح سے اس سے فرار حاصل کرنے کی کوشش میں تھی اس کا رویہ ملک منصور کے لیے بہت حیران کن تھا۔

”کیا بات ہے..... تم کچھ پریشان اور بیزاری لگ رہی ہو؟“

”نہیں..... آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے.....“

”سنو..... میری آنکھ کہاں ہے.....؟“ وہ پھر اس کی طرف محبت پاش نظروں سے بڑھا۔

”وہ..... وہ شاید کہیں گم ہو چکی ہے۔“ آنکھ اس کی طرف پشت کرتے ہوئے بولی۔

”نہیں..... ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ملک منصور بازی جیت کر کبھی ہار نہیں سکتا اس نے بار بار سیکھا ہی نہیں اور جس دن اس نے اپنی بار کو قبول کر

لیا وہ شاید اس کی زندگی کا آخری دن ہو گا لیکن مجھے یقین ہے وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔“ وہ بڑا ذوق لہجے میں بولا۔

آنکھ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی وہ شدید الجھن کا شکار لگ رہی تھی۔

”آنکھ تمہیں کیا ہو گیا ہے..... ڈارلنگ تم اس طرح بی ہو کر رہی ہو آخر تم مجھ کیوں نہیں رہی کہ میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں اور

اس وقت مجھے تمہاری اشد ضرورت ہے مگر تم بہت بدلی بدلی لگ رہی ہو کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی.....؟“ ملک منصور اس کے سامنے صوفے پر

بیٹھ کر بولا۔ وہ خاموش تھی۔ شاید مناسب الفاظ کی تلاش میں..... یا پھر مناسب موقع کی۔

”بولو..... ڈارلنگ..... تمہارے دل میں جو کچھ ہے بول دو..... میں نے تم سے محبت کی ہے اور تمہاری ہر پریشانی میری پریشانی ہے۔

میں تمہارا ہر دکھ ہر پریشانی اور ہر الجھن شہر کرنا چاہتا ہوں..... پلیز بولو تو سہی.....“

ملک منصور نے اس کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اسے پیار سے چکارتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا کر کہا۔ وہ خاموش رہی۔

”بولو نا..... کیا بات ہے.....؟“ اگر میری کوئی بات تمہیں بری لگی ہے تو کہہ دو میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مناؤں گا۔ تم مجھے دنیا کی ہر

ہستی سے زیادہ عزیز ہو اور تمہاری آنکھوں میں حیرت ان آنسوؤں کے بدلے میں دنیا کی قیمتی سے قیمتی شے قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا

کیا تم میری محبت کی آزمائش کرنا چاہتی ہو..... یا پھر مجھ سے دور جانا چاہتی ہو.....“ ملک منصور نے اسے اعتماد بخشے ہوئے کہا۔

”بولو..... ڈارلنگ..... میں تمہارے دل کی آواز سننا چاہتا ہوں۔“ وہ بہت محبت سے نرم لہجے میں بولا۔

”میں..... آپ سے شادی نہیں کر سکتی.....“ وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔ ملک منصور نے گہری سانس لی..... بڑے مشاہدہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور صوفے سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ آنکھت اس کے جواب کی منتظر تھی۔

”کیا تم شادی نہیں کر سکتیں یا پھر کرنا نہیں چاہتیں؟“

”اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سوچ میں پڑ گئی۔

”تم الجھن میں مت پڑو..... اگر تم نہیں کر سکتیں تو اس میں یقیناً کوئی مصلحت یا پھر تمہاری کوئی مجبوری ہوگی اور اگر کرنا نہیں چاہتیں تو پھر تمہارے دل میں میرے لیے نفرت یا پھر بے یقینی ہے۔ اب بتاؤ ان دونوں میں سے تم کس الجھن کا شکار ہو کیونکہ اگر اب تمہارے دل میں میرے لیے بدگمانی ہے تو یقیناً تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو..... اور میں وہ غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں.....“ وہ آہستہ آہستہ اسے لفظوں کے جال میں الجھا رہا تھا اور وہ مزید الجھ گئی تھی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے..... سچ کہے یا جھوٹ۔

”بولو..... آنکھت.....“ وہ آہستہ سے اس کے قریب آ کر بولا۔

”میری کچھ مجبوریاں ہیں اس لیے..... اس لیے میں شادی نہیں کر سکتی۔“ اس نے جلدی سے کہہ دیا۔ وہ اس پھوٹیشن سے جلد از جلد فرار چاہتی تھی..... وہ اس کی قربت اور رفاقت سے دور بھاگنا چاہتی تھی۔

”کیا وہ مجھ سے شیر نہیں کرو گی؟“ اس نے پھر کہا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”نہیں.....“ وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

”آنکھت تم مجھے وجہ بتائے بغیر چھوڑ سکتی ہو لیکن میں تمہیں وجہ جانے بغیر کیسے چھوڑ دوں؟ کچھ تو بتاؤ..... کچھ تو کہو..... ورنہ..... میں.....“

آنکھت نے خاموشی مگر استغہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم سوچ بھی نہیں سکتیں میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میرا نہ تو سیاست میں دل لگ رہا ہے نہ بزنس میں سوائے تمہارے۔“

”خدا کے لیے..... بس کریں..... محبت..... محبت..... یہ سب جھوٹ ہے..... فراڈ ہے..... آپ جیسا شخص زندگی میں کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ آپ کو صرف اور صرف اپنے آپ سے محبت ہے۔ اپنی دولت سے اور اپنے اثاثوں سے..... آپ نے تو مجھے استعمال کرنا چاہا..... میں ہی بے وقوف تھی..... جو آپ کی محبت اور ذات کے بحر میں کھو گئی۔“ آنکھت غصے سے پھٹ پڑی اور شدت جذبات سے اس کا گلارہ مٹنے لگا۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ ملک منصور خاموشی سے صوفے پر پرسکون ہو کر بیٹھ گیا اور گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اس کی بات پر ہالک نہ بھڑکا بلکہ آہستہ آہستہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلنے لگی۔

”بس..... کچھ اور..... میرا خیال ہے ابھی تمہارے دل میں بہت کچھ ہے اور ڈیڑیر میں وہ سب کچھ سن کر تمہارا کھار سس کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولا اور آنکھت اس کو پرسکون دیکھ کر اور بھڑک اٹھی۔

”آپ کو اطلاع تھی کہ میں پاکستان کس مقصد کے لیے آ رہی ہوں اور آپ نے میرے لیے محبت کا سنہرا جال بچھایا۔ میں سوچ میں پڑ گئی اور خوش فہمی کا شکار ہو گئی کہ محبت جیسے حسین اور نازک جذبے اور رشتے کو کوئی بھی شخص یوں کسی کو ایکسپلاٹ کرنے کے لیے استعمال نہیں کر سکتا میں نے زندگی میں کسی سے محبت نہیں کی تھی۔ اس جذبے سے نا آشنا تھی اور..... بہک گئی یا پھر آپ نے مجھے بہکا لیا.....“ وہ قدرے رو ہانسی ہو کر بولی۔

”یہ سب تمہیں کس نے بتایا.....؟“ وہ بغیر گھبرائے اور پریشانی ظاہر کیے بولا۔

”یہ خدا نے مجھے بچانا چاہا اور اس لیے راستے پیدا کر دیے.....؟“

”سنو آئیٹ..... مجھے علم تھا کہ تم پاکستان کس مقصد کے لیے آ رہی ہو۔ ہماری حکومت کی پالیسیوں اور ہمارے بارے میں رپورٹس اکٹھی کرنے ہمارے فراڈ کیمرے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے..... لیکن جب تم اپنے مشن پر آئی تھیں تو تمہیں کچھ علم نہیں تھا۔ اس کی فیڈ بیک تمہیں آہستہ آہستہ ملتی تھی۔ پچھلی مرتبہ جب تم آئیں تو تب تک تمہیں ٹیکس موصول نہیں ہوئے تھے یہ سب کچھ تمہیں اب ملا ہے لیکن مجھے تم سے..... اور تمہارے مشن سے قطعی کوئی خطرہ نہیں تھا اس کو میں نے بہت لاکھی لیا..... اس ملک کا بڑے سے بڑا طاقتور اور کرپٹ شخص اور ابجینسی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ملک منصور نے کبھی کبھی گولیاں نہیں کھیلیں اگر ہمارے خلاف ثبوت اکٹھے کیے جا رہے ہیں تو غافل ہم بھی نہیں..... میں نے بھی ہر ایک کے بارے میں ڈاؤنٹس اکٹھے کیے ہوئے ہیں اور میں نے ان چیزوں سے بالاتر سے محبت کی ہے۔ مجھے دنیا میں کسی سے خطرہ نہیں..... ہر ایک کو اس کی اوقات کے مطابق ذیل کرنے کا فن میں بخوبی جانتا ہوں..... لیکن اس کے ساتھ ساتھ میری ایک کمزوری ہے جو صرف تمہیں بتا رہا ہوں۔ میں حسن پرست ہوں..... اور تمہارا آتشیں حسن مجھے کس کس طرح بہکا رہا ہے اور بھڑکا رہا ہے..... تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔“ وہ بہت سنجھے ہوئے انداز میں الفاظ پر زور دے کر بولا۔

”بس کریں..... منصور..... کس حسن کی بات کر رہے ہیں، ہر بات کی لٹس ہونی چاہئیں۔ ایک بیوی کو طلاق دی..... دوسری ویسے Suffer کر رہی ہے..... اور آپ کی فیملی کس قدر شہر ڈا ہے..... مجھے سب ظلم ہے اور..... ابھی..... چند روز پہلے آپ کی بہو اور بیٹا قتل ہوئے ہیں۔ یہ سب کیا ہے..... آپ نے تو مجھے ڈسٹرب کر کے رکھ دیا ہے۔“

”اوہ..... تو تمہیں سب خبریں ہیں۔“

”ہاں..... آپ کب تک مجھ سے جھوٹ بولتے رہیں گے۔“

”میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا..... بتاؤ میں نے کب جھوٹ بولا..... تم نے میری فیملی کے بارے میں کب پوچھا اور میں نے تمہیں کب جھوٹ بتایا..... رہی بات بیوی کو طلاق دینے کی تو طلاق اس نے خود لی اس کا کیریئر اچھا نہیں تھا اور یہی بات اس کے بچوں کے لیے ڈسٹربنس کا باعث بنی میں نے تو انہیں ہر آسائش دی مگر وہ فطرتاً ہی رہے اور میں جانتا ہوں یہ سب باتیں تمہیں شزانے بتائی ہیں۔“ وہ ذریعہ لب مسکرا کر بولا۔

اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ ہونٹوں کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”اگر تمہیں یاد ہو تو آج تم اپنا موبائل ادھر ہی بھول گئی تھیں..... اور اتفاق سے میں نے سارے نمبر فزیز آؤٹ کر دیا لیے ہیں جہاں

جہاں سے وہ فون کرتی تھی شہزائے بہت کوشش کی کہ اپنے آپ کو چھپائے، ہر دفعہ تلفن نمبر استعمال کیے مگر تم عورتیں ہمیشہ کہیں نہ کہیں حماقت کر بیٹھتی ہو اور کوئی نہ کوئی کلیو چھوڑ دیتی ہو..... چھوڑو..... ڈارلنگ کن چکروں میں پڑ گئی ہو..... صرف یہ سوچو کہ میں تم سے واقعی محبت کرتا ہوں.....“ وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ آنیکٹ پوری بھڑاس لگانے کے بعد اب خاموش بیٹھی تھی وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ شخص کتنا گھاگ لکھے گا..... وہ ہر بات میں شاطر کھلاڑی کی طرح صاف کچ لکھاتا تھا..... الٹا وہ پکڑی گئی تھی۔ شہزادہ اس کے چہرے پر پامائیت کا رنگ نمایاں تھا۔

”سوئٹ ہارٹ..... شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں..... ملک منصور کا دل بہت وسیع ہے..... اس میں تم اپنی ساری کمزوریوں اور خامیوں سمیت آسانی سے سما سکتی ہو..... کیا تم اپنے لیے میری اتنی محبت کو بھول بیٹھی ہو..... کس طرح میں شدت سے تمہاری آمد کا منتظر تھا..... اور تمہارے مگر کی آرائش..... آنیکٹ حسن پاکستان میں بھی بہت ہے..... جس طرف لٹاوا کھڑا کرو گیہوں..... حسن بچتا ہوا میرے پاس آ جاتا ہے مگر تمہیں تو میرے دل نے پسند کیا ہے..... اور میرا دل جسے پسند کر لے..... وہ شے میری نہ ہو یہ کبھی نہیں ہوا.....“ وہ قطعیت سے مسکرا کر بولا۔

”مگر شہزادہ کو بھی تو آپ کے دل نے ہی پسند کیا تھا.....“

”ہاں..... مگر وہ اس دل میں سما نہ سکی۔“

”شادی کے بعد تو اس سے آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ آپ کسی سے شادی نہیں کریں گے اور نہ ہی کسی کی طرف دیکھیں گے..... تو پھر.....“ وہ قدرے معصومیت سے سب کچھ اگلنے کو تیار تھی۔

”اچھا..... اور کیا کیا کچھ شہزائے بتایا۔“ وہ بھرپور قہقہہ لگا کر بولا۔ آنیکٹ نے حیران کن لگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر بٹاشت اور سکون ہی سکون تھا۔

”بہت کچھ.....“ وہ بھی بڑے سکون لہجے میں بولی۔

”اپنی اپنی آرزویشن ہے..... تم صرف اتنا اس سے پوچھتیں کہ اگر ملک منصور اتنا برا ہے تو کیوں اس کے ساتھ رہ رہی ہے۔ وہ خود مختار ہے این جی او چلا رہی ہے پھر اس نام نہاد شادی کو کیوں بھاری ہے۔ رہی میری بات تو مجھے اسے ساتھ رکھنے میں کسی قسم کا نہ فائدہ ہے اور نہ نقصان..... شی از تھنگ ٹومی ایٹ آل..... اوٹلی یو آر..... ڈارلنگ..... اوٹلی یو آر.....“ وہ اس کے قریب آ کر محبت بھرے لہجے میں بولا۔

آنیکٹ اب حراحت نہ کر سکی..... اور خاموشی سے سر جھکا لیا.....

”آج تمہیں میرے دل کی دھڑکن سن کر یقین کرنا ہوگا اس میں صرف اور صرف میری کیوٹ آنیکٹ ہے.....“ وہ اسے بھیجتے ہوئے بولا..... آنیکٹ جیسے آکٹوپس کے ٹکٹے میں بری طرح جکڑی جا چکی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ آنکھوں کے دراتے دل کا غبار مچھٹ رہا تھا۔ اس کی سانسوں میں اس کے کھلون اور ایکسٹی کی خوشبو رچ بس رہی تھی..... وہ پہلے والی آنیکٹ نہیں رہی تھی..... ایک نیا وجود جنم لے رہا تھا..... یہ زندگی تھی یا سراب..... یہ سب سراب تھا..... یا پھر فریب..... وہ کچھ یقین نہ کر سکی۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھا اور واش روم میں چلا گیا۔ فریش ہو کر باہر نکلا تو آنیکٹ لیٹی ہوئے

آنکھیں کھولے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور وہ اس کی طرف مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں.....؟“

”مجھے لاہور بہت ضروری کام سے جانا ہے..... رات تک آ جاؤں گا اور پھر ہم شادی کر لیں گے..... اور اپنے گھر میں رہیں گے..... اب تو تمہیں مجھ سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے نا.....“ وہ قہقہہ لگا کر بولا تو وہ بھی مسکرا دی۔

”ہائیم کیا ہوا ہے.....“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کیا رہنچ رہے ہیں.....“

”اوہ..... مجھے تو بہت ضروری کام تھا..... آفس جلدی پہنچنا تھا.....“

وہ ایک دم اٹختے ہوئے بولی۔

”کیا اب بھی کام کی ضرورت ہے..... مجرم تو خود تمہارے کٹہرے میں دوڑاؤ کھڑا ہے اب کس لیے کام کر رہی ہو..... سب چھوڑو.....“

لائف انجوائے کرو.....“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تو وہ کچھ نہ کہہ سکی..... بس خاموش لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”اچھا..... اپنا خیال رکھنا..... میں جلدی آ جاؤں گا..... ایچ آئی ایم ریلی سو گھنٹہ.....“ وہ اس کی پیشانی پر لب رکھتے ہوئے بولا۔ ”اب تو

تمہیں یقین آ گیا ہوگا..... میرے دل کی دھڑکن سن کر..... اور ہر طرف اپنا عکس دیکھ کر.....“ وہ مسکراتے ہوئے بولا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا..... اور وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ گہری سوچ میں گم تھی یہ سب کیا ہو گیا تھا..... اس نے تو نہ جانے کتنی پلاننگ کی تھی..... ملک منصور کو دھکارنے کی..... اسے اپنے سے دور رکھنے کی اور وہ کیسے اس کے گلے میں آ گئی..... اسے شزا کے الفاظ یاد آنے لگے.....

”وہ ہر عورت کو آ کنو پس کی طرح گلے میں جکڑ لیتا ہے اور وہ پھر مزاحمت نہیں کر سکتی.....“ شزا نے اس کو بہت وارن کیا تھا اس کی ہر ہر

بات بتاتی تھی۔ اس کی عادتیں، اس کی دلچسپیاں، اس کی مکارانہ چالیں..... سب کچھ اور وہ پھر بھی اس کی باتوں میں آ گئی اسے شدید احساسِ زیاں ہو رہا تھا۔ شدید غلطی اور گناہ کا احساس اسے رفتہ رفتہ اپنے حصار میں لے رہا تھا۔ آنسو اس کے چہرے کو تر کرنے لگے..... اتنے میں اس کا موبائل بجنے لگا..... اس نے نمبر اٹھا کر دیکھا اور ہلکا ہوا.....

”آئیٹ..... کیا تم آئیٹ ہو؟“

”ہاں.....“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”تمہاری آواز..... کیا تم رورہی ہو؟“ وہ جواہر خاموش رہی۔

”کیا ملک منصور تمہارے پاس آیا تھا؟“

”ہاں.....“ وہ آہستہ سے بولی۔

”تو پھر.....“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔

”کیا تم اس کے ہاتھوں کھلوانا بن گئیں..... اور..... وہ تم سے کھیل چکا۔“ آنیکٹ سسکیاں بھرنے لگی۔

”آنیکٹ تم نے بہت خسارے کا سودا کیا۔ میں نے ہر ہر بات سے تمہیں آگاہ کیا تھا وہ عورتوں کی مجبوریوں سے ان کو ایکسپلائٹ کرنے کا فن اچھی طرح جانتا ہے اور تم بھر بھی..... میرے ہر طرح سے سمجھانے کے باوجود اس کے شکبے میں آ گئیں۔ میں نے تمہیں بچانے کی بہت کوشش کی مگر تم بھی میری طرح کمزور نکلیں۔ شاید ہر عورت اندر سے اتنی ہی کمزور ہوتی ہے۔ مجھے بہت افسوس ہوا ہے..... اب تمہارے پاس کوئی آپشن نہیں رہا..... ساری زندگی تم سسکتی رہو گی اور وہ تمہیں ڈاج دیتا رہے گا..... آنیکٹ تمہارے ہاتھ سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں رہ گیا..... اور تم نے یقیناً اسے سب کچھ بتا دیا ہوگا.....“ اس نے پوچھا۔

”نہیں..... وہ خود ہی جان گئے.....“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”اس نے یقیناً یہ کہا ہوگا کہ شزا اگر اسے اتنا برا کہتی ہے تو اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتی.....“ شزا نے پوچھا۔

”ہاں.....“ وہ آہستہ سے بولی۔

”آنیکٹ میں اپنی بیمار بیٹی کی خاطر اس سے کپڑا مائٹ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ شیزوفرینیا کی پوٹنٹ ہے۔ اس گریٹ ہسپتال میں اس آ رہا..... اور اب وہ رفتہ رفتہ میڈنس کی طرف جا رہی ہے..... مگر شاید مجھے اب کچھ سوچنا ہوگا..... وہ ہر ایک کو ڈانٹتی اور بتاتی ہے۔ جسے وہ ماڈرن سوسائٹی کے فیض کو کہتا ہے۔ خدا کرے تم اس سے بچ سکو۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ تمہیں اس دورندے سے بچاؤں مگر افسوس تم بھی نہ بچ سکیں۔ سب کچھ کا رت گیا.....“ اس نے اچانک فون بند کر دیا۔ آنیکٹ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اتنا الجھ چکی تھی کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خودکشی کر لے۔ وہ ان لہجوں کو کوس رہی تھی جب وہ ملک منصور سے ملی تھی اور اس نے کیسے کیسے اپنے دام میں پھنسا دیا تھا اور وہ پھنستی گئی تھی..... ہر طرف دلدل تھی..... اور وہ اس میں پوری کی پوری دھنس چکی تھی۔ اس سے سانس لینا بھی محال ہو رہا تھا۔ دل میں جیسے آگ لگی تھی..... اور وہ اس آگ میں ملک منصور کو بھی جلا کر بھسم کرنا چاہتی تھی۔



نجیب احمد شفیق کو خود پشاور چھوڑ کر آئے تھے ان کے بچپنے سے پہلے ہی حیدر نے تبسم آپا کو فون کر دیا تھا اس کی ہر ممکن حفاظت کرنے کو کہا تھا اور انہوں نے بھی اسے ہر طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس سے بہت محبت اور تپاک سے ملیں گو کہ وہ اس سے شہلا حیدر کی شادی پر مل چکی تھیں مگر جب رسالہ ملاقات ہوئی تھی۔ نجیب احمد اسے چھوڑ کر چند گھنٹوں کے بعد چلے گئے تھے وہ اپنے آپ کو اس گھر میں بہت انجینی محسوس کر رہی تھی۔ وہ جب سے ماں سے مل کر آئی تھی اس کے اندر ایک شدید جھنجھٹ تھی۔ ایک پھانس تھی۔ وہ ظاہراً تو انہیں بہت دکھ دے کر آئی تھی۔ بہت غصے کا اظہار کر کے آئی تھی مگر دل بہت بے چین تھا۔ ماں کی اس حالت پر نہ جانے کیوں وہ اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی جب بھی چہرہ نظروں کے سامنے محسوس جاتا اس کی آنکھوں میں خود بخود نمی سی حیرنے لگتی..... وہ اس خیال کو بار بار جھٹکتا چاہتی تھی مگر نہ جانے کیوں دل وہاں اٹک سا گیا تھا..... وہ

بہت پریشان اور افسردہ تھی۔ جب سے وہ آئی تھی وہ بہت خاموش تھی۔

”جینا کیا بات ہے۔۔۔۔۔ آپ کچھ بولتی نہیں، کیا باتیں کرنا نہیں آتیں؟“ تبسم آپا نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے محبت سے پوچھا۔
”نہیں۔۔۔۔۔ بس یونہی۔“

”یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ تم یہاں ہر طرح سے محفوظ ہو۔ حیدر بتا رہا تھا کہ تمہیں کوئی خطرہ ہے۔۔۔۔۔ کس سے خطرہ ہے۔۔۔۔۔“
”پاپا سے۔۔۔۔۔“ نادانستہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ اپنے گئے باپ سے۔۔۔۔۔ اور حیدر نے کچھلی دھکے دیا تھا کہ تمہارے پاپا تو امریکا گئے ہوئے ہیں اس لیے تمہیں ان کے پاس چھوڑ گئے ہیں۔ کیا وہ آ گئے۔۔۔۔۔“ تبسم آپا نے قدرے حیرت سے پوچھا۔
”آں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔“ وہ بوکھلا گئی۔

”لگتا ہے تم کافی خوفزدہ ہو۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ آری امیر یا ہے۔ اس میں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔۔۔۔۔ آرام سے رہو۔۔۔۔۔ ایک بات پوچھوں اگر تم برا نہ مناؤ تو۔۔۔۔۔“

”جی پوچھیے۔۔۔۔۔“ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”کیا تم شہلا اور منصور کی بیٹی ہو۔۔۔۔۔؟“ تبسم آپا نے تجسساً لہجے میں پوچھا۔ وہ خاموش ہو گئی اور اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

”تو پھر۔۔۔۔۔ تم تو میری اپنی بیٹی ہو۔۔۔۔۔ میں تمہاری خالہ ہوں۔۔۔۔۔“ تبسم آپا نے فرط جذبات سے اسے گلے لگاتے ہوئے اور چومتے ہوئے کہا۔ ایک اور نئے رشتے کی دریافت اور اس کا احساس اسے بہت اچھا لگا۔

”میں نے جب پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تب ہی جان گئی تھی تم ہو، بہو شہلا پر مٹی ہو۔۔۔۔۔ اور تمہاری آواز بھی اس سے ملتی ہے مگر حیدر کے اٹکار پر خاموش رہی۔۔۔۔۔ اب یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔۔۔۔۔ تم نہیں جانتی میں نے شہلا کو اپنی گود میں کھلایا ہے۔۔۔۔۔ وہ بہت پیاری اور اچھی ہے۔۔۔۔۔ بس قسمت کے ہاتھوں مار کھا گئی۔“ وہ انیسوس سے پولیس۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی اتنے میں سیٹ مین چائے لے کر آ گیا اور اس کے سامنے قرینے سے چائے رکھ رہا تھا۔

”تجسم صیب۔۔۔۔۔ صیب آپ کو بلارہی ہے۔۔۔۔۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا تو شفق اس کی بات سن کر مسکرا دی۔
”سنو۔۔۔۔۔ تم مسکراتی بھی اپنی ماں کی طرح ہی ہو۔۔۔۔۔ میں ابھی تمہارے انگل کی بات سن کر آتی ہوں۔ تم چائے پیو۔۔۔۔۔“ وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں تو وہ پھر کہیں کھو گئی۔

قسمت کیسے کیسے لوگوں سے ملارہی تھی۔ اس نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ پشاد تبسم آپا کے ہاں آئے گی اور یہاں رہے گی۔
”اور ہاں تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہاری ماں اب کہاں ہے۔ یقیناً مانو اس سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔“ تبسم آپا نے واپس آ کر پھر

وہیں سے بات شروع کی۔

”وہ..... بہت بیمار ہیں..... شاید آپ ملیں تو انہیں پہچان ہی نہ سکیں۔“ اس نے آہستہ سے بتایا۔

”خدا خیر کرے..... اسے کیا ہوا ہے؟“

”برین ٹیومر..... اور کیمو تھراپی کے بعد تو وہ بس..... اٹکل حیدر بتا رہے تھے کہ شاید وہ چند دن کی مہمان ہیں.....“ اس نے گہری سانس

لے کر بتایا۔

”ہائے اللہ یہ کیا ہو گیا اور حیدر نے مجھے بتایا ہی نہیں..... میں ابھی حیدر کو فون کرتی ہوں۔ وہ بیمار ہے اور میں یہاں ہوں.....“ تبسم آپا کی

آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

”آئی پلیز..... اٹکل کو فون مت کریں وہ خود آئیں گے۔“

”اور..... تم..... ماں کے پاس کیوں نہیں رہیں؟“ انہوں نے بغور اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ جواباً وہ خاموش رہی۔

”بولو بیٹا..... تمہاری ماں کی حالت اتنی خراب ہے اور تم یہاں ہو؟“

”میں ان کو دیکھنا بھی نہیں چاہتی.....“ اس نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“

”وہ ہم سے اس وقت ناتا توڑ گئیں جب ہم نے ڈھنگ سے چلنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ ہم نے زندگی کے اتنے تلخ رنگ دیکھے ہیں کہ اب تو

ان سے نفرت ہی ہو گئی ہے..... آئی آپ کو معلوم ہے نا..... ہمارے ایک انگریز سے شادی کی تھی۔ ان سے ان کا ایک بیٹا بھی ہے۔“ ولیم انہوں نے

اس کو اپنے پاس رکھا..... اور جو پہلا بیٹا تھا..... اس کو دھکے کھانے اور سسکتے کے لیے چھوڑ دیا..... میرا بھائی..... آفاق..... وہ بھی مر گیا اب ہم ان

سے کس ناتے سے ملیں.....“ وہ سسکیاں لینے لگی۔

”چپ ہو جاؤ بیٹا..... میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا..... رشتوں کی دیواروں میں دراڑیں ضرور پڑتی ہیں لیکن وہ کبھی زمین بوس نہیں ہو

سکتیں..... دنیا میں جہاں بہت سی اٹل حقیقتیں ہیں۔ وہاں رشتے ناتے بھی قدرت کے بنائے ہوئے ہیں جو کبھی بھی مٹ نہیں سکتے اور ماں اور اولاد کا

رشتہ تو کائنات میں سب سے حسین رشتہ ہے۔“

”ہمیں کیا معلوم کہ وہ حسین ہے یا نہیں..... ہم نے تو اس میں بھی تلخی اور بد صورتی دیکھی ہے..... ہم نے جس شے کو محسوس نہیں کیا اس

کے بارے میں کیا جانیں؟“ وہ دکھ سے بولی۔

”تم بھی ٹھیک کہتی ہو..... لیکن کبھی نہ کبھی تو رویوں کو بدلنا ہی پڑتا ہے اور کہیں نہ کہیں تو سرنگر کرنا ہی پڑتا ہے۔ تم کب تک یونہی سوچتی رہو

گی۔ اس طرح تو تم بھی بکھری بکھری اور پریشان رہو گی اور تمہاری ماں بھی..... بہتر ہے کہ تم اپنی سوچ کو بدلو.....“ تبسم آپا نے سمجھایا۔

”لیکن جب دل ہی کسی طرف سے پلٹ جائے..... جب دلوں میں کسی کے لیے جگہ نہ رہے تو سوچ کیسی.....؟“ وہ قطعیت سے بولی۔

”کیا تم اس کے مرنے پر بھی نہیں جاؤ گی؟“

”نہیں.....“ وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

”ٹھیک ہے..... میں تو کل ہی یہاں سے روانہ ہو رہی ہوں..... میں اسے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں نے تو اسے اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔ تمہارا دل سخت ہو سکتا ہے۔ میرا نہیں..... بے شک اس نے اتنا عرصہ ہم سے رابطہ نہیں کیا لیکن دورِ پاں مچھڑوں کو کم نہیں کر سکتیں۔“ تبسم آ پانے کہا تو وہ خاموشی سے سننے لگی۔

اگلے دن وہ انہی تو تبسم آ پالا ہو جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ ان کے شوہر اسپتال جا چکے تھے اور گھر میں صرف بیٹ مین تھا جس کے سر پر وہ سارا گھر چھوڑ کر جا رہی تھیں وہ اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئیں۔ تبسم آ پاحیدر کو انظارِ م کیے بغیر لاہور آ گئی تھیں وہ اس کے ڈیفنس والے گھر گئیں تو وہاں حیدر موجود نہیں تھا انہوں نے شہلا اور اسد کو فون کر کے پوچھا تو وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ شہلا ان کی آمد کا سن کر خوش ہو گئی تھی اور وہ ان سے ملنے آ رہی تھی۔ شہلا اور اسد دونوں بہت محبت سے انہیں ملے۔ شہلا پہلے سے کافی صحت مند ہو چکی تھی اور اس کی جذباتیت بھی قدرے کم محسوس ہو رہی تھی۔

”پچھو آپ اچانک لاہور کیسے آ گئی ہیں؟“ شہلا نے حیرت سے پوچھا۔

”دراصل شفق میرے پاس گئی تھی..... شفق شہلا کی بیٹی ہے..... اس نے بتایا کہ شہلا کی حالت بہت خراب ہے اسے برین ٹھوکر ہے..... سچ مانو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ بس صبح سویرے ہی کوچ میں بیٹھ گئی۔ تمہارے اکل بہت روکتے رہے کہنے لگے ویک ایڈ پر اکٹھے چلیں گے مگر میرا دل نہیں مانتا..... بس چلی آئی.....“ تبسم آ پانے بتایا تو شہلا اسد نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”کیا واقعی وہ بہت بیمار ہیں.....“

”پچھو..... شفق آپ کے پاس کیوں گئی ہے؟“

”بس اس کا ایک مسئلہ ہے..... اس کا باپ اس کی جان کے پیچھے پڑا ہے اس لیے حیدر نے اسے میرے پاس بھیج دیا..... وہاں وہ محفوظ ہے۔“

”اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟“

”میں تو جلد از جلد شہلا سے ملنا چاہتی ہوں.....“

”اسد آپ کو ضروری کام تھا؟ آپ چلے جائیے..... میں خود ہی رات کو آ جاؤں گی.....“ شہلا کچھ سوچتے ہوئے اسد سے مخاطب ہوئی۔

”ٹھیک ہے..... میں جا رہا ہوں..... تم آ جانا.....“ اسد ان سے اجازت لیتے ہوئے بولا۔ شہلا نے ذوالفقار ڈرائیور کا نمبر ملا یا اور اسے

گھر آنے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں وہ پہنچ گیا۔

”پاپا کہاں ہیں.....؟“ اس نے آتے ہی پوچھا۔

”آج صبح انہیں اسلام آباد جانا پڑا..... ان کی ایک اہم میٹنگ تھی..... میں انہیں ایئر پورٹ چھوڑ کر آیا ہوں۔“

”ذوالفقار..... ہمیں اس گھر لے چلو جہاں کوئی بیمار عورت رہتی ہے۔“ تبسم آ پانے کہا۔

”گلبرگ میں.....“ ذوالفقار نے پوچھا۔

”ہاں وہیں۔“

”ٹھیک ہے بیگم صاحبہ..... آپ گاڑی میں بیٹھو۔“ ذوالفقار چاہیاں اٹھاتے ہوئے بولا اور دونوں اس کے ساتھ چلی گئیں۔

”شہلا..... کیا تم نے اس کے بارے میں ساری بدگمانیاں ختم کر دی ہیں۔“ تبسم آ پانے پوچھا۔

”ہاں..... کچھ سو..... شاید میں غلطی پر تھی..... میں ان سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔“

”اچھی بات ہے..... کاش وہ بھی مان جائے۔“

”کون.....؟“

”شفق..... وہ بھی ماں سے ناراض ہے..... اسی لیے نہیں آئی..... میں نے بہت سمجھایا مگر وہ کچھ سننے کو تیار نہیں اس کے دل میں اس کے

لیے بہت نفرت ہے.....“ وہ تاسف سے بولیں تو شہلا حیرت سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ دونوں نے کمرے میں قدم رکھا تو اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”آ..... آپ..... تبسم آ پانے.....“ شہلا نے حیرانی سے کہا۔

”شہلا..... کیا یہ تم ہو.....“ وہ لپک کر آگے بڑھیں اور اسے گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ”یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ شہلا تم ایسی

تو نہ تھیں..... تم..... تو وہ نہیں۔“ تبسم آ پانے کے بازوؤں، ہاتھوں اور چہرے پر ہاتھ لگا کر بول رہی تھیں اور وہ روتی جا رہی تھیں۔ شہلا اسد بھی خاموش مگر ماندہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”آپ کو کیسے پتا چلا..... کیا حیدر نے بتایا.....؟“

”نہیں..... شفق نے.....“

”کیا وہ آپ کے پاس ہے؟“

”ہاں..... پشاور میں.....“

”وہ نہیں آئی.....“ اس نے ارد گرد حلاشی لگا ہوں سے دیکھا۔

”نہیں۔“ آ پانے آہستہ سے کہا۔

”ہاں..... وہ کیسے آ سکتی ہے..... وہ تو مجھے دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔“ اس نے آہ بھر کر کہا۔

”لیکن یہ سب کیسے ہوا.....؟“ تبسم آ پاروتے ہوئے بولیں۔

”میرے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ شفق بھی تو یہی کہتی ہے.....“ وہ تاسف سے بولی۔

”وہ جھوٹ کہتی ہے..... تم ایسی تو نہ تھیں.....“

”مگر ہوگئی..... نہ چاہتے ہوئے گناہ پر گناہ کرتی گئی اور آج میں ہر ایک کی مجرم بنی کٹھری ہوں..... اور آپ مجھے تو کوئی معاف کرنے کو بھی تیار نہیں۔“ وہ ان کے گلے لگ کر سسکتی گئی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں آگئی ہوں نا..... میں تمہارے پاس رہوں گی۔“ وہ اس کے آنسو پوچھتے ہوئے بولیں۔
 ”شکریہ آپ.....“ اس کی آنکھیں محبت سے چمکنے لگیں۔ ”سسر..... افضل سے کہو چائے بنالے..... آپ آپ فریش ہو جائیں تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔“ اس نے سسر سائرہ سے اور پھر آپ سے کہا۔

”اچھا..... میں ذرا واش روم سے ہواؤں۔“ آپ اٹھتے ہوئے بولیں۔ سسر سائرہ بھی جا چکی تھی۔ شہلا اسدا بھی تک خاموش تھی۔ موقع بہتر تھا وہ دونوں تنہا تھیں وہ آرام سے اپنے دل کی بات کہہ سکتی تھی۔ وہ اٹھ کر ان کے پاس ان کے بستر پر بیٹھ گئی۔

”آئی آئی ایم سوری..... مجھ سے بہت غلطیاں ہوئی ہیں..... کبھی میں آپ کو غلط سمجھتی رہی اور کبھی آپ کو..... میں بہت کنفیوژ رہی..... میں آپ کے رشتے کی نوعیت کو ہی نہ سمجھ پائی اور آپ دونوں سے بہت تنگی سے باتیں کرتی رہی..... لیکن اب جبکہ میں خود محبت کے رشتے سے بندھ چکی ہوں اور مرد اور عورت کے رشتے سے مانوس ہوئی ہوں تو بہت غلط محسوس کرتی ہوں اب میں نے اس حقیقت کو جانا ہے خدا نے پہلے عورت اور مرد کو کیوں تخلیق کیا۔ ان کے درمیان پہلے محبت کا رشتہ پیدا کیا اور پھر اس محبت سے قربت نے جنم لیا اور اس قربت نے قرابت واری کو جنم دیا۔ اولاد، ماں باپ، بہن بھائی تو اس محبت کی پیداوار ہیں اور میں بالکل سمجھ ہی نہ سکی..... اور آپ دونوں کے بارے میں بدگمان رہی..... مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہوگئی..... یا پھر گناہ کہ میں جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ میرا باپ مضبوط کردار کا انسان ہے ان کے بارے میں بدگمان ہوگئی۔ میں تو گنہگار ہوگئی اور..... آپ سے بھی میں نے بہت بدتمیزی کی..... آئی ایم سوری..... یقین مانجیے۔ جب سے میری شادی ہوئی ہے میں ہر لمحہ اپنے آپ کو نامحسوس کرتی ہوں اور دکھی رہتی ہوں..... خدا سے بہت دعا کرتی رہی کہ وہ مجھے موقع فراہم کرے اور میں آپ سے معافی مانگ لوں..... شکر ہے آج اس نے مجھے یہ موقع دے دیا اور پھوپھا گئی..... آپ پلیز مجھے معاف کر دیں.....“ وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

”مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں..... یہ تو نیچرل ہے..... اور تم بھی تو میری شوق کی طرح ہو اور مجھے بہت عزیز ہو..... حیدر میں اور مجھ میں محبت انجانے میں پروان چڑھی لیکن ہم نے اپنے بزرگوں کی روایات کی پاسداری کی اور ہاشی نہ ہوئے۔ بڑوں کے بر فیصلے پر سر جھکا یا لیکن دلوں کا کیا کیا جائے..... جہاں ماضی دفن تو ہو جاتا ہے ختم نہیں۔ ہزار دفعہ بھی کمر چوکھ صاف نہیں ہوتا..... نہ یہ کبخت بھولتا ہے نہ انسان چھٹکارا پاسکتا ہے اور آج اگر حیدر میرا خیال رکھ رہا ہے تو اس لیے بھی کہ سید صاحب کی سگی نہ سکی مگر بیٹی تو تھی..... میں نے نہ جب کسی کا حق چھیننے کی کوشش کی تھی نہ بعد میں..... میں تو راستے سے ہی ہٹ گئی۔ اس لیے دور چلی گئی تاکہ پھر کبھی یہاں نہ آؤں مگر قسمت سے کون لڑ سکتا ہے..... انسان جس شے سے جتنا بھاگتا ہے وہ اتنا ہی اسے گھیرتی ہے۔ میں تو ریزہ ریزہ ہوگئی ہوں۔ ٹوٹ چکی ہوں..... میرا وجود تو ختم ہو چکا ہے۔ اب چند سانس باقی ہیں وہ بھی نہ جانے کس وقت.....“ اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔

”آئی آئی آپ لٹیک ہو جائیں گی۔“ اس نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔

”نہیں بیٹا..... اب دعا کرو..... کہ میں زندگی کے اس نفس سے جلدی نجات پا لوں..... اب تو ہر پل اذیت اور آزمائشوں سے بڑھ رہا ہے.....“ وہ دکھ سے بولی۔

تبسم آپا فریض ہو کر آگئیں اور تھوڑی دیر بعد افضل چائے کی ٹرائی بھی لے آئے۔

”ولیم اٹھ گیا ہے۔ اسے کہو وہ بھی ادھر آ جائے۔“ اس نے افضل سے کہا۔

”جی اچھا.....“ وہ چائے بن کر وکر کے باہر چلا گیا۔

”چند لمحوں بعد ولیم وکیل جیسے پر کمرے میں داخل ہوا تو دونوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”آپا..... یہ میرا بیٹا ہے.....“ اس نے متعارف کرایا۔

آپا نے اٹھ کر اسے چومنا اور گلے لگایا۔ شہلانے بھی محبت سے اس کو ہلو کہا۔

”کیا نام ہے بیٹا.....؟ میں تمہاری خالہ ہوں۔“ تبسم آپا نے محبت سے پوچھا۔

”ولیم.....“ وہ آہستہ سے بولا۔

تبسم آپا اور شہلانے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ ولیم کے لیے ان نظروں میں استفہام اجنبی نہیں تھا مگر اب وہ اس سب سے شدید الرجک ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اب ایسی نظروں سے شدید تبسم محسوس کرتا تھا اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کسی اجنبی دیس میں ہو یا پھر بالکل تنہا وجود..... اسی لیے ہر نگاہ اس کے بارے میں مشکوک تھی اور اسے مشکوک لگا ہوں سے دیکھتے تھے..... اس کے لیے وہاں رکنا محال ہو گیا وہ آہستہ سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں آ گیا..... دروازہ بند کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا..... اسے اپنا وجود بہت حقیر لگنے لگا تھا۔ ان سب کے درمیان وہ اپنے آپ کو نجس اور ناپاک محسوس کرنے لگا تھا۔ نہ جانے کیوں جب سے وہ آیت اس کو ذہن نشین ہوئی تھی اس نے ہر بات کو اور اپنی ذات کو مختلف انداز میں آبرور کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اندر ہی اندر اپنے بارے میں شدید ہدامتادی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ بھی ریت کے گھروندے کے مانند کھڑکھڑکتا تھا..... وہ اتنا چٹکی ہو گیا تھا کہ معمولی سی بات، لہجے اور لگا ہوں میں چھپے مفہوم کو خود ہی اخذ کر کے رونے لگتا۔ نور کے جانے کے بعد تو وہ اور ہی زیادہ کھڑکھڑکتا تھا۔ اس لیے بھی وہ شدید اجنبیت، تنہائی اور ڈپریشن محسوس کر رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس سے بات کرے..... اس نے آنسو پونچھے ہوئے قادر کا نمبر ملا یا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

”کون.....؟“ قادر کی بارعب آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”قادر میں ولیم ہوں۔“ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اوہ..... تم.....“ قادر نے لہجے میں کھٹکی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”قادر..... آئی ایم آل آلون..... قادر میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور میں اب چل بھی نہیں سکتا.....“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”یہ تو ہوتا ہی تھا..... مائی من..... یو آر کر سڈ جو لوگ کرائسٹ سے بے وفائی کرتے ہیں۔ گاڈ ان کو ایسے ہی سزا دیتا ہے۔ تم نے گاڈ سے

اور کرائسٹ دونوں سے اپنا پر اس توڑا ہے وہ قسمیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اب تم ساری زندگی یونہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرو گے۔ وہ بس ایک دفعہ آزماتا ہے پھر سرکشوں کو ایسی سزائیں دیتا ہے کہ وہ ساری زندگی تمہاری طرح تڑپتے رہتے ہیں۔“

”قادر پلیز ایسا مت کہیں۔۔۔۔۔ میں بہت شلوار ہو چکا ہوں۔“ وہ روہانسا ہو کر بولا۔

”تمہارے ساتھ اس سے بھی برا ہوگا۔۔۔۔۔ میں تو قسمیں بچا کی طرف لا رہا تھا۔ مورٹل بنانا چاہ رہا تھا۔ تمہاری سول کو کرائسٹ سے ملا نا چاہ رہا تھا مگر تم بیک مئے تم بہت کمزور انسان نکلتے۔۔۔۔۔ اور گاڈ اپنے لیے کمزور انسان ہانکل پسند نہیں کرتا۔ تم خود ہی دیکھو اس نے قسمیں لو لاء، لنگڑا، اپالچ بنا دیا ہے اب وہ قسمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔۔۔۔۔ نیور۔۔۔۔۔ ایور۔۔۔۔۔ اور خداوند یسوع مسیح بھی تم سے بہت ناراض ہیں۔۔۔۔۔ دس ورڈ اڈمٹیل فار یو۔۔۔۔۔“ قادر نے غصے سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ وہ اور شدت سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔۔۔۔۔ اس نے بہت بڑا امید ہو کر فون کیا تھا اور قادر نے اس کی رہی سہی امید اور حوصلہ سب کچھ ختم کر کے رکھ دیا تھا۔۔۔۔۔ اس نے بہت مشکل سے شفق کے الفاظ کو بھلانے کی کوشش کی تھی رات کے جس پہر اس کی آنکھ کھلتی تھی۔ شفق کے الفاظ ”چلتا پھرتا گناہ“ اس کے اندر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے۔۔۔۔۔ اور اب قادر نے جب گاڈ اور کرائسٹ کی ناراضی کا بتایا۔ تو وہ شلوار ہو گیا۔۔۔۔۔ گاڈ اس سے ناراض تھا اور کرائسٹ بھی۔۔۔۔۔ ”یو آر کر سڈ، یو آر ہلڈ، کر سڈ اینڈ ہلڈ۔۔۔۔۔ پنڈ اینڈ کر سڈ۔۔۔۔۔“ یہ الفاظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے اور اس کے اندر کو دوبا لاکر رہے تھے۔ وہ اتنی شدت سے رو رہا تھا کہ آنسو ختم ہی نہیں رہے تھے۔۔۔۔۔ اس لمحے وہ شدید تنہائی محسوس کر رہا تھا۔۔۔۔۔ ”گاڈ۔۔۔۔۔ اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں تو۔۔۔۔۔ پلیز نور کو کہو۔۔۔۔۔ مجھے فون کرے۔۔۔۔۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ بہت پریشان ہوں۔۔۔۔۔ آئی ایم شلوار۔۔۔۔۔“ وہ دل ہی دل میں گڑ گڑا کر دعائیں کرنے لگا۔۔۔۔۔ اس نے رو رو کر اور گلے میں کرائسٹ کے لاکٹ کو ہاتھ میں پکڑ پکڑ کر دعائیں کیں۔۔۔۔۔ وہ رو رو کر تھک چکا تھا اور آنکھیں سوچ چکی تھیں۔۔۔۔۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹا ہی تھا کہ موبائل کی بیل بجنے لگی۔۔۔۔۔ اس نے اٹھایا تو نور بول رہی تھی۔

”ہیلو ولیم کیسے ہو۔۔۔۔۔؟“ وہ بٹاش لہجے میں بولی۔

”نور۔۔۔۔۔ تم کہاں ہو۔۔۔۔۔ اور قسمیں کس نے فون کرنے کو کہا۔“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”بھئی کہا کس نے ہے۔ میرا دل چاہ رہا تھا اور بہت دنوں سے کوشش بھی کر رہی تھی مگر وقت ہی نہیں مل رہا تھا۔ ولیم میں یہاں بہت بڑی ہوں۔ میں یہاں اپنا گارمنٹس کا بزنس سیٹ کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ تم سناؤ ٹھیک ہوتا۔۔۔۔۔“

”نور تم کب واپس آؤ گی۔۔۔۔۔؟ اس نے بے تاب لہجے میں پوچھا۔

”کیوں بھئی، کیا ہو گیا ہے؟“

”میں بہت اپ سیٹ ہوں۔“

”قادر گاڈ سیک۔۔۔۔۔ اب تو سدھر جاؤ۔۔۔۔۔ نہ جانے کب سمجھو گے۔۔۔۔۔ میں بھی قسمیں سمجھا سمجھا کر تھک چکی ہوں مگر تم۔۔۔۔۔ اب تم نے ایسا کیا نامیں تم سے بات نہیں کروں گی۔“ وہ مصنوعی خلگی سے بولی۔

”پلیز نور۔۔۔۔۔ سنو۔۔۔۔۔ ناراض مت ہو۔۔۔۔۔ اور تم مجھے بتائے بغیر کیوں چلی گئیں۔“

”بھئی میں نے فون کیا تھا تم سو رہے تھے میں نے حیدرا نکل کو بتا دیا تھا۔ مجھے اچانک آنا پڑا..... اور میں نے کئی بار تمہیں فون کیا..... حیدرا نکل نے تمہیں نہیں بتایا۔“

”نہیں..... دو مصروف تھے شاید۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”اب بولو..... کیوں پریشان ہو؟“

”میں نے قادرو فون کیا تھا۔“

”پھر.....“ وہ خاموش رہا۔

”انہوں نے تمہیں ڈانٹا ہوگا۔“

”ہاں..... کہنے لگے یو آر کر سڈ ایٹنڈ بائے گاڈ۔“

”وہاٹ نان سمنس..... ولیم آئی ایم سک آف یو..... کب تک تم Puppet بنے رہو گے..... تم کب اپنا ذہن استعمال کرو گے..... خدا کے لیے اب تو سوچو سمجھو۔ چھوڑ دو یہ سب کمزور سہارے.....“

”میں کیا کروں.....؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ وہ بول رہا تھا کہ ایک دم فون ڈس کنکٹ ہو گیا۔ اسے شدید رنج ہونے لگا۔

شہلا واپس جا چکی تھی اور جسم آ پاؤں رک گئی تھیں۔ رات کو حیدر آیا تو انہیں وہاں دیکھ کر چوک گیا۔

”آپا..... آپ..... یہاں..... کیسے..... اور کب آئیں؟“ حیدر بے حد حیران ہو رہا تھا۔

”جیسے ہی شفق نے بتایا کہ شہلا بیمار ہے مجھ سے رہانہ گیا اور چلی آئی تاکہ شہلا بھی یہاں آئی تھی۔“

”وہ..... یہاں..... کیسے.....؟“ حیدر نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ بہت شرمندہ ہے اور شاید اس نے شہلا سے معافی بھی مانگی ہے۔“ تبسم آ پانے کہا تو وہ حیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”اور شفق..... وہیں پر ہے۔“

”ہاں..... میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر ماں کے بارے میں وہ بہت بدگمان ہے لیکن میں نے تمہارے بھائی کو کہا ہے کہ وہ

اسے ہر ممکن طریقے سے سمجھانے کی کوشش کریں اور تم گھر نہیں کرو..... وہ وہاں ہر طرح سے محفوظ ہے۔“ تبسم آ پانے اسے بتایا۔

”اسی لیے تو ادھر بھیجا ہے.....“

”مگر منصور کیوں اس کی جان کے پیچھے پڑا ہے.....“

”جب انسان کا دل ہوس اور لالچ سے بھر جائے تو وہ ہر رشتے کو مفادات کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ منصور نے ہمیشہ اپنی ذات اور مفاد کو

اہم جانا..... نہ رشتوں..... کی پروا کی نہ جذباتوں کی..... اور اب تو وہ ایسی گندی پھل بن چکا ہے جو ہر جمل کو گندا کر دیتی ہے۔ آپا..... میں تو حیران ہوتا

ہوں کہ جس شخص کا گھر تنکا تنکا بکھر چکا ہو..... نہ اولاد باقی رہے..... نہ رشتے اور جذبات باقی رہیں تو وہ کیسے سروائیو کر سکتا ہے مگر وہ کس قدر مطمئن اور

خوش ہے..... نہ جانے کیسی زندگی وہ گزار رہا ہے.....؟“

”ہاں..... وہ شروع سے ہی ایسا تھا یہ تو شہلا کے نصیب ہی برے تھے کہ وہ اس کا نصیب بن گیا..... اس کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو شاید آج شہلا کے یہ حالات نہ ہوتے.....“ وہ تاسف سے بولیں۔

”آپ نے اچھا کیا کہ آپ یہاں آ گئی ہیں..... شہلا کی حالت روز بروز خراب ہو رہی ہے۔ کسی بھی وقت شاید.....“ وہ مایوس کن لہجے میں بولا۔

”حیدر..... کیا اس بیماری کا کوئی علاج نہیں.....“

”جتنا ممکن ہو سکا میں نے کروایا ہے..... مگر اب کہیں بھی کچھ بھی ممکن نہیں۔ نہ یہاں نہ بیرون ملک.....“

”حیدر..... کیا شہلا کا بیٹا کرچن ہے.....؟“ آپ نے استہلہا میہ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں..... وہ کچھ بھی نہیں..... نہ کرچن نہ مسلم..... اس بچارے کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ شہلا نے بہت حماقتیں کیں ہیں اور یہ اس کی سنگین غلطی ہے..... وہ بچہ پنی طور پر منتشر ہو چکا ہے..... اس کو راہ نہیں مل رہی۔ آپ آپ نے جس طرح ہماری تربیت کی اسی طرح اس کا ذہن بھی ہموار کرنے کی کوشش کریں..... اگر سید صاحب زندہ ہوتے تو شاید اتنا مسئلہ نہ ہوتا اور مجھے تو سیاست اور بزنس نے اس قدر کھپا کر رکھ دیا ہے کہ میں تو اپنے پروفیشن سے بھی دور ہو گیا ہوں..... کبھی کبھی سوچتا ہوں جس گدی نشینی کے لیے سید صاحب نے سب کچھ کیا۔ میں تو ایک دن بھی اس کا حق ادا نہ کر سکا۔ سب کچھ بے معنی ہی رہ گیا..... نہ میں وہ بین سکا جو وہ چاہتے تھے اور نہ وہ بین سکا جو میری خواہش تھی.....“ وہ تبسم آپ کے سامنے اپنا دل کھول رہا تھا۔

”ہاں..... کبھی کبھی انسان کو خود بھی کچھ سمجھ نہیں آتا اور سب فیصلے بالآخر ہال ہو جاتے ہیں بہر حال میں کوشش کروں گی..... تم فکر نہیں کرو..... اور اب کچھ آرام کر لو..... بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔“

”ہاں..... میں واقعی بہت تھک چکا ہوں..... اوپر جا کر کچھ میرا آرام کر لیتا ہوں۔“

وہ شہلا کو دیکھے اور ملے بغیر لاؤنج سے ہی اوپر چلا گیا۔



آنیکت کا پورا جسم جیسے آگ میں جھلس رہا تھا..... وہ آگ کے گڑھے میں کھڑی تھی ہر طرف آگ کی دیواریں تھیں اور اس پر شدید سنگباری ہو رہی تھی..... وہ منہ ہکا تھی اس نے گناہ کیا تھا..... بہت بڑا گناہ اس کا اندر باہر آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ کہیں راہ فرار نہیں تھی۔ خوبصورت ہال..... نیلی آنکھیں..... آنکھیں حسن..... سب کچھ ست رنگی آگ کی نذر ہو رہا تھا..... وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی..... اس کا سارا جسم پیسے میں نہا رہا تھا۔ وہ دونوں سے یہی خواب دیکھ رہی تھی۔ شدید احساس گناہ نے اس کی سوچوں کو تھس تھس کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کو شدید بخار ہو رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی بستر سے نہیں اٹھ سکی تھی۔ اس کو بہت رونا آ رہا تھا۔ وہ ایسی تو نہ تھی۔ اس نے تو زندگی کے ہر موڑ پر سوچ سمجھ کر قدم رکھا

تھا۔ اس نے تو اپنی طرف اٹھنے والی ہر بری نگاہ کو ایسا نشتر چھو یا تھا کہ وہ دوبارہ نہ اٹھ سکی۔ وہ کس قدر اپنی ذات کے۔

وہ کس قدر اپنی ذات کے ذمہ میں جلتا تھی۔ اسے ہمیشہ غور رہا تھا کہ اس نے صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی گزاری ہے۔ اگرچہ وہ ماڈرن سوسائٹی کی اہم رکن تھی۔ اس کا گیٹ اپ اور لائف اسٹائل سب کچھ ماڈرن تھا مگر زندگی کی ترجیحات، قدامت پسندی اور روایت کے حصار میں جکڑی ہوئی تھیں۔ وہ اتنی مذہبی تو نہ تھی مگر خدا تو ہر جگہ موجود تھا۔ یہ سوچ اور گناہ و سزا کا احساس سچے جذبے کی طرح خون میں رواں دواں تھا۔ اس کا گھرانا اوسط درجے کا مذہبی گھرانہ تھا جہاں مذہبی تعلیمات ہر دن، ہر وقت ڈہرائی تو جاتی تھیں، عمل شاذ و نادر ہوتا تھا۔ مذہب دل کے کسی گوشے میں محفوظ تھا مگر مقنود نہیں تھا اور اب تو جیسے سب کچھ عود کر آ رہا تھا۔ اسے خدا کے تصور سے ہی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ جب عورت اپنا سب کچھ گنوا دیتی ہے تو پھر خدا سے کیسے نظریں ملا سکتی ہے کیونکہ وہ ایسی بے باک نظروں کو پسند نہیں کرتا جن میں سے حیا ختم ہو جائے۔ یہ سب کچھ کیا ہو گیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا زور زور سے سینہ کو پی کرے، خوب روئے۔ اتار دئے کہ آنکھوں کی پٹنائی ختم ہو جائے اور وہ ملک منصور کے مکروہ چہرے کو دوبارہ نہ دیکھ سکے۔ وہ نرم و گداز بستر پر لیٹی تڑپ رہی تھی، اندر ہی اندر چلا رہی تھی۔ ہر کروٹ پر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے آگ کی سلاخوں سے داغا جا رہا ہو۔

زمانے کی قسم انسان خسارے میں ہے۔

”ہاں، بہت بڑے خسارے میں، ہر طرف سے، اندر سے، باہر سے۔ یا الہی! میں کس کو پکاروں، میں کیا کروں۔ کاش میں اسی وقت مر جاتی۔“ وہ بڑبڑاتی تھی، پچھتا رہی تھی، سسک رہی تھی مگر سب کچھ بے کار تھا۔ وہ بری طرح جکڑی جا چکی تھی۔

ملک منصور رات کو آنے کا کہہ کر گیا تھا اور دو دن ہو گئے تھے وہ ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ وہ اس کی آمد کی اتنی بھتر نہیں تھی جتنی یہ جاننے کی کہ اس نے شزا کے ساتھ کیوں ایسا کیا تھا۔ شزا کے الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں نشتر کی طرح چھو رہے تھے۔

”آنکھ! ملک منصور نے مجھے بہت مارا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اس نے مجھے اس شدت سے مارا ہے اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم نے جو جو گناہ کیے ہیں، میری بددعا ہے کہ خدا تمہیں کبھی معاف نہ کرے۔ میں نے بہت خلوص سے تمہیں پھانسا چاہا تھا اور تم نے مجھے ہی اجاڑ دیا۔ ملک منصور نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ میرا نام نہاد گھر بھی اجاڑ دیا۔ خدا کرے تمہارا ہر لمحہ اذیت میں گزرے اور تم کبھی سکون سے نہ رہو۔“

شزا نے غصے سے روتے ہوئے فون بند کر دیا۔ وہ تنگی سی سنتی رہی اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اتنا بھی نہ بتا سکی کہ اس نے تو ملک منصور کو اس کے ہارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ تو خود ہی اتنا شاطر نکلا۔ کیسے کیسے اس نے وہ سارے نمبرز فریسن آؤٹ کیے اور پی ٹی سی ایل سے سارے نمبرز کنفرم کیے۔ خدا جانتا تھا کہ اس نے کچھ بھی ایسا نہیں کیا تھا اور وہ کیسے شکفے میں آ گئی تھی۔ اس شخص نے کیسے اسے اپنے سنہری جال میں پھنسا لیا تھا۔ شزا کے فون کے بعد تو اس کی اذیت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اگلے دن رات گئے وہ لوٹا۔ وہ میروں اور آف وہائٹ کو کنکشن میں پہلے سے بھی زیادہ ڈیٹنگ اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔ وہ کمرے میں آیا تو اس کے پیچھے تین چار وٹیز بڑے بڑے ڈبے اٹھا کر لا رہے تھے۔

”ہاں، ادھر رکھ دو اور تم لوگ جاؤ!“ اس نے ٹھکانہ لہجے میں کہا۔ اس نے اسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”ہیلو ڈارلنگ اسویٹ ہارٹ کیسی ہو؟“ وہ خاموش رہی اور نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ کیا ابھی تک بستر میں ہو، سوری میں کل نہیں آ سکا اسی لیے ناراض لگ رہی ہو۔ آئی ایم سوری.....“ اس نے تجھے پر کھسکے اس کے ہاتھ کو پکڑنے کی کوشش کی۔ ”اوہ گاڈ! تمہیں تو بہت چیز بخار ہے۔ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔ ٹھہرو میں ابھی ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔“ اس نے جلدی سے ڈاکٹر کا نمبر ملا یا۔ ”وہ ابھی آ رہا ہے۔ تم کچھ بولتی کیوں نہیں اور تمہاری آنکھوں میں اتنی اُداسی کیوں ہے؟“ اس نے محبت سے اس کے بلوط بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہی اور خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں سے آنسو گر کر تجھے میں جذب ہونے لگے۔

”یہ کیا..... یہ اتنے سارے آنسو کہاں سے آ گئے۔ ڈونٹ یو وری ڈیر! ابھی ڈاکٹر آ رہا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اس کے گرم، پتے ہوئے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

ڈاکٹر نے چیک اپ کیا اور میڈیسنز وغیرہ دے کر چلا گیا۔ وہ میڈیسنز کھا کر سوری تھی اور وہ کیا کرتا رہا اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ صبح جب بیدار ہوئی تو اس کی طبیعت پہلے سے کافی بہتر تھی۔ وہ کمرے میں نہیں تھا۔ کمرے میں ہر شے قرینے سے اپنی اپنی جگہ پر تھی۔ وہ واش روم سے فارغ ہو کر باہر ننگی تو فون کی تھل بجنے لگی۔ آفس سے کال تھی۔ انھیں وہ ڈاکومنٹس چاہیے تھے جو اس کی سیکرٹ فائل کا حصہ تھے۔ اس کا کوئی واپس ڈاکومنٹس لینے آ رہا تھا۔ وہ دروازہ لاک کر کے اپنے چھوٹے سے سیکرٹ چینڈ بیگ سے وہ پیپرز نکالنے لگی۔

ایک کے بعد دوسری..... پیپرز اس نے ہر ہر جگہ تلاش کیے مگر ڈاکومنٹس غائب تھے۔ وہ پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے تو بیگ انتہائی احتیاط کے ساتھ سائیز ٹیبل کے خفیہ خانے میں رکھا تھا پھر کیسے اور کہاں غائب ہو گیا۔ وہ پریشان اور حیران ہو رہی تھی۔ اس کا دھیان بار بار ملک منصور کی طرف جارہا تھا مگر اسے بیگ مل نہیں سکتا تھا کیونکہ اس نے بہت احتیاط سے اسے چھپایا تھا۔ اس نے بیگ بار بار چیک کیا اور پھر اسے الٹا یا تو ملک منصور کا ایک لاکٹ چمکتا ہوا فرش پر لڑھکتے لگا۔ اس کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ اس نے اس کے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا تھا۔ وہ تو کہتا تھا اسے نہ کسی شخص کی پروا ہے اور نہ ہی ڈاکومنٹس کی اور وہ ڈاکومنٹس موجودہ حکومت کے لیے کس قدر خطرناک تھے وہ بھی جانتا تھا۔ نہ جانے اس کام کے اس نے کتنے ڈالر کمائے تھے۔ اسے شدید دکھ ہونے لگا۔ آفس والوں نے اسے ایماء عمار کچھ کر اس پر ٹرسٹ کیا تھا اور وہ خود ہی دھوکا کھا گئی تھی۔ ان لوگوں کو کیا جواب دے گی۔ وہ ہسٹل ہٹتی چکا تھا اور تھوڑی دیر میں اس تک پہنچنے والا تھا۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کہے۔ وہ ہسٹل اس کے سامنے بیٹھا اس سے پیچہ زما لگ رہا تھا اور وہ جیسے لگ سی بنی کچھ سن ہی نہیں رہی تھی۔

”میری طبیعت بہت خراب ہے اور فائل میں نے کہاں رکھی ہے، مجھے یاد نہیں آ رہا۔ میں شام کو فائل لے کر خود آؤں گی۔ مجھے تلاش کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔“ اس نے وہ ہسٹل سے کہا تو وہ حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔ وہ کچھ کہنے لگا تو وہ خود ہی بول پڑی۔

”ہاں، میں جانتی ہوں وہ بہت اہم ہے۔ میں نے کہا نا شام کو پہنچا دوں گی۔“ وہ ہسٹل بنا کچھ کہے حیرت سے ”اوکے“ کہتا ہوا ہا ہر نکل گیا۔ اس کا سر فم و غصے سے پھٹ رہا تھا۔ اس شخص نے اس کے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا تھا۔ اس کی زندگی کے ساتھ بھی کھیلا اور اس کے پروفیشن کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ پہلے ہر لہہ گناہ کے احساس کی وجہ سے اذیت سے بڑھتا اور اب دھوکا دہی کے ڈپریشن سے۔

”آنیکت! تم نے بہت بڑا دھوکا کھایا ہے۔ محبت کے خوبصورت لفظ سے دھوکا کھا گئی ہو۔ اس کی دلکش شخصیت، اس کے خوبصورت الفاظ، سب کچھ فریب تھا۔ وہ تو خود سراپا فریب ہے۔“ کوئی اندر ہی اندر کچھ کے لگا رہا تھا۔ اسے اپنے سارے جسم پر چیونٹیاں رہتی ہوئی اور ڈنک مارتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ گناہ اور فریب، سنگساری یا قتل؟ تھوڑی دیر بعد وہ لوٹا تو مسکرا رہا تھا۔ وہ صوفے پر اتنا جان بچی رہی اور ایک میگزین دیکھتی رہی۔

”اب کیسی ہو؟ لگ رہا ہے کہ بھر ہو۔“ وہ اس کے کندھے پر اپنا ہانڈ پھیلاتے ہوئے بولا۔

”آج باہر چلیں۔“ آنیکت ایک دم بولی۔

”کہاں؟“

”اپنے گھر..... میرا دل بہت چاہ رہا ہے وہاں جانے کو۔“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ تمہارا گھر ہے۔ مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے اور سنو! تم نے تو وہ جیوٹری اور پرفیومز دیکھے ہی نہیں۔ کل تمہاری طبیعت خراب تھی اس لیے دکھانے کا ڈارنگ اکھول کر تو دیکھو۔ تمہارے ہوش اُڑ جائیں گے۔“ اس نے ڈبے اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”بعد میں دیکھ لوں گی۔“ وہ پیدلی سے بولی۔

”نہیں نہیں، ابھی دیکھو۔“ وہ ڈبے کھولنے لگا۔ ایک کے بعد ایک خوبصورت وائٹ گولڈ اور ڈائمنڈ کا سیٹ تھا۔ ہوشربا پرفیومز خوبصورت، دلکش جینٹلو میں۔ وہ لڈ ہٹا کر سامنے کو اس کے سامنے کر کے دبا تا۔ خوش کن، سوئم می سوئم می خوشبوئیں روح تک کو مہل کرنے لگیں۔

”کیسا لگا سب کچھ؟“ وہ مسکرا کر بولا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”اچھا ہے۔“

”لیکن تم سے اچھا نہیں۔“ وہ اس کے آگے جھکتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے چلیں۔“

”ہاں، لیکن تم فریش تو ہو کر آؤ۔ چیخ کرو اور ان میں سے سب سے خوبصورت ترین سیٹ پہنو۔ آج وہاں صرف ہم تم اور خوشبوئیں ہوں گی۔“ وہ معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔ آنیکت خاموشی سے اٹھ کر واش روم میں چلی گئی اور شاور کھول کر شدت سے رونے لگی۔ اس کا دل پھٹ رہا تھا، چیخ رہا تھا۔ اس شخص نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ اس کی زندگی، عزت، اس کا مستقبل اور شاید عاقبت بھی۔

وہ واش روم سے نکلی تو ملک منصور جیسے آنکھیں جھپکنا ہی بھول گیا۔ اس نے ریڈ کلر کا اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا اور شاید پہلی دفعہ ریڈ کلر کی ڈارک لپ اسٹک لگائی تھی۔ اس کا دل بھی خوں میں ہو رہا تھا۔

”واؤ..... اس دیکھو! تم ہر روز مجھے حیران کرتی ہو۔“ وہ ہانڈ کی طرح اس پر جھپٹ کر اسے اپنے حصار میں لیتے ہوئے بولا۔

”ناٹم کم ہے، چلیں۔“ وہ اسے آہستہ سے اپنے علیحدہ کرتے ہوئے بولی۔

”ہاں، ناٹم تو واقعی کم ہے اور ہمارے لیے تو ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ وہ گاڑی میں بھی اس سے محبت بھری ہاتھیں

کرتا رہا اور وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ گاگر کے پیچھے آسواں کی آنکھوں میں جیسے غم سے گئے تھے۔ اسے دل کسی آراء سے کشتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کس قدر مطمئن اور خوش لگ رہا تھا۔

”وہ یونہی ہر عورت کو تہاہ کرتا ہے۔ پہلے اسے اتنا مجبور کرتا ہے کہ راہ فرار نظر نہیں آتی اور پھر رفتہ رفتہ اسے تہاہ و برہاد کر کے چھوڑتا ہے۔“ اسے شزا کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ وہ ایسی نہ تھی۔ وہ کیسے کھلونا بن گئی اور ٹوٹ گئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔

”خدا تمہیں کبھی محال نہیں کرے گا۔“ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ نیلگوں آسمان پر سفید ہادلوں کی ٹکڑیاں ابھر اُھر بکھری تھیں۔ چمکدار، شفاف، روشن صبح اب آہستہ آہستہ زوال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سائے دگنے ہو رہے تھے۔ سورج کی روشنی بھی زوال پذیر ہو رہی تھی۔ ارد گرد سفیدے کے لیے درخت تھے سیاہ کول تار کی سڑک سے ہوتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ بلیو ایریا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ملک منصور نے کل نما گھر کے سامنے جا کر گاڑی روکی اور اپنے بریف کیس میں سے چابیاں نکال کر گیٹ کھولا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ کسی ایک شے کے نہ ٹکرانے کی آواز تھی، نہ سانس لینے کی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر ساکت و جامد ہو گئی ہو اور مجسم تماشا ہو۔ ہر شے بے جان اور مردہ لگ رہی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوا۔ دونوں نے بھرپور لگا ہوں سے ارد گرد دیکھا۔ ہر شے قرینے سے اپنی جگہ پر رکھی خوبصورت لگ رہی تھی۔

”آؤ، اپنے کمرے میں چلتے ہیں۔“ وہ محبت سے بولا اور وہ خاموش روایت کے مانند اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس نے اپنا کوٹ اتار کر صوفے پر پھینکا اور شوزا اتار کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”آج میں بہت تھک گیا ہوں۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں بولا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”کیوں؟“

”بس کبھی کبھی اچانک ہی تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔“

”کافی لاؤں کہ کوئلہ ڈرے؟“

”کافی لے آؤ اور سنو جلدی آنا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کافی لے کر آ گئی۔ خوبصورت چائینز کافی سیٹ سے قرینے

سے کچی ٹرے کو اس نے ٹیبل پر رکھا اور کافی بنانے لگی۔ وہ کریم کافی بنا کر لائی تھی، کافی بنا کر اسے دی۔

”تم نہیں پیو گی؟“

”میں بلیک پیو گی۔ آپ جانتے تو ہیں۔“

”اوہ آئی سی!“ دونوں کافی کے سپ لینے لگے۔ آہستہ آہستہ حیران تھی کہ اب وہ شادی کا ذکر بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس نے خود ہی بات چھیڑی۔

”منصور! ہم شادی کب کریں گے؟“

”بہت جلد.....“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”کیا تم ابھی چاہتی ہو؟“

”نہیں، میں تو یونہی پوچھ رہی تھی۔“

”بے فکر ہو ڈارنگ! میں ریلیشن کے لیے شادی ضرور کرتا ہوں ورنہ میری اپنی ساکھ کو بھی خطرہ ہوتا ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”بھئی پوچھو کل اسٹیشن کو ورنہ لوگ ہمیں جلسوں میں ہی نہ چھوڑیں۔ شادیاں کرنا ہماری مجبوری بن جاتا ہے۔ تم لوگوں کی بھی اور ہماری بھی۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولا تو وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

”واقعی آج تو میں بہت تھک گیا ہوں، نیند بھی آنے لگی۔“ وہ ٹائی کی ٹاٹ لوڑ کرتے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں تھوڑا سا ریٹ کروں پھر باہر چلیں گے۔“ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ آہستہ آہستہ گہری نیند کی طرف سفر کر رہا تھا۔ اس نے بیٹر کا گیس پوائنٹ آن کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ لان میں چکر لگا رہی تھی۔ شام کا آگیا سا سیاہ آہستہ آہستہ دوپہر کی مدھم، بے جان دھوپ اور اس کی روشنی کو اپنے وجود میں سمونے لگا تھا۔ وہ گہری سوچوں میں گم تھی اور نیچے پاؤں ادھر ادھر محکوم رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا آنسو، جھڑی سی رواں ہو گئی۔ انسان کے ٹپکنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔ بس ایک پتھر کا فاصلہ.... بڑھکتے، غیر متوازن پتھر پر قدم رکھتے ہی انسان اسفل السالطین کے گہرے کھڈ میں جا گرتا ہے اور پھر ساری زندگی پاتال کے اندھیریوں اور گرداب میں پھنسا رہتا ہے۔ وہ احساسِ ندامت کا شکار ہو رہی تھی۔

”یا خدا یا! مجھے معاف کر دے۔ مجھ سے گناہ ہو گیا ہے۔ ایسا گناہ جو بہت کریم اور رسوا کر دینے والا ہے۔ کیا تو مجھے معاف کرے گا۔“ وہ گھاس پر روزانو بیٹھ کر آسمان کی طرف ترچہ اٹھا کر دعا کرنے لگی۔ ”یہ زندگی کیسے گزر پائے گی؟ میرا گناہ اور اس کا احساس مجھے کہیں بھی چھین نہیں لینے دے گا۔ ایسی اذیت، ایسا کرب اور ایسی جہنم تو میں نے کبھی بھی محسوس نہیں کی۔ میرا اندر تو جیسے الاؤ دین چکا ہے۔ ہر طرف آگ ہی آگ ہے جھلسا دینے والی، بھسم کر دینے والی۔“

شام کا اندھیرا اب تاریکی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ پورے گھر میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ تاریکی، گہرا سکوت اور گناہوں سے لتھڑے وجود، طعن زدہ مکروہ چہرے..... اس نے سوچا اور اندر کی طرف گئی۔ اسے وہ کرتا تھا جس کی وہ پلاننگ کر کے آئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر لاؤنج کی لائٹ آن کی اور کچن میں گئی۔ کینڈلر اور لائٹر لے کر وہ بیڈ روم کی طرف گئی۔ اندر گہری خاموشی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو معطر کن خوشبوؤں کے جھوکوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ چمک سی گئی۔ وہ تو گیس کا پوائنٹ آن کر کے گئی تھی اور اب ہر طرف خوشبوئیں ہی خوشبوئیں تھیں۔ اسے سب کچھ سمجھ آنے لگا۔ وہ جاگ رہا تھا اور شاید اسے آہ بزدلی بھی کر رہا تھا۔

”میں کبھی کبھی گولیاں نہیں کھیلتا۔“ اسے منصور کے کہے ہوئے الفاظ یاد آنے لگے۔ وہ ہی بے وقوف تھی جو اسے یوں ڈانچ دیتے تھے۔ وہ تو عورت کی رگ رگ اور اس کی سرشت سے اچھی طرح واقف تھا۔ ان کے کمزور لحوں کی ڈیمائزر، ان کے انتقامی لحوں کی سوچوں اور ان کے ری ایکشن سے شہنا تھا۔ جس شخص نے ساری زندگی اس کھلونے سے اچھی طرح جی بہلایا ہو۔ اس کو جی بھر کر توڑا ہو۔ اس کو کئی بار مسلا ہو، کئی بار جوڑا ہو۔ ریزہ ریزہ کر کے پھر اس کو نیا وجود دیا ہو۔ اس میں اپنی سانسوں سے روح پھونگی ہو اور اسے ہر بار نیا روپ دیا ہو کیا وہ اس کی نفسیات سے واقف نہ ہوگا۔ وہ کس قدر بے وقوف تھی۔ اس نے آہ بھری اور اپنی پلاننگ پر خود ہی لعن طعن کرنے لگی۔

”تم کبھی بھی اس کی سوچ تک نہیں پہنچ سکتیں۔ وہ مگر مجھ ہے اور تم مجھی رنگ برنگی پھلیوں کو اس کا ترنوالہ بننے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔“
آنکھ اس کے لیے بڑا چال بچھاتا پڑے گا۔ آگ کا کھیل کھیلنا ہوگا اور شاید خود بھی اس میں کودنا ہوگا۔ ”وہ تاریکی میں کھڑی سوچتی رہی اور لائٹز آن کیا۔ ملک منصور نے ایک دم اسے پیچھے سے آکر اپنے مضبوط ہانڈوں کے حصار میں لے لیا۔

”سوٹ ہارٹ! ابھی تم بہت نا تجربہ کار ہو۔“ وہ اسے مضبوطی سے جکڑتے ہوئے بولا۔

”کیا مطلب؟“ وہ چونک کر اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے بولی۔

”بھئی اس گھر کی چیزوں سے واقفیت حاصل کرنے میں ابھی تھوڑا سا وقت تو لگے گا نا۔ تم شاید بیٹر کا پوائنٹ کھلا چھوڑ گئی تھیں۔“ اس نے چھت سے لٹکتے خوبصورت شینڈیلز کو آن کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ، آئی ایم سوری! لائٹز نہیں مل رہا تھا۔ شاید بھول گئی۔ بس طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے میں بھول ہی گئی۔“

”کوئی بات نہیں، وہ تو ایک دم اسمبل آئی تو پھر میں نے بند کیا۔ آئندہ احتیاط کرنا۔ کبھی کبھی ایسی نا تجربہ کاری زندگی کو بھی شعلوں کی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔“ وہ مسکرتہ انداز میں بولا اور وہ ٹبل ہی کینڈلر جلانے لگی۔

”کیا کوئی خاص بات ہے؟“ اس نے کینڈلر روشن کرتی آنکھ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”بس یونہی دل چاہ رہا تھا اس تنہائی میں ان کی روشنی میں چند لمبے چلنے کو۔“

”واؤ گریٹ! آج تو تم بہت غیر معمولی چیزوں کے بارے میں سوچ رہی ہو۔“ اس کے لہجے میں چھپے شگ اور طنز کو وہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

”کھانا کھانے باہر نہ چلیں۔“ ملک منصور نے رائے مانگی۔

”نہیں، اچھے دن ہو گئے ہوٹل میں کھاتے ہوئے۔ آج گھر میں کھانا کھائیں گے۔“

”ٹھیک ہے پھر باہر سے لے آتے ہیں اور! دھری کھا لیتے ہیں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“

”چلو پھر چلتے ہیں۔“

”او کے!“ وہ کینڈلر پر پھونک مارتے ہوئے بولی۔ کھانا یک کروا کے وہ واپس آئے تو اس نے شیشے کی وسیع و عریض ڈائننگ ٹیبل پر کھانا جن دیا، کینڈلر جلانے لگا۔ ملک منصور نے ڈائننگ روم کی ایک جگہ کے نیچے لگا ٹیبل آن کیا۔ جینگ خود بخود پیچھے ہٹ گئی اور اس کے پیچھے سے ایک شیلٹ نمودار ہوئی جس میں رنگ برنگی، خوبصورت مختلف انواع و اقسام کی شیشے کی بوتلیں ترے سے جھکی تھیں۔ آنکھ نے حیرانی سے دیکھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شیمپین گلاس اور گلاس میں ڈال کر ٹیبل کو پھر دیا یا پینٹنگ اپنی جگہ پر آ گئی۔

”یہ کیا؟“ آنکھ نے حیرانی سے تصدیق کرنا چاہی۔

”بھئی شیمپین ہے اور کیا ہے، کیا تم لوگ؟“ وہ ٹارل لہجے میں بولا۔

”نہیں۔“ اس نے فکرت سے لہجے میں جواب دیا۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے شیمین پی۔ اس کی آنکھوں میں اور لہجے میں سرور اور مستی چھانے لگی۔ وہ مدہوش ہو رہا تھا اور وہ بے ہوش ہونے والی تھی۔ اسے اس شخص سے خوف آنے لگا تھا۔ اس کا ایک اور روپ سامنے آ رہا تھا۔ ایک غاصب لٹیرے کا۔

”آنکھ! جلدی کرے میں آؤ۔ میں تمہارا شہر ہوں۔“ وہ قدرے جھکمانہ لہجے میں بولا۔ آنکھ نے دیکھا وہ مضبوط اعصاب کا آدمی تھا۔ نہ وہ لڑکھڑا رہا تھا، نہ بہک رہا تھا۔ آنکھ نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ وہ جاچکا تھا۔ آنسو شیشے کی ٹیبل پر ٹپ ٹپ کر کر ادھر ادھر بھسلنے لگے اور مخصوص زاویے بنانے لگے۔ اس نے ٹیبل میں اپنا عکس دیکھا۔ اس کا چہرہ دگنا لگ رہا تھا، بگڑا ہوا، مسخ شدہ، پھٹکا زدہ اور لمحوں زدہ۔ وہ کتنی ہی دیر ادھر بیٹھی سوچتی رہی۔ اٹھ کر دوش روم میں چلی گئی اور وارڈ روپ سے شلوار قمیض اور چادر نکالی۔ ملک منصور بیڈ پر بیٹھا سگار پینے میں مصروف تھا اور ساتھ ساتھ موبائل پر کسی سے بات بھی کر رہا تھا۔ اس نے کن آنکھوں سے سوٹ کی طرف دیکھا اور ٹیبل میں سر ہلایا اور وائٹ فرلر والی مہین سی ٹائلی کی طرف اشارہ کیا۔ آنکھ نے اشارے سے کچھ سمجھایا اور دونوں ڈر۔ سولے کر باہر نکل گئی۔ دوسرے کمرے میں جا کر اس نے سوٹ پہنا اور جانماز پر بیٹھ کر سجدے میں سر رکھ کر رونے لگی۔ اتنا روئی کہ شاید یہ رونے کا آخری دن تھا۔ آنکھیں اور دل پھٹنے کو تھے۔ وہ کوئی دعا نہیں کر رہی تھی۔ اسے زندگی میں اب کچھ بھی نہیں چاہیے تھا۔ سب کچھ حاصل ہو کر اب لا حاصل میں بدل چکا تھا۔ ہر شے اپنا مفہوم کھو چکی تھی۔ بس وہ رو رہی تھی، گڑ گڑا رہی تھی۔

”بس تو مجھے معاف کر دے اور کچھ نہیں چاہیے۔ مجھ سے ناراض نہ ہونا، میں بہک گئی اور راد سے بھٹک گئی تھی۔ اب میرے پاس کوئی راستہ نہیں رہا۔ میری مدد کر، بس ایک دفعہ، آخری بار اس کے بعد میں تجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔“ اس نے روتے ہوئے آنسو پونچھے اور جانماز قرینے سے تہ کر کے کرسی پر رکھی اور ٹائلی مہین پی۔ اس سوٹ کو ختم تھا لپیٹ کر اس میں ایک بوتل رکھی اور کمرے میں چلی گئی۔

”کہاں رہ گئی تھیں، میں تو پریشان ہو رہا تھا۔“ اس نے موبائل بند کرتے ہوئے کہا۔ ”اوہ، فریش ہو رہی تھیں۔“ اس نے اسے ٹائلی میں ملیں دیکھ کر کہا۔ آنکھ نے خاموشی سے ختم تھا سوٹ شاچک۔ بیک میں ڈال کر سائیز ٹیبل کے ساتھ بے خیالی میں رکھنا چاہتا کہ اسے شک نہ ہو اور اس کے پاس آگئی۔

”اس کو ادھر کیوں رکھ دیا؟“ ملک منصور نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

”وہ تھوڑا سا گندا ہو گیا ہے۔“

”تو دوش روم میں رکھ دیتیں۔“

”اوہ، آئی ایم سوری!“ وہ اٹھ کر جانے لگی۔

”چلو رہے دو، صبح اٹھا لینا۔“ اس نے کہا۔

”منصور! کیا آپ نے شزا کو بتا دیا کہ ہم شادی کر رہے ہیں؟“ وہ کسی نہ کسی طرح شزا کے بارے میں جاننے کی خواہش تھی۔

”ہاں، ہاں مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ اس نے بغور اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”یونہی میرے ذہن میں خیال آ رہا تھا۔“

”اس وقت کچھ مت سوچو۔ صرف اپنے اور میرے بارے میں سوچو۔ اس کے علاوہ ہر سوچ کو ذہن سے مٹا دو۔ اس خوبصورت ماحول میں صرف ہم دونوں ہیں۔ کسی تیسرے کو دستک بھی نہیں دینی چاہیے۔“ وہ رفتہ رفتہ اسے اپنے حصار میں لینے لگا اور وہ ہر آن گم ہوتی گئی۔ اندر ہی اندر روتی رہی اور سسکتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ریت بھر گئی تھی۔ وہ شدید جھین محسوس کر رہی تھی۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ نیند کی وادی میں کھور ہا تھا۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک لیا۔ وہ سانس روک کے لیٹی رہی۔ کافی دیر بعد اس نے چپک کیا وہ سوچا تھا۔ اس نے لیپ آف کیا اور بیڈ سے اٹھ کر اندازے سے دھڑکی طرف گئی اور اس کا پوائنٹ پوری قوت سے کھول دیا۔ گربہ پانی سے ٹوٹتی ہوئی وہ اس کی سائڈ پر آئی اور اس کے اوپر بوسل اُٹھ لے دی۔ وہ تڑپنے لگا، چیخنے چلانے لگا، ہڈیاں بکنے لگا۔ اس نے جلدی سے لائٹس آن کیا اور اس کی روشنی میں اس کو تڑپتے ہوئے دیکھا۔

”ملک منصور اتم ہمیشہ عورتوں کے ساتھ کھیلتے آئے ہو اور تم نے مجھے بھی تباہ کرنا چاہا۔ آج میں تمہیں تڑپا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ اب تمہارا مسخ شدہ چہرہ دیکھ کر کوئی بھی نہیں پہچانے گا کہ یہ تم ہو۔“ تیزاب کی بوتل نیچے کارپٹ پر اوندھے منہ پڑی تھی اور قطرہ قطرہ تیزاب کارپٹ میں جذب ہو رہا تھا۔ وہ چیخ رہا تھا۔ مدد کو پکار رہا تھا۔ اس کو گالیاں بک رہا تھا مگر ہر طرف گہرا سکوت تھا جیسے وہ قبر میں چلا رہا ہو، کوئی بھی اس کی آواز نہیں سن رہا تھا۔ اس کا گہرا ہرے پر سکون لگ رہا تھا۔ چاند اور ستاروں کی روشنی میں جنگ کا ناخوبصورت محل..... ملک منصور نے لپک کر اس پر حملہ کرنا چاہا ایک دم جلتا لائٹس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے پڑی تیزاب کی بوتل پر گرا۔ گیس کی اسمبل نے بھی سارے خلا کو پڑ کر رکھا تھا۔ لائٹس گرا اور ایک دم آگ بھڑکی۔ ہر طرف شعلے ہی شعلے تھے۔ آئینک نے بھاگنا چاہا مگر ملک منصور نے اس کی ناک کی کاٹنا پکڑ کر اسے اپنی طرف گھسیٹا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے اور دونوں کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کمرے میں ویلیٹ کے خوبصورت دیوار پر دے آگ کے لمبے لمبے ستون بن گئے تھے۔ ہر شے آگ میں بھڑک رہی تھی۔ انسان، ہڈیاں، لوہا، تاج، بکڑی، پتھر سب اس دوزخ کا حصہ بن گئے۔ دونوں چلا رہے تھے، چیخ رہے تھے۔ چاروں طرف آگ پھیلی تھی، اوپر بھی نیچے بھی اور ارد گرد بھی۔ ان کے چہرے چنگھاڑتے وجود لکھ خاکستر ہو رہے تھے۔

اس کے خوبصورت بلونڈ ہال، نازک سرسبز بدن، آتشیں حسن، ذہانت، فطانت، لطافت سب کچھ آگ کی نذر ہو رہا تھا اور وہ ڈی شنگ، پینڈسم وجود، شاطر، فطین الذہن اپنی ساری مکارانہ چالوں اور پلاننگ سمیت آگ میں جل کر خاک ہو رہا تھا۔ سالوں کی پلاننگ اور منصوبے بنانے والا چند ثانیوں میں راکھ ہو رہا تھا۔ چاروں طرف اونچی اونچی دیواروں سے طرہ جیسی آگ لپٹ رہی تھی۔

خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ کی طرح جودلوں پر جا لینے کی اور وہ اس میں بند کر دیے جائیں گے یعنی آگ کے لمبے لمبے ستونوں میں..... انہیں آگ کے لباس پہنا دیے گئے تھے اور آگ کی زنجیریں۔ ان کے چہرے جھلس رہے تھے۔ دل خاکستر ہو رہے تھے۔ بدن تڑپ رہے تھے اور رو جس جیسے آگ کی تیش سے راؤ فراہ چا رہی تھیں اور اس قلنس سے پرواز کو بے تاب تھیں۔ وہ چیخ رہے، تڑپتے رہے اور راکھ ہو گئے۔ کب آگ ٹھنڈی ہوئی۔ کب کسی نے پولیس کو بلا دیا، خوبصورت محل راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ بلیک وی ٹی آئی سے صرف چند جملے ہوئے کاغذ ملے تھے جن سے

بڑی مشکل سے کینوں کی شناخت ہوئی تھی۔ نہ وجود رہے تھے نہ آثار، نہ شناخت باقی رہی تھی نہ پہچان۔ راکھ کے ذرے ہوا میں بکھر چکے تھے۔ نہ نماز جنازہ ہوئی نہ کسی نے دعا پڑھی۔ بے شک انسان خسارے میں ہے۔ نہ کوئی لب دعا کے لیے بل سکے نہ کوئی ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ سکے۔ ان کی پہچان ہی مشکل ہو گئی تھی۔ کوئی تصدیق کیا کرتا۔

شہزاد نے خبر اخبار میں پڑھی تو جیسے سکون کا گہرا سانس لیا۔ اس شخص سے ہدائی کا اسے نہ دکھ ہوا تھا نہ ملال۔ اسے تو اس کے پروردگار نے بکڑا تھا جس کی پکڑ بڑی شدید ہے اور جب وہ اچانک پکڑتا ہے تو انسان بوجھلا جاتا ہے۔ اسے کس نے اٹھایا۔ وہ تو گہری نیند میں تھی۔ شاکل تو بے خبر تھی۔ اسے رشتوں کی ضرورت نہ رہی تھی اور نہ ہی کسی کے جانے کا افسوس اس کے لیے باپ کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور وہ اس سے بے خبر رہی۔ شفیق اخبار پڑھ کر بہت روئی تھی مگر اس نے بھی کوئی دعا نہ کی اسے بچپن یاد آنے لگا جب وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ پھر کسی اور سے کرنے لگا تو انھیں بھولتا گیا اور رفتہ رفتہ اس کی جان کا دشمن بن گیا۔ اس کی گھات میں بیٹھا رہا۔ اب اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ آزاد ہو گئی تھی ہر خوف سے، ہر خطرے سے۔

حیدر نے اخبار پڑھا تو گہری سانس لی اور اخبار آپا کی طرف بڑھا دیا۔ آپا نے خبر پڑھی اور چپ ہو گئیں۔
سمیر نے فون کیا۔ وہ بہت رو رہا تھا۔ جلد از جلد گھر آنا چاہتا تھا اور شہزاد سے لینے جا رہی تھی۔

آنکھ کے گہروالوں کو اطلاع دے دی گئی تھی مگر ابھی تک وہ امید و بیم کی کشتی میں سوار تھے۔ وہ یقین نہیں کر رہے تھے البتہ اس کی چند چیزیں جائے وقوعہ سے ملتی تھیں۔ اس کی ماما کا میٹل کالا کٹ جس پر آنکھ لکھا تھا جو انھوں نے اسے تحفے میں دیا تھا۔ اس کی آگ میں مجلسی ہوئی سیاہ انگوشی مگر راکھ نہ تو تابوت میں سما سکی نہ قبر کا حصہ بن سکی۔ نہ جانے ہوا اسے کہاں لے آئی اور کس کس کے قدموں تلے روندی گئی۔

”بے شک تو مجھے روئے نڈال، خاک کر دے، میرے تن بدن کو جلا دے مگر مجھے معاف کر دے۔“ آپاں بھرتی ہوا سسکتی راکھ کو ادھر سے ادھر اڑا رہی تھی۔ اس کا بھائی آیا اور ناکام لوٹ رہا تھا۔ نہ وجود ہاتھ آیا تھا نہ آثار..... وہ بپتے انگلیوں اور دعا گولیوں کے ساتھ اس کی مغفرت کی دعا کرتے ہوئے واپس لوٹ گیا۔

”تمہاری دنیا کی زندگی تو بس ایک دن کی تھی۔ دنیا کی زندگی تو بس کھیل تھا شادی۔“ کھیل ختم ہو چکا تھا اور دنیا محو تماشا تھی۔ کردار جا چکے تھے اور دنیا کا اسٹیج خالی تھا۔ شکر لگا ہیں پہلے کرداروں کو رفتہ رفتہ بھلا رہی تھیں۔ وہ ذہن سے محو ہو رہے تھے۔ ماضی کا تاریک حصہ بن رہے تھے۔ زمانے کا فرعون وقت کے عمیق سمندر میں قصہ پارینہ بننے کے لیے غوطہ زن تھا۔

.....

”یہ دلیم کا گلاس ہے اور مجھے اس کے گلاس میں پانی مت دیا کرو۔“ سسٹر سارہ لاؤنج میں بیٹھی انفلز پر برس رہی تھی۔ دلیم اپنے کمرے سے وکیل چیئر پر کھل رہا تھا۔ یہ الفاظ اس کی سماعتوں سے ٹکرائے تو وہ وہیں رک گیا۔ دکھ کا شدید احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔
”میڈم! یہ ان کا گلاس نہیں۔ ان کے برتن تو ملیمہ ہیں۔“ انفلز نے صفائی دی۔

”نہیں، یہ دیکھو۔ میں نے مار کر سے اس کے گلاس اور دوسرے برتنوں پر نشان لگا دیے ہیں۔ وہ مسلمان نہیں اس لیے اس کے برتن علیحدہ رکھا کرو۔“ وہ غلطی سے بولی۔ اس کا دل کرچی کرچی ہو رہا تھا۔ یہ پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔ اسے ہار ہا ایسے رویوں اور نظروں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مشکوک لہجے، جتنسا نا استقلال پر لگائیں، معترضہ جملے، سب کچھ اتنا تکلیف دہ تھا کہ وہ اندر ہی اندر بہت زیادہ بکھر چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اپنے آپ کو بچس اور ناپاک تصور کر رہا تھا۔

”بھئی ہم تو نماز پڑھنے والے لوگ ہیں، اس طرح کی ناپاکیوں سے ہمیں بچاؤ۔“ سسٹر سائرہ زبان کی بہت تلخ عورت تھی۔ وہ افضل کو ڈانٹ رہی تھی جو گلاس ٹرے میں رکھ کر واپس جا رہا تھا۔ اسی لمحے تبسم آ پا کرے سے باہر آئیں۔ انھوں نے بھی اس کی باتیں سن لی تھیں۔ ولیم دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔

”کیا بات ہے بھئی، کس بات پر ناراض ہو رہی ہو؟“ آپا نے پوچھا۔

”ہونا کیا ہے جی افضل، ولیم صاحب کے برتنوں میں مجھے کھانے پینے کو دے تو میں ناراض نہیں ہوں گی تو کیا ہوگا؟“ وہ گلاز کر بولی۔

”کیوں، اس کے برتنوں کو کیا ہوا ہے؟“

”جیسے آپ کو تو معلوم ہی نہیں کہ وہ کرکچن ہے۔“

”اور کرکچن کے ساتھ کھانا پینا جائز ہے، یہ قرآن کا فیصلہ ہے۔“ آپا نے بات کاٹ کر کہا۔

”لیکن احتیاط تو کرنی چاہیے۔ ہم لوگ نماز، روزے والے لوگ ہیں۔ ایسی ناپاک باتیں برداشت نہیں کر سکتے۔“

”خدا کے لیے اتنی تنگ نظر مت بنیں۔ آپ تو پڑھی لکھی ہیں اور ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ ہم کیا اور ہماری نمازیں کیا..... ہم جیسے لوگوں نے تو مذہب کو بدنام کر کے رکھ دیا ہے اسی لیے ایک مشہور مسلم ادیب نے خود ہمارے بارے میں ہی لکھا ہے کہ اسلام دنیا کا بہترین مذہب ہے مگر اس کے ماننے والے بدترین لوگ ہیں۔“ آپا غلطی سے بولیں۔

”اب ایسی بھی بات نہیں، اسلام طہارت اور پاکیزگی کا حکم دیتا ہے۔“

”لیکن دلوں کو توڑنے کا نہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا ایک تلخ جملہ دوسروں کے لیے کس قدر روحانی اذیت کا باعث بن سکتا ہے اور خدا تو کہتا ہے کہ وہ تمہاری صورتوں کو نہیں، تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔ آپ ایسی گفتگو سے پرہیز کیا کریں اور..... خیر چھوڑیں۔“ آپا نے ناراضی سے کہا۔

”ٹھیک ہے جی، میں یہ نوکری ہی چھوڑ دیتی ہوں۔ میں کافروں کے گھر نوکری نہیں کر سکتی۔ نہ پاکی کا پتہ نہ پلیدی کا۔“ وہ پھر غلطی سے بولی۔

”خدا کے لیے آپ ایسی گفتگو سے کیا چاہتی ہیں۔ آپ اپنی سوچ کو نہیں بدلیں گی مگر نوکری چھوڑ دیں گی۔ کیا آپ کے اس عمل سے خدا

خوش ہوگا اور آپ کا تو شعبہ ہی انسانیت کی خدمت ہے۔ آپ تو مذہب اور رنگ کی تہود سے آزاد ہو کر انسانیت کی خدمت کے لیے میدان میں آئی ہیں۔“ آپا نے ملائمت سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”نہیں جی، مجھے کوئی انسانیت کی خدمت کا شوق نہیں۔ یہ میری مجبوری ہے۔ میرا شوہر نفی ہے اور مجھے اپنے بچے پالنے ہیں۔ اللہ مالک

ہے ایک در بند، سوز کھلے اور خدا خوش ہونہ ہو، میرا دل تو مطمئن ہوگا۔“ وہ غصے سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”آپ بیٹھیے اور سکون سے میری بات سنئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسجد نبوی ﷺ کی اسلام میں کیا اہمیت ہے؟“

”ہاں، کیوں نہیں، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کالی کالی والے ﷺ کے بعد اس سبز گنبد کے سوا ہمارا اور ہے کون؟“ وہ قدرے عقیدت

سے بولی۔

”اگر آپ کو ان سے اتنی محبت ہے تو آپ جانتی ہیں کہ ایک دفعہ کچھ عیسائی مہائے کے لیے مسجد نبوی ﷺ میں آئے۔ جب ان کی عبادت کا وقت ہوا تو انہوں نے اپنے قبلے کی طرف رخ کر کے اسی مسجد میں عبادت کی اور جب ہماری نماز کا وقت ہوا تو ہمارے نبی ﷺ نے اپنے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ انہوں نے تو یہ نہیں فرمایا کہ نکلویہاں سے۔ تمہارے وجود سے ہماری مسجد ناپاک ہوتی ہے۔ ایسے نبی ﷺ کے ماننے والوں کی ایسی چھوٹی سوچ نہیں ہونی چاہیے۔ وہ تو کسی کی طرف غصے کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔“ آپ نے ہر سمجھانے کی کوشش کی۔

”وہ جی بڑے دل اور عظمتوں والے لوگ تھے۔ ہم گنہگار اس قابل کہاں۔ ہم تو ان کے قدموں کی خاک ٹھہرے۔ بس میرا دل ہی نہیں مانتا اس گھر میں کام کرنے کے لیے آپ کسی کرچن نرس کا بندوبست کر لیں۔ بڑی مل جاتی ہیں، میں جا رہی ہوں اور حیدر صاحب کو کہہ دیجیے گا میرا حساب کر دیں خدا حافظ، کہا نا معاف کر دیں۔“ وہ پرس اتھاتی یا ہر نکل گئی اور آپ اس پر کڑ کر بیٹھ گئیں۔ ولیم کا دل ٹوٹ چکا تھا مگر آپ کی باتوں سے نہ جانے اسے کیا تقویت ملی تھی کہ وہ ان کی طرف آ گیا۔ آپ نے اسے دیکھا تو پیار سے مسکرائیں اور محبت سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”آئی! مجھے ہاتھ لگانے سے آپ ناپاک تو نہیں ہوئیں؟“ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

”نہیں بیٹا! ایسا سوچتے بھی نہیں۔ جو لوگ ایسا سوچتے ہیں وہ بہت چھوٹے ذہن کے لوگ ہوتے ہیں اور چھوٹے ذہن کے لوگ تو ہر جگہ، ہر ملک اور ہر مذہب میں ہوتے ہیں۔ یہ لو مجھے کیا ہوا ہے کہ میں اپنے بیٹے کو پیار نہ کروں؟“ انہوں نے اٹھ کر اس کا ہاتھ چومنا اور محبت سے ساتھ لگا لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

”بے خوف! تم دل کیوں چھوٹا کر رہے ہو۔ ہم سب کو تم بہت عزیز ہو۔“ آپ نے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر ہر کوئی مجھے کیوں ایسی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ ہر ایک کا پہلا سوال یہی کیوں ہوتا ہے کہ کیا میں کرچن ہوں، کیا کرچن خدا کے بندے نہیں؟“

”ہیں کیوں نہیں بلکہ ہمارے قرآن میں تو ان کا ذکر بڑی محبت سے آیا ہے کہ دوسرے لوگوں کی نسبت یہ ہمارے زیادہ قریب ہیں۔ یہ تو ہم لوگ ہیں جو خود ہی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں پڑ جاتے ہیں۔ رہی تمہارے ہارے میں جاننے کی بات تو جب تم سے ایسا پوچھا جاتا ہے تو حیرانی تم پر نہیں تمہاری ماں پر ہوتی ہے کہ اس نے کیا کیا۔ تم سوال نہیں بننے بلکہ سوال تو تمہاری ماں بنتی ہے۔ تم یونہی پریشان نہ ہو۔“

”آئی! شفق نے مجھے چلتا پھرتا گناہ کہا تھا۔“ اسے بہت دنوں بعد کوئی عمر بے راز ملا تھا اور اب وہ اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ رہا تھا۔

”اچھا، اس نے ایسا کہا۔ اصل میں وہ تمہاری ماما سے بہت ناراض ہے اس لیے ایسا کہا ہوگا اور بہت غلط کہا ہے۔ میں ضرور اسے ڈانٹوں گی۔“ وہ خشکی سے بولی۔

”نہیں رہنے دیں۔“ وہ مصیبت سے بولا۔

”اور یہ تمہاری ناگھوں کو کیا ہوا ہے؟“

”ایکسڈنٹ.....“ وہ آہستہ سے بولا۔

”اوہ آئی ایم سوری! اللہ آرام دے گا۔“

”لیکن فادر تو کہتے ہیں کہ جب خدا کسی سے ناراض ہوتا ہے تو ایسے ہی سزا دیتا ہے۔“ وہ مایوس کن لہجے میں بولا۔

”بہت بری بات ہے، نہ جانے انھوں نے ایسا کیوں کہا ہے۔ دیکھو اللہ کو سب سے پیارے نبی ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ تکلیفیں بھی انہی کو دی گئیں اور جس کو ایک تکلیف پہنچتی ہے اللہ اس کی دس برائیاں معاف فرماتا ہے۔ وہ تو اپنے بندوں سے بہت پیار کرنے والا ہے۔ انہی محبت کہ کوئی کسی سے نہیں کر سکتا۔ اب تم اپنے قادر کو دیکھو اور سسٹر سائرہ کو۔ ان کی سوچوں میں کیا فرق ہے اور یہ دونوں کتنے اہم شعبوں سے وابستہ ہیں۔ ایک روحانی مسیحا اور ایک جسمانی..... خدا کو وہی پاتا ہے جو اس سے سچی محبت کرتا ہے چاہے وہ کوئی فقیر ہو یا ان پڑھ مزدور یا پھر کوئی عالم، پیر اتو سب کو اسی نے کیا ہے۔“ تبسم آپا نے اتنی محبت سے اس کو سمجھایا کہ ایک دم اس کے اندر سے دکھ اور غم کے بادل چھٹنے لگے۔ اسے ایک روحانی خوشی ہی ملنے لگی۔ اسنے دنوں سے اس کا اندر شدید انتشار کا شکار ہو چکا تھا۔ اب متہدم عمارت اپنی واضح شکل میں پھر سے نمودار ہونے لگی۔ اس کے دل سے بوجھ کم ہونے لگا۔ وہ خدا جو بہت دنوں سے اس سے دور جا چکا تھا، ایک دم اسے اپنے بہت قریب محسوس ہوا۔

”آئی! کیا گاڈ واقعی مجھ سے ناراض نہیں؟“ وہ تھدتی کرنا چاہ رہا تھا۔

”نہیں بیٹا، بالکل نہیں۔ وہ کیوں اپنے بندوں سے ناراض ہوگا اور تم نے کیا گناہ کیا ہے جو تم یوں پوچھ رہے ہو۔“

”میں چرچ جو آئن کرنے والا تھا کہ ماما کی طبیعت خراب ہوگئی اور ان دنوں مجھے ایک..... ورکشاپ انٹینڈ کرنا تھی جو میں نہ کر سکا۔ فادر مجھ سے ناراض ہو گئے۔ وہ مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے اور پھر میرا ایکسڈنٹ ہو گیا اس لیے انھوں نے ایسا کہا۔“

”تم اپنے ذہن کو بالکل صاف رکھو۔ خدا ان باتوں سے بالکل ناراض نہیں ہوتا۔ وہ تو کہتا ہے کہ زمین و آسمان تمہارے گناہوں سے بھرے ہوں، تو یہ کر کے میری طرف لوٹو تو میں سب کچھ معاف کر دوں گا۔“

”کیا واقعی آئی؟“ اس کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں۔

”ہاں، کیوں نہیں، ہماری کتاب میں تو بار بار یہی ذکر ہے کہ وہ بہت معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ تم ایسی بات سوچنا بھی

مت۔ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے اور تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے انشاء اللہ اور یہ تکلیفیں تو انسان کی آزمائشیں ہوتی ہیں۔“

”تو کیا ماما کی بھی یہی آزمائش ہے؟“

”ہاں بالکل! وہ شاید اس کی ساری تکلیفیں اسی دنیا میں ختم کر دیتا چاہتا ہے۔“

”آئی! کیا ممانے زندگی میں بہت گناہ کیے ہیں؟“

”یہ تمہیں کس نے کہا؟“ آقا کو اس کا یہ سوال قدرے برا لگا۔

”میں نے ممانے سنا تھا اور شفق بھی کچھ ایسا ذکر کر رہی تھی۔“

”وہ بہت ناانسنس ہے۔ ہاں اس نے ناان مسلم سے شادی کر کے گناہ کیا ہے۔ ہمارے مذہب میں یہ جائز نہیں۔“

”کیوں جائز نہیں۔ ایک عورت کسی مرد کو پسند کرے تو وہ اس سے شادی کیوں نہیں کر سکتی۔ شادی کرنے کا حق تو ہر ایک کو ہے کہ وہ اپنی

پسند سے شادی کرے۔ اس میں کیا برائی ہے جب دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہوں۔“ اس کی نظروں کے سامنے نور گھوم گئی جو ایک دوسرے

سے محبت تو کرتے تھے مگر شادی کا ذکر کبھی نہیں چھیڑا تھا۔ وہ خود تو چرچ جو اُن کرنے کی وجہ سے خاموش تھا مگر حالات بدلنے کے بعد بھی نور نے کبھی

اس کا ذکر نہیں کیا تھا اور یہ بات اکثر اسے حیران بھی کرتی تھی۔ شادی کا مقصد نسل انسانی کی بقاء ہے اس لیے فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔

”اسلام جذباتی فیصلوں کے حق میں نہیں۔ یہ محبت کی شادیاں وقتی طور پر تو بہت اچھی لگتی ہیں لیکن یہ آئندہ نسلوں کے لیے بہت خطرناک

ہوتی ہیں جیسے اب تم مختصر رہتے ہو۔ پریشان سوچوں میں گم کہ تمہارا انجو چر رہیجن کیا ہوگا۔ باپ، اولاد اور بیوی دونوں کا قہقہل ہوتا ہے۔ وہ دونوں کو

مجبور کر سکتا ہے کہ وہ اس کے مذہب یا اصولوں پر رہیں اس لیے ہمارے مذہب میں مردوں کو حق ہے کہ وہ اہل کتاب عورتوں سے شادی کر لیں لیکن

پھر بھی بہتر یہی ہے کہ وہ ہم مذہب میں کریں جبکہ عورت کو اس لیے منع کیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلم شوہر کی وجہ سے مجبور ہوگی اور اپنی اولاد کو اپنے عقیدے

کے مطابق نہیں پال سکے گی اور ویسے بھی آج کل کے دور میں جہاں ڈپریشن بہت بڑھ رہا ہے ایسے تصادم بچوں کے ذہنوں کو شدید مضطرب کر دیتے

ہیں اور وہ اکثر نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں۔ ہر مذہب کی اپنی آئیڈیالوجی ہوتی ہے۔ جو ہمارے ہاں حلال ہے ان کے ہاں حرام ہے۔ ایسے تصادم

اذہان کو شدید زک پہنچاتے ہیں اس لیے اللہ نے آغا میں ہی ایسا کرنے سے منع کیا ہے اور اللہ کا کام تو انسان کو پہچانا ہے۔ پورے قرآن کا موضوع

ہی انسان ہے۔ وہ انسان کی مجبور یوں اور نفس کی خواہشوں کو سمجھتا ہے، پھر سمجھاتا ہے، کہیں محبت سے، کہیں ڈانٹ کر، ڈرا کر۔“ آقا نے اسے محبت

سے سمجھایا۔

”ڈانٹ کر کیوں؟“

”کیوں، ممانے نہیں ڈانٹیں جب غصے میں آتی ہیں۔ کیا ان کی ڈانٹ بری لگتی ہے۔“

”نہیں، وہ محبت بھی تو بہت کرتی ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”اللہ ممانے بھی کہیں زیادہ محبت کرتا ہے۔“

”آئی! سب لوگ آپ جیسے کیوں نہیں؟“ وہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔

”اچھا کیونکہ ہمارے بیٹے ولیم جیسے کیوٹ بھی تو نہیں۔“ انہوں نے محبت سے اس کے سر پر چھت ماری۔

”تھیک یو آئی!“

”کس بات کا تھیک یو، اچھا بتاؤ کیا کھاؤ گے۔ میں اپنے بیٹے کے لیے خود پکاؤں گی۔“

”سینڈویچ اور فرنیچ فرائر۔“

”وائے ٹاٹ شیور!“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

”آئی! آپ اپنے بچوں سے بھی ایسے ہی پیار کرتی ہیں۔“

”ہاں بہت زیادہ، تمہارے جتنا۔“

”اور وہ؟“

”وہ بھی بہت زیادہ، میری بیٹی ایسا اسلام آباد میں ڈاکٹر ہے۔ اطہر آری میں کپٹن ہے اور ضیغم ابھی ایف ایس سی میں ہے اور پٹری میں پڑھتا ہے۔ سب لوگ ہم دونوں کو مجھے اور تمہارے انکل کو بہت بہت مس کرتے ہیں۔ ہم سب لوگ فرینڈز کی طرح رہتے ہیں۔ جب وہ گھر آتے ہیں تا تو کبھی سب کرکٹ کھیل رہے ہیں۔ کبھی چس (Chess)، کبھی کیرم، کبھی آؤٹنگ اور قمیص بتاؤں ایٹا نے ایک دفعہ گڑیا کی شادی کی۔ جینوں باپ بیٹا راتی بن کر آئے اور ہم ماں بیٹی نے گڈی کو رخصت کیا۔“ تبسم آپ کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں اور وہ بھی ان کی بات سن کر مسکرانے لگا۔

”آئی! آپ بہت اچھے لوگ ہیں۔“

”تھیک ہے، مان لیتی ہوں اگر تم کہتے ہو۔ ویسے تمہارے انکل تو ہر وقت مذاق ہی اڑاتے رہتے ہیں کہ ہم بہت جھگڑالو لوگ ہیں۔“

”نہیں، وہ مذاق کرتے ہیں۔“ وہ ایک دم ہنستے ہوئے بولا۔

”ہنستے رہا کرو۔ بہت پیارے لگتے ہو۔ میرا ضیغم تمہاری طرح ہی ہنستا ہے۔ میں قمیص ان لوگوں سے ملواؤں گی تو تم بہت خوش ہو گے، وہ

واقعی بہت کیوت ہیں۔“

”آئی کب؟“

”جب وہ آئیں گے۔ اب میں بچن میں جاتی ہوں۔ تم ماما کے پاس چلو۔ آؤ میں ہی لے چلتی ہوں۔“ وہ اس کی وکیل جیئر کو دھکیلتے

ہوئے شہلا کے پاس لے گئیں۔ وہ سو رہی تھی اس لیے وہ اسے داپس اپنے کمرے میں لے آئیں۔

وہ تبسم آئی کے آنے سے بے حد خوش ہو گیا تھا۔ جیسے ہر طرف پھیلی تار کی میں جھنوکے مانند کہیں سے اڑتی ہوئی روشنی آگئی ہو اور اس

نے سارے گھر کو نور کر دیا ہو۔ آئی خوبصورت، دراز قد، ہار وہ درمیانی عمر کی اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت تھیں۔ ساری زندگی آری سیٹ اپ میں گزار

تھی اس لیے ہر بات اور کام بہت منظم طریقے سے کرنے کی عادی تھیں۔ ان کا محبت بھرا شفیق لب دلچہ، ہر مشکل کو لاکھ لینا اور کسی کو بھی ٹینس نہ

ہونے دینا اس کے لیے باعث رحمت بن گیا تھا۔ شہلا بھی ان کے آجانے سے بہت بہتر محسوس کر رہی تھیں۔ وہ کبھی اسے محبت سے سمجھاتیں، کبھی

قرآن پڑھ کر سناتیں تو کبھی اس کی دلجوئی کرتیں۔ حیدر سے وہ ہر صبح یوں محبت سے ملتی تھیں جیسے پھول، خوشبو کا استقبال کرتا ہے۔ وہ سارا پامحبت تھیں

اور اس کے لیے رحمت بنتی جا رہی تھیں۔

وہ چند دنوں میں ہی ان کا اتنا عادی ہوتا جا رہا تھا کہ اپنے دل کی ہر بات ان سے کرنے لگا تھا۔ وہ اپنی ہر سوچ ان سے شیئر کرنے لگا تھا۔ ان سے گفتگو کر کے اسے تسلی ہوتی اور مسرت بھی محسوس ہوتی جو روحانی احساس اور ارتقا کا قائل ایک سال پہلے شروع ہوا تھا، اچانک رک جانے کی وجہ سے وہ شدید بے چارہ اور مضطرب کا شکار ہوا تھا اب پھر عود کر رہا تھا مگر اب اس کا زلزلہ بدل رہا تھا۔ وہ جو ہمیشہ گاؤں اور کرائسٹ کا ذکر کرنا باعث افتخار سمجھتا تھا، عقیدت سے اس کا دل پہنچ جاتا تھا۔ اب اکثر باتوں میں اللہ اور اس کے پرافٹ کا ذکر کرنے لگا۔ گوکہ حضرت محمد ﷺ کہتے ہوئے وہ ہمیشہ تہذیب کا شکار ہوتا لیکن پرافٹ کہنے میں کبھی عار محسوس نہ کرتا۔ صرف ہائیل کو ہمیشہ مقدس اور روحانی کتاب سمجھنے والا اب قرآن کے بارے میں بھی تجسس سے سوال کرتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا سے محبت کا تصور اس کی ذات کو رفتہ رفتہ اعتماد بخش رہا تھا۔ پہلے وہ ہر بات میں خدا سے بہت خوف محسوس کرتا تھا۔ کرائسٹ سے محبت اور خدا سے خوف، انہی دو غلطوں تک اس کی سوچیں محدود تھیں، اب خوف کم اور محبت نے جگہ لے لی تھی۔ اس احساس نے اس کی روح میں ایک دروا کیا تھا۔ ایسا در جس کے اندر نور و طہانیت تھی اور جس نے اس کے وجود کو خوشی اور اطمینان سے بھر دیا تھا۔

”محبت ہر رنگ میں خوبصورت ہے۔ ایک حسین احساس کا نام جو دلوں سے کدورتیں اور نفرتیں مٹاتی ہیں۔ خدا کی طرف سے ایک مرہم..... نہ ہر آلود دلوں کے لیے تریاق کا کام دیتی ہے۔“ تبسم آئنٹی نے محبت کا ایسا ہی حسین احساس اس کے اندر جگایا تھا۔ نور کی محبت تو دل کے ایک گوشے تک محدود تھی جس سے روح سیراب ہوتی تھی۔ اب ایسی محبت پیدا ہو رہی تھی جو عام تھی اور جو وجود کے ساتھ ساتھ پورے ماحول کو بھی مضطر کر رہی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ نور کی غیر موجودگی کو قبول کر رہا تھا۔ پہلے جس طرح مضطرب اور پریشان رہتا، اب صرف مختل رہتا۔ ہر خوبصورت انسان اپنی ذات میں بند موتی کی طرح ہے۔ ہر ایک کے لیے مخصوص چمک اور دلکشی لیے ہوئے۔ وہ نور کو سب کچھ بنانے کے لیے شدت سے مختل تھا۔



تھوڑا سا آسمان (معاشرتی رومانی ناول)

تھوڑا سا آسمان آپ کی پسندیدہ مصنفہ عمیرہ احمد کی ایک نہایت عمدہ تحریر ہے۔ آسمان وہ عروج ہے جس کو پانے کی خواہش ہمیں ہمیشہ بے تاب رکھتی ہے۔ ہم سب کبھی نہ کبھی تھوڑا سا آسمان ضرور تلاش کرتے ہیں۔ اس تلاش میں بہت سے لوگ بہت کچھ کھودیتے ہیں اور بعض دفعہ اس تلاش میں ہم اپنے حیروں کے نیچے موجود زمین کو ٹھوکر مار دیتے ہیں۔ پھر جب آسمان تک پہنچ نہیں پاتے تو واپس زمین پر آنے کی کوشش کرتے ہیں جب بعض دفعہ زمین ہمیں پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں دیتی۔ خوبصورت تحریروں کی خالق عمیرہ احمد کا یہ ناول کتاب گھر کے معاشرتی رومانی ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

شزا، سمیر کو گھر لے کر آئی تو بے چمن ہو گئی۔ وہ ہاپ کے ہارے میں بہت عجیب و غریب سوالات کرتا۔ کبھی شائل کے ہارے میں پوچھتا رہتا۔ شائل کی حالت روز بروز بگڑ رہی تھی۔ اتنے شاکس کے بعد بھی وہ ٹھیک نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے ٹھیک ہونے کے ہارے چانسز ختم ہو چکے تھے۔ شزا اس کو دیکھ کر ہر وقت آہیں بھرتی رہتی۔ اتنی خوبصورت، نرم و نازک، حسین و جواں کانچ کی گڑیا کے مانند کرچی کرچی بکھر چکی تھی اور اب اس کی کرچیاں بھی سیلنا مشکل ہو گیا تھا۔ شزا کی انگلیاں دکھراور روح پھٹتی ہوئی تھی۔ اس کی ساری کوششیں رائیگاں مٹی تھیں۔

”اس کا بھی مل ہے کہ اسے فوٹین ہاؤس بھیج دیں۔“ ڈاکٹر نے مشورہ دیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”کاش وہ مر جائے تو مجھے سکون مل جائے۔ اس طرح کیسے اسے زندہ درگور کر آؤں۔“ اس نے کہا۔

”ہمت نہ ہاریں، حرف آخر خدا ہے جو بے جان سے جاندار تخلیق کرتا ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ آپ پڑامید رہیں اور اس سے دعا کریں۔“ ڈاکٹر نے تسلی دی۔ وہ جانتی تھی یہ محض تسلی ہے۔ اس کا دل کہیں نہیں ٹھہر رہا تھا کیونکہ اس کی ریکوری کے تمام چانسز وہ خود کو زکریا کی تھی یا پھر حالات نے اسے مواقع فراہم نہیں کیے تھے۔

”ڈاکٹر صاحب! میں خود کیسے اسے چھوڑنے جاؤں۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔“ وہ روتے ہوئے ”ٹھیک ہے مسز منصور! میں آپ کی مدد کروں گا اور اسے فوٹین ہاؤس چھوڑ آؤں گا۔“

”نہیں۔“ وہ ایک دم بڑبڑانے لگی۔

”ٹھیک ہے، آپ فیصلہ کر لیں اور پھر مجھے بتا دیجئے گا۔“ وہ بے دلی سے اٹھ کر آ گئی۔ وہ سمیر کو لے کر شائل سے ملنے گئی۔ وہ خاموشی سے لیٹی تھی۔ ان کو دیکھتی رہی پھر اٹھی اور ٹھٹھکا کر بیٹھنے لگی۔

”یہ بندر کہاں سے آ گیا؟“

”میں بندر نہیں ہوں۔“ سمیر غصے سے بولا۔

”سمیر! خاموش ہو جاؤ، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“ شزا نے اسے سمجھایا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سب پاگل ہیں۔ گندے لوگ، ہر وقت لڑتے رہتے ہیں اور یہ کی ماؤں۔۔۔۔۔ مکی، یہ بھی پاگل ہے۔“ وہ اس کا منہ چڑاتے ہوئے بولی۔

”شٹ اپ!“ سمیر ایک دم غصے سے بولا۔

”کس کو شٹ اپ کہا، کس کو؟“ وہ غصے سے سمیر کو زور زور سے تھپڑ مارنے لگی۔ شزا بچانے کی کوشش کرنے لگی تو اس نے اسے بھی زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھا کر گر پڑی مگر وہ سمیر کو مسلسل مارتی رہی۔ کسی طرح رک ہی نہیں رہی تھی۔

”سمیر! تم کمرے سے بھاگو اور نرس کو بلاؤ۔“ شزا نے دونوں کے درمیان آتے ہوئے سمیر سے کہا۔ وہ ایک لمحے کے لیے علیحدہ ہوا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ شزا بھی جلدی سے باہر نکلے اور دروازہ زور سے بند کر دیا۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ ابھی اسے فونٹین ہاؤس ہی چھوڑ آئیں۔ یہ بہت ناقابل برداشت ہو رہی ہے۔“ اس نے قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں ڈاکٹر سے کہا۔

”ٹھیک ہے، آپ کل آ جائیے۔ ابھی تو میں کچھ مصروف ہوں کل چلیں گے۔“ وہ افسردہ سی کمرے سے باہر نکل گئی۔

”مما! شائل کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ تو بالکل پاگل لگتی ہے۔“ سمیر نے حیرانی سے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ اس نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور کانگڑا مہین لپے۔

”مما! بتائیں نا اسے کیا ہو گیا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“

”تو وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ کہیں وہ الیکٹک تو نہیں کر رہی۔“

”نہیں۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

”مما، اس کو اب گھر نہ لانا اور نہ وہ مجھے مارے گی۔ خیر، مجھے کیا ہے۔ میں تو واپس مری چلا جاؤں گا۔“

”نہیں سمیر! اب تم واپس نہیں جاؤ گے۔ میرے پاس رہو گے۔“

”نہیں، مجھے واپس جانا ہے۔ مجھے آپ کے ساتھ رہنا اچھا نہیں لگتا۔“

”کیوں؟“ شیزا کو سخت دچکا لگا۔

”آپ بہت بور لوگ ہیں۔ ہر وقت بڑی، گھر سے اچھا تو ہاٹل ہے۔ وہاں میرے دوست ہیں۔ ہم سب مل کر کھیلتے ہیں اور پڑھتے

ہیں۔ یہاں پر کیا ہے، کچھ بھی نہیں، مجھے آپ کے پاس نہیں رہنا۔“

”پلیز بیٹا! میں آپ کے لیے اب کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”نو ماما! آئی ڈونٹ لرسٹ یو!“ شیزا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ کس قدر صاف گوئی سے اسے آئینہ دکھا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کا منہ

دیکھنے لگی اور کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اس وقت اس سے بحث کرنا اسے مناسب نہ لگا۔

ملک منصور کے بعد اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اس نخواست زدہ گھر سے جلد از جلد دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس نے ایک

فلٹ کرائے پر لے لیا تھا اور وہ سمیر کے ساتھ وہاں شفٹ ہو جانا چاہتی تھی۔ صرف سمیر ہی اس کے پاس باقی بچا تھا اور وہ اسے کسی قیمت پر بھی کھونا

نہیں چاہتی تھی۔ وہ آنے والے دنوں کی تنہائی سے خوفزدہ تھی۔ شائل پہلے ہی جدا ہو رہی تھی اور اب سمیر بھی ایسی باتیں کر رہا تھا۔ زندگی کا حاصل کیا

تھا؟ سب کچھ رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا۔

اگلے دن وہ سمیر کو گھر چھوڑ کر ڈاکٹر کے ساتھ شائل کو فونٹین ہاؤس چھوڑنے گئی تو سارا وقت روتی رہی۔ شائل پہلے تو خاموشی سے ماں کے

ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی پھر ڈاکٹر کو دیکھ کر ایک دم چلانے لگی۔

”میں اس کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہ مجھے مارتا ہے، بہت مارتا ہے۔“ اس نے کچھ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کارڈ رائٹ کرتے ہوئے ڈاکٹر پر حملہ کر دیا۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ میری گاڑی میں آجائیے۔ میں اس کو لے کر جاتی ہوں۔“ شہزاد نے اپنی گاڑی کی چابی پرس میں سے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ وہ گاڑی سے باہر نکل گیا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ اب وہ ایسے مطمئن بیٹھی تھی جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ سیٹ کے ساتھ سر نکا کر باہر دیکھ رہی تھی۔ شہزاد آنکھوں سے مسلسل بہتے اشکوں کو بھی نہیں پونچھ رہی تھی۔ اس لمحے وہ اسے نارمل لگ رہی تھی جیسے موت سے پہلے ہر مریض صحت یاب لگتا ہے۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے اندر داخل ہوئی اور ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگی۔ وہ تھوڑی دیر بعد پہنچ گیا اور انچارج سے ساری بات کی۔ اس کی رپورٹس دکھائیں اور اسے عملے کے حوالے کیا۔ شہزاد باہر نکلنے کو تھی کہ وہ تیزی سے اس کی طرف بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے ساتھ چٹ گئی۔

”میں یہاں نہیں رہوں گی، میں آپ کے ساتھ گھر جاؤں گی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ پلیز مجھے چھوڑ کر مت جائیں۔“ وہ سہم کر چڑیا کی مانند اس کے ساتھ چٹ رہی تھی اور اس کا دل لہوا لہان ہو رہا تھا۔ شہزاد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”حوصلہ کریں مسز منصور!“ ڈاکٹر نے تسلی دینا چاہی۔ ایک نرس اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ شہزاد نے زور سے اسے تھمڑا مارا۔ وہ تپورا کر گر پڑی۔ دو تین لوگ بھاگتے ہوئے آئے اور اسے زبردستی اندر لے کر جانے لگے۔ وہ رو رہی تھی، چلا رہی تھی، چیخ رہی تھی، سسک رہی تھی مگر کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ سب محو تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایک پاگل کردار دنیا کے اسٹیج پر پر فارم کر چکا تھا اور تماشا شائق حیرت سے انسانوں کے اس جم غفیر میں ایک ایٹارل کردار کو دیکھ کر تاسف کر رہے تھے۔ ایک کے بعد ایک اور اسٹیج ایک اور کردار نہ ادا کر سکے وہ دنیا کے لیے مرجاتا ہے اور دنیا کو ایسے کرداروں کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کا خوبصورت مگر بے کار وجود ایک حقیر جھگے کے مانند حالات کے بہاؤ میں بہہ چکا تھا۔ اب کوئی اس کا منتظر نہیں تھا۔ اس کا وجود رفتہ رفتہ زوال پذیر تھا۔ اونچی اونچی دیواروں میں قید، ہراساں، پریشاں حال، منتشر وجود جیسے خزاں رسیدہ درخت کا سوکھا، پتھر پھڑاتا، شکستہ حال، ادھر ادھر سرگرداں پتا۔



مغیث اکل فون پر اپنی بیٹی ایٹا سے بات کر رہے تھے اور وہ صوفے پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ مغیث اکل کا انداز گفتگو بہت محبت بھرا تھا۔ وہ ایٹا کے فون کا سن کر ہی کھل اٹھے تھے۔ اس سے ہر بات پوچھ رہے تھے۔ اس کی صحت، روٹین، کھانے، مریضوں، موسم غرضیکہ وہ کوئی موضوع نہیں چھوڑ رہے تھے۔ دونوں نے گھٹنا بھر باتیں کیں اور وہ حیرت سے پاس بیٹھی سنتی رہی۔ دونوں کی محبت کو قدرے رشک بھری نگاہ سے دیکھتی رہی۔ جس شے سے انسان محروم ہو وہ ہمیشہ اسے چھٹی رہتی ہے۔ اس کے نہ ہونے کا احساس ہمیشہ انسان کو اندر ہی اندر دھکی کر تارہتا ہے۔ پہلے وہ حیدر اکل اور شہلا کی محبت کو حسد بھری نگاہوں سے دیکھتی تھی اور اب مغیث اکل اور ایٹا کو۔

”کیا ہر باپ اپنی بیٹی سے ایسی ہی محبت کرتا ہے؟“ وہ بار بار اپنے آپ سے سوال کر رہی تھی۔ ”ہر باپ نہیں صرف کوئی کوئی یا پھر شاید سب ہی سوائے میرے باپ کے۔“ اس نے سختی سے ہونٹ چبائے اور آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے باہر نکل

گئی۔ مفیث اٹکل کی اس کی طرف پشت تھی اس لیے اسے دیکھ نہ سکے۔ وہ باہر لان میں آگئی اور ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ کافی دیر وہ ادھر ادھر ٹہلتی رہی پھر بیٹ میں بلانے آگیا۔

”ہاجی! کرل صیب کھانے کے لیے بلا رہی ہے۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا تو وہ اندر آگئی۔

”کیا بات ہے بیٹا! آپ کچھ اور اس لگ رہی ہیں۔“ اٹکل مفیث بھی تبسم آنٹی کی طرح بہت شفیق اور مہربان تھے۔ انسانوں کے جھوم میں..... خوبصورت وجود، بیکر محبت.....

”نہیں یونہی، آپ کسی سے بات کر رہے تھے اس لیے میں باہر چلی گئی۔“

”بھئی، وہ میری اینا کا فون تھا۔ دیکھو میں آج ہی اسے مس کر رہا تھا اور اس کا فون آگیا۔ کہہ رہی تھی کہ وہ بھی آج مجھے بہت یاد کر رہی تھی۔“ وہ فرط جذبات سے مسکراتے ہوئے بولے۔

”اینا سے آپ بہت محبت کرتے ہیں؟“

”ہاں، یقیناً ہر باپ اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتا ہے۔“

”کیوں ہر باپ کیوں اپنی بیٹی سے محبت کرتا ہے؟“ اس نے سوال ڈہرایا۔

”فرائض تو اسے الیکٹرا کپلیکس کہتا ہے۔ جنس مخالف کی محبت لیکن ہمارے مذہب میں تو اسے اصول رشتے کے طور پر لیا جاتا ہے۔ باپ اپنی ذات کا عکس اس میں دیکھتا ہے اور شاید یہ قدرتی امر بھی ہے کہ باپ کو قدرتی طور پر بیٹیاں بہت عزیز ہوتی ہیں۔“

”لیکن ہر باپ کو نہیں۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”ہاں یہ بھی ممکن ہے لیکن ایسے باپوں کو صرف بیٹیاں نہیں بیٹے بھی عزیز نہیں ہوتے۔ ان کے اندر خود غرض خواہش ہوتی ہے۔ ایک نارمل باپ دونوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ ابھی تم دیکھنا جیفیم کا بھی فون آئے گا کیونکہ میں آج اسے بھی بہت مس کر رہا ہوں۔ تم کھانا کھاؤ۔ یوں باتوں میں نہ کھو جایا کرو ورنہ تمہاری آنٹی مجھ سے بہت ناراض ہوں گی۔ معلوم ہے جاتے ہوئے بھی اور ہر روز فون کر کے بس یہی کہتی ہتی ہیں مفیث! شفیق کا بہت خیال رکھنا۔ بھئی تم مجھے ان کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچالینا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”اٹکل! کیا آپ آنٹی سے بہت محبت کرتے ہیں؟“

”ہاں بھئی، یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔ شی ازویری ٹائس لیڈی! انھوں نے میرا اور میرے بچوں کا بہت خیال رکھا ہے۔“

”تو کیا صرف آپ اس وجہ سے ان سے محبت کرتے ہیں کہ انھوں نے آپ کا اور آپ کے بچوں کا خیال رکھا۔“ اس نے معنی فیز انداز میں سوال کیا تو وہ چونک گئے اور اس کی طرف قدرے حیرت سے دیکھنے لگے۔

”آپ کیوں ایسا پوچھ رہی ہیں؟“

”کیا ایک مرد صرف عورت سے اس لیے محبت کرتا ہے کہ وہ اس کا اور اس کے بچوں کا خیال رکھتی ہے، ان کی خدمت کرتی ہے۔ ساری

زندگی اسی میں صرف کر دیتی ہے۔ پھر وہ اسے محبت کرتا ہے۔"

"نہیں، وہ اس لیے بھی اس سے محبت کرتا ہے کہ اس کے وجود سے اسے خوشی بھی ملتی ہے۔ سرت اور اطمینان کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے جب وہ باعثِ رحمتِ تصور کی جاتی ہے۔" وہ ذرا سنجیدہ ہو کر بولے اور پانی پیا۔

"اور جو عورت یہ سارے کام نہ کر سکے تو اسے زندگی سے نکال دینا چاہیے۔ اس کی تو پھر زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی تا۔ وہ تو ایک بے کار وجود ہوتی ہے جسے پھینک دینا چاہیے، دھکار دینا چاہیے۔"

"جینا، آپ کیوں اتنا متقی ہو کر سوچتی ہیں؟"

"انگل اشاید میری ماما بھی ایسی تھیں اس لیے انھیں زندگی میں کسی سے بھی محبت نہ مل سکی اور میں بھی ایسی ہی ہوں۔ میرے دل میں کسی کے لیے بھی محبت نہیں۔ کسی ایک انسان کے لیے بھی نہیں۔ شاید میں پوری زندگی کسی سے بھی محبت نہیں کر سکوں گی۔" وہ بے یقینی کے انداز میں بولی۔

"انسان کچھ بھی دُشوک سے نہیں کہہ سکتا۔ اگلے لمحے وہ کیا کرے گا اسے خود بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ انسان اس دنیا کی سب سے زیادہ..... ناقابلِ یقین مخلوق ہے۔ جس کے سارے دعوے کھوکھلے اور بے معنی ہوتے ہیں۔ وہ ہر وقت تغیر و تبدل کا شکار رہتا ہے اس لیے ایسا سوچنا بھی خام خیالی ہے۔ ہم کس سے، کب کہاں اور کیسے ایک دم محبت کرنے لگتے ہیں، ہمیں خود بھی معلوم نہیں ہوتا۔ ویسے بھی محبتوں اور نفرتوں کا سرچشمہ تو دل ہوتا ہے اور دل کب بدل جائے، کسے معلوم؟" وہ نیکیوں سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے۔

"جیسے میں نے کہا تھا۔ مجھے یقین تھا اس کا فون ضرور آئے گا۔" وہ ہنستے ہوئے بولے اور وہ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ حینم سے بھی ایسا کی طرح ہنس نہ سکتی کہ باتیں کر رہے تھے۔ ان کے چہرے سے بے حد ملامت اور اطمینان جھلک رہا تھا اور وہ انھیں دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ رشتے کتنے اصول ہوتے ہیں جب محبتوں کی شیرینی سے گندھے ہوں۔ دنیا کی ہر نعمت سے زیادہ قیمتی اور نایاب.....



نور کے فون نے اسے چونکا دیا۔ اس نے صرف چند منٹوں کی کال کی تھی، وہ بے حد خوش تھی۔ وہ اپنے باپ کا بیٹا ایک گارمنٹس فیکٹری میں انویسٹ کر رہی تھی۔ انور چچا اور وہ کراچی میں ایگریمنٹ پراسائن کرنے کے لیے رک گئے تھے۔ امریکا میں ان کے پارٹنر نے ڈیڈی کی پراپرٹی سیل کر کے انھیں سارا پیسہ بھجوایا تھا اور اب چچا اسے اپنے ایک دیرینہ دوست کے بیٹے شرنیل کے ساتھ بزنس کرنے پر آمادہ کر رہے تھے۔ وہ تو اس بات سے بالکل بے خبر تھی۔ چچا اس کے گارڈین تھے۔ اس کے گھر، بینک بیلنس اور امریکا دالی پراپرٹی اور اس سے متعلقہ سارے معاملات وہی دیکھتے تھے۔ اس نے کبھی بھی اس سلسلے میں ان سے کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اس اچانک بزنس ڈیل پر وہ بوکھلا گئی، انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ ابھی وہ پڑھ رہی ہے۔ تعلیم کے بعد وہ بزنس کرے گی مگر وہ کسی طور مان ہی نہیں رہے تھے اور اچھی طرح کوئی نہیں کرنے لگے کہ تعلیم مکمل ہونے تک اس کا بزنس بالکل سیٹ ہو چکا ہوگا۔ وہ تعلیم بھی جاری رکھے اور بزنس بھی دیکھے۔ وہ مان گئی۔ شرنیل سے ملاقات کے بعد تو وہ واقعی مطمئن ہو گئی۔ اس کی ایک کھی

کی ٹل تھی اور ایک گارمنٹس فیکٹری۔ اس نے بی اے کر رکھا تھا لیکن بزنس میں وہ بہت گھاگ تھا۔ اس کے والد راجیل ایک اعلیٰ ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھے انھوں نے اپنی دینی سچ کر سارا پیسا شرجیل کے بزنس میں لگایا تھا اور اب اس کی ترقی دیکھ کر وہ بزنس مزید پھیلاتا چاہتے تھے۔ شرجیل کے ساتھ ساتھ راجیل کو بھی بزنس کا کریز ہو گیا تھا بلکہ انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران ہی انور چچا کے ساتھ بزنس شروع کر دیا تھا اور دونوں نے تین سال پہلے چھوٹی ملیا۔۔۔۔۔ میں کوئی فیکٹری لگائی۔ بزنس میں نقصان ہوا تو وہ سب کچھ بیچ کر کراچی چلے گئے جہاں بزنس دن دگنی رات چمکنی ترقی کرنے لگا۔ چچا نے نہ جانے کب ان سے ساری بات چیت مکمل کر لی تھی اور اب ایگریمنٹ سائن ہونے والا تھا جب نور نے فون کر کے اسے تفصیلات بتائیں۔

”نور! کیا تم بزنس کر دگی؟“ ولیم نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں بھئی، کیوں نہیں۔ مجھ میں اتنے ٹکس ہیں کہ میں ایک بہت اچھا بزنس چلا سکتی ہوں۔“ وہ بڑا اعتماد لہجے میں بولی۔

”لیکن بزنس کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم یونہی۔۔۔۔۔“

”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں۔“

”بتاؤ نا۔“

”کچھ بھی تو نہیں۔“

”اچھا میں تمہیں بعد میں فون کروں گی۔ ہم لوگ کل آرہے ہیں پھر بہت سی باتیں ہوں گی۔“ اس نے فون بند کر دیا۔ وہ کہیں کھوسا گیا

تھا۔ وہ سارا وقت افسردہ رہا۔ اندر ہی اندر اپنے آپ سے الجھتا رہا۔ اسے صاف محسوس ہو رہا تھا جیسے رفتہ رفتہ نور اس سے دور جارہی تھی اور وہ اپنا وجود بھی کھوتا جا رہا تھا۔ وہ اس کے بغیر ادھورا تھا۔۔۔۔۔ بہت ادھورا۔ وہ تو سانسیں بھی اس کے ساتھ لینے کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ چند روز کے لیے دور گئی ہے اور جلد لوٹ آئے گی مگر اب کراچی بزنس کرنے سے وہ اس سے بہت دور چلی جائے گی۔ اسے شدید رنج ہونے لگا۔

”کیا بات ہے بیٹا! آپ کچھ اس لگ رہے ہو؟“ تبسم آنٹی نے اسے سوچوں میں گم اور پریشان ساد کچھ کر پوچھا۔

”یونہی، کوئی خاص بات نہیں۔“

”کچھ تو ہے، کچھ الجھا الجھے لگ رہے ہو۔“

”نہیں۔“ اسی لمحے شہلا اور اسد گھر میں داخل ہوئے۔ تبسم آنٹی خوشی سے ان کی طرف ٹپکیں اور وہ مایوسی سے اندر لوٹ آیا۔ شہلا اور اسد

کافی دیر شہلا کے پاس بیٹھ رہے اور پھر واپس چلے گئے۔ جانے سے پہلے حیدر کمرے میں داخل ہوئے تو دونوں کو وہاں دیکھ کر چوہے گئے۔

”السلام علیکم پاپا!“ شہلا آگے بڑھ کر سر جھکاتے ہوئے بولی۔

”ولیم السلام! کیسی ہو اور اسد بیٹا تم؟“

”نہیک ہوں انکل!“ وہ بھی تپاک سے ملا۔

”آج ادھر کیسے آنا ہوا؟“ حیدر نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”ہم لوگ آنٹی کو دیکھنے آئے تھے۔“ شہلا نے بستر پر لیٹی شہلا کی طرف دیکھ کر کہا تو حیدر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور معنی خیز انداز میں مسکرا دیے۔ دونوں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلے گئے تو حیدر نے حیرت سے تبسم آپا اور شہلا کی طرف دیکھا۔

”اٹس اے پلیز نٹ چیچ! شہلا بہت بدل گئی ہے۔“ حیدر مسکرا کر بولے۔

”وقت انسان کو بہت بدل دیتا ہے اور جب انسان کو خود کسی بات کا تجربہ ہوتا ہے تو وہ خود بخود بدل جاتا ہے۔“ تبسم آپا نے کہا۔
 ”آپا شفیق کے لیے بھی دعا کریں۔ خدا اسے بھی بدل دے۔ اس کے دل میں میرے لیے بہت غرت ہے۔ حیدر اس کو فون کرو کہ مجھے صرف ایک دفعہ آ کر مل جائے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ معلوم نہیں وہ آتی بھی ہے کہ نہیں۔“ شہلا مایوس کن لہجے میں آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔

”وہ کیوں نہیں آئے گی، میں خود اس سے بات کروں گی بلکہ مفیث کو کہوں گی کہ اسے لے کر آئیں۔“ تبسم آپا نے انھیں تسلی دی۔
 ”حیدر اتم اسے فون کرو۔ تمہاری وہ ہر بات مانتی ہے۔ حیدر سنو! میں مرگئی تا تو ولیم اور شفیق کو تم اپنے پاس رکھنا۔ ان کو کبھی جدا نہ ہونے دینا۔ انھیں میری طرح خار خراہ نہ بننے دینا ورنہ دونوں میری طرح کھرجائیں گے۔ نہ ان کا حال رہے گا نہ مستقبل۔ پلیز حیدر وعدہ کرو۔“ وہ ایک دم بے چینی سے بولیں تو حیدر حیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ انھیں قطعی یقین نہیں تھا کہ وہ یوں اچانک باتیں کرتے ہوئے کس طرف جا نکلیں گی۔
 ”شہلا اتم کیسی باتیں کر رہی ہو؟“

”نہیں حیدر، وعدہ کرو۔۔۔۔۔ پلیز یہ وعدہ تمہارا دینا۔ اس میں تو کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوگی نا۔“

”وہ پہلے بھی تو میرے پاس ہیں نا۔ کیا تمہیں مجھ پر شک ہے۔ کیا میں ان کی دیکھ بھال نہیں کر رہا اور تم جانتی تو ہو میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں؟“ حیدر نے قدرے سنجیدگی سے کہا اور استفہامیہ لگا ہوں سے شہلا کی طرف دیکھا۔

”تبسم آپا گواہ ہیں تاپا ابا مرتے دم تک تمہیں یاد کرتے رہے اور مجھ سے بھی وعدہ لیتے رہے کہ میں زندگی کی آخری سانسوں تک تمہارا خیال رکھوں۔ وہ ہار ہار بھی کہتے تھے کہ تم لوٹ آؤ گی۔ شاید وہ وجدان کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے جب تم تھک کر لوٹو گی تو تمہارے اپنے ہی تمہیں سنبھالیں گے۔“

”ہاں شہلا! آخری لمحوں تک سید صاحب کی زبان پر تمہارا نام تھا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ وہ تم سے کتنی محبت کرتے تھے۔“
 ”واقعی۔۔۔۔۔ اور آپ لوگوں نے مجھے بتایا ہی نہیں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

”شہلا! اہم تو رشتوں کی محبت کو ایک وقتی جذبہ سمجھ کر انھیں بھلانے اور ان کے آثار بھی ختم کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ وہ تو اہل حقیقتوں کے مانند ہمارے دلوں میں اور روحوں میں اچھی طرح طول ہوتے ہیں۔ وقت کی لوانہیں مدھم تو کر سکتی ہے، ختم نہیں کر سکتی۔“
 حیدر نے کہا تو وہ ان کی طرف خاموش نظروں سے دیکھنے لگیں۔ اسے میں لاؤنج میں رکھے فون کی بیل بجی تو آپا اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

”حیدر! کون کہتا ہے کہ میں نے تمہیں اور سید صاحب کو کبھی بھلایا۔ تم تو اس وقت بھی میرے ساتھ تھے جب میں منصور اور پیٹر کی بھئی تھی۔ شاید میں بھی ان رشتوں سے انصاف نہیں کر پائی۔ میں جس طرف قدم بڑھاتی، تم نہ جانے کہاں سے درمیان میں آ جاتے۔ تمہارے ساتھ تو میں نے ہر لمحہ ہر آن سفر کیا ہے۔ تم تو میری روح کا حصہ تھے، ہم تم جدا ہو گئے تو میری روح بھی مضطرب اور منتشر ہو گئی۔ نہ محبت ختم ہوئی اور نہ آثار مٹ سکے۔ میں تو کسی بھی بات میں کامیاب نہیں ہوئی۔ ساری زندگی سرگرداں رہی۔ ناکامیوں کا سفر طے کرتی رہی، بھٹکتی رہی اور لڑتی رہی۔“ وہ چہت پر لپکتے کانوس کو دیکھ کر بولیں۔

”اور یہی کچھ میرے ساتھ ہوتا رہا۔ شہلا! ہم کیسا سفر طے کرتے رہے ہیں۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آتا۔“

”اور میں خارجہ خزاں بنتی گئی۔“ وہ افسردگی سے بولیں۔

”میں ایسا بے شرم، ہوا کا جھوٹا جو کسی کو بار آور نہ کر سکا۔“ وہ بھی آہ بھر کر بولے۔

”زندگی یونہی رائجیاں چلی گئی۔“ شہلا تاسف سے بولیں۔

”شاید یہی لا حاصل کی جستجو اور اس کا شرم ہے۔“ حیدر بولے۔

”مغیث! اسے لے کر ویک اینڈ پر آئیں گے۔“ تبسم آ پامسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ شفق کے بارے میں بتایا اور دونوں کو خاموش اور آنکھوں میں نمی کی دھیر تہوں کو دیکھ کر چمک سی گئیں۔

”یہ تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے۔ پھر ماضی میں کھو گئے تھے؟“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”ہاں شاید“ حیدر بولے۔

”وہ محبت ہی کیا جس میں جدائی کا درد نہ ہو اور اس کی معراج ہی کیا جس میں لا حاصل کی تمنا اور تڑپ نہ ہو۔“ آپا نے کہا تو شہلا نے

چمک کر ان کی طرف دیکھا۔

”چاہے لا حاصل کی تمنا انسان کو ریزہ ریزہ کر دے۔“ شہلا بولیں۔

”ہاں اور معراج تو ہے ہی خدا اور خدا کے سطر میں انسان کے پاس باقی رہتا ہی کیا ہے اور محبت جب عشق کا روپ دھارتی ہے تو اصل میں خدا

کی طرف قدم بڑھاتی ہے۔“ آپا نے دونوں کی طرف دیکھ کر کہا تو دونوں خاموش ہو گئے۔ کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ ہر طرف ایک ایسی خاموشی

تھی جو اپنی زبان میں ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ مفہوم سمجھا رہی تھی اور تینوں محو ہو کر سن رہے تھے، سمجھ رہے تھے مگر کچھ بول نہیں رہے تھے۔

.....

نور کو ایئر پورٹ چھوڑنے سے پہلے شرجیل نے اسے پرہیز کیا تو وہ چمک گئی۔ اس کے تو دہم دگمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ وہ تو خالصتاً

بزنس کی نیت سے وہاں آئی تھی۔ اس نے حیرت سے شرجیل کی طرف دیکھا۔

”اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟ ہمارے بزرگ بھی تو یہ چاہتے ہیں۔“ شرجیل نے اس کو اس قدر تمہید دیکھ کر کہا۔

”کون؟“

”میرے ڈیڈی اور آپ کے اگلے۔“

”لو آئی سی! تو اس لیے چچا نے یہ سارا جال بنا تھا۔“ وہ بری طرح ان کے زعمے میں آئی تھی۔ ایگریمنٹ سائن ہو چکا تھا۔ وہ اور شرجیل فنی پر سنٹ شیئر کے بزنس پارٹنر تھے اور جانے سے پہلے انھوں نے اس سے کسی قسم کا ذکر کیے بغیر ہی اس کے دشمن کی بات شرجیل کے ڈیڈی سے کر دی تھی۔

”آپ اس قدر حیران کیوں ہو رہی ہیں؟“ شرجیل نے پھر پوچھا۔

”مجھے حیرانی آپ پر نہیں بلکہ اپنے چچا پر ہو رہی ہے۔ انھوں نے مجھے کس طرح ٹریپ کرنا چاہا ہے۔“

”انھوں نے کوئی جال تو نہیں بچھایا؟“

”بچھایا ہے نظر نہ آنے والا۔ بہر حال اگر میں اس رشتے سے انکار کر دوں تو کیا آپ بزنس میں میری مدد نہیں کریں گے۔“

”کیوں نہیں، بزنس تو ہم کسی سے بھی کر سکتے ہیں۔ دیکھئے آئے نور! میرے لیے بے شمار پروپوزٹرز ہیں۔ میں کسی بھی لڑکی کی ہر ڈیمانڈ

پوری کر سکتا ہوں لیکن مجھے آپ بے حد پسند آتی ہیں۔“

”تھینک یو لیکن جہاں آپ کے بے شمار پروپوزٹرز ہیں، میرا ایک بھی نہیں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”تو پھر انکار کی وجہ؟“

”میری کسی سے کمینٹ ہے..... اگر آپ کی کسی سے کمینٹ ہو تو کیا آپ اسے میرے لیے چھوڑنا پسند کریں گے۔“ آئے نور نے اس

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

سے پوچھا۔

”ہرگز نہیں۔“

”بس میرا بھی یہی مسئلہ ہے۔ میں کس طرح اسے چھوڑ دوں جس سے میں نے آخری سانس تک ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا ہے۔ آئی

ہو پ! ایڈونٹ مائنڈاٹ!“

”نور ایٹ آل! ابھی بات ہے آپ نے حقیقت بتادی لیکن بزنس کے لیے مجھ سے ان ٹچ رہے۔ ہم اچھے پارٹنرز کی طرح ایک دوسرے

کو اسسٹ کرتے رہیں گے بلکہ جب آپ لاہور میں اپنی کارمشین فیکٹری کا افتتاح کریں تو مجھے ضرور انوائٹ کیجئے گا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”تھینک یو بری ٹچ! پلیز ان تمام باتوں کا ذکر اگلے سے نہ کریں۔ خود ہی اپنے ڈیڈی کو منع کر دیں۔“

”رائٹ، اب چلیں!“

انور چچا اور اس کے ڈیڈی لان میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ان دونوں کو باہر نکلا دیکھ کر ان کی طرف آئے۔

”اچھا ابھی راجیل! اب میں چلتا ہوں۔ مجھے اس بات کا جلدی جواب دینا۔“ چچا نے معنی خیز انداز میں شرجیل کے ڈیڈی سے کہا۔

”ہاں ہاں، تم بے فکر رہو۔ ہماری طرف سے ہاں ہی سمجھو۔“ وہ مطمئن لہجے میں بولے۔ نور اور شرجیل نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا

اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ لاہور آنے تک چچا اور اس میں کوئی بات نہ ہوئی البتہ چچا بہت خوش تھے اور اسے ان کی اس حرکت پر بے حد فیسوس ہوا تھا۔
”کیا بات ہے نور بیٹا! تم خوش نہیں؟“

”کس بات پر؟“

”بھئی تم اپنا بزنس شروع کرنے جا رہی ہو اور سنو! شرجیل اچھا لڑکا ہے۔ میں نے راجیل سے تمہارے سلسلے میں بات کی ہے۔ میرا خیال ہے شرجیل بھی تمہیں پسند کرنے لگا ہے۔“

”خدا کے لیے انکل! آپ کن باتوں میں پڑ گئے ہیں۔ ہم یہاں بزنس کے سلسلے میں آئے تھے کہ رشتے دار یاں کرنے۔ ویسے بھی فی الحال میرا شادی کا کوئی موڈ نہیں۔ ابھی تو میری اسٹڈیز بھی کمپلیٹ نہیں ہوئی۔“ وہ قدرے خفگی سے بولی۔

”لیکن مجھے تو اس انکار کے پیچھے کوئی اور بات لگ رہی ہے۔“ وہ اپنے مخصوص جاسوسانہ سٹائل میں بولے۔

”ایک تو آپ ہر وقت ہر بات کی جاسوسی نہ کرتے رہا کریں۔“

”لیکن جب بات ہی ایسی ہو تو جاسوسی کرنا پڑتی ہے اور سنو! تمہارے دماغ میں ولیم کا جو خیال ہے نا وہ نکال دو۔ ہم تمہاری شادی ہرگز کسی کرکچن سے نہیں ہونے دیں گے اور ویسے بھی تم اس کے آگے کوئی ہے اور نہ پیچھے۔ نہ جانے کس کی اولاد ہے اور...“

”پلیز انکل! احمہ سے مت گزر جایا کریں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے لیے کیا بہتر ہے۔ میں نان سنس نہیں ہوں اور اپنی شادی کا فیصلہ بھی میں خود ہی کروں گی۔“ وہ حتیٰ لہجہ میں بولی۔

”لیکن ایسا بالکل نہیں ہوگا جو تم چاہتی ہو۔“ وہ بھی غصے سے بولے جو اب وہ خاموش ہو گئی اور ان کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ گھر آ کر بھی وہ بہت خاموش تھی۔ چچی اسے مبارک باد دے رہی تھیں اور اسے قطعی کوئی خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ چچا بھی کوئی خاص رتی ایکٹ نہیں کر رہے تھے۔

اگلے دن وہ ولیم سے ملے گئی تو گھر کا بدلا بدلا ہر سکون ماحول دیکھ کر اسے قدرے حیرت ہوئی۔ ولیم بہت تارل انداز میں مسکراتا ہوا ملا۔ اس کی ماما بھی قدرے سکون سی سو رہی تھیں۔ ان کے علاوہ گھر پر کوئی نہ تھا۔

”ولیم! میں آج کچھ خاص بات یہاں محسوس کر رہی ہوں۔“

”کیا؟“ ولیم مسکراتا ہوا۔

”گھر کی فضا قدرے بہتر اور خوشگوار لگ رہی ہے اور تم بھی منہ بھلائے بھلائے نہیں پھر رہے۔ لگتا ہے یہاں کچھ چیخ آیا ہے۔“

”میں تمہارے آنے سے بے حد خوش ہو رہا ہوں اس لیے تمہیں ایسا لگ رہا ہے۔“

”لیکن اس میں اتنی خوشی کی کیا بات ہے۔ مجھے واپس تو آنا ہی تھا۔ بات کچھ اور ہی ہے۔“

”کچھ بھی نہیں، تم سناؤ بزنس کا کیا بنا؟“

”ہاں سب کچھ سیشنل ہو گیا ہے۔ بہت جلد ہم یہاں کام شروع کر دیں گے۔“

”ہم کون؟“

”میں اور شرجیل۔“ وہ قدرے بے خیالی میں بولی۔

”کون شرجیل؟“

”میرا بزنس پارٹنر۔“

”او آئی سی!“ وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

”افواہ ایک تو تم لوگ بھی بڑے جلیس ہوتے ہو۔ جیسے ہی کسی دوسرے لڑکے کا ذکر کرو، اسی کو میکسٹ میں دیکھنا شروع کر دیتے ہو۔ وہ

صرف میرا بزنس پارٹنر ہے اور کچھ نہیں۔“ وہ حتیٰ لچھ میں بولی۔

”آئی ایم سوری اتم نے ایسا محسوس کیا۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔“

”تمہارا جو بھی مطلب تھا وہ مجھے تمہارے لچھ سے ہی پتا چل گیا ہے۔ خیر تم سناؤ کیسی طبیعت رہی اور انکل حیدر کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں۔“

”اور آنٹی کیسی ہیں۔ ابھی سو رہی ہیں اس لیے بات نہیں ہو سکی لیکن چہرے سے وہ بھی بے سکون لگ رہی ہیں۔“

”آ خر تم جانتا کیا چاہتی ہو۔ ہم مطمئن اچھے نہیں لگ رہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”بہت اچھے لگ رہے ہو۔ اس راز کو جانتا چاہتی ہوں۔“ اسی لمحے تبسم آنٹی اور شہلا اسد لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ وہ مارکیٹ سے کچھ

شاپنگ کر کے لوٹی تھیں اور دونوں کی بات پر ہنس رہی تھیں۔

”یہ باہر شور کیسا ہے؟“ نور نے جلدی سے ولیم کے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھنا چاہا۔

”رہنے دو وہ ابھی ادھر ہی آ جاتی ہیں۔“

”کم آن ولیم! کون ہیں یہ لوگ؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہیلو ولیم! کیسے ہو؟“ شہلا اسد مسکرا کر اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

”بیٹا! کوئی پراہم تو نہیں ہوئی۔“ تبسم آنٹی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں بلو! گئی تھی۔“ اس نے نور کی طرف اشارہ کیا۔

”نور! تم جو بات پوچھ رہی تھیں اس کی وجہ تبسم آنٹی ہیں۔ یہ شہلا ہاجی ہیں اور یہ نور ہے۔ میری کلاس فیلو اور فرینڈ بھی۔“ ولیم نے تعارف

کر دیا تو سب نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر مسکرانے لگے۔

”ہیلو بیٹا! کیسی ہیں آپ؟“ تبسم آنٹی نے اسے محبت سے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ نور کو ان کا یہ محبت بھرا انداز بہت اچھا لگا اور وہ مسکرا کر

ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”اچھا بھئی تم لوگ ہاتھیں کرو۔ ہم لوگ تمہاری ماما کے پاس جا رہے ہیں اور افضل کو میں کہتی ہوں۔ تم لوگوں کو چائے! دھری پتھارے۔“
 ”نہیں! آئی! ہم سب لوگ آج آئی کے پاس ہی چائے پئیں گے۔“ نور نے کہا تو وہ مسکرا دیں۔

”وائے! ٹاٹ شہور! میں پھر آپ لوگوں کو بلاتی ہوں ابھی آپ ہاتھیں کرو۔“ دونوں مسکراتے ہوئے ہاں ہل گئیں۔
 ”ولیم! یہ کون ہیں۔ شی ازجی! آٹکس لیڈی۔“

”یہ ماما کی بہن اور میری آئی ہیں اور شہلا ہاجی حیدر انکل کی بیٹی ہیں۔“
 ”زبردست! یہ ایک متاثر کن شخصیت کی مالک ہیں۔“

”وہ بھی بہت اچھی ہیں مگر جسم آئی سب سے اچھی ہیں۔ پشاور سے آئی ہیں۔ جب ان کو ہاتھ چلا کہ ماما پتھار ہیں ماما دن آ گئیں۔“
 ”ان کو پہلے کسی نے نہیں بتایا تھا؟“ نور نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں، یہ تو شفق نے جا کر بتایا تھا۔“
 ”کون شفق؟“

”میری اسٹیپ سسٹر۔“

”ولیم! یہ سب کیا ہے۔ میرے جانے کی دیر تھی۔۔۔۔۔ اتنے زیادہ انکشافات ہو رہے ہیں۔ یہ تمہاری اسٹیپ سسٹر کہاں سے آ گئی؟“
 ”بس آ گئی ہے لیکن وہ ہر ایک سے ناراض ہے۔“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
 www.pdfbooksfree.pk

”کیوں، کیا وہ بہت خشک حراج ہیں؟“
 ”نہیں، وہ بہت پریشان ہے۔ چھوڑو اس بات کو۔ تم اچانک کیوں چلی گئی تھیں، تمہارے یوں اچانک چلے جانے کی وجہ سے میں بہت
 اپ سیٹ ہو گیا تھا۔“

”ہاں میں جانتی تھی لیکن سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ مجھے بھی کچھ سمجھ نہیں آیا۔ انکل نے بہت برا گیم کھیلا ہے۔“
 ”کون، وہی جاسوس انکل؟“

”ہاں۔“

”کیا کیا؟“ اسی لمحے افضل انہیں بلانے آ گیا اور وہ اس کی وکیل چیر دھکیلتے ہوئے ماما کے کمرے میں لے گئی۔ شہلا، نور کو یوں اچانک
 دیکھ کر کھل اٹھیں۔

”نور بیٹا! تم کب آئیں؟“ وہ اسے لیٹے لیٹے پیار کرتے ہوئے بولیں۔

”کل رات کو اور آپ کیسی ہیں؟“

”تمہیک ہوں۔ آپا! اس بچی نے ہماری بہت خدمت کی ہے۔ میں ہاسٹل سے اس کے گھر میں شفٹ ہوئی اور پھر یہی مجھے ولیم کے ساتھ

اسپتال بھی لے کر جاتی تھی۔ میرا بہت خیال رکھتی رہی ہے۔ کپڑے پہنچ کر داتی، میڈیسن کھلاتی۔" وہ آہستہ آہستہ انھیں بتا رہی تھیں اور تبسم آپا معترف انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"تھینک یو بیٹا! آپ نے میری بہن کا اتنا خیال رکھا۔" تبسم آنٹی نے محبت سے کہا تو وہ مسکرا دی اور اٹھ کر سب کے لیے چائے بنانے لگی۔

"مما! نور لاہور میں گارمنٹس فیکٹری شروع کرنے لگی ہے۔" ولیم نے ماں کو بتایا۔

"واؤ! زبردست! ابھی تو آپ اسٹوڈنٹ لگتی ہیں۔ بزنس بھی شروع کر لیا۔" اب کی بار شہلا اسد بولی۔

"ہاں! بس حالات ہی ایسے ہو گئے سب کچھ خود بخود ہو گیا۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ سب کو چائے دے کر فارغ ہوئی تھی

کہ حیدر کی گاڑی بھی پورچ میں داخل ہوئی۔ اس کا ہارن سن کر وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

"حیدر اٹکل آ گئے۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بولی تو شہلا اسد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ حیدر کمرے میں آ چکے تھے۔

کمرے میں اتنی گہما گہمی دیکھ کر وہ مسکرا دیے۔

"ارے بھئی نور بیٹا! آپ کب آئیں۔ آپ نے تو ہمیں اداں کر دیا تھا۔" وہ سامنے بیٹھی نور کو دیکھ کر بے ساختہ بولے۔

"اٹکل! میں بھی آپ کو بہت مس کرتی رہی۔" وہ حیدر کے آگے سر جھکاتے ہوئے بولی انھوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

حیدر، شہلا کو نہیں دیکھ سکے۔ ایک دم شہلا کو یہ سب بہت برا لگا اگلے ہی لمحے اس نے اپنے آپ کو تارل کرنے کی کوشش کی۔

"شہلا! تم کب آئیں۔ آج تو سب لوگ کسی خاص موڈ میں لگ رہے ہیں۔" وہ شہلا کے قریب جا کر بولے اور اسے بھی پیار دیا۔

"میں نے تبسم بھیسو کے ساتھ مارکیٹ جانا تھا، ابھی آئی ہوں۔" وہ اپنے لہجے میں چھپی خفگی کو چھپانہ سکی۔

"نور! میری بیٹی سے ملی ہو۔"

"جی اٹکل! شی! از لٹلک ویری ہائس ایڈگر لیس فل!" وہ چپکتے ہوئے بولی تو شہلا نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"شہلا! نور بہت اسٹرونگ لڑکی ہے۔ اس کے پیرٹنس نہیں ہیں لیکن بہت ہمت سے ہر کام کرتی ہے اور بہت ذہین بھی ہے۔" ولیم سے

زیادہ حیدر نے چستے ہوئے کہا تو ولیم کے منہ بنانے پر سب کھلکھلا کر ہنس دیے۔

"شہلا! اسد نہیں آیا؟" حیدر نے اس کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"وہ رات کو نو بجے لینے آئیں گے۔"

"حیدر! آج دیک ایڈ ہے۔ رات کو ہمارے بچے مفیٹ کی فلائٹ بھی ہے۔ وہ اور شفق آ رہے ہیں۔ ان کو ایئر پورٹ لینے جانا ہے۔" تبسم

آنٹی نے حیدر اٹکل کو بتایا تو ولیم کا دل لرز سا گیا۔ اسے شفق کے نام سے ہی ڈر لگنے لگتا تھا۔ اس نے خوفزدہ لگا ہوں سے تبسم آنٹی اور نور کی طرف اور

پھر ماما کی طرف دیکھا۔ صرف ماما اس کی لگا ہوں کا مطلب جان سکیں کیونکہ وہ بھی جانتی تھیں کہ شفق کے آنے کے بعد دونوں کو کس قسم کی صورت حال کا

سامنا کرنا پڑے گا۔

”ٹھیک ہے لیکن کیا آپ نہیں چلیں گی؟“ حیدر نے تبسم آپا سے پوچھا۔

”شہلا اکیلی ہوگی۔“ آپا نے ان کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

”نہیں، ولیم میرے پاس ہوگا۔ آپ چلی جائیے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ آپا نے کہا۔ ولیم وہیل جیسے کوآہستہ سے چلاتے ہوئے باہر جانے لگا تو نور جلدی سے آگے بڑھی اور اسے لے کر اس کے کمرے میں چلی گئی۔

”ولیم! کیا بات ہے تم ایک دم کیوں اپ سیٹ ہو گئے؟“

”نور! مجھے شفق کی فضا بھری لگا ہے اور لہجہ یاد آتا ہے تو بہت ڈر لگنے لگتا ہے۔ نہ جانے وہ مجھ سے کیوں اتنی خائف ہے؟“ ولیم کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

”تم اس قدر کیوں خوفزدہ ہو رہے ہو، کچھ نہیں ہوگا۔“ نور نے اسے تسلی دی۔



”انگل! میں ماما کے پاس نہیں جاؤں گی۔ آپ مجھے ڈینٹس والے گھر..... چھوڑ دیں۔“ شفق گاڑی میں ہی حیدر سے ضد کر رہی تھی۔ تبسم آپا اور کرل مغیٹ دونوں ہی اس کو مسلسل سمجھا رہے تھے مگر وہ کسی کی نہیں سن رہی تھی۔

”ٹھیک ہے حیدر بھائی! اس کو وہیں چھوڑ دیتے ہیں۔“ مغیٹ انگل ایک دم بولے۔

”بیٹا! آپ کیوں ایسا کر رہی ہیں۔ سب بڑے سمجھا رہے ہیں اور آپ ہیں کاپنی بات پھاڑی ہوئی ہیں۔“ حیدر نے اسے مزید سمجھانا چاہا۔

”انگل! میں جب بھی ان کے سامنے جاتی ہوں، بدتمیزی کرتی ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت ان کی حالت بہت خراب ہے اور مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے لیکن میں اپنے آپ پر کنٹرول نہیں رکھ سکتی۔“ وہ صاف گوئی سے بولی تو سب خاموش ہو گئے۔

”لیکن وہ اس وقت تمہاری منتظر ہے شفق بیٹا! ہم جا کر اسے کیا کہیں گے؟“ تبسم نے اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”آئی! میں کچھ نہیں جانتی۔ جو حقیقت ہے میں نے آپ کو بتا دی ہے۔ بس میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ حیدر نے اسے گھر ڈراپ کیا اور ہاتی سب لوگ گلبرگ چلے گئے۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ شہلا ابھی تک منتظر لگا ہوں سے اس کا شدت سے انتظار کر رہی تھیں لیکن ان سب کے ساتھ اسے نہ پا کر وہ پریشان ہی ہو گئیں۔

”شفق کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آئی؟“ شہلا نے بے تابانی سے پوچھا۔

”وہ ڈینٹس والے گھر میں ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ہم سامان رکھنے وہاں گئے تو وہ ادھر ہی رک گئی بکل آ جائے گی۔“ حیدر نے

آہستہ سے کہا۔

”نہیں، وہ نہیں آئے گی۔ وہ بڑی خدی ہے۔ وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔“ آنسان کی آنکھوں سے بہہ کر ٹپک بھگونے لگے۔
”ہمت کر دھملا! کیا ہو گیا ہے؟“ تبسم آپا نے سمجھانا چاہا۔

”مغیث بھائی سے تو ملو۔“ حیدر نے توجہ ہٹانے کے لیے کہا تو انھوں نے ان کی طرف دیکھا اور مسکرا دیں۔

”کیسی ہیں آپ؟“ کرل مغیث نے خوش کن لہجے میں پوچھا۔

”ٹھیک ہوں، بس آخری سانس کا انتظار کر رہی ہوں۔ نہ جانے وہ بھی کیوں نہیں آ رہی؟“ وہ مایوس کن انداز میں بولیں۔

”بری بات! ایسی باتیں نہیں کرتے۔ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔“ کرل مغیث نے کہا۔

”خدا کی رحمت میری دفعہ نہ جانے کہاں چلی جاتی ہے۔ مغیث بھائی! میں تو ہمیشہ اس کی رحمت کی بے خطر رہی اور وہ کبھی بھی میری مہمت

پر نہ بری ساری زندگی میں ایک دفعہ بھی نہیں۔ مجھے تو بس سزا نہیں ہی ملی ہیں۔“ وہ بے حد شکستہ لہجے میں بولیں تو سب لوگ پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

”شہلا! پلیز دل چھوٹا نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ذرا مغیث کو کھانا دے دوں پھر ہم سب ادھر ہی آتے ہیں۔ تمہیں کچھ چاہیے تو

نہیں۔“ تبسم آپا نے صورت حال کے پیش نظر کہا۔

”نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولیں سب لوگ باہر نکل گئے۔

”مغیث! کیا آپ نے اس کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی؟“ تبسم نے کرل مغیث کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے کہا۔

”تبسم! اس کا ذہن بے حد متحرک ہے۔ وہ ایسے سوال کرتی ہے کہ بعض اوقات میں خود بھی دنگ رہ گیا اور جو شخص ذہنی طور پر اتنا مستعد ہو

اس کو سمجھانا بے حد مشکل کام ہے بہ نسبت اس شخص کے جو اتنا ہاشور نہ ہو اور تم جانتی ہو انسان جتنا زیادہ ہاشور ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ سوچتا ہے اور

جتنا زیادہ وہ سوچتا ہے اتنا ہی زیادہ ڈپر پریژر ہوتا ہے۔ اس کو کنوینس کرنا اور اسے اپنے موقف سے ہٹانا شاید دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ وہ واقعی

ذہنی طور پر بہت پریشان ہے۔“ کرل مغیث نے سالن پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”جن بچوں کی زندگی ایسے ماحول میں گزری ہو ان کی سوچ بھی تو ویسی ہی ہوگی۔ یقین کریں آپا میں نے اسے کبھی مسکراتے کرتے

ہوئے اور ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہر وقت پریشان رہتی ہے۔“ اب کی بار حیدر نے کہا تو کرل مغیث نے بھی تائید کی۔

”وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن اب کیا کرنا چاہیے؟“ تبسم آپا فکر مندی سے بولیں۔

”میں خود پریشان ہو گیا ہوں۔ شہلا شدید پریشان ہے اور وہ کسی طور مانتی ہی نہیں۔ میں تو خود سخت الجھن میں ہوں۔“ حیدر بھی فکر مندی

سے بولے۔ ”آپا! کیا ولیم نے کھانا کھا لیا ہے؟“ حیدر نے ایک دم پوچھا۔

”ولیم کون؟“ کرل مغیث نے گہری استغما مہلکا ہوں سے پوچھا۔

”وہ شہلا کا بیٹا ہے۔ وہ بھی شدید ٹینشن میں تھا۔ شکر ہے میرے سمجھانے سے کچھ بہتر ہوا ہے۔ وہ لوگوں کے رویوں سے خائف تھا، اب

بہر ہے۔" آپا نے بتایا۔

"شفق، آفاق کو نہیں بھولتی۔" حیدر بولے۔

"اور آپ نے بھی تو ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اس سارے جھگڑے میں تو اولاد ہی ہستی ہے نا۔ زیادہ تو انھوں نے ہی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ شفق میں اتنا رٹتی بہت بڑھ گئی ہے۔" تبسم آپا تاسف سے بولیں۔

"اب میرے لیے کیا حکم ہے۔ میں کل شام کو واپس جا رہا ہوں۔" کرل مغیث نے کہا۔

"ٹھیک ہے، آپ چلے جائیں۔ شہلا کی حالت خاصی خراب ہے۔ میں کچھ روز بعد آ جاؤں گی۔" تبسم آپا نے کہا۔

"رائٹ اب میں کچھ آرام کر لوں۔ مجھے کمراد کھادو۔" کرل مغیث ایک سائیڈ پر نگے واپس میں ہاتھ دھوتے ہوئے بولے۔

"آپا انھیں ولیم کے ساتھ والے کمرے میں لے گئیں اور حیدر اوپر کمرے میں چلے گئے۔ شہلا بے چین اور مضطرب سی بستر پر تڑپتی، سکتی اور آہیں بھرتی رہیں مگر سب کچھ بے معنی لگ رہا تھا۔



نورخت پریشان تھی۔ نور چچا نے اس کا گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا۔ گوکہ وہ ان کے ایسے احکامات کو کم ہی خاطر میں لاتی تھی مگر اب کی بار تو وہ نہ جانے کیوں خامے سخت ہو رہے تھے۔ ہر وقت اس کے کمرے کے باہر بیٹھ کر اخبار پڑھتے رہتے۔ گھر سے بھی کم نکلتے اور وہ ان سے کسی بھی قسم کی بحث میں پڑ کر گھر میں ٹینشن پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"راہیل مجھ سے رشتے کا پوچھ رہا ہے۔ پولو میں کیا جواب دوں۔ میں نے بس کل تک کا وقت مانگا ہے۔" وہ قدرے غصے سے اس کے کمرے میں آ کر بولے تو وہ چونک گئی۔ اس سلسلے میں اس میں اور شرجیل میں کمنٹ ہو چکی تھی اب وہ کیوں ایسا کہہ رہے تھے۔ وہ سخت الجھن میں تھی۔ اس نے شرجیل سے رابطہ کرنا چاہا تو اس سے بھی بات نہ ہو سکی۔ اس نے ولیم کا نمبر ملایا۔ وہ اس وقت سو رہا تھا۔ اس نے فینڈ میں ہی فون اٹھایا۔

"پولو نور! کیا بات ہے۔ پریشان لگ رہی ہو؟" ولیم نے اسے قدرے گھبرائے ہوئے محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"ولیم! حیدر بالکل کہاں ہیں، میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"مگر بتاؤ تو سہی، آخر کس لیے اور نور تم جیسی لڑکی پریشان ہو، میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔" ولیم نے حیرانی سے کہا۔

"کیوں، میں انسان نہیں اور جب صورت حال ایسی ہو کہ قدموں تلے زمین بھی گردش میں آ جائے تو انسان بھاگ کر کہاں جائے۔ اس وقت میں بھی ایسی ہی چھوٹن فیس کر رہی ہوں۔"

"آخر ہوا کیا ہے؟"

"انور چچا خوا خواہ میں میرا رشتہ شرجیل کے ساتھ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک سا گیا۔

”مجھے قطعی علم نہیں کہ ان کی اس بزنس ڈیل کے پیچھے کیا پلاننگ ہے۔ شرجیل اچھا انسان ہے اور اس سے میری اس سلسلے میں بات بھی ہوئی ہے لیکن شرجیل کے ڈیڑی اور انور چچا تو بس میری جان کو ہی آگئے ہیں۔ ہر صورت میں یہ رشتہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ کاروبار کے ساتھ ساتھ رشتہ بھی ایسا مضبوط ہو کہ ٹوٹنے کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکے۔“

”اور نور تم کیا چاہتی ہو؟“ وہ آہستہ سے بولا۔

”ظاہر ہے میرے اٹکار کی وجہ سے ہی وہ مجھ پر سختی کر رہے ہیں؟“

”تو تم وہ گھر ہی کیوں نہیں چھوڑ دیتیں؟“

”کم آن ولیم! دنیا میں صرف اور صرف یہی میرے رشتے دار ہیں۔ ان کے بغیر میں ادھوری ہوں۔ میری کہیں بھی کوئی پہچان نہیں اور نہ

ہی کوئی اور مجھے قبول کرے گا۔ میں اس حقیقت کو جھٹکا نہیں سکتی۔“

”اور نور، دل کے رشتے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”نہیں ولیم! دل کے رشتے انسان کو کوئی شناخت نہیں دے سکتے اور نہ ہی کسی کو سوشل کرائس سے بچا سکتے ہیں۔ یہ تو ایک شخص کے وجود اور

اس کی روح تک محدود رہتے ہیں۔ دنیا کی نظر میں تو یہ بے نام رشتہ ہوتا ہے اور جس کا اپنا کوئی نام نہ ہو، دنیا اس سے ساری پہچان چھین لیتی ہے۔ یہ تو

ادھرے رشتے ہوتے ہیں۔“ وہ بہت سنجیدگی سے بولی۔

”تو کیا تم اور میں؟“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”معلوم نہیں۔“ وہ آہ بھر کر بولی۔

”نور! تم نے تو زندگی کی آخری سانس تک وعدہ مہمانے کو کہا ہے۔“

”ہاں اور میں یہ پورا کر کے رہوں گی بشرطیکہ.....“

”بشرطیکہ کیا.....؟“

”خدا ساتھ ہو، میں نے تم سے حب بھی کہا تھا۔ وہ اگر ساتھ نہ دے اور کائنات کی ساری قوتیں بھی مل کر میری مدد کریں تو میں کچھ نہیں کر

سکوں گی۔“

”نور! خدا کیوں ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔ وہ..... وہ تو ہم سب سے محبت کرتا ہے۔“

”لیکن ولیم! خدا سے کچھ طلب کرنے کے لیے پہلے اپنا تعارف بھی تو کروانا پڑتا ہے نا۔“

”کیا مطلب..... کیا میرا انسان ہونا کافی نہیں۔“

”نہیں، انسان تو اس نے بہت سے پیدا کیے ہیں مگر بہتوں پر غضب ناک بھی ہوتا ہے۔ کسی کی طرف تو دیکھتا بھی نہیں اور کسی پر اپنی محبتیں

اور رحمتیں نچھاور کرنا جاتا ہے۔ ہمیں خود تو تعین کرنا چاہیے ہم کس کھٹکری سے تعلق رکھتے ہیں۔“ وہ بلاواسطہ انداز میں سمجھا رہی تھی۔

”کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ مجھے بحیثیت کرکچن کہیں بھی قبول نہیں کیا جائے گا؟“

”ولیم! جو تم نہیں ہو وہ تم کیوں دنیا کے سامنے بن رہے ہو۔ تم تو کرکچن بھی نہیں۔“

”اور اگر کرکچن ہوتا تو ہائی لوگوں کی طرح تمہارے گمردائے بھی مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے۔“ اس کے لہجے میں شکستگی سی پیدا ہو گئی۔

”نفرت کی نہیں بلکہ حیرت کی نگاہ سے۔ ولیم! تم سمجھ کیوں نہیں رہے۔“

”آخر جو تم مجھے سمجھانا چاہتی ہو صاف صاف کیوں نہیں کہتیں۔“

”بے وقوف تم بھی نہیں۔“

”آج تمہارے گمردائے میرے نان مسلم ہونے پر اعتراض کر رہے ہیں۔ کل میرے معذور ہونے پر کریں گے۔ نور اس سوسائٹی کے

پائینٹ آف ویو سے میں کسی بھی طرح تمہارے قابل نہیں۔ آئی ایم ریجیکٹڈ بائے آل..... ہر کوئی مجھ سے نفرت کرتا ہے..... ہر کوئی مجھے یوں دیکھتا

ہے جیسے میں بہت ہی گنہگار، ناپاک انسان ہوں۔ سب لوگ اتنے تنگ دل کیوں ہیں؟“

”اکیس بات نہیں، تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”مذہب..... مذہب..... سب لوگ مذہب کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں۔ بس تم لوگوں کا ہی خدا اور رسول ہے باقی کسی کا نہیں۔ تم لوگ

دیوانے ہو چکے ہو۔“ ولیم کی آواز غصے سے تھر تھرانے لگی اور اس نے فون بند کر دیا۔

نور بیٹو، بیٹو کبھی رسی مگر وہ فون بند کر چکا تھا۔ نور کا دل شدت سے تڑپنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ اب وہ رو رہا ہوگا اور وہ اسے دلاسا دینا

چاہتی تھی۔ اس کے پاس جانا چاہتی تھی۔ اس نے چابی اٹھائی اور باہر نکلتا چاہا۔ نور بچا کی خوشگسنگیاں لگا ہوں نے اس کا تعاقب کیا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ انھوں نے غصے سے پوچھا۔

”مارکیٹ تک، مجھے ضروری کام ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”اب جھوٹ بولنا بھی شروع ہو گئی ہو۔ میں جانتا ہوں تم کہاں جا رہی ہو۔“

”اگر جانتے ہیں تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”یکو اس بند کر دو اور اندر دھج ہو جاؤ۔“ وہ اس پر چلاتے ہوئے بولے۔ اس کے لیے ان کا لہجہ اور یہ انداز یہاں اس قدر غیر متوقع تھا کہ وہ

حیران رہ گئی۔ وہ تو انھیں ہمیشہ مضبوط پرستائی سمجھتی آئی تھی اور وہ اب کیسے بدل رہے تھے۔

”مجھے جانے دیں، مجھے بہت ضروری کام ہے۔“ وہ لاؤنج میور کرنے لگی تو انھوں نے زمانے دار تھپڑا سے جڑ دیا۔ وہ بے ہوش ہونے

کے قریب تھی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

نور بچا اور ایسا رویہ..... وہ تو ان کو کبھی اتنی اہمیت ہی نہیں دیتی تھی۔ پھپھو کے گھر بھوپا اور ان کے بچوں کا رویہ اس سے اچھا نہیں تھا تو اس

نے مستقل بچا کے ہاں رہنے کا سوچا تھا اور اب وہ نہ جانے کیوں ایسا کر رہے تھے۔ یقیناً یہ سب اس کی محبت اور بہتری کے لیے تو نہیں کر رہے تھے۔

یہ وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ انھوں نے اسے کمرے میں دھکا دیا اور دروازہ زور سے بند کر دیا۔ اس لمحے وہ بہت روئی۔ اسے اپنی ذات کی اتنی حقیر محسوس ہوئی کہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو اپنے آپ کو بولڈ سمجھتی تھی اور اپنے آپ کو اس قابل سمجھتی تھی کہ وہ ہر چھوٹا بچہ بٹل کر سکتی ہے مگر یہ کیا۔۔۔۔۔ وہ تو ذرہ خاک نکلی۔ ایک عورت جس کی کوئی پہچان نہیں تھی۔ وہ ان سب کے بغیر ادھوری تھی اور عورت چاہے معاشرے کے اعلیٰ ترین طبقے سے تعلق رکھتی ہو یا نچلے سے، اسے اپنی ذات کی وابستگی اور شناخت کے لیے ہمیشہ سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب اسے رفتہ رفتہ اپنی حیثیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ نہ وہ ان لوگوں کو چھوڑ سکتی تھی اور نہ ان کے سامنے سر ہنڈ کر سکتی تھی۔ چچی تو کسی بات میں دخل نہیں دے رہی تھیں ورنہ وہ ہر بات میں چچا کو ڈانٹ کر رکھ دیا کرتی تھیں۔ ایسی چھوٹا بچہ میں وہ سخت ڈپریشن کا شکار ہو رہی تھی۔ کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ولیم کے لیے کیسے بات کرے جس کو اپنی منزل کا خود علم نہیں تھا۔ وہ تو راستے کے پتھر کی طرح خود ادھر ادھر ٹھک رہا تھا۔ کس طرح اس کی وکالت کرے۔ کوئی ٹھوس بنیاد ہی نہیں تھی۔ وہ کوئی مضبوط سہارا نہیں تھا جس پر وہ تکیہ کر سکتی۔

ولیم دو دن سے کمرے میں بند تھا۔ لائٹ آف کیے بالکل خاموش۔۔۔۔۔ کبھی بستر پر لیٹ جاتا تو کبھی دھیل چیمز پر بیٹھ کر کمرے میں ادھر ادھر چکر لگاتا شروع کر دیتا۔ شہلا بار بار اس کا پوچھ رہی تھیں اور آپا کرے کی لائٹ آف دیکھ کر باہر سے ہی مٹی جاتیں۔ وہ بے حد مضطرب تھا۔ اسے اس وقت نور کی بہت ضرورت تھی۔ نور ہی نے تو اس کی زندگی میں رنگ بھرنے کی کوشش کی تھی۔ ہر قدم پر اسے امید کی کرن دکھائی تھی۔ اس کی مضطرب اور متشنج سوچوں کو سنوارنے کی کوشش کی تھی اور اب وہ اس سے بچھڑ جائے گی۔ یہ تصویر ہی سوہان روح تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی طرح بھاگ کر اس کے پاس چلا جائے۔

اسے اپنی زندگی کا کوئی مقصد نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کس قدر متشرانسان ہے۔ اس کا کیا فوچ ہوگا؟ ادھوری شخصیت، معذور جسم، ادھوری تعلیم، ادھوری پہچان، وہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اتنے نام والے، عزت و ناموس والے وقت کے بہاؤ میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں اور وہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے شدید کمپلیکس ہونے لگا تھا۔ پہلے تو ہمیشہ اسے ڈپریشن ہوتا تھا اور اب کمپلیکس بھی، شدید احساس کمتری۔۔۔۔۔ وہ حیدر انکل سے بات کرنا چاہتا تھا مگر اس کے پاس کیا تھا۔ کس بنیاد پر ان سے بات کرے۔ وہ اپنے آپ سے لڑا کر تھک گیا تھا۔ ایک دم لائٹ آن ہوئی۔ کمرے میں ہر طرف روشنی سی پھیل گئی۔ تبسم آنی مسکراتی ہوئی اس کے سامنے کھڑی تھیں، وہ چونک سا گیا۔

”کیا بات ہے بیٹا! کیوں اس قدر پریشان ہو؟“ انھوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”آنٹی۔۔۔۔۔ نور۔۔۔۔۔!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”کیا ہوا نور کو؟“

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ انھیں کیا اور کیسے بتائے۔

”اس سے بہت محبت کرتے ہو، کیا وہ بہت اچھی لگتی ہے؟“

”ہاں۔“ وہ آہستہ سے سر جھکا کر بولا۔

”اور وہ؟“

”وہ بھی۔“

”تو پھر مسئلہ کیا ہے؟“

”آئی! مسئلہ میں ہوں۔ اس کے چچا اس کی شادی کہیں اور کرنا چاہ رہے ہیں اور وہ نور پر بہت سختی کر رہے ہیں۔“

”ہائیں ایہ..... یہ کیا بات ہوئی۔ میں اور حیدر خود ان کی طرف جاتے ہیں۔“ وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولیں۔

”نہیں آئی، وہ کسی معذور اور وہ بھی کرچن سے ہرگز شادی نہیں کریں گے۔“ تبسم آئی کے قدم واپس رک گئے اور وہ خاموشی سے اس کی

طرف دیکھنے لگیں۔

”تو تم کیوں مسلمان نہیں ہو جاتے؟“ آئی ایک دم بولیں تو اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

”میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔ مجھے اسلام کی ابھی تک کسی بھی بات نے متاثر نہیں کیا کہ میں اسے فوراً قبول کر لوں۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولا۔

”تو کیا تم نور سے متاثر نہیں اور کیا وہ مسلم نہیں؟“

”اس نے بحیثیت انسان مجھے متاثر کیا ہے۔ ہم دونوں نے بھی مذہب کو اس طرح ڈسکس نہیں کیا جس طرح کرنا چاہیے۔ اگر کیا بھی ہے

تو بہت کم۔“

”تو تم کیا چاہتے ہو، ہر نان مسلم کی طرح تم بھی کسی معجزے کے طلب گار ہو؟“

”لیکن کچھ تو ایسا ہو جو روح کو جکڑ دے اور انسان کو پھر رافرا نظر نہ آئے۔ کیا مسلمانوں کے پاس ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں ہے۔ اگر آٹھویں کھول کر دیکھو گے تو سب کچھ ہے۔ اگر بند رکھ کر دیکھنے کی کوشش کرو گے تو سامنے کا منظر بھی نظر نہیں آئے

گا..... مسلمانوں کے پاس ان کا نبی ﷺ ہے۔ ایسا نبی ﷺ جس کی ذات معجزہ ہے۔ جو شخص پڑھنا لکھنا نہ جانتا ہو اور ساری دنیا کی مخلوق کے حقوق متعین

کر دے جو رہتی دنیا تک ایک مشورہ کے طور پر مانے جائیں۔ کیا یہ معجزہ کسی سے کم ہے اور ہمارا کلام ایسا ہے جو ہر قسم سے بھی سخت دلوں کو موم کر دے۔“

”یہ بھی تو حیرت کی بات ہے کہ اتنے اعلیٰ نبی ﷺ کے ماننے والے دوسروں کو اتنا حقیر اور کمتر سمجھیں۔ مجھے اب تک جن رویوں کا سامنا

کرنا پڑا ہے، مجھے تو مسلمانوں نے بہت مایوس کیا ہے۔“ وہ مایوسی سے بولا۔

”کیا ان سب میں سے کوئی ایک بھی اس قائل نہیں ملا جو تمہاری سوچ کو بدل سکے۔ اگر ایسا ہے تو گنہ گار ہم ہیں نہ کہ ہمارا مذہب اور کلام۔“

”ہاں ملا ہے، صرف آپ، حیدر انکس اور نور۔“

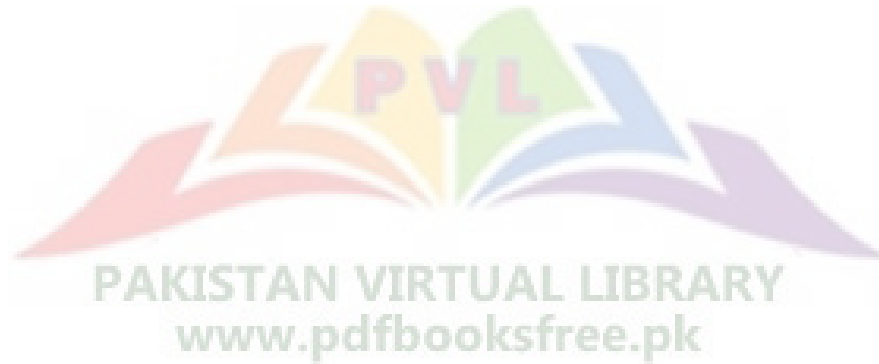
”کیا اتنے بہت سوں میں سے یہ چند کوئی اہمیت نہیں رکھتے؟“

”لیکن صرف اس بات کے لیے زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ بدلا بھی نہیں جاسکتا۔“ وہ قطعیت سے بولا۔

”آخر تم کیا چاہتے ہو؟“ تبسم آئی نے حیرت سے پوچھا۔

”ایسا شعلہ جو میرے اندر بھڑکے تو میرے اندر کو جلا کر راکھ کر دے۔ میں کچھ ایسا..... محسوس کرنا چاہتا ہوں جو میرا ماضی، میرے اب تک کے عقائد اور میرا سب کچھ بہا کر لے جائے اور گھٹنے ٹیکنے کے سوا پھر مجھے کوئی راہ نظر نہ آئے۔“ تبسم آنٹی اس کی بات سن کر خاموش ہو گئیں۔

شہلا کے بچے کتنے عجیب ہیں۔ شفیق بھی انتہائی عجیب و غریب باتیں کرتی ہے، نہ جھکنے والی اور ولیم بھی..... شاید ان کی سرشت میں ایک ہی لمحے میں ہر تسلیم ختم کرنا شامل نہیں۔ وہ ہر بات کے پس منظر اور اس کے ہر پہلو پر مکمل بحث کرتے ہیں..... یا تو جھکنے ہیں یا پھر انتہائی ضدی۔ تبسم آنٹی کوان کے رویے بہت عجیب لگے۔ پہلے شفیق نے نہ جھکنے والی باتیں کی تھیں اور اب وہ بھی ایسی ہی بحثیں کر رہا تھا۔ وہ خود بھی الجھ گئیں اور اٹھ کر چلی گئیں۔



شہلا کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی تھی۔ شام سے ہی ان کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ بار بار ہاتھ اور پاؤں بستر پر زور زور سے مار رہی تھیں۔ آنکھیں قدرے باہر کو کھل آئی تھیں۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ آپا تو گھبرا گئیں۔

”کیا بات ہے شہلا! کیا محسوس ہو رہا ہے؟“ وہ گھبرا کر پوچھیں۔

”آپا! بس میرا آخری وقت آ گیا ہے، پلیز شفٹ کو بلا لیں۔۔۔۔۔ حیدر کو کہیں اس کو ایک دفعہ صرف۔۔۔۔۔ صرف ایک دفعہ لے آئے۔“ ان کی سانس اکھڑ رہی تھی اور وہ شفٹ سے ملنے پر مصر تھیں۔

”اچھا، تم لکڑ نہیں کرو۔ میں ابھی حیدر کو فون کرتی ہوں۔“ انھوں نے حیدر کے موبائل پر رنگ کیا اور انھیں شفٹ کو لانے کو کہا۔

”اچھا، میں کوشش کرتا ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولے۔

”آپا! ولیم کو بھی میرے پاس لے آئیں۔“

”اچھا۔“ وہ اٹھ کر اسے لینے چلی گئیں۔

”آپ مجھے کہاں لے کر جا رہی ہیں؟“ ولیم نے حیرت سے پوچھا۔

”شاید یہ تمہاری ماما کے آخری لمحات ہیں اور وہ تمہیں اپنے پاس دیکھنا چاہتی ہے۔“ آپا کی آنکھوں سے ایک دم آنسو بہہ نکلے۔

”نہیں، یہ کیسے۔۔۔۔۔ اس امپاسیبل!“ وہ لرز سا گیا۔ موت کی موجودگی کا احساس تو تھا مگر یوں اس قدر اچانک سامنے آ کھڑی ہوگی اس

نے سوچا بھی نہ تھا اور وہ بھی ماما۔۔۔۔۔ اگر ماما کو کچھ ہو گیا تو اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ ایک ہی لمحے میں بے شمار سوچیں اس کے دماغ کا احاطہ کرنے

لگیں۔ آپا اسے لے کر کمرے میں داخل ہوئیں۔ شہلا بستر پر ٹپ رہی تھیں۔

”ولیم! تم آگئے۔“ شہلا نے اپنا لرزاں ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

”ہاں ماما، میں ادھر ہی ہوں اور آپ بھی میرے پاس ہیں، آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے انھیں تسلی دینی چاہی۔

”نہیں، اب نہیں۔ اب میرے پاس وقت نہیں۔ ولیم! وعدہ کرو شفٹ کو کبھی تنہا نہیں چھوڑو گے۔ وہ بہت اکیلا ہے۔“

”ماما! آپ کیسی بات کر رہی ہیں۔ آپ سب جانتی تو ہیں۔“ وہ حیرت سے بولا۔

”نہیں، میں کچھ نہیں جانتی، میں کچھ نہیں جانتی۔ بس تم دونوں حیدر انکل کے پاس رہو گے۔ کبھی ایک دوسرے کو نہیں چھوڑو گے، وعدہ

کرو۔“ وہ بے حد مضطرب ہو کر بولیں۔

”شہلا! امت کرو اور یہ سیرپ ہل لو۔“ آپا نے سیرپ ایک جگہ میں ڈال کر اسے پلانا چاہا۔

”نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں۔ آپ بس میرے پاس بیٹھ کر کچھ قرآن پاک سنا دیں تاکہ میری جان آسانی سے نکل سکے۔ آپا! اس

وقت میں سخت تکلیف میں ہوں۔ شفٹ ابھی تک نہیں آئی اور حیدر کہاں ہے۔ اس کو کہیں جلدی آئے۔“ وہ دروازے کی طرف دیکھ کر بولیں۔

”بس وہ آ رہے ہیں، میں نے فون کر دیا ہے۔“

”آپ مجھے قرآن سے کچھ سنا دیں۔ وقت بہت کم ہے، میری جان نکل رہی ہے۔“ ولیم ماں کی ایسی حالت دیکھ کر سخت مضطرب اور پریشان ہو رہا تھا۔

آپا جلدی سے قرآن پاک لے آئیں اور سورہ یٰسین پڑھنے لگیں۔ ولیم خاموشی سے سنتا رہا اور اس دوران ماما کو آہ بڑھاتا رہا۔ وہ کس طرح ایک خوبصورت، صحت مند عورت سے ایک مضمحل، بیمار، ہڈیوں کا بچہ بن کر رہ گئی تھیں۔ نہ سر پر بال تھے، نہ جسم پر گوشت..... جلد کی رنگت بھی جل کر سیاہ ہو چکی تھی اور اب تو ان کی حالت ایسی خوفناک ہو رہی تھی کہ وہ ڈر رہا تھا۔ وہ کبھی پاؤں کو زور سے جھٹکتی تھیں، کبھی ہاتھوں کو بستر پر مارتیں۔ کبھی منہ پر ہاتھ بھیرتی تھیں۔ چہرے پر شدید کرب اور اضطراب کے آثار تھے۔ اس سے ان کی یہ کیفیت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

”اور تم مرنے والے مسلمان ہی مرنے والے۔“ آپا نے آیت پڑھی تو ولیم کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ بہت دنوں سے اپنے آپ کو مصروف رکھے ہوئے تھا۔ نور کی ذات میں اور اس کے بارے میں گہری سوچوں نے اس کی توجہ اس طرف سے ہٹا رکھی تھی اور اب پھر سب کچھ عود کر رہا تھا۔ وہ پھر مضطرب ہو رہا تھا۔ وہ پھر اسی کیفیت سے دوچار ہونے لگا تھا۔ رات بھر نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا اندر اچھل پھل ہونے لگا۔ ایسا اضطراب اور بے چینی پیدا ہونے لگی جو شاید اس وقت ماما کے چہرے پر نمایاں تھی۔

”شہلا اکھہ شہاوت پڑھتی جاؤ۔ میرے ساتھ پڑھو۔“ آپا کلمہ پڑھنے لگیں تو شہلا کی آنکھوں سے جیسے دھارے پھوٹ پڑے۔

”اے انسان! تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔“ آپا نے ایک آیت کا ترجمہ پڑھا اور پھر اسے تسلی دی۔

”وہ معاف کرنے والا ہے اور اس کی رحمت انسان کو ہر جگہ گھیرے ہوئے ہے۔ فکر نہیں کرو، سب بہتر ہوگا۔“ آپا نے محبت سے کہا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ شدت سے رو رہی تھیں، جاں بلب تھیں۔ تڑپ رہی تھیں اس مچھلی کی طرح جسے سمندر سے نکالا گیا ہو اور وہ دوبارہ پانی میں جانے کے لیے تڑپ رہی ہو۔ دم توڑنے سے پہلے اپنے وجود کی ساری قوتوں کے ساتھ ہر ممکن زندہ رہنے کی جدوجہد میں مصروف ہو۔ ان کے لب بھی آہستہ آہستہ بل رہے تھے۔ وہ کلمہ پڑھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی مگر کلمہ ادا کرنا انتہائی مشکل ہو رہا تھا۔ زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ قوت گویائی زائل ہو رہی تھی۔ زبان اکثر گنگی تھی یا پھر کوئی غیر مرئی قوت اسے ان کے لیے مشکل بنا رہی تھی۔ ان کا تاواں وجود کلمے کا بوجھ نہیں سہہ پا رہا تھا۔ وہ الفاظ کو گھسیٹ رہی تھیں۔ ساری زنجیریں توڑ کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے ہونٹ سکڑ رہے تھے، زبان خشک ہو رہی تھی۔ گلے میں کانٹے اور ان کی شدید جھنجھٹ تھی۔ شاید ایمان اور عقائد آپس میں برسرِ پیکار تھے یا پھر دوبارہ از سر نو روح میں حلول ہو رہے تھے۔ جس چیز کا اعادہ دنیا میں آسان تھا شاید اب اس ہستی کے سامنے اقرار مشکل ہو رہا تھا۔ بیماری کے دوران شہلا نے ہمارا کلمہ پڑھا تھا اور اب ایک دفعہ کی ادائیگی بھی مشکل ہو رہی تھی۔ شاید جسم اور روح کی آپس میں چھٹلش تھی۔ جسم کی ساری قوتیں، روح کی ساری سہائیاں، حواس کی ساری لطافتیں اور جذبات کی ساری نزاکتیں..... سب کچھ صرف ایک کلمے کی ادائیگی میں صرف ہو رہی تھیں مگر پورا کلمہ پھر بھی ادا نہیں ہو پا رہا تھا۔ ”یا اللہ! تیری رحمت کبھی مجھ پر کھل کر نہیں..... اب کی بار صرف آخری بار مجھے اس سے نوازدے۔“ شہلا نے دل میں گڑگڑا کر دعا کی۔

”اور ہم نے انسان کو احسن ترین صورت میں پیدا کیا پھر اسے اسل ترین گھاٹی میں پھینک دیا۔“

وہ اس گھاٹی سے نکلتا چاہ رہی تھیں۔ اندر ہی اندر التجائیں کر رہی تھیں۔ سارے گناہ مجرم بنے ان کے سامنے کھڑے تھے اور وہ سر نہیں اٹھا پا رہی تھیں۔ ان کی حالت ناقابل بیان حد تک خراب اور مضطرب ہو رہی تھی۔ شاید وہ مسلمان ہونے کا اعادہ کر رہی تھیں۔ کلمہ اور مہم کی جدوجہد۔۔۔۔۔ آخری لمحوں کی اضطرابی کیفیت۔۔۔۔۔ رگوں میں گردش کرتے خون کی توانائی سے خارج ہونے والی اکھڑتی سانپوں کے ساتھ اعراب اور تلفظ کی قیود سے آزاد محض الفاظ ادا کرنا چاہ رہی تھیں۔ ایسا کلمہ جو شاید نامہ اعمال میں سب سے بھاری تھا۔ جس کا اقرار انسان کی راہیں متعین کرتا ہے، اس کی حد بندی کرتا ہے۔ اسے ذرہ خاک سے ذرہ آفتاب بنا دیتا ہے۔ اسے وحدہ لا شریک کی ہستی کے سر اور رموز سے آشنا کرتا ہے اور عام حقیر انسانوں کے نجوم سے نکال کر اسے ایک قابل عزت امتی کا درجہ دیتا ہے۔

”اور ہم نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔“ انسان کے وجود کو اتنی جلا بخشنے والا کلمہ یقیناً بھاری تھا۔ نامہ اعمال میں سب سے بھاری جس کا اقرار انھیں کہیں پہنچا رہا تھا، ان کی راہیں متعین کر رہا تھا۔ انھیں گناہوں سے پاک کر رہا تھا۔ وجود کی آلائشوں اور گنہ گریوں سے ان کو معاف کر رہا تھا۔ ان کی منزل متعین ہو رہی تھی۔ وہ خطا و لسیان کے ادوار سے نکل کر اقرار کی منزلوں پر گامزن تھیں، مجھو سفر تھیں۔ وہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اضطراب میں وہ سب کچھ بھول چکی تھیں۔ شفق، حیدر، ولیم، آ پاکوئی بھی ارد گرد نہیں تھا۔ صرف ایک ہستی سامنے تھی اور وہ اس کے سامنے اقرار کرنے کی سر توڑ کوشش میں مصروف تھیں۔

”لا۔۔۔۔۔ اللہ۔۔۔۔۔ محمد۔۔۔۔۔“ الفاظ سمجھ نہیں آ رہے تھے۔ سانس کی کھڑکڑاہٹ، گلے کی گڑگڑاہٹ، آواز کی قہر قہر اہٹ اور جسم کی کپکپاہٹ۔۔۔۔۔ سب ہی قوتیں بہت مشکل سے ان الفاظ کا اعادہ کر رہی تھیں۔ ولیم حیرت سے آنکھیں کھولے دیکھ رہا تھا ایسا مضر جو روح فرما تھا۔ انسان کو لرزادینے والا، اس کا انجام بتا دینے والا، کس قدر تکلیف دہ اور کٹھن تھا۔ بس یہی ہے انسان، اس قدر بے بس، وہ الفاظ ڈھرانے کی بار بار کوشش کر رہی تھیں، دل پھٹ رہا تھا، روح منھ پر اڑ رہی تھی۔ ساری قوتیں ہوتا نائیاں اور لطافتیں زائل ہونے کو بے تاب تھیں۔ ولیم کا اپنا دل بے تاب ہو رہا تھا۔ اسے اچانک ایسی ہستی کا شعور ہو رہا تھا جسے وہ جھٹلاتا آیا تھا جس تک پہنچنے کے لیے اس نے غلط راہوں کا انتخاب کرنا چاہا تھا۔ شاید اس کے اپنے بھی زاویے درست ہو رہے تھے۔

”جیسے اللہ نور نہ دیکھے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔“ اسے اس نور کی تابانیاں اپنے حصار میں لے رہی تھیں۔ اس کے اندر جذبات طوفان کی صورت میں ابھر رہے تھے، دل شق ہو رہا تھا، روح پھڑپھڑا رہی تھی۔ کچھ کرنے کو آکسار ہی تھی۔ ایسا اقرار جو اسے حیات کے اسرار سے آشنا کر دے۔

”ہم معترِب ان کو اپنی نشانیاں ان کے گرد و نواح میں بھی دکھا دیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی اور یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہی حق ہے۔“

ایسا اضطراب اور استغبار اس نے کبھی زندگی میں محسوس نہیں کیا تھا۔ اچانک فون کی بیل بجنے لگی۔ آ پاکوئی اندر ہی اندر پریشان تھیں۔ جلدی میں قرآن پاک کو رطل پر کھلا رکھ کر باہر نکل گئیں۔ ولیم پہلے ہی بے تاب ہو رہا تھا۔ مہم کی کیفیت، آیات کا ترجمہ اس کے دل کو کھینچنے میں جکڑ رہا تھا۔

اس کا دل بھر رہا تھا جیسے کسی مائع سے لبریز ہو رہا تھا۔ وہ جی بھر کر رونا چاہ رہا تھا مگر آنسوؤں کو ضبط کیے ہوئے تھا۔ اس نے بغیر ہاتھ لگائے قرآن کے ایک کھلے ہوئے صفحے کو پڑھنا چاہا۔ عربی سمجھ نہ آئی تو ترجمے پر نظر دوڑائی۔

”اور جب عملوں کے دفتر کھولے جائیں گے اور جب آسمان کی کھال کھینچی لی جائے گی اور جب دوزخ کی آگ بجڑ کاٹی جائے گی اور بہشت جب قریب لائی جائے گی جب ہر شخص معلوم کر لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔“

اس نے جیسے ہی ترجمہ پڑھا اس کا دل لرزنے لگا۔ اس نے ایک ننگ ممالی طرف دیکھا۔

”تب ہر شخص معلوم کر لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے؟“ اس نے ایک لمحے کے لیے اپنے بارے میں سوچا۔ ”کیا لے کر آیا ہے؟ کچھ بھی نہیں..... خالی ہاتھ..... خالی دل..... خالی روح..... کچھ بھی نہیں..... کیا لے کر آیا ہے؟ کچھ بھی نہیں.....“ اس کا دل پکار پکار کر اس سے سوال کر رہا تھا۔ اس کے اندر عظیم سایہ پا ہونے لگا۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی۔ نہ جانے کہاں سے ایک آنسو گرا، دوسرا پھر تیسرا اور چھڑی سی لگ گئی۔ اشک بہنے لگے۔ مائع سے لبریز دل، اشکوں کی صورت میں اندر کے غبار کو خارج کرنے لگا۔ نہ جانے کون کون سا روح کو سمجھ رہا تھا۔ جسم کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اس کے روکنے کھڑے ہو رہے تھے۔ دل پھٹنے کو تھا۔ کہیں غرار کا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ساری راہیں مسدود نظر آ رہی تھیں۔ بس گھٹنے ٹیکنے کو دل چاہ رہا تھا..... سر تسلیم خم کرنے کو مجبور کر رہا تھا۔ ماما توپ رہی تھیں۔ عجب بے چارگی اور بے بسی کا عالم تھا۔ وہ بری طرح سرا دھرا دھرا رہی تھیں۔ لمحہ بہ لمحہ ان کی جان جسم کے ایک ایک دوئیں سے کینچی جا رہی تھی۔ نزع کی کیفیت کس قدر تکلیف دہ تھی۔ وہ کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ ان کی تکلیف محسوس کر سکتا تھا مگر مجبور تھا، بے بس تھا، کتنا قریبی رشتہ اور کس قدر مجبور، وہ اس وقت بالکل تنہا اور بے سہارا لگ رہی تھیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksf

”کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔“

”مما..... ممما..... پلیز ہمت کریں۔“ اس نے سخت مضطرب ہو کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تسلی دینی چاہی مگر وہ کچھ بھی نہیں سن رہی تھیں۔ بس شدید کرب میں جھٹلا تھیں۔ کرب، اضطراب، ملال، ڈکھ، رنج، غرار..... کبھی ہاتھوں کو بند کرتیں اور کھولتیں۔

”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے۔“

نہ کوئی دوا کام آ رہی تھی، نہ دعا۔ وہ بھی الفاظ بھول گیا تھا۔ دعا یہ الفاظ..... جو کبھی قادر نے اسے سکھائے تھے۔ وہ یاد کرنا چاہ رہا تھا مگر ذہن خالی ہو چکا تھا۔ اس میں اب کوئی پرانی یاد باقی نہ تھی۔ وہ پریشان ہو گیا پھر قرآن کی طرف نظر دوڑائی۔ شاید کہیں سے الفاظ مل جائیں جن سے وہ ماما کو تسلی دے سکے۔

”اور تمہیں کس چیز نے اپنے رب کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈالا۔“ اس کی انا پرکاری ضرب تھی۔ اس کا وجود کرچی کرچی ہو گیا۔ سامنے ماما تھیں اور ان کا مکمل ٹکڑا..... ایک طرف وہ تھا خالی الذہن..... اس نے ایسا شعلہ مالٹا تھا جو اندر کو بجڑ کا دے۔ اس کی ہستی کا ثبوت مانگتے والا، اب ایک ہی وار میں چاروں شانے چٹ ہو گیا تھا۔ بلند دہانگ دعوے ہوا ہو رہے تھے۔ منطق اور دلائل پر تکیہ کرنے والا خود ہی دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ بس چند الفاظ نے شعلہ بجڑ کا یا تھا اور اس کے وجود کو خاکستر کر دیا تھا۔

انسان کے دعوے کتنے بڑے ہوتے ہیں جیسے اس کا وجود، جیسے ماما کا وجود، ماما، باپ کا وجود، ماما، سسکتا، بوڑھا، بیمار، انا اور زخم کے قیدی کیسے خود ہی دام میں آ جاتے ہیں۔ اپنے ہی لفظوں سے مات کھا جاتے ہیں۔ اپنے ہی وجود سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور پھر کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ دلوں کو پلٹنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ وہ چاہے تو ساری زندگی انہیں زنگ آلود رہنے دے اور چاہے تو لکھوں میں اپنے نور سے انہیں جلا بخش دے۔ سب کچھ بدل کر رکھ دے۔ آن ہی آن میں نیا وجود جنم لے لیتا ہے اور انسان کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ ماما اس کی کیفیت سے بے خبر اپنے آپ سے برسرِ پیکار تھیں۔

تبسم آنٹی اسے سمجھا رہی تھیں۔ حیدر انکل کنوئیں کر رہے تھے مگر وہ ان ہی نہیں رہی تھی۔ ”صرف ایک دفعہ آ جاؤ۔“ تبسم آنٹی نے انتہائی ملتجیانہ انداز میں کہا تو اس نے فون رکھ دیا۔ بعض اوقات لکھوں کی کنکشن انسان کو خوفناک حد تک منتشر کر کے رکھ دیتی ہے۔ تبسم نے آہ بھر کر سوچا اور دل ہی دل میں خدا سے دعا کی۔

”یالٹی! وقت رخصت کو کچھ وصال بنا دے۔ یارب! اچھے سے تو کچھ بھی بعید نہیں۔ تیری رحمت کی نظر تو بیا بیا انوں کو نکلستان بنا دیتی ہے۔ دلوں کو بدلنا تو تیرے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ اس کا دل بدل دے۔“ وہ امید و بیم کی کنکشن میں جتلا اندر گئیں۔ وہ ابھی تک مضطرب تھی اور شاید منتظر بھی اس لیے جان لیوں پر آ کر رک گئی تھی۔

”شہلا! وہ آ رہی ہے۔“ تبسم آپا نے کہا۔ شہلا نے کچھ نہیں سنا اور نہ ہی جواب دیا۔ بس لب لہجے رہے اور بند آنکھوں سے آنسو بہتے رہے جیسے کوئی کفارہ ادا کر رہی ہو۔ ولیم سر جھکائے آنسو بہا رہا تھا۔

”حوصلہ کرو بیٹا! بہادر بنو۔“ تبسم آنٹی نے اسے دلاسا دیا مگر وہ خاموش رہا۔ وہ بے تاب آنسوؤں اندر کے غبار کو کم کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی کا باہرں بجا۔ تبسم آپا نے جلدی سے کھڑکی سے دیکھا۔ شفق، شہلا اور حیدر اندر آ رہے تھے۔ آپا نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔

”شہلا! شفق آ رہی ہے۔“ وہ مسرت سے چلائی تھیں۔ شفق، شہلا اور حیدر انکل اندر آ چکے تھے۔ ماما نے مشکل سے آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھا۔ شفق کی آنکھوں میں ماں کے لیے کسی قسم کے کوئی جذبات نہیں تھے البتہ چہرے پر انسردگی سی چھائی تھی۔ ماما نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا دیا۔ تبسم آنٹی نے جلدی سے اسے ان کے پیڑ پر ہی بٹھا دیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی بھی آنکھوں سے آنسو رواں تھے مگر وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔

”شفق!“ شہلا نے بے شکل کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ولیم کی طرف بڑھا دیا۔ ”خیال رکھنا۔“ وہ بے شکل بولیں۔ شفق خاموش رہی اور ولیم کی طرف بالکل نہ دیکھا۔ ان کی سانس اکڑ رہی تھی جیسے وہ صرف اس کی آمد کی منتظر تھیں۔ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھیں مگر کہہ نہیں پا رہی تھیں۔ ایک دم گلے میں کھڑکڑاہٹ سی ہونے لگی۔ شہلا نے اشارہ کیا۔ آپا نے جلدی سے برتن آگے کیا۔ انھوں نے خون آلود تھے کی اور بظہ حال سی ہو کر لیٹ گئیں۔ ہر ایک کی آنکھوں میں خوف سا سا گیا تھا۔ ناقابل بیان مہلک انتہائی روح لبرسا، دلوں کو شق کرنے والا۔

اس نے آخری بار اونچی آواز میں کلمہ پڑھنا چاہا تو آپا، حیدر، شہلا اور شفق بھی بلند آواز میں کلمہ شہادت پڑھنے لگے۔۔۔۔۔ سب حیران رہ گئے۔ ایک دم چونک گئے اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ ولیم کی آواز سب سے زیادہ بلند تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اس کی آواز سب آوازوں سے منفرد لگ رہی تھی۔ اس کا کلمہ سب سے مختلف تھا۔ ممانے انتہائی اضطراب کی کیفیت میں ایک دم ولیم کی طرف دیکھا اور زیر لب مسکرانے کی کوشش کی۔ حیدر نے آگے بڑھ کر ولیم کو گلے لگایا۔ آپا نے بھی پیار سے اس کا ماتھا چوما۔ ایک شعلہ سا بھڑکا تھا اور اس کے اندر آنکھوں میں خاکستر کر دیا تھا۔ اس نے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ سب کچھ بہ چکا تھا۔ لہجوں میں مجروحہ ردفا ہو گیا تھا۔ دلوں کو پلٹنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ انسان خود ہی حیران رہ جاتا ہے۔

وہ بھی ماما کی طرح انک انک کر کلمہ دہرا رہا تھا اور آنسو بھی بہا رہا تھا۔ روح محو پرواز تھی۔ خون کی گردش میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ایمان رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ اس کے رو گھٹنے کھڑے ہو گئے تھے۔ جسم کا ایک ایک حصہ، مسام اور ہر رواں سب اس کے ایمان کی تصدیق کر رہے تھے۔ سب حیران تھے مجروحہ طلب کرنے والا جب خود ہی کسی مجروحے کا سامنا کرتا ہے تو کیسے دنگ رہ جاتا ہے۔ اس کی بے قرار روح کو ایک لمحے میں سکون مل گیا۔ ماما کے چہرے پر سکون سا آ گیا تھا۔ شاید وہ اسی لیے مضطرب تھیں۔ اب ہر طرف سکوت اور ٹھہراؤ تھا۔ ان کی آنکھوں میں اطمینان اور مسکراہٹ کی لمبری نمودار ہوئی۔ خدا کی رحمت نے ہر طرف احاطہ کر لیا تھا۔ ان کی جان کب اور کیسے نکلی کسی کو احساس بھی نہ ہوا۔ وہ سب تو ولیم پر حیران ہو رہے تھے جس نے سب کو حیران کر دیا تھا۔ سب اس کی طرف متوجہ تھے اور وہ سب سے منہ موڑ کر کہیں جا چکی تھیں۔

”ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

حیات کا ایک طویل سفر ختم ہو گیا تھا۔ زندگی کے اسٹیج پر ایک اور کردار اپنا رول ادا کر کے جا چکا تھا۔ دنیا محو تماشائی اور حیران تھی۔ ایک اور کردار کی آمد کی منتظر تھی جو قصہ پارینہ سن سکے، جو ہمیشہ ذہنوں میں موجود رہے اور جس کی یاد سے اذہان منور ہیں۔

شاید کوئی ایسا ہو۔۔۔۔۔ ہر نگاہ منتظر تھی۔۔۔۔۔ ہر طرف جھوم تھا اور افراتفری تھی۔۔۔۔۔ کوئی تو ہو جو انسانیت کی بھا کے لیے کچھ کر سکے۔۔۔۔۔ جس کی طرف نگاہیں اٹھیں تو اس کے انسان ہونے پر فخر محسوس ہو۔۔۔۔۔ کوئی تو ہو۔۔۔۔۔



نور، انور چچا کے غصے اور ڈانٹ پہنکار کے باوجود حیدر کے فون کرنے پر آگئی تھی۔ وہ کئی دنوں سے وہیں تھی۔ شہلا کی وفات کا دکھ تو تھا مگر ولیم کے یوں اچانک راستہ بدلنے اور سچائی قبول کرنے پر سخت حیرانی اور خوشی بھی تھی۔ گھر میں خوب مصروفیت تھی۔ کبھی گرد و نواح کے لوگ تعزیت کے لیے آرہے تھے تو کبھی مسجد سے قرآن خوانی کے لیے حفاظ۔۔۔۔۔ درنگ و یمن ہاسٹل سے بھی خواتین آرہی تھیں۔ ہر کوئی آنے والا دعائے مسخرت کر رہا تھا اور اس کے لیے سب کچھ بہت عجیب تھا۔

جمعے کا دن تھا جب حیدر نے اسے غسل کرنے اور نئے کپڑے پہننے کے بارے میں کہا۔

”کیوں؟“ وہ حیران ہو گیا۔

”آج تم مسجد میں میرے ساتھ چلو گے اور اسلام قبول کرو گے اس لیے اور سنو! تمہارا اسلامی نام کیا رکھیں؟“ حیدر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
 ”جو آپ کو بہتر لگے، مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں۔“
 ”آپ کا کیا خیال ہے؟“ حیدر نے تبسم آ پائے رائے مانگی۔
 ”بھئی فور سے پوچھو، اسے جو نام پسند ہو۔“ وہ کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔
 ”موحد.....!“ دوا چانک بولی تو سب مسکرا دیے۔

وہ دن انتہائی خوشی کا دن تھا جب وہ مسجد سے اسلام قبول کر کے لوٹا۔ اس کا دل اور روح انتہائی مسرور تھی۔ ایسی خوشی نصیب ہوئی تھی جس کا کوئی نعم البدل نہیں تھا۔ حیدر انکل، تبسم آنٹی اور باقی سب لوگ بھی بہت خوش تھے۔ حیدر انکل نے مسجد میں بھی مٹھائی بانٹی تھی اور اپنی لیکچریز میں بھی..... یہ لکھ کسی نعمت سے کم تو نہ تھا۔ جب انسان سر تسلیم خم کر دے اس ہستی کے سامنے جس کے سامنے کائنات کی بڑی سے بڑی قوت بھی ہتھی ہے اور جو دلوں میں رہتا ہے۔ سب نے اسے مبارک باد دی سوائے شفق کے۔ وہ ماما کی وفات کے بعد بہت خاموش تھی۔ وہ جس کیفیت سے دوچار تھی یہ صرف وہی جانتی تھی۔ اس نے آخری لمحوں تک ماما کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو دلوں کے درمیان ناراضی ختم ہونے کی علامت سمجھی جاتی۔ سب کے بہت سمجھانے کے باوجود وہ اپنی ضد پر اڑی رہی تھی۔ وہ موجود تو تھی مگر اس کی آنکھوں میں ان کے لیے محبت مفقود تھی اور اب اس کا دل بے حد پریشان تھا جیسے کسی بھاری بوجھ تلے آ گیا ہو۔ کسی طرح بے قراری کم ہی نہیں ہو پاری تھی۔ وہ سخت پریشان اور بے چین تھی۔ سب آہستہ آہستہ خاک میں پنہاں ہو گئے تھے۔ کیا تھا اگر وہ ماما کو معاف کر دیتی۔ ان کے آخری لمحوں میں ان کے لیے تسکین کا باعث بن جاتی مگر وہ اپنے دل کو نہ بدل سکی۔ وہ اسی طرح اکڑی رہی۔ وہ تو صرف تبسم آنٹی کی بہت زیادہ التجا اور حیدر انکل کی محبت میں چلی آئی تھی ورنہ وہ لو آنے سے گریز اس تھی اور اب جبکہ ماما نہیں رہی تھیں، سب کا اصرار بھی ختم ہو چکا تھا۔ وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ کسی نے بھی اس کو اس کے رویے پر سرزنش نہیں کی تھی۔ کسی نے اس کو زچ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سب خاموش تھے اور ان کی خاموشی کو وہ اپنے لیے کسی عذاب اور آزمائش سے کم نہیں سمجھ رہی تھی۔ وہ بہت بری ہے۔ اس کا اندازہ اسے بار بار کچھ کے لگا رہا تھا اور وہ مزید مضطرب ہو جاتی۔

”ہاں ہاں، میں ہی بری ہوں۔ سب کی گتھنگار..... قاتلہ..... اور..... اور.....“ اس کی نظروں کے سامنے زویا اور عابد گھومنے لگے۔ وہ چننا چلانا چاہتی تھی۔ خوب رونا چاہتی تھی مگر اب سب کچھ بے سود لگ رہا تھا۔ ہاہر نور، شہلا، اسد، حیدر، موحد، تبسم آنٹی اور کرل مغیث سب خوش اور مسرور بیٹھے تھے اور وہ تنہا کمرے میں دروازہ لاک کر کے اپنے آپ سے الجھ رہی تھی۔
 دروازے پر دستک ہوئی۔ الفضل اسے بلانے آیا تھا۔ حیدر انکل اسے ہمارے تھے۔
 ”کہہ دو میری طبیعت ٹھیک نہیں اور میں سو رہی ہوں۔“ اس نے دروازہ کھول کر اور اپنا موقف سنا کر دروازہ بند کر دیا۔ نہ جانے یہ اس کی خود سری تھی یا مگر اس کا ڈپریشن۔ سب نے خاموشی سے اس کے ایکسکیو ز کو قبول کر لیا۔
 ”موحد اتم نے یہ فیصلہ بہت اچانک نہیں کیا؟ یہ تو مجھے معلوم ہی ہے کہ تم اچانک فیصلے کرنے کے عادی ہو.....“ نور نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... تھا تو اچانک لیکن پروسس بہت دنوں سے شروع ہو چکا تھا اور اس لمحے میں مزاحمت نہیں کر سکا..... لور میں اس وقت کی کیفیت کو غفلتوں میں بیان نہیں کر سکتا..... اور اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید پھر ایسا نکھرتا کہ ختم ہو جاتا..... ان لمحوں کی شدت نے میرے جسم اور روح کو ایسا جکڑا تھا کہ فرار ممکن نہیں تھا۔ نور واقعی ایمان میں جو لطافت اور طاقت ہے وہ دنیا کی کسی اور شے میں نہیں..... تم نے ٹھیک کہا تھا کہ کوئی سچا مسلمان کبھی اپنا راستہ نہیں بدلتا۔ میں خوش ہوں اور تم سب لوگوں کا مشکور کہ اتنی بڑی نعمت کے حصول میں تم سب نے میری بھرپور مدد کی..... درنہ میں نہ جانے کہاں کہاں اور کب تک بھٹکتا رہتا، اب میری روح بہت بڑے سکون ہے جیسے کسی منزل پر پہنچ کر کوئی بڑے سکون ہو جاتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں خوشی اور مسرت سے آنسو جھسلانے لگے۔

”کیا قادر کو کچھ نہیں بتاؤ گے.....؟“ لور نے جان بوجھ کر اسے چھیڑنا چاہا۔

”نہیں..... اب مجھے کسی کا ڈر نہیں اب مجھے اس ہستی تک پہنچنے کے لیے کسی رابطے اور وسیلے کی ضرورت نہیں، کسی قادر کا خوف نہیں..... اور نہ ہی کسی مشن کے چھوٹنے کا ملال..... میرا راستہ تو اب صاف اور سیدھا ہے۔“ وہ اعتماد سے بولا۔

”موحد..... تم کتنے بڑے اعتماد لگ رہے ہو..... ایک دم غلط اور مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ تم میں پھر وہ کونفیڈنس آچکا ہے جو میں نے پہلی دفعہ ہاسٹل میں تم سے مل کر محسوس کیا تھا۔ اس وقت تم مجھے بہت اچھے اور بڑے اعتماد لگے تھے..... بعد میں تو تم.....“ اس نے مسکراتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ان دنوں بھی میں اپنے آپ کو خدا کے قریب محسوس کرتا تھا، صرف ایک لگن تھی کہ مجھے خدا تک پہنچنا ہے..... پھر میں جنونی ہوتا گیا جیسے ایک دم غبارے میں ہوا بھر کر پھر اس کا منہ کھول دیا جائے اور جب ہوا نکلتی ہے تو وہ بھر سے مرل سا پھس پھسا سا ہو جاتا ہے لیکن میں اس وقت کے اعتماد میں اور اب کے اعتماد میں بہت فرق محسوس کرتا ہوں۔ اب میرے پاس ٹھوس حقیقت اور سچ کی روشنی ہے، سیدھا راستہ ہے اور منظر صاف ہے..... میری منزل کیا ہے..... اب مجھے اس کا علم ہے، نور اب مجھے یقین ہو چکا ہے کہ اندھیرے اب میرا مقدر نہیں..... میں اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ خدا نے اپنے نور کی شمع میرے اندر روشن کی ہے اس کا مطلب ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ بس یہی احساس کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے میرے لیے اس دنیا میں ہر شے سے بڑھ کر قیمتی ہے اور جب کسی کو یہ احساس ہو جائے کہ کوئی اس سے جی محبت کرتا ہے تو اس کا سر فہرے کس قدر بلند ہو جاتا ہے اور اس کے احساسات کا کیا عالم ہوگا جسے یہ احساس ہو کہ کائنات کا مالک اس سے محبت کرتا ہے..... نور دیکھو میں ماما کی ڈیڑھ سے پہلے ان سے جدائی کا تصور کر کے ہی کانپ جاتا تھا۔ سوچتا تھا کس طرح زندہ رہ پاؤں گا لیکن اب مجھے دکھ تو ہے مگر خوف نہیں، کاش تم اس وقت ہو تم جب ماما صرف گلے کی ادائیگی کے لیے اس قدر رڑپ رہی تھیں..... ایسی بے چینی میں نے آج تک کسی چہرے پر نہیں دیکھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت صرف اور صرف خدا کے سامنے کھڑی ہوں اور پوری قوت سے کلمہ ادا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں..... میں تو چونک ہی گیا انھیں کوئی فکر نہیں تھی، کسی قسم کا کوئی خوف نہیں تھا۔ صرف ایک ہی جدوجہد تھی کہ کسی طرح کلمہ ادا ہو جائے اور پھر انھوں نے جس کیفیت میں کلمہ پورا کیا..... میرے اندر جیسے آگ سی لگ گئی اور پھر کیسے اور کس قوت نے میری زبان سے بھی کلمہ جاری کروا دیا میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ کاش تم اس وقت ہو تم.....“ اس

کی آنکھیں پھر فرط جذبات سے جھلکانے لگیں۔ نور کی آنکھوں میں بھی نمی ہی تیرنے لگی۔

”شکر ہے موصد..... خدا نے میری بھی دعائیں سن لیں جب تم چرچ میں حیدر کے لیے گئے تھے؟..... اس وقت میں نے بظاہر میں جس طرح تمہارے لیے دعائیں کی تھیں تم اندازہ نہیں کر سکتے۔“ نور نے مسکرا کر کہا۔

”واقعی..... اور اس وقت میں اس قدر بے چینی اور بے بسی محسوس کر رہا تھا پہلی دفعہ چرچ سے میں اس قدر مضطرب ہوا تھا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ نور اس کا مطلب ہے خدا کوئی دعا بھی رائیگاں نہیں جانے دیتا۔“

”ہاں بالکل نہیں..... اور تمہاری ٹانگیں بھی جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔“ نور نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... انشاء اللہ اب میں بہت بڑا امید ہوں، الحمد للہ۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”ہیں..... ہیں..... یہ تم نے اتنے سارے عربی کے الفاظ کہاں سے سیکھے؟“ نور نے حیرت سے پوچھا۔

”تبسم آنتی سے... شی از ویری ٹائس، لائنگ در.....“ وہ مسکرا کر بولا۔

”نیں شی از.....“ اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

”تم آتی رہو گی نا.....؟“ وہ اسے اٹھتے دیکھ کر بولا۔

”معلوم نہیں..... کیا بنتا ہے..... انور چچا خواہنا خواہ میں مجھے تنگ کر رہے ہیں، مجھ میں نہیں آ رہا آخر وہ کیوں ایسا کر رہے ہیں۔ بہت مشکل

سے صرف حیدر انکل کے کہنے پر مجھے یہاں آنے کی اجازت ملی ہے ورنہ تو وہ باہر بھی نہیں نکلنے دیتے..... تم میرے لیے دعا کرنا۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں اب تم بہت نہ ہارنا۔“ وہ بولا تو اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، مسکرا دی..... اور باہر چلی گئی۔



وہ گھر پہنچی تو ڈرائنگ روم سے اونچی اونچی آوازیں آرہی تھیں جیسے کوئی جھگڑ رہا ہو، چچی کچن میں مصروف تھیں۔ چچا کی کوئی اولاد تو تھی نہیں کہ گھر میں کسی قسم کا شور شرابا ہوتا، وہ تھوڑی دیر لاؤنچ میں بیٹھی اور پھر کمرے میں جانے لگی تو اس کے قدم جیسے دک گئے۔

”راہیل..... مجھے تھوڑا سا وقت دو وہ مان جائے گی۔“ چچا ان سے التجا کر رہے تھے مگر وہ تو ایسے بھڑکے ہوئے تھے کہ ان کی کسی بات کو سننے کو تیار نہ تھے۔

”انور..... تم میرے ساتھ کب تک جھوٹ پہ جھوٹ بولتے رہو گے تم بہت دھوکے باز انسان ہو..... اب میں تمہارے فراڈ میں آنے والا نہیں۔“

”راہیل تم تو میرے کالج کے دوست ہو..... اور خدا گواہ ہے میں نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکا کرنے کی کوشش نہیں کی، بس حالات ہی ایسے ہوتے گئے کہ میں تمہاری رقم لوٹا نہیں سکا اور قرضوں کے بوجھ تلے دب گیا مجھے بزنس کا خاک غم تھا تم نے ہی خواہ مخواہ مجھے پھنسا دیا..... اور آج میں اس حالت کو پہنچ گیا ہوں۔ تم تو سارا بزنس سنبھال بیٹھے اور میں کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا..... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم مجھے میری بھینجی کے ہاتھوں ہی ذلیل کر دانا چاہتے ہو..... پہلے اس کے پیسے پر ہاتھ صاف کیا اور اب اس کی زندگی پر ڈاکا ڈالنا چاہتے ہو..... تم کیسے دوست ہو وہ ایک قیمتی بچی ہے اور قیموں کا مال کھانا بیٹوں میں آگ ڈالنے کے برابر ہے۔“ انور چچا قدرے اونچی آواز میں بولے تو راہیل اٹکل کھلکھلا کر ہنس دیے۔

”اسی لیے تو آسان راستہ بتا رہا ہوں کہ اس کی میرے بیٹے کے ساتھ شادی کر دو..... اس کے علاوہ تو کوئی اور آپشن تمہارے پاس ہے ہی نہیں اور یہ میں ہی ہوں..... انور جس نے تمہاری فضول کہو اس بن لی، آئندہ اس لیے میں مجھ سے بات کی تو جان لینا کہ وہ تمہاری زندگی کا آخری باعزت دن ہوگا۔ مجھے جلد از جلد اس رشتے کا مثبت جواب چاہیے.....“ وہ جواب کم دھمکی زیادہ دے رہے تھے۔

”لیکن شرجیل اور نور دونوں ہی اس رشتے میں اتنے زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے۔“

”شرجیل تو بے وقوف ہے اسے کیا معلوم کہ بزنس چلانے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور وہ جو کار مشین کی ٹیکنری چلا رہا ہے وہ کس کی ہے..... ہونہہ..... بیویوں کے بغیر بزنس چلا کر تو دکھائے..... سارا دم ٹم نہ ٹکل جائے تو میرا نام بدل دے۔ اپنی بھینجی کو بتاؤ کہ تم اس وقت پھانسی کے پھندے پر لٹک رہے ہو..... اگر وہ قسمیں بچا سکتی ہے تو بچالے۔ شرجیل کی تم فکر نہ کرو..... میں اگر آج اسے عاق کر دوں تو کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جائے گا۔ اسے اس رشتے پر ہاں کرنا ہی ہوگی۔“

”اس کے پاس بھی اور کوئی راستہ نہیں وہ یہ بزنس میرے بھروسے پر ہی تو کر رہا ہے ورنہ اس کے پاس ہے کیا۔ بی اے کی خالی خولی ڈگری..... کئی بی اے تو چڑا ہی بھرتی ہونے کے لیے بھی نہیں کرتے رہتے ہیں.....“ راہیل صاحب فیسے سے پھٹکارے ہوئے بولے۔

اسے کچھ کچھ بات سمجھ میں آگئی تھی اور وہ تقریباً بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس بات کے پیچھے کیا وجہ جال بچھا ہے اور شرجیل بھی یقیناً اس سے ناواقف تھا..... اس لیے تو اس نے آسانی سے اس رشتے سے انکار کو قبول کر لیا تھا..... اس کا دل جیسے پھٹنے کو تھا وہ بے حد پریشان تھی۔ اس سے وہاں رکنا محال ہو گیا وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ شدید شش و پنج کا شکار تھی..... اسی لیے انور چچا اس پر اتنی سختی کر رہے تھے ورنہ وہ اتنے سخت مزاج نہیں تھے وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ پورے دن سے گاڑی دیورس کرنے کی آواز آئی..... اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔

راحیل انکل گیٹ سے باہر چاچے تھے اور انور چچا انتہائی مایوسی میں گیٹ کے پاس کھڑے تھے اور انھیں جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ وہ جیسے ہی اندر آئے سسلی چچی ان پر برسنے لگیں، وہ ہمیشہ ان کی خوب بے عزتی کرنے کی عادی تھیں۔

”سنو..... انور تمہاری جماعتوں نے ہمیں آج یہ دن دکھا دیا ہے..... آئندہ اس شخص کو گھر نہ آنے دینا ورنہ تم دونوں کو دھکے مار کر باہر نکال دوں گی۔ یہ تو فیاں تم کرو اور سزا کیس ہم بھگتیں.....“ سسلی چچی غصے میں بولیں، چچا خاموش تھے۔ انور کمرے کے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر باتیں سن رہی تھی۔

”کہاں گیا وہ سب پیسہ نہ جانے کس کس کو عیش کروائے اور اب اتنا قرضہ چڑھا لیا ہے۔“

”خدا گواہ ہے سسلی ایسی کوئی بات نہیں..... بس میری نا تجربہ کاری مجھے لے ڈوبی۔“ چچا رو ہانے لہجے میں بولے۔

”تم تو ہو ہی ایک نمبر کے یہ قول، گاڈ دی..... تم جیسے شخص کے ساتھ تو شادی کرنا ہی میری سب سے بڑی غلطی تھی..... تم تو اس قابل ہی نہ تھے۔“ انور کو بہت افسوس ہو رہا تھا سسلی چچی ان کی اتنی بے عزتی کر رہی تھیں اور وہ خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے۔ انور کو ان پر ترس آنے لگا پھر ایک دم خاموشی چھا گئی..... چچا اس کے پاس بھی نہیں آئے وہ بھی کمرے میں بند رہی۔

”وہ دن بعد راحیل انکل کا فون پھر آ گیا..... وہ شاید دوبارہ ان کا وعدہ یاد دلار ہے تھے اور چچا ہوں نہیں کر کے سن رہے تھے۔“

اس کے پی۔ اے کے فائل ایگزامز ہونے والے تھے اور وہ کتابیں بیڈ پر پھیلانے کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب دروازے پر دستک ہوئی اور چچا کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ بہت شکست اور پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ انور انھیں دیکھ کر چمک گئی۔

”انور بیٹی..... آج میں تم سے کچھ بات کرنے آیا ہوں اور پھر فیصلہ تمہارا ہوگا..... یوں سمجھو آج تمہارے سامنے تمہارا چچا نہیں تمہارا مرحوم باپ ہے جس سے تم بہت پیار کرتی تھیں اور میں بھی تم سے اتنا ہی پیار کرتا ہوں..... میری کوئی اولاد نہیں لیکن خدا گواہ ہے تمہیں میں نے اپنی اولاد سے کم نہیں سمجھا.....“ انھوں نے اسے راحیل انکل کے ساتھ کی گئی ساری ذیل بتادی۔

”اب تمہارے ہاتھ میں میری عزت ہے..... کیا تم چاہو گی کہ میں یوں بے عزت ہو کر مر جاؤں۔ اگر راحیل کو اس کا پیسہ دالیں نہ ملا تو تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ وہ کس حد تک گر جائے گا اور میں اگر اپنے جسم کا ایک ایک بال بھی بیچ دوں تو اس کا قرض نہیں اتر سکے گا..... پلیز..... مجھے بچاؤ مجھے معلوم ہے تم ولیم کو پسند کرتی ہو اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے اور مجھے تمہارے رشتے پر قطعی کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن میں بہت مجبور ہوں..... بہت مجبور..... اور اس گھر کی بات بھی باہر نہ جائے میں یہی چاہتا ہوں..... کیا تم میرے لیے یہ قربانی دے سکتی ہو..... کیا تم یہ کر سکتی ہو؟“ چچا نے روتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے..... وہ انتہائی بے بس لگ رہے تھے۔

”پلیز..... انور چچا..... آپ کیا کر رہے ہیں بہت کریں کچھ نہیں ہوگا ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے اور یقیناً اس کا بھی ہوگا، آخر آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں مجھے تو اس ساری بات کے بیک گراؤ کا علم ہی نہیں۔ آپ پلیز مجھے کچھ بتائیں تو سہی آخر بات کیا ہے.....؟“ انور نے دھجے لہجے میں کہا۔

”راہیل ان دنوں لاہور میں تھا اور اس کی ریٹائرمنٹ قریب آ رہی تھی جب تمہارے ڈیڑی کا انتقال ہو گیا..... تمہاری جائیداد تمہارے نام منتقل کروا تا رہا تھا۔ خدا گواہ ہے میرے دل میں رتی بھر بھی بے ایمانی نہیں تھی میں بے وقوف ضرور ہوں مگر بے ایمان نہیں..... جب اسے تمہارے ڈیڑی کی وصیت کا بھی علم ہو گیا جس میں مجھے تمہارا گارڈین بتایا گیا تھا، مجھے تب بھی قطعی علم نہیں تھا اس نے کیا پلاننگ کر رکھی تھی۔ اس نے مجھے کنوئیں کر لیا کہ میں تمہارا سارا پیسہ کاروبار میں لگا دوں تاکہ تمہارا مستقبل محفوظ کیا جاسکے اس ضمن میں، میں نے تمہارا گھر بھی بینک میں رہن رکھ دیا۔ اس نے چچو کی ملیا میں شوگر مل لگانے کو کہا پھر خود ہی ارادہ بدل لیا اور کیمیکلز فیکٹری لگالی۔ اس نے نقصان میں مجھ سے ففٹی پرسنٹ پر ڈیل کی جبکہ پرافٹ میں ٹوٹی پرسنٹ پر۔ جب میں نے دے بے گفتگوں میں احتجاج کیا تو کہنے لگا کہ تم تو صرف پیسہ انویسٹ کر رہے ہو جبکہ میں پیسہ بھی انویسٹ کر رہا ہوں اور اپنی محنت بھی۔

ایک سال تو آرام سے گزر گیا۔ پرافٹ بھی ٹھیک ٹھاک ملا..... وہ میں نے تمہارے اکاؤنٹس میں جمع کروا دیا پھر نہ جانے کیا ہوا ایک سال بعد مجھے خبریں ملنا شروع ہو گئیں کہ بزنس خسارے میں جا رہا ہے، کیسے خسارے میں جا رہا ہے مجھے علم نہ ہوسکا۔ سوائے اس کے کہ کنسٹنٹ کینسل ہو گئی۔ یہ ہو گیا وہ گیا..... انہی دنوں بینک سے نوٹس ملے شروع ہو گئے کہ جو لون لیا تھا مارک اپ سمیت اسے واپس کیا جائے میں تو شدید الجھ گیا پھر راہیل نے مجھے منتیں لاکھ روپے دیے کہ میں بینک کا قرضہ واپس کر دوں میں نے کر دیا۔ پھر وہ سب کچھ بیچ کر کراچی چلا گیا۔ اب دو سال بعد اس نے وہ پیسہ اور پچھلا پیسہ ملا جلا کر میری طرف اسی لاکھ نکال دیے ہیں..... اور تم تو جانتی ہو میرے پاس پھونکی کوڑی نہیں ہوتی۔ مشکل سے یہ دس مرلے کا گھر بتایا ہے اور جاب بھی کیسی ہے تم سب جانتی ہو..... میں سخت پریشان تھا تو اس نے ایک اور آفر دی کہ میں اس کے جیے شرجیل کے ساتھ ففٹی پرسنٹ لاس اینڈ پرافٹ پر گارنٹنٹ فیکٹری لاہور میں لگاؤں میں نہ مانا تو کہنے لگا کہ اب تمہاری بیٹی اس قابل ہو چکی ہے اس کو کاروبار میں شریک کر لو..... میں نے پہلے تو نہ کر دی اس نے مجھے انکسپلا میٹ کرنا شروع کر دیا کہ یا تو میں اس شیئر پر رضامند ہو جاؤں یا اس کی رقم واپس کروں..... مجبوراً مجھے ایسا کرنا پڑا کیونکہ راہیل کو تمہاری امریکا والی جائیداد کا بھی علم تھا، میں نے جب سرمائے کی کمی کی بات کی تو اس نے خود ہی امریکا والی پراپرٹی یاد دلائی اور مجھے چاروٹا چارایا کرنا پڑا۔ مجھے پھر بھی یقین تھا کہ وہ دوست ہو کر مجھ سے کوئی ایسی ویسی ڈیل نہیں کرے گا۔ جب ڈیل ہو گئی تو اس نے تمہارا رشتہ مانگ لیا میرے تو قدموں تلے زمین نکل گئی۔ میں تو قطعی یہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسا گنیمت جال بچائے گا اور تم نے وہاں نوٹ کیا ہوگا کہ اس نے ڈاکو منٹس پہلے سے ہی بنوا کر رکھے تھے، ہمیں ڈسکس کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اب میں نے یہاں وکیل سے ڈسکس کیے ہیں تو میں حیران رہ گیا ہوں کہ ہم تو بری طرح پھنس چکے ہیں۔

”انکل..... یہ آپ نے کیا کیا.....؟“ اتکا بڑا نقصان..... ڈیڑی نے آپ پر ہی تو اعتماد کیا تھا اور آپ نے اتنے بڑے ہینڈلرز کیسے ہیں۔“ نور پریشانی سے بولی۔

”ہاں..... لیکن اب میں کیا کر سکتا ہوں ہمارے پاس تو کوئی راستہ نہیں اس نے ہماری ساری کشتیاں جلا دی ہیں۔“

”آخر شادی کیوں ضروری ہے..... مجھے زندگی میں پیسے سے زیادہ اپنا سکون چاہیے..... اپنی خوشی عزیز ہے میں ایسے مکار لوگوں میں کیسے

زندہ رہ پاؤں گی جنہیں پیسے کی اتنی ہوس ہے..... انکل یہ ناممکن ہے..... میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی، مجھے تو ایسے لوگوں کے سائے سے بھی خوف آتا ہے اس قدر لاچکی اور مکار لوگ ہیں..... اور ویسے بھی میری کسی اور کے ساتھ کمنٹسٹ ہے۔“

”جینا میں سب جانتا ہوں لیکن پھر بھی میں مجبور ہوں اگر تم شادی سے انکار کرتی ہو تو سارا پیسہ تو جائے گا ہی ساتھ ساتھ اس نے جو قرضوں کے بوجھ ہم پر لا دیے ہیں وہ ہم کہاں سے ادا کریں گے..... ہمارے پاس تو اس شخص نے ایک کوڑی تک نہیں چھوڑی..... قصص ہر صورت میں یہ شادی کرنا ہوگی۔“

”انکل اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ شادی کے بعد وہ آپ کو تنگ نہیں کرے گا۔“

”جینا تم سمجھ کیوں نہیں رہیں..... وہ سب جانتا ہے کہ ہمارے پاس کچھ نہیں، دراصل جو فنقی پرسنٹ شیئرز پر فیکٹری کی ڈیل ہوئی ہے وہ اپنے فنقی پرسنٹ میں تمہارے فنقی پرسنٹ ملا کر مکمل طور پر مالک بننا چاہتا ہے، وکیل نے مجھے یہی بتایا ہے۔“

”اُف..... آپ نے یہ کیا کیا.....؟“

”میں تمہارا گنہگار ہوں لیکن ایک امید ہے کہ شرجیل باپ سے بہت مختلف ہے اور اچھا انسان ہے..... وہ قصص خوش رکھے گا۔“

”انکل مجھ سے میری ساری خوشیاں چھیننے کے بعد آپ کن خوشیوں کی بات کر رہے ہیں..... آپ نے تو میرا سارا کچھ چھین لیا، مجھے کچال کرنا چاہ رہے ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرا آئے۔

”جینا پلیز ان سفید بالوں کی لالچ رکھ لو مجھے اس شخص کے ہاتھوں ڈیل ہونے سے بچالو..... میں مانتا ہوں کہ میں تمہارا مجرم ہوں اور شاید میں اپنے آپ کو ساری زندگی معاف نہ کر سکوں..... آئی ایم اے گریٹ فلیمر..... بٹ پو.....“ چچا نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور مولے مولے آنسو ان کا چہرہ تر کرنے لگے..... وہ تڑپ اٹھی۔

”انکل بس کریں۔“ وہ ان کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے بولی تو وہ باہر نکل گئے اور وہ شدید الجھن کا شکار ہو گئی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حالات اس قدر خراب ہو جائیں گے۔ وہ بری طرح جکڑی جا چکی تھی..... ہر طرف گرداب تھے اور وہ سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کر رہی تھی..... کبھی کبھی حالات کیسے انسان کی گرفت سے نکل جاتے ہیں اسے اندازہ بھی نہیں ہو پاتا..... وہ مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی مگر اب وہ بھی لمحہ بہ لمحہ بکھر رہی تھی..... جب سے صورت حال کھل کر سامنے آئی تھی۔ سلی چکی ہر وقت چچا کی بے عزتی کرتی رہتیں اور وہ خاموشی سے سب کچھ سنتے جاتے۔ چچا کے ساتھ وہ اسے بھی باتیں ستانے سے گریز نہ کرتیں۔ وہ بہت تلخ ہو جاتی تھیں مگر دل سے ہمدردی بھی بہت کرتی تھیں..... اسی لیے تو اس نے ان کے پاس رہنے کا فیصلہ کیا تھا وہ ان کی باتوں کا برا نہیں مانتی تھی مگر چچا کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا دماغ سوچ سوچ کر تھک جاتا تھا..... ہر وقت سوچا آنکھوں کے سامنے گھومتا جس سے اس نے زندگی کی آخری سانسوں تک ساتھ نبھانے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ انسانی دعوے کتنے پورے ہوتے ہیں اور وہ جو دیکھنے کو کھلے..... وہ انتہائی بے بسی سے سوچ رہی تھی۔

شوق بہت پریشان تھی..... ماما کے آخری لمحات اور اس کی ہٹ دھرمی سب کچھ اندر ہی اندر اسے مجھوڑ رہا تھا..... اسے سرزنش کر رہا تھا اس نے جو کچھ بھی کیا غلط کیا..... وہ تو ماں تھیں اور شاید ایک مجبور ماں وہ کیوں اتنی کٹھود ہو گئی..... سب کے سمجھانے کے باوجود..... کاش اسے اندازہ ہوتا کہ بعد میں وہ اتنی مضطرب ہو جائے گی تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتی۔ اسے ماما کے الفاظ شدت سے یاد آ رہے تھے..... جب وہ ولیم کا خیال رکھنے کے بارے میں کہہ رہی تھیں.....

میں کیسے اسے بھائی مان لوں..... میرا بھائی تو صرف آقا قاتل تھا..... یہ..... یہ تو ماما کا بیٹا ہے..... میرا اپنا بھائی مجھ سے روٹھ کر چلا گیا تو یہ کیسے میرا بھائی بن سکتا ہے..... بھائی تو دکھوں کو سمجھنے والے اور انھیں شیر کرنے والے ہوتے ہیں..... جو بہنوں کے لیے مضبوط ڈھال ہوتے ہیں، ان کی آہوں پر تڑپنے اور پلکنے والے..... ان کے آنسوؤں کو پونچھنے والے جو دلوں کے قریب رہتے ہیں..... جس کے ہارے میں سوچنے سے روح بھی سرور ہو جاتی ہے..... مجھوں بھرا یہ رشتہ کس قدر انمول ہے مگر میں اس رشتے کی لطافت سے بے بہرہ رہی۔ آقا قاتل کبھی بھی ایسا بھائی نہ بن سکا جو میرے لیے کبھی ڈھال بننا..... جس کی موجودگی سے میری روح بھی سرشار ہو جاتی جو میرے کبھی آنسو بھی پونچھتا..... وہ تو کچھ بھی نہ کر سکا لیکن وہ تھا تو طمانیت کا اک احساس تھا کہ پوری دنیا میں میری ماں کی نشانی میرے پاس ہے..... ہمارے وجودوں میں ماں کی آغوش کی خوشبو ایک جیسی تھی اور میں اسے اپنے لیے قیمتی سرمایہ سمجھتی تھی..... پوری دنیا میں میرا اپنا بھائی..... یہ میرا بھائی کبھی بھی نہیں بن سکے گا اور میں اسے کبھی بھی آقا قاتل کی جگہ نہیں دے سکوں گی..... یہ کیسے ممکن ہے..... وہ اپنے آپ کو جھٹلاتی اور پھر ماما کا چہرہ نظروں کے سامنے گھومنے لگتا جنھوں نے آخری لمحات میں بس یہی اک آرزو کی تھی۔ انھوں نے اس سے کچھ بھی طلب نہیں کیا تھا اور اس کے کندھوں پر کتنی بڑی ذمہ داری ڈال دی تھی۔ ماما نے ایسا کیوں کیا..... وہ؟ وہ سب کچھ جانتی بھی تھیں پھر بھی انھوں نے مجھے آزمائش میں ڈال دیا۔ وہ جھٹلانے لگی تھی، ماما پر اسے غصہ آنے لگا انھوں نے مرکز بھی مجھے آزمائش میں ڈال دیا..... لیکن اگلے ہی لمحے کسی نے بری طرح سرزنش کی۔ یہ ماما کی آرزو تھی..... اور مجھے یہ پوری کرنی ہے..... لیکن..... نہیں..... یہ ناممکن ہے وہ ایک دفعہ اپنے آپ کو سمجھاتی تو دوسرے ہی لمحے جھٹلا جاتی۔ وہ سخت کشمکش اور شش و پنج میں مبتلا تھی پھر وہ اچانک انھی اور موصد کے کمرے کی طرف بڑھی..... دروازہ کھولنے سے پہلے ایک دفعہ اس کے قدم دھچک گئے..... وہ جھٹلا گئی..... پھر زور سے دروازہ کھول دیا۔ موصد ایک اسلامی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا اس نے سر اٹھا کر اور قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ.....؟ آجائیں.....“ وہ قدرے آہستگی سے بولا مبادا وہ کہیں پھر ناراض نہ ہو جائے۔

”نہیں..... میں جا رہی ہوں.....“ وہ پھر مزاحی موصد خاموشی سے اسے دیکھتا رہا وہ پھر جھٹلا گئی..... اور اس کی طرف مڑ کر دیکھا وہ حیرت سے ہونٹوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا..... وہ جو کچھ کر رہی تھی وہ قطعی نارمل رویہ نہیں تھا۔

”کیا آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں؟“ وہ اس کی بے چینی اور جھٹلاہٹ دیکھ کر بولا۔

”سنو..... کیا تم ماما سے بہت محبت کرتے تھے؟“ اس کے اس اچانک سوال پر وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

”ہاں..... اور..... آپ.....؟“

”نہیں..... میں ہانکل نہیں..... میں ان سے محبت نہیں کرتی تھی۔“

”کیا اب بھی نہیں..... جبکہ وہ اب اس دنیا میں نہیں۔“

”ہاں..... اب بھی نہیں وہ ہمارے لیے تب ہی مر گئی تھیں جب ہمیں چھوڑ کر.....“

”میرے ڈیڈی سے شادی کر لی۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”ہاں.....“

”بار بار اس بات کو دہرانے سے قانکہ..... اب آپ مجھے کیا بتانے آئی ہیں؟“ موصد نے اطمینان سے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

”میں..... میں، کچھ بھی نہیں.....“ وہ پھر مڑنے لگی۔

”آپ کیوں پریشان ہیں آپ کو مجھ سے اگر کچھ کہنا ہے تو آپ کہہ سکتی ہیں۔“

”تم میرے بھائی نہیں ہو اور میں تمہاری آپلی بھی نہیں..... سنا تم نے ا“

”آپ کی دونوں باتیں غلط ہیں..... میں آپ کا بھائی بھی ہوں اور آپ میری آپلی بھی ہیں، میں سگاتہ سبکی سوچتا تو ہوں..... اور خدا نے

جو ہمارے درمیان رشتہ بنایا ہے آپ اس کو کبھی مٹا نہیں سکتیں۔

”میرا بھائی صرف آقا تھا اور وہ مر گیا ہے.....“ وہ قلعیت سے بولی۔

”لیکن آپ میری بہن ہیں اور جب تک میں زندہ ہوں آپ میری بہن رہیں گی اور میں آپ کو دل سے اپنی بہن مان کر عزت کرتا

رہوں گا۔“ وہ بھی بڑے سکون لہجے میں بولا۔

”شفق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا..... اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی کے پیچھے رقصاں سچائی کو محسوس کیا اور اس کے قریب صوفے

پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔

”یہ محبت ہے جو ہانکل انجانے لوگوں کو بھی دل کے ساتھ قریب لے آتی ہے کہ رشتے دار یاں بھی پیچھے رہ جاتی ہیں اور میں آپ سے بہت

محبت کرتا ہوں..... آپ کو دیکھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میری ماما میرے سامنے آ گئی ہیں آپ کو سنتا ہوں تو لگتا ہے ماما مجھ سے بات کر رہی

ہیں..... کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ اپنے دل سے ساری غزلیں ختم کر دیں..... ساری رنجشیں..... اور ہم دونوں بہن بھائی ایسے رہیں جیسے تبسم آتی اور حیدر

انکل ہیں..... وہ دونوں بھی تو مجھے بہن بھائی نہیں لیکن آتی، انکل سے کس طرح محبت سے ملتی ہیں۔ ان دونوں کو دیکھ کر میں اکثر خدا سے دعا کرتا تھا

کہ وہ مجھے بھی ایسی بہن دے، سچی محبت کرنے والی، بلائیں لینے والی..... کیا آپ میری ایسی بہن نہیں بن سکتیں؟“ موصد نے اس کی آنکھوں میں

جھانکتے ہوئے بہت محبت سے سوال کیا۔

”یہ ناممکن ہے.....“

”لیکن میں اس کو ممکن بناؤں گا.....“ موصد نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور محبت سے انہیں اپنی آنکھوں

کے ساتھ لگایا۔ شفق چمک گئی، اس کے لیے محبت کا یہ لمس، یہ احساس اتنا نیا اور لطیف تھا کہ وہ حیران رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیسے اور کہاں سے ڈھیروں آنسو بھر آئے وہ اس کی محبت کے آگے کوئی بند نہ باندھ سکی اور بالکل مزاحمت نہ کر سکی۔ آفاق تو اس کا سچا بھائی تھا مگر اس نے کبھی ایسے نہیں کیا تھا..... اس نے تو کبھی محبت سے اسے چھوا بھی نہیں تھا اور جسے وہ بھائی ماننے کو تیار ہی نہیں تھی اس نے کیسے ایک ہی منٹ میں اجنبیت کی ساری دیواریں مسمار کر دیں تھیں، اسے اپنی محبت کے حصار میں لے لیا تھا..... اور اسے چوکا دیا تھا..... اس کے اندر اتنی محبت اور وارفتگی کہاں سے عموماً آئی تھی، شاید اس کے اندر محبت کا چشمہ فراوانی سے بہتا تھا جس نے اسے ایک ہی لمحے میں سیراب کر دیا تھا کہ اس کی روح بھی سرشار ہو گئی تھی..... اس کا بھی ہاتھ محبت سے اس کی طرف بڑھا اور اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا..... وہ اس کے قریب آیا اور اس کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا..... اس نے محبت سے اس کی پیشانی کو چھوا اسے یوں محسوس ہوا جیسے آفاق اس کے سامنے تھا اس کا چھوٹا، پیارا سا بھائی، اس کا ماں جاپا..... وہ بھی بے حد سرور و ہور ہوا تھا..... اسے اس سے ماما کی خوشبو آ رہی تھی..... اس کی بہن، ماما جیسی کتنا خوبصورت رشتہ تھا، کتنا قریبی اور کتنا منفرد..... قدرت نے دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت بھری تھی اور دونوں اس محبت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ فرط جذبات سے دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔



وہ سخت غصے میں تھی جب اچانک شرجیل کا فون آ گیا وہ کچھ روز کے لیے ہانگ کاٹھ، فیکٹری کی نئی مشینری خریدنے کے لیے گیا تھا اور جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ نور نے کئی دفعہ اسے رنگ کیا تھا تو اس نے فوراً ہی اس سے رابطہ کیا وہ ہر بات سے لائٹم تھا یہ جان کر وہ حیران رہ گئی۔

”شرجیل..... آپ کے کڈیڈی ہر ممکن یہ چاہ رہے ہیں کہ ہماری شادی ہو جائے۔“ وہ بہ مشکل بولی۔

”لیکن وہ کیوں بھند ہیں..... میں نے تو انہیں آرام سے بگھادیا تھا کہ ایسا ہونا ناممکن ہے پھر بھی..... نہ جانے کیوں.....؟“ وہ خود ہی حیرت سے بولا۔

”کیا واقعی آپ سے انہوں نے کچھ ڈسکس نہیں کیا.....؟“

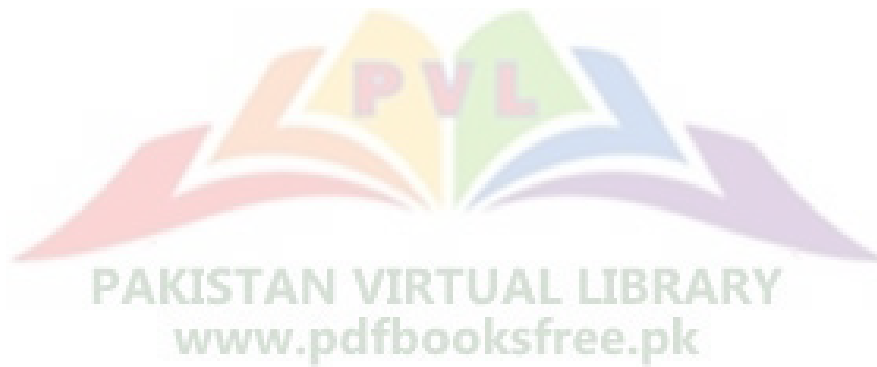
”بھدا بالکل نہیں..... میں تو آج ہی ہانگ کاٹھ سے لوٹا ہوں اب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں.....؟“

”معلوم نہیں.....“ وہ آہ بھر کر بولی۔

”نور..... میں نہیں جانتا کہ قدرت نے ہمارے لیے کیا فیصلہ کیا ہے میں پوری کوشش کروں گا کہ ایسا نہ ہو لیکن اگر خدا نے ہماری قسمتوں میں کچھ ایسا لکھ دیا ہے تو یقین رکھنا میں مشکل انسان نہیں..... آپ کی جو بھی کمینٹ کسی سے ہے وہ میرے لیے محترم رہے گی..... اور میں وعدوں پر نہیں حقیقت اور عمل پر یقین کرنے والے بندہ ہوں۔ آئی ایم ہنڈرڈ پرسنٹ پر ٹیکنیکل“ نور خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ فیکٹری کا بچہ ورک مکمل ہو چکا تھا اور اب اسٹیبلشمنٹ کے مراحل میں تھی لیکن جب سے یہ صورت حال پیدا ہوئی تھی اس کا دل ٹوٹ سا گیا تھا..... گو کہ بچانے ہی یہ کام شروع کیا تھا مگر اس کی دلچسپی بھی بڑنس میں تھی اور اب نہ دلچسپی رہی تھی نہ کسی قسم کا جذبہ..... ہر چیز جیسے جہاں کی طرف گامزن تھی..... سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہو گیا تھا..... وہ جو لکھوں میں معاملات حل کرنے کی دعوے دار تھی اور اسے اپنی صلاحیتوں پر بہت

اعتماد تھا اب خود ہی کشمکش کا شکار ہو گئی تھی۔

الور چچا اس کی طرف ایسی بے بس نگاہوں سے دیکھتے کہ اس کا دل کٹنے لگا۔۔۔۔۔ انھوں نے گھر سے باہر جانا چھوڑ دیا تھا ہر وقت اپنے کمرے میں بند رہتے اور جب اس کی طرف دیکھتے تو آنکھوں میں اُن گت سوال اور الجھتا نہیں ہوتیں۔ سلیٹی چچی اٹھتے بیٹھتے ان کو صلو اتیں سناتی رہتیں۔۔۔۔۔ ایسا لٹا پٹا شخص جس کی سادہ لوحی نے اسے اس حال تک پہنچا دیا تھا، اب کسی مجھڑے کا منتظر تھا۔ راحیل اٹکل کا جب بھی فون آتا ان کے اوسان خطا ہو جاتے۔۔۔۔۔ اور اس وقت ان کی بے بسی ناقابل بیان ہوتی۔ ایسی صورت حال میں فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا خاموش تراشائی بن کر وقت گزارنا بہت کٹھن ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ ذمہ کی نے ایسے موڑ پر لاکھڑا کیا تھا جہاں ہر طرف کانٹوں کا جال بچھ گیا تھا اور اسے دامن پچائے بغیر اس جال کو پھلانگنا تھا۔۔۔۔۔ وہ کس طرح اپنے آپ کو پچائے یہ لکڑ دامن گیر تھی۔۔۔۔۔ اس کی ساری صلاحیتیں جیسے منجمد ہو گئی تھیں۔



تبسم آپادوسوں کے بعد واپس جاری تھیں اور حیدر سمیت گھر کے سب افراد بہت افسردہ تھے۔ ان کے وجود سے گھر بھر میں اجالا سا کھیل گیا تھا اور سب ان کی موجودگی سے اک حرارت سی محسوس کرتے..... اک مہربان بزرگ کی جن کی آنکھوں سے صرف اور صرف محبت کی شعاعیں ہی پھوٹی تھیں، لہجے سے مٹھاس اور محبت کی شیرینی سننے والے کے کانوں میں دس گھوٹی تھی..... انھوں نے ان دنوں جس طرح شفق اور موعده سے محبت کی تھی وہ کبھی بھی انھیں بھلا نہیں سکتے تھے۔ کرل منیٹ ایٹا اور ٹیغم انھیں لینے آئے تھے، وہ بھی انہی کی طرح بہت محبت کرنے والے تھے..... شفق اور موعده ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ایٹا ویسے تو ڈاکٹر تھی مگر اس کی عادتیں بالکل بچوں والی تھیں..... وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھرپور تہنہ لگاتی اور جان بوجھ کر احتجاج کرتی تاکہ ماما اور پاپا اس کی باتوں کو انجوائے کریں لیکن وہ اتنی احمق نہیں تھی جتنا وہ ظاہر کرتی تھی..... ان سب کی موجودگی میں وہ اپنی ساری تکلیاں تھوڑی دیر کے لیے بھلا بیٹھے تھے..... شفق اور موعده میں آہستہ آہستہ بے تکلفی پیدا ہو رہی تھی..... اجنبیت کی دیواریں گر رہیں تھیں..... وہ چھوٹی چھوٹی باتیں ڈسکس کرنے لگے تھے، شفق بھی کافی حد تک نارل ہو رہی تھی۔ کبھی اس کی ویل چیرے لے کر لاونج میں لے آتی تو کبھی کمرے میں اور اکثر اس کے لیے کھانا بھی لے جاتی..... تبسم آپا اور حیدر اس میں یہ تبدیلی دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور خدا کا شکر ادا کرتے۔

تبسم آنٹی کے بچوں کے قیام کے دوران تو وہ بہت خوش رہنے لگے تھے..... اب جب آنٹی جاری تھیں تو دونوں بھرا افسردہ ہو گئے تھے اور وہ انھیں بار بار تسلیاں دے رہی تھیں کہ وہ ان سے ملنے آتی رہیں گی۔ انھوں نے جس طرح موعده کو اسلامی آداب زندگی سکھائے تھے وہ ان سے بہت متاثر ہوا تھا..... خدا نے کیسے اس کے لیے خود بخود بندوبست کر دیا تھا وہ اکثر سوچ کر حیران رہ جاتا۔ اس نے ہلکی ہلکی داڑھی بھی رکھ لی تھی..... وہ پکا اور سچا مسلمان بننا چاہتا تھا۔ سنت نبوی ﷺ پر مکمل طور پر عمل پیرا ہونا چاہتا تھا۔ اسلام اور ایمان کی تابانیوں سے اپنے وجود کے ایک ایک گوشے کو منور کرنا چاہتا تھا وہ نام نہاد مسلمان بن کر زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا..... وہ اہدیت اور لاقائیت کے وسیع بحر میں غوطہ زن ہونا چاہتا تھا..... ان کے جانے کے بعد دونوں افسردہ ہو رہے تھے اور حیدر، شفق کے کہنے پر دونوں کو گاؤں لے کر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ شفق موعده کو حویلی اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں سب کچھ مزے لے لے کر بتا رہی تھی اور وہ حیرت سے سن رہا تھا۔

"شفق آپنی..... نور کو بھی ساتھ لے لیں....." اس نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"ہاں..... ہاں..... کیوں نہیں تم اسے فون کرو..... خوب مزہ آئے گا اور وہ اتنے دنوں سے آئی بھی نہیں۔" شفق پکٹک کرتے ہوئے بولی۔

"اس کے بی۔ اے کے ایگزاحر ہونے والے ہیں نا..... پڑھائی میں بہت مصروف ہے میں ابھی اسے فون کرتا ہوں وہ ہمارے ساتھ جانے پر ضرور تیار ہو جائے گی۔" اس نے خوشی خوشی اسے فون کر کے آنے کو کہا۔ وہ تھوڑی دیر بعد اس کے سامنے تھی مگر کچھ کچھ خاموشی تھی۔ موعده اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کچھ دلیلی بھی لگ رہی تھی، اس کی سفید رنگت بھی پیلا ہٹ کا شکار ہو گئی تھی اور آنکھیں ایسے سوچی تھیں جانے کب سے سوئی نہیں تھی۔

"کیا بات ہے پور..... تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟" موعده نے حیرت سے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں..... تمہارا وہم ہے..... اور تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟" اس نے ارد گرد پیک سامان دیکھ کر پوچھا۔ شفق اس سے مل کر دوسرے

کرے میں تیار ہونے چلی گئی تھی۔

”ہم لوگ گاؤں جا رہے ہیں..... تم بھی ہمارے ساتھ چلو نا.....!“ وہ خوش ہو کر بولا۔

”نہیں..... میں نہیں جاسکتی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”کیوں.....؟“ نور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اپنے بیک کی طرف ہاتھ بڑھایا موصد حیرت سے اس کو آہستہ کر رہا تھا اس

نے ویڈیو کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”یہ..... یہ..... یہ کیا ہے.....؟“ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

”کھول کر دیکھ لو.....“ وہ آہستہ سے بولی۔ اس نے بے مبری سے لٹافہ کھولا..... اس کے ہاتھ مسلسل کانپ رہے تھے۔ اس نے مشکل

سے کارڈ کھولا..... اس کے جذبات میں شدید عظام پیدا ہونے لگا..... سارا جسم پسینے میں نہا گیا اس نے گھبراتے ہوئے کارڈ کھولا تو ایک دم چیخ کر اپنی

جگہ سے اٹھ گیا..... نور سر جھکائے بیٹھی تھی..... اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

”تم ایسا نہیں کر سکتی ہو..... تم..... نور..... تم نے جو مجھ سے وعدہ کیا تھا کیا تم بھول گئیں..... اتنی جلدی.....“ اس کی آنکھوں سے آنسو

بس چھلکنے کو ہی تھے۔ نور نے اس کی آواز کے ارتعاش سے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔

”موصد..... تم کھڑے ہو گئے! کیا تم جاننے ہو کہ تم ٹھیک ہو گئے ہو!“ وہ حیرت اور خوشی سے چلا رہی تھی مگر وہ اس کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔

”اس بات کو چھوڑ دو..... اور مجھے جواب دو۔“ وہ کچھ اور سننے کے موڑ میں نہیں تھا۔

”کیا..... اس بات کو چھوڑ دوں جس کے لیے میں نے اتنے وعینے اور دعائیں کیں اور خدا نے کیسے لمحوں میں یہ معجزہ کر دیا..... آئی ایم

رنگل سوہی۔“

”پلیز نور..... میرے لیے اس وقت کچھ اہم نہیں سوائے تمہارے..... تم نے ایسا فیصلہ کیوں کیا بولو..... جواب دو۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”رشتوں کو بچانے کے لیے کبھی کبھی بہت بڑی قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں اور مجھے بھی یہ کرنا پڑا.....“ وہ منہ دوسری طرف کر کے بولی۔

”تم ایسا نہیں کر سکتیں..... اور مجھ سے جو وعدہ کیا تھا۔“

”میں ہمیشہ یہ بھی تو کہتی تھی بشرطیکہ خدا بھی ایسا چاہے اور موصد اب خدا ایسا نہیں چاہ رہا..... وہ ہمارا ساتھ نہیں دے رہا..... میں نے اس

کے آگے بہت ہاتھ جوڑے ہیں، بڑی دعائیں کی ہیں..... بہت واسطے دیے ہیں مگر..... مگر نہ جانے وہ یہ دعا کیوں نہیں سن رہا..... میں کیا کروں۔“

وہ بھی رد ہانے لہجے میں بولی۔

”کیوں..... وہ کیوں نہیں سن رہا..... کیا وہ ہم سے محبت نہیں کرتا..... کیا وہ نہیں جانتا کہ ہم بھی کتنی محبت کرتے ہیں..... وہ کیوں ایسا چاہ

رہا ہے؟“

”شاید وہ ہماری آزمائش کرنا چاہ رہا ہے.....“ وہ آہ بھر کر بولی۔

”نہیں..... وہ ہمیں توڑنا چاہتا ہے..... منتشر کرنا چاہتا ہے وہ..... وہ کیوں ایسا کر رہا ہے اور میرے ساتھ ہر دفعہ ایسا کیوں کرتا ہے پہلے ماما اور اب تم..... نہیں یہ نہیں ہوگا۔ میں بکھر رہا ہوں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”موحد..... مجھے رونے والے مرد پسند نہیں میرے سامنے مت رویا کرو..... مجھ سے تمہارے آنسو برداشت نہیں ہوتے کبھی بھی نہیں۔“ وہ آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ چہرہ دوسری طرف کر کے بولی۔

”اور تم بھی تو رورہی ہو۔“

”لیکن میں تمہیں مضبوط دیکھنا چاہتی ہوں..... ایسا مضبوط کہ پھاڑ بھی تم پر ٹوٹ پڑیں تو تم گھبراؤ نہیں..... یہ میری خواہش ہے شاید آخری خواہش۔“ موحد پھر رونے لگا۔ وہ سسکیاں بھر رہا تھا اور وہ بھی خنم آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی مگر کچھ بول نہیں رہی تھی۔

”نور..... خدا ہمارے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے؟“ وہ روتے ہوئے بولا۔

”شاید ہم زندگی میں جس شے اور جس ہستی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں وہ زندگی میں ایک بار ضرور اسے ہمارے سامنے آزمائش بنا کر کھڑا کر دیتا ہے..... کبھی محبتوں میں آزماتا ہے تو کبھی جذباتوں میں اور کبھی رشتوں میں..... اور میں تو ہمیشہ رشتوں میں آزمائی جاتی رہی ہوں اور اب جذبے سے بھی ہار گئی۔“

”ایسی کیا قیامت آگئی ہے کہ شرجیل سے تمہاری شادی بہت ضروری ہے۔“

”میں کیا کہوں..... میرے پاس کہنے کو کچھ بھی تو نہیں جب خدایٰ کسی بات کو ہمارے لیے بہت ضروری بناوے تو فرار کہیں ممکن نہیں..... میرے لیے بھی فرار کا کوئی راستہ نہیں میں اس کو چیلنج نہیں کر سکتی۔“

”تو پھر مجھے بتاؤ..... میں کیا کروں..... میں تو زندگی کا تصور بھی تمہارے بغیر نہیں کر سکتا میری سوچوں پر، میرے جذباتوں پر، میرے دل و دماغ پر، میری روح پر ہر جگہ تو تم ہو..... صرف تم، میں کیا کروں گا، میں پاگل ہو جاؤں گا یا پھر مر جاؤں گا۔“

”نہیں موحد، تمہیں کچھ نہیں ہوگا یاد ہے جب ہم ملے تھے تو میں ایک بات کہا کرتی تھی کہ معلوم نہیں ملاپ ہونا قسمت میں ہے کہ نہیں مگر میں اپنی زندگی میں اور ماضی میں ایک ایسی کھڑکی ضرور رکھنا چاہتی ہوں..... جب زندگی کے درد و غم سے گھبرا جاؤں تو اس سے تازہ جھونکے لینے کے لیے اسے کھول دوں..... کبھی کبھی نادانستہ کبھی ہوئی باتیں کیسے پوری ہو جاتی ہیں۔ میں وہ بات بھول گئی تھی اور خدا سے ہمیشہ اپنے اور تمہارے ملاپ کی دعا کرتی تھی لیکن وہ بھولی ہوئی بات کیسے سامنے آگئی اور موحد..... یاد ہے وہ اسکاٹ بروکن ہارٹس جس میں پرنس محبت میں ناکام ہوتا ہے تو پادری بن جاتا ہے اور لڑکی شہن..... مائی گاڈ..... دیکھو وہی اسکاٹ، وہی قسیم، وہی سب کچھ ہمارے ساتھ ہو گیا ہے اور اس وقت اسٹیج پر ہم کیسے سراپے گئے تھے صرف جذبات سے بھرپور ایکٹنگ کی وجہ سے اور اب حقیقت میں بھی ہم جذباتوں کی شدت کے ساتھ..... رخصت ہو رہے ہیں..... موحد کیسے کوئی غیر مرنی تو تم ہم سے سب کچھ کرواتے ہو ہم چلیاں ہیں اور کچھ نہیں۔“

”میں کچھ نہیں مننا چاہتا..... میں تمہیں جانے نہیں دوں گا..... یہ کیسے ممکن ہے کہ مجھے سارا کچھ آہستہ آہستہ دے کر اب سارا کچھ ایک دم

تجربہ ریز ہو۔ میرا نام..... میرا اعتماد..... میرے اندر پھیلی روشنی..... یہ سب تمہاری دین ہی تو ہے..... نہیں، میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔“ وہ بہت بے صبر اور ہاتھ۔

”موصد..... خدا شاید تمہیں کندن مانا چاہتا ہے..... ہم دونوں کا وقتی ملاپ شاید ایک دوسرے کی آزمائش تھا۔“

”میں کچھ نہیں جانتا..... تمہاری کوئی لاجب، کوئی ریزن کچھ بھی نہیں، بس تم ایسا کچھ نہیں کرو گی..... نور..... ایسا کرتے ہیں کہ نہ تم شادی کرو اور نہ میں..... ہم دونوں تنہا تنہا زندگی گزار لیں گے، کیا یہ بھی ممکن نہیں؟“

”نہیں..... کبھی کبھی کسی کو زندگی بچانے کے لیے اپنی سانسیں بھی قربان کرنا پڑتی ہیں، بس سمجھ لو اب میں بھی ایسی ہی مجبور ہوں۔“

”کس کی خاطر..... کون ہے وہ جو تمہیں مجھ سے بھی بڑھ کر عزیز ہو گیا..... کون ہے وہ خوش قسمت.....؟“

”میرے چچا..... میرے ڈیڈی کے بھائی، میرے رشتے دار..... جو مجھے اپنی بیٹی کہتے ہیں۔“

”ان کے لیے.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... انہی کے لیے۔“

”کیا وہ تمہیں مجھ سے زیادہ عزیز ہیں؟“

”نہیں.....“ وہ آدھ بھر کر بولی۔

”تو پھر..... کیوں مجھے الجھا رہی ہو..... تم ہمیشہ سے مجھے الجھاتی آئی ہو.....“

”تم سے تو میرا دل کا رشتہ ہے، دل کے رشتے تو اندر ہی اندر روح تک کو کھوکھلا کر دیتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی..... زہر میں مجھے بغیر کے مانند..... جو رنگوں میں بہتے خون کو آہستہ آہستہ زہر آلود کر دیتا ہے اور کسی کو پتا بھی نہیں چلتا..... مگر دنیا کی نظر میں یہ رشتے بالکل بھی اہم نہیں..... دنیا کو تو وہ رشتے چاہئیں جو نظر آتے ہیں وہ ان کو مضبوط دیکھنا چاہتی ہے، موصد دل کے رشتے ہار جاتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی مگر ہم چل پھر رہے ہوتے ہیں..... صحت مند انسانوں کے مانند بہتے، قہقہے لگاتے ہیں جبکہ ہمارے دل اس وقت بھی مسکایاں لہ رہے ہوتے ہیں۔ نہ جانے یہ کس کا المیہ ہے انسانوں کا..... جذبیوں کا..... یا پھر رشتوں کا.....“ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ شاید زندگی میں پہلی بار وہ اس کے سامنے یوں روئی تھی اور اس سے اس کے آنسو بھی برداشت نہیں ہو رہے تھے۔ نور جیسی لڑکی بھی رو سکتی ہے۔ جب دوسروں کی ہمت بندھانے والا خود ریزہ ریزہ ہوتا ہے اور شکستہ پر طائر کی طرح پھڑپھڑاتا ہے، روتا ہے اور سسکتا ہے تو پوری کائنات قہم سی جاتی ہے، ورنہ حیرت میں ڈوب جاتی ہے اور حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہے..... ہر انسان رک کر اسے دیکھتا ہے ایسا مضبوط انسان بھی یوں ٹوٹ سکتا ہے..... اشک بہا سکتا ہے جیسے مضبوط سنگلاخ پتھروں سے بھی جھٹلے جا رہے ہوتے ہیں۔ دونوں رونے لگے زندگی میں آخری بار یا پہلی بار ایسی شدت سے جس سے دل بھی شق ہوتے ہوئے محسوس ہوں اور کیلیے پھٹتے ہوئے..... شفق اچانک کمرے میں آئی تو چونک گئی موصد کھڑا تھا اور زہر ہاتھ لہو پٹھی تھی اور زہر ہی تھی۔

”کیا ہوا..... خیریت تو ہے..... تم دونوں کیوں رو رہے ہو.....؟“ شفق نے حیرت سے پوچھا۔

”اچھا اب میں چلتی ہوں۔“ نور بیک اٹھا کر باہر نکل گئی۔ وہ وہیں ساکت سا کھڑا رہا پھر اس کے پیچھے بھاگا۔۔۔۔۔ وہ گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔۔۔۔۔ اس نے اسے آواز دی وہ رکی اور سرخ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”نور۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ تمہارے لیے کیا دعا کروں؟“ اس نے گہرے دھکے سے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں چاہیے۔۔۔۔۔ کوئی دعا نہیں جب دنیا کی قیمتی شے ہاتھ سے چھوٹ کر گر جائے تو ساری زندگی انسان کیا دعا کر سکتا ہے۔ اس کے پاس تو کوئی آپشن ہی نہیں ہوتا اب تو زندگی کا سفر ہے جیسے تیسے اس کا سفر تو بننا ہی ہے مگر کیا تم میری ایک خواہش کو پورا کر دے گے؟“ اس نے استغما میرے لگا ہوں سے پوچھا۔

”کیا۔۔۔۔۔؟“

”یہ آنکھیں کبھی بھیگتے نہ پائیں، کبھی بھی نہیں، چاہے کسی دن میری موت کی خبر بھی سنو تب بھی نہیں۔۔۔۔۔“

”دل میں مخمخ بیست ہو۔۔۔۔۔ اور کوئی قطرہ خون بھی نہ بہے یہ ناممکن ہے میں یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔“ وہ دم آلود آنکھوں سے بولا۔

”تو کیا تمہارے دل سے میں یونہی خالی ہاتھ چلی جاؤں۔۔۔۔۔ وقت رخصت کوئی تھکے لیے بغیر۔۔۔۔۔“ اس نے زخمی لہجے میں پوچھا تو وہ دل مسوس

کر رہ گیا اور غم آنکھوں کے ساتھ بے تاب ہو کر اندر لوٹ آیا۔۔۔۔۔ اس سے ضبط نہیں ہو رہا تھا وہ لمحہ بہ لمحہ کھل رہا تھا ایسی بے قراری اور بے تابی کہ اس کا دل پھٹنے کو تھا۔۔۔۔۔ وہ جا چکی تھی اور شفق پریشان تھی۔ اس نے حیدر انکل کو فون کیا اور جیسے ہی وہ آئے نور کا کارڈ ان کے سامنے رکھ دیا وہ تو چونک ہی گئے اور لرزتے ہاتھوں کے ساتھ کارڈ کھولا۔۔۔۔۔ کارڈ پڑھا تو وہ آنسو نہ جانے کہاں سے آ کر کارڈ پر گرے۔۔۔۔۔ انھیں اپنے ہی کہے ہوئے الفاظ دکھ دینے لگے۔

”خدا کرے۔۔۔۔۔ جسے تم چاہتی ہو وہ تمہارا نصیب بھی بنے اور کتنے نصیب والے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا خدا یوں ملاپ کر دے انسان سوچے تو اسے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔“ وہ بھی انہی کی طرح نکل تھی کیا وہ دونوں بھی ایسے ہی تڑپتے رہیں گے، یا خدا یا۔۔۔۔۔ یہ کیسی آزمائش ہے نہ جانے یہ محبت کی معرکہ ہے یا پھر۔۔۔۔۔ آزمائشوں کی۔۔۔۔۔ ان کی دل کرچی کرچی ہو رہا تھا اور شہلا آنکھوں کے سامنے نہ جانے کہاں سے آ گئی تھی۔۔۔۔۔ ”دل کی دنیا کن ناموں سے آباد ہوتی ہے کسے خبر ہوتی ہے؟“ انھوں نے آہ بھری۔

حیدر انکل نے اس کے چچا سے رابطہ کیا اور انھیں روکنے کی کوشش کی مگر انھوں نے ذاتی معاملہ کہہ کر انھیں خاموش کر دیا۔ انھوں نے نور سے بھی بات کی مگر وہ بھی خاموشی سے سختی رہی اور پھر اچانک خدا حافظ کہہ دیا۔

”یا خدا یا تو کیوں ایسے لوگوں سے ملا دیتا ہے جو کسی اور کا نصیب ہوتے ہیں۔۔۔۔۔“ موحدرات کی تنہائیوں میں اٹھا اٹھ کر خدا سے دعا کرتا، جب وہ تڑپ رہا ہوتا۔۔۔۔۔ وہ بھی بے قراری محسوس کرتی تھی۔۔۔۔۔ جب وہ سکتی تو اسے لگتا جیسے کوئی اسے یاد کر رہا ہو۔۔۔۔۔ جب وہ تنہائی میں چونک جاتی تو لگتا وہ اسے دیکھ رہا ہے اور بلارہا ہے اور جب وہ آہیں بھرتا تو اسے لگتا کہ وہ بھی اس کے لیے یونہی بے قرار ہے۔ دل کے رشتے بھی عجیب ہوتے ہیں نہ سمجھ میں آنے والی داستان جو دل کے زیادہ قریب ہوتا ہے وہ سب سے زیادہ دکھ دیتا ہے۔۔۔۔۔ یہ فلسفہ تھا یا حقیقت!

شفق اس کا بہت خیال رکھتی۔۔۔۔۔ وہ گاؤں نہیں گئے تھے یا پھر کہیں بھی جانے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ شفق اس سے ڈھیروں باتیں کرنے

لگی تھی مگر وہ کہیں گم ہو جاتا..... ہاتھ کرتے کرتے رک جاتا..... آنکھوں میں نہ جانے کہاں سے نمی آ جاتی تو جلدی سے ضبط کرنے کی کوشش کرتا..... کسی کی آواز کی بازگشت سنائی دیتی "میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی....." وہ جلدی سے ہاتھوں کی پشت سے آنکھوں کو رگڑنے لگتا مبادا کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے اور اس سے روٹھ نہ جائے..... شفق چونک کر اس کی طرف دیکھتی اور سوچتی، کوئی اتنا دور ہونے کے بعد بھی اتنا قریب ہو سکتا ہے۔ یہ سراب تو نہیں اور یہ تخیل بھی تو نہیں..... یہ تو دل کی دنیا ہے اور دل کی باتیں ہیں..... نہ سمجھ میں آنے والی..... نہ نظر آنے والی شفق اسے یوں اندر دھکی دیکھتی تو سبیل نظروں کے سامنے گھوم جاتا۔ اس کے دل سے بھی آہ نکلتی اور آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی۔

حیدر اسے دیکھتے تو ان کا دل بھی کٹنے لگتا..... اپنا زمانہ یاد آنے لگتا انسان کہیں چلا جائے..... مشرق ہو یا مغرب..... ہا اختیار ہو یا بے اختیار اس کا نصیب کہیں نہیں بدلتا..... شہلا اور نور..... شہلا نے شہلا کے ہاتھوں مار کھائی تھی اور اپنے نصیب سے لڑنے کی کوشش کی تھی، کرہی کرہی بکھر گئی..... خاک میں پنہاں ہو گئی..... اور نور رشتوں کے ہاتھوں ہار گئی جیسے میں اور موحہ جذبوں کے ہاتھوں شکست کھا گیا اور شفق اس کے پاس تو کچھ بھی ایسا نہ تھا جو آزمائش بننا مگر پھر بھی وہ ہار گئی۔ قدرت انسان کو کیسے کھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتی ہے اور ہر چیز میں آزمائش ہے جن کا اس نے وعدہ کیا ہے.....

نہ حیدر اسے سمجھاتے، نہ شفق اسے سمجھاتی..... سب جانتے تھے کہ دلوں کے یہ زخم قدرت خود ہی بھرتی ہے نہ لفظ مرہم بنتے ہیں نہ حوصلہ افزائیاں، جیوں اپنی اپنی جگہ منتشر اور بکھرے ہوئے تھے اور سسک رہے تھے..... جس دن نور کی شادی تھی..... وہ سارا دن کمرے میں بند رہا اور نصرت فتح علی خاں کی آواز پورے زیر و بم کے ساتھ سارے گھر میں گونجتی رہی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

"سانوں اک ہل چمن نہ آئے جہاں تیرے ہٹا۔"

حیدر انگل صبح سویرے ہی گھر سے نکل گئے..... ان کا دل بھی بہت پریشان تھا۔ نہ جانے انھوں نے بھی دل میں کتنی دعائیں ان کے لیے مانگی تھیں۔ کسی ایسے مجزے کے لیے جو دونوں کو پھر سے ملا دے..... شفق نے بھی بہت گڑگڑا کر دعائیں کی تھیں، خود اس کے پاس تو سوائے آہوں اور دعاؤں کے کچھ بھی نہ تھا جو دل کی گہرائیوں سے نکلتی تھیں۔ وہ دن اس کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا..... اس نے فون ملایا..... نور کی آواز سنی وہ ہلوی لو کرتی رہی۔

"میں جانتی ہوں یہ تم ہو، کیا تم مجھے بھول نہیں سکتے؟"

"اپنے نام کو کیسے بھولوں..... جو تم نے دیا ہے اور اپنی سوچوں کو کیسے بھکوں جن پر صرف تم حادی ہو۔"

"پلیز..... ہمت کرو..... میں بھی تو اس وقت..... اس وقت خوش ہوں۔" اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی تھر تھراہٹ پیدا کرنے لگی.....

اور اس نے فون رکھ دیا۔ اس نے آنکھیں بند کیں تو پوری شدت سے آنسو بہنے لگے۔ وہ شدت سے رونے لگا پلکیں بھی جھپکتا تو آنسو گر پڑتے آج تو نہ جانے کہاں سے اتنی طراوانی سے آنسو آ گئے تھے..... سارا دن اور ساری رات مسلسل آنکھیں جھپکانے کے ساتھ آنسو ٹپ ٹپ کرتے رہے..... اس کی آنکھوں کے گوشے اس قدر متورم ہو گئے تھے کہ آنکھیں بند کرنے میں بھی تکلیف ہونے لگی تھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے صدیوں سے آنکھیں

خراب ہوں اور بند ہی نہ ہو رہی ہوں۔ ساری رات بے خوابی میں گزری..... کروٹیں بدلتے ہوئے، سسکیاں بھرتے ہوئے اور روتے ہوئے۔
اگلے دن شفق اس کی حالت دیکھ کر سخت پریشان ہوئی۔ ”موحد..... کیا تم میرے ساتھ کہیں چل سکتے ہو؟“ اس نے اس کی توجہ ٹانے کے لیے اسے کہیں باہر لے جانا چاہا۔

”کہاں.....؟“ وہ بے زاری سے بولا۔

”کہیں..... ضروری کام ہے.....؟“

”کیا آج ہی ضروری ہے.....؟“

”ہاں.....“

”اچھا..... چلیے۔“ وہ اسی طرح اٹھتے ہوئے بولا۔

”کم آن..... کپڑے تو مینج کر لو۔“

”یہی ٹھیک ہیں..... کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ اس کے ساتھ باہر نکلا۔ شفق گاڑی ڈرائیو کرنے لگی اور وہ خاموشی سے سوچوں میں گم بیٹھا رہا۔ وہ سب سے پہلے سہیل کے گھر گئی..... اس کے گھر والوں کو پیسے دیے اور ان کا ایڈریس لیا کہ آئندہ وہ انھیں منی آرڈر بھجوا دیا کرے گی..... اس کی ماں ابھی تک بستر پر پڑی موت کی منتظر تھی..... اس کی بہنیں اس کا بہت شکر یہ ادا کر رہی تھیں موحد نے چوبیس کی طرف دیکھا اور گرد بھیلی یا سیت کو چار پائی پراڈیاں رگڑتے وجود کو..... زندگی کو یوں سسکتے دیکھ کر وہ گھبرا سا گیا اس کا دل کٹنے لگا۔

”کون تھے یہ لوگ.....؟“ اس نے شفق سے گاڑی میں پوچھا۔

”ہمارا ایک ڈرائیو تھا اس کے گھر والے وہ مارا گیا..... اور اب یہ تھا ہیں بالکل تھا کوئی بھی تو آسرا نہیں۔“ شفق آہ بھر کر بولی۔

”کیا..... وہ ایک ہی آسرا تھا اور وہ بھی مارا گیا..... یہ پھر بھی زندہ ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... زندگی تو گزاری ہی پڑتی ہے نا..... ہر کوئی اعدا سے اتنا ہی دیکھی ہے جتنے تم ہو۔“

”کیا آپ بھی.....؟“

”ہاں..... میں بھی.....“ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

”کس کے لیے.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”بہت سوں کے لیے.....“ وہ خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگی۔ پھر آصف کے گھر اس نے پیسے دیے..... شام گہری ہو رہی تھی جب اس نے بڑے سے گھر کے سامنے گاڑی روکی اور باہر نکل کر گیٹ کھولا ہر طرف گہری اداسی اور تاریکی سی چھائی تھی..... یوں جیسے کوئی شہر غمناک ہو، نہ جانے زندگی کے آثار کب کے مٹ چکے تھے..... اس نے گاڑی پورچ میں داخل کی، اس کی لائٹ آن کی اور دروازہ کھول کر اندر چلی گئی وہ اس کے ساتھ تھا..... لاؤنج میں ہلکی ہلکی روشنی تھی اور ٹی وی انتہائی آہستہ آواز میں چل رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ٹیوب لائٹ آن کی شزا ایک صوفے پر

چادر لیے بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ وہ شفیق اور موحّد کو دیکھ کر چوکی۔

”شزا آئی..... یہ..... یہ آپ کو کیا ہوا ہے.....؟“ وہ شزا کی بری حالت دیکھ کر بولی۔ اس کی صحت بہت خراب لگ رہی تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے جیسے نہ جانے کب سے جاگ رہی تھیں۔

”شفیق..... تم..... کہاں سے آئی ہو.....؟“ شزا نے حیرت سے پوچھا۔

”میں..... میں..... میری چھوڑ دیے، آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے..... آپ کو کیا ہوا ہے اور شائل کہاں ہے؟“ شائل کے نام پر موحّد نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کے سامنے خوبصورت نیلی آنکھوں والی ماڈرن سی خاتون محوّم گئی جواب اپنی ذات سے بھی بے نیاز عجیب سے طریقے میں بیٹھی تھی۔

”کیا آپ شائل کی ماما ہیں.....؟“ موحّد نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... میں ہی اس بد نصیب کی ماں ہوں۔“ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

”کیوں..... کیا ہوا..... اور شائل کہاں ہے.....؟“ اس نے یکدم چونک کر پوچھا۔

”وہ..... فوشین ہاؤس میں ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اوہ..... فو.....“ موحّد اور شفیق دونوں ایک دم چونک کر بولے۔

”اس کے حواس کام نہیں کر رہے، وہ بالکل پاگل ہو گئی ہے۔“ وہ شکستہ لہجے میں بولی۔

”مگر کیسے.....؟“ شفیق بوکھلا کر بولی۔

”اس گھر میں نہ جانے کون سی فحش ہے یہاں کسی کا بھی اپنے حواسوں پر قابو نہیں ہے اور شائل کے اندر تو بہت سے طوفان اکٹھے ہو گئے

تھے۔ وہ..... وہ..... ان کا مقابلہ نہ کر سکی اور ٹوٹ گئی..... بکھر گئی..... میری بیٹی ریزہ ریزہ ہو گئی۔“ شزا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”آئی ایم سوری..... اور اس نے مجھ سے بھی رابطہ نہیں کیا۔“ موحّد بولا تو شزا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی جیسے کچھ

بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔

”تم..... تم..... ولیم ہو.....“ شزا نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... پہلے تھا..... اب موحّد ہوں۔“

”کیا تم مسلمان ہو گئے ہو.....؟“

”ہاں.....“ شزا کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔

”اور تم شفیق کے ساتھ..... کیسے؟“

”یہ میری بہن ہیں.....“ موحّد نے جواب دیا۔

”کیا مطلب..... تم شہلا کے بیٹے ہو.....؟“

”جی.....“

”اوہ..... مائی گاڈ..... یہ سب کیا ہے تو وہ مری میں شہلا تھی اور میں اسے پہچان ہی نہ سکی۔ یہ کیسے ممکن ہے.....؟“ وہ بڑبڑائی۔

”مما کی اب ڈیڑھ ہو چکی ہے۔“ شفق نے اسے بتایا۔

”کب.....؟“

”ایک ماہ ہو چکا ہے اور آپ سیر کو ادھر ہی کیوں نہیں بلا لیتیں عجاز مدی کیسے گزرے گی؟“ شفق نے کہا۔

”وہ..... یہاں نہیں رہنا چاہتا، اسے اس گھر کے درد و یار سے نفرت ہے میں نے اس کے لیے فلیٹ بھی لیا تھا لیکن وہ نہ میرے ساتھ

رہنا چاہتا ہے اور نہ ہی اس گھر میں..... آئی ایم آل الون..... لو کر ہیں اور میں ہوں۔“

”آئی آپ فکر نہیں کریں، ہمت کریں ہم یہاں آتے رہیں گے۔“ شفق نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”جج.....“ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں جیسے گھٹاؤپ اندھیرے میں کوئی جگنو چاٹک بھٹکا ہوا کہیں سے آ گیا ہو اور وہ ایک لمحے کے لیے دم

بخورہ گئی ہو.....

”ہم..... شمل سے ملنے فوشین ہاؤس بھی جائیں گے اور شمل ٹھیک ہو جائے گی۔“ موحّد نے اسے تسلی دینا چاہی۔

”کیا وہ واقعی ٹھیک ہو جائے گی..... کیا تم واقعی جج کہہ رہے ہو۔“ انتہائی مایوسی میں اس جملے نے جیسے مرہم کا کام کیا..... ”خدا..... تمہیں ہمیشہ

سلامت رکھے۔“ اس نے موحّد کے سر پر پیار دیا..... شزا کے منہ سے انتہائی بے بسی سے نکلی ہوئی دعا نے جیسے اس کے اندر حرارت بھردی..... اسے اپنے

قدموں تلخ زمین اور سر کے اوپر آسمان مسکراتے ہوئے محسوس ہوئے..... ایک نونے دل کی دعا کتنا اثر رکھتی ہے اس کا دل بھی سرور ہونے لگا۔

”ہم کل اس سے ملنے جائیں گے.....“ موحّد نے شفق سے کہا تو وہ خوش ہو گئی۔

”آئی اپنا خیال رکھیں..... سب ٹھیک ہو جائے گا مجھے اپنی کچھ چیزیں چاہیے تھیں وہ لینے آئی ہوں۔“ وہ کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔

”تم بہت خوش نصیب ہو کہ خدا نے تمہیں ایک اچھی بہن دے دی ہے۔“ شزا نے اس سے کہا تو وہ کہیں کھوسا گیا۔ خدا ایک رشتہ دیتا ہے

تو دوسرا چھین لیتا ہے۔ نور کو چھینا تو شفق کو دیا..... ماما کو چھینا تو حیدر انکل کو دے دیا..... خدا کی مصلحتیں وہی جانے لیکن شزا آئی کی بات نے اسے

قدرے سکون سادیا۔

”چلو..... موحّد.....“ اس نے بیگ پکڑتے ہوئے کہا۔

”لائیں یہ مجھے پکڑا دیں۔“ اس نے آگے بڑھ کر اس کا بیگ پکڑا اور ہا ہر نکل گیا..... اسے واقعی آج کسی بھائی کی بہن ہونے پر فخر ہونے

لگا۔ اس کا بوجھ اٹھانے والا اس کے ساتھ قدم بہ قدم چل رہا تھا اسے ایک عجیب سی طمانیت اور تحفظ کا احساس ہو رہا تھا..... وہ قدرت کی اس نعمت پر

حیران ہو رہی تھی..... تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا..... جہاں ہر طرف تاریے بھٹلا رہے تھے جیسے ان کے ملاپ پر خوش ہو رہے ہوں.....

دونوں اگلے دن فوشین ہاؤس گئے تو شزا بھی وہاں پہنچی ہوئی تھی آج وہ قدرے بہتر لگ رہی تھی۔

”آئی آپ کب آئیں.....؟“ شفق نے حیرت سے پوچھا۔

”صبح سے یہاں بیٹھی ہوں..... تم لوگوں کی منتظر تھی کہ ہو سکتا ہے ہم تینوں کو دیکھ کر میری شائل کچھ پاز پٹوری ایکٹ کرے۔“ وہ ہنسی میں

لہجہ میں بولی۔

تینوں شائل سے ملنے گئے..... شائل کے ہال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں کسی بھی جذبے سے بالکل عاری تھیں نہ چہرے پر کسی قسم کے تاثرات تھے نہ آنکھوں میں..... وہ حیرت سے تینوں کی طرف دیکھتی رہی اور پھر جیسے موحہ کی طرف دیکھتے دیکھتے وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی..... وہ زبان سے کچھ نہ بولی..... بس دیکھتی رہی اور پھر نہ جانے کہاں سے اس کے لپوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی..... اسے عرصے بعد خوبصورت سی مسکراہٹ آنکھوں میں بھی ان کا عکس لہرا سا گیا..... شزا، شفق اور موحہ تینوں چونک گئے جیسے کسی کو نزاع کے عالم میں زندگی کا پروانہ مل گیا ہو..... وہ بغیر کچھ کہے مسکراتی ہوئی واپس چلی گئی۔

”موحد..... وہ..... وہ دیکھا تم نے..... آج..... اسے عرصے بعد مسکرائی ہے وہ..... میری شائل ٹھیک ہو جائے گی تا..... وہ زندگی کی طرف لوٹ آئی گی تا..... اے میرے خدا اس کو بس ایک بار زندگی کی طرف لوٹا دے۔“ شزا کی مسرت دیدنی تھی۔ آنکھوں سے خوشی کے آنسو برسنے لگے۔

”موحد شاید اس نے تمہیں پہچان لیا ہے۔“ شفق بولی۔ خوشی کے مارے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

”معلوم نہیں.....“ وہ آہستہ سے بولا۔

”ہاں..... یقیناً..... وعدہ کرو..... تم یہاں آتے رہو گے پلیز میری بیٹی کو زندگی کی طرف واپس لے آؤ جہاں راہِ احسان میں کبھی بھی نہیں بھولوں گی۔ ایک ٹوٹے دل کی یہی دعا ہے کہ خدا تمہیں ایسی خوشیوں سے نوازے کہ ساری زندگی کسی بھی شے کی تمنا نہ رہے.....“ شزا کے لہجے کی بے بسی اور ملتی جلتی لہجے نے اس کے دل کے زخموں کو ہرا کر دیا۔ اس نے سر جھکا یا تو نور آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔

”میں انسانیت کی ایسی خدمت کرنا چاہتی ہوں کہ جب میں مردوں تو میرے لیے زمین بھی روئے اور آسمان بھی.....“ اس کی آنکھوں میں آنسو حیرنے لگے۔ تمہاری کس کس بات کو بھولوں..... تم بن زندگی کیسے گزر پائے گی۔ شائل نہ جانے کہاں سے آگئی تھی اور نور کا مشن اسے کچھ کرنے پر آمادہ کرنے لگا نہ جانے خدا کڑیاں کہاں سے کہاں ملاتا ہے..... ہم سوچتے رہ جاتے ہیں اور ان راستوں اور نشانوں کو کھوجتے رہ جاتے ہیں کہ اس نے ہمارے لیے کیا کچھ پلان کیا ہے، کیا کیا مصلحتیں..... کیا کیا حکمتیں اور کیا کیا راز پوشیدہ ہیں..... اتنی دنیاؤں کا خالق انسانوں کو بھی کیسے کیسے الجھاتا ہے..... اور انسان زندگی کی آخری سانسیں تک ان الجھے ہوئے دھاگوں کو سلجھاتا رہتا ہے..... سمجھ بھگ بھی نہیں آتی۔

”وعدہ کرو..... تم انسانیت کے نامے یہاں آتے رہو گے میری مدد کرو گے..... ایک بے بس، کمزور ماں کی جس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا اور تمہارے لیے صرف میرے پاس دعائیں ہیں۔“ اس نے لڑکھاتے لہجے سے اس کے ہاتھوں کو چوم لیا۔ اس کے اندر خوشی کا گہرا احساس جاگزیں ہو

گیا..... ایسی خوشی جس کا زندگی میں پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے مگر چہرے پر مسکراہٹ ہی پھیل گئی۔

”ہاں..... میں انشاء اللہ یہاں آتا رہوں گا..... شاکل اور اس طرح کے بہت سے لوگوں کے لیے میں جو کچھ بھی کر سکا، ضرور کروں گا۔“ وہ آہستہ سے بولا تو شزا مسروری لوٹ گئی جیسے اس کے سر سے کوئی بوجھ دھڑکی طور پر ہٹ گیا ہو اور اس نے چند ساعتوں کے لیے سکون کا سانس لیا ہو۔ انسان کا نٹوں کی کیسی چیخیں اندر ہی اندر محسوس کرتا رہتا ہے مگر پھر بھی چہرے پر مسکراہٹیں سجائے شاداں رہتا ہے۔ شاید ہر ایک کے اندر کہیں نہ کہیں ایک کھڑکی ضرور ہوتی ہے..... جہاں زندگی کے درد و الم سے گھبرا کے وہ چند لمحوں کے لیے اسے کھولتا ہے تو تازہ ہوا کے جھونکے اسے چند ساعتوں کے لیے پرسکون کر دیتے ہیں..... ایسا سکون جس کا پوری کائنات میں کوئی نعم البدل نہیں ہوتا..... جس سے صرف روح مضطرب ہوتی ہے، دل کی دنیا مسرور رہتی ہے مگر پھر بھی نہ جانے نمی کہاں سے آ کر آنکھوں میں حیرت لگتی ہے اور گونج دار قبضوں کے سنگ اک سرد آہ نہ جانے کہاں سے ابھر کر سارے وجود کا احاطہ کرنے لگتی ہے۔ آنکھیں سامنے کوئی اور منظر دیکھتی ہیں مگر نہ جانے کہاں کھوسی جاتی ہیں، باتوں باتوں میں بہتے ہوئے نہ جانے آنکھیں کیوں برسنے لگتی ہیں۔ جسم سے جذبات اور روح سے آشناسائی کے سفر میں اتنی مات کھانے کے بعد انسان پل بھر کو رک کر سوچتا ہے.....

جب تک کسی ایسی ہستی کا دکھ دل میں بسیرانہ کر لے اور روح میں سرایت نہ کر جائے جو دنیا بھر سے محبوب ہو..... جو عزیز از جان ہو..... جس پر سارے سچے جذبے قربان ہوں، جو ہمیشہ سانسوں کے سنگ زندہ رہے، جو دل میں آنے والے خیالوں سے بھی ہم کلام ہو اور جو سوچوں پر بھی حاوی ہو..... ایسی ہستی سے جدائی کا دکھ انسان کے روئیں روئیں میں جب تک حلول نہ کر جائے تو یہ آنکھیں دنیا والوں کے دکھوں پر یوں اچانک کبھی نہ بھرا آئیں..... اٹک اچانک کبھی نہ بہہ نکلیں، کسی کو مضطرب دیکھ کر دل کبھی بے قرار نہ ہو کسی کی تڑپ کبھی اپنی تڑپ نہ محسوس ہو۔ جذبات کی ایسی آبیاری کے لیے پہلے انہی کے خون سے تو انہیں سنبھالنا پڑتا ہے۔

کس	قدر	دکھ	ہے	زندگانی	میں
جیسے	تھل	جائے	زہر	پانی	میں
سستی	صدیوں	کا	درد	شال	ہے
ایک	انسان	کی	کہانی		میں

وہ دنیا کے اسٹیج پر کھڑا تھا۔

ہر کوئی بڑ شوق لگا ہوں سے ٹھٹھاٹھا تھا..... اس کے وجود کی روشنی سے گرد و نواح بھی روشن ہو رہے تھے..... نہ جانے کتنے اذہان منور ہو رہے تھے..... کتنے لب دعا گو تھے..... اور آنکھیں محبت سے جھکی جا رہی تھیں۔ اس کی حیات جاوداں کے لیے کتنے ہی دل محمودا تھے..... انسان جنم لیتا ہے اور پھر راسخ عدم ہو جاتا ہے مگر حقیقت میں وہی کامیاب ہوتا ہے جو قدم بڑھاتا ہے شکستہ ہاتھوں کو تھامنے کے لیے..... نونے دلوں کو جوڑنے کے لیے..... اور برستی آنکھوں کو پوچھنے کے لیے..... جو زمانے کے دھککارے ہوؤں کو خار غزاں نہیں بننے دیتا۔ قدرت اس پر حیات جاوداں کے راز منکشف کرتی ہے۔ دنیا کا اسٹیج ان کے مرنے کے بعد بھی ان کے وجود کی رعنائیوں سے کبھی خالی نہیں ہوتا۔

قدرت ان کے وجود کی خوشبو پوری کائنات میں بھردیتی ہے۔ وہ ایسا ہی ایک کردار بنے جا رہا تھا..... جیسا نور نے چاہا تھا۔ جو نور کا مشن تھا اسے اب وہ اپنا نے جا رہا تھا..... اور اس نے پہلا قدم رکھ دیا تھا..... شاید قدرت بھی ایسا ہی چاہ رہی تھی۔

”اور تم کچھ چاہ بھی نہیں سکتے مگر جو جہانوں کا پروردگار چاہے۔“

انسان ناملد ہوتا ہے..... اس کی حکمتوں سے اور اس کے منصوبوں سے اسرار ہمیشہ اسرار ہی رہتے ہیں۔



ختم شد

